

مقالہ عثمانی

افادات

حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ

ترتیب و تحقیق : خالد القاسمی

منتظم اشاعت

ناشر

دارالعلوم حیدرآباد دارالمؤلفین، دیوبند

مَجْمُوعَه

مَقَالَاتِ عِثْمَانِي

حضرت مولانا شبیر احمد صناعثماني رحمہ اللہ

مباحث علم الکلام

۹۸۲۹۴
۱۵۴۱۵۴
۱۵۴۱۵۴

ترتیب و تحقیق
خالد القاسمی

ناشر: دارالعلوم حیدرآباد۔ اے، پی

مستظم اشاعت: دارالمؤلفین دیوبند۔ یو، پی
۲۳۴۰۵۵۴

فہرست رسائل

۱۔ الاسلام	از صفحہ ۱۷	تا صفحہ ۷۲
۲۔ العقل والنقل	۷۳	۱۵۲
۳۔ خوارق عادات	۱۵۳	۱۹۲
۴۔ مسئلہ تقدیر	۱۹۳	۲۳۲
۵۔ الدار الآخرہ	۲۳۳	۲۶۴
۶۔ اعجاز القرآن	۲۶۵	۳۴۴
۷۔ ہدیہ سنہ	۳۴۵	۳۹۲
۸۔ الشہاب لرحم الخاطف المرتاب	۳۹۳	۴۴۰

نوٹ: ہر سالہ کے شروع میں اس کے مندرجات کی فہرست
ملاحظہ کی جائے۔

رسائل

حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ

مباحث علم الکلام

سلسلہ مطبوعات دارالعلوم حیدرآباد، اے، پی
(۲)

۱۹۹۲ - ۱۴۱۳
قیمت ۹۵۰/-

طبع اول

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

عرض ناشر

حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمہ اللہ علماء دیوبند میں اپنی منفرد اور ممتاز دینی علمی حیثیت کے مالک اور برصغیر کے مایہ ناز اہل علم میں شمار کئے جاتے ہیں ان کے علمی کارناموں سے کون بے جو آشنا نہیں، حضرت مولانا مرحوم کا حیدرآباد سے خاص تعلق رہا ہے، آپ کی علم حدیث کے موضوع پر مشہور تصنیف ”فتح المہم“ شرح صحیح مسلم، جو عربی زبان میں ہے اسی علاقہ سابقہ ریاست، میں پایہ تکمیل کو پہنچی اور اس کی اشاعت میں سابق نظام دکن مرحوم میر عثمان علی خان کی خاص دلچسپی رہی،، میں فخر ہے کہ آج ہم حضرت مولانا رحمہ اللہ کے ان علمی افادات کو دوبارہ منظر عام پر لانے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں جو اپنی علمی دینی افادیت کے باوجود عرصہ سے نایاب تھے، دارالتوفیق دیوبند کے تعاون سے، حضرت مولانا کے تمام رسائل خورد و کلاں کو جن میں سے ہر ایک نہایت اہم ہے جدید ترتیب اور تحقیق و تنقیح کے ساتھ دارالعلوم حیدرآباد کی جانب سے شائع کیا جا رہا ہے، یہ دارالعلوم حضرت مولانا حمید الدین عاقل حسامی صاحب مدظلہ کی زیر سرپرستی حیدرآباد میں ایک عرصہ سے تعلیم و تدریس اور اشاعت دین کی اعلیٰ پیمانہ پر خدمات انجام دے رہا ہے، اس مرکز سے پہلی کتاب ”سیرت رسول اعظم“، مؤلفہ حضرت مولانا قاضی زین العابدین صاحب حالی ہی میں اشاعت پذیر ہوئی ہے، خدا تعالیٰ اس کتاب کو بھی اہل علم کیلئے خصوصاً اور اہل ایمان کیلئے عموماً نافع و مفید بنائے۔

رحیم الدین انصاری

مخلص :-

ناظم دارالعلوم حیدرآباد
فلک نما، حیدرآباد، آندھرا پردیش۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

ابتدائیہ

حمد و صلوة :

حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب کے مشہور اور مایہ ناز تلامذہ اور دیوبند کے علماء عمقرین میں شمار کئے جاتے ہیں آپ کی تفسیر قرآن پاک جو ترجمہ شیخ الہند کے حاشیہ پر فوائد کے عنوان سے ہے دریا بکڑہ کا مصداق ہے، اور تمام کتب تفسیر کا عطر کشید کرنے کے بعد انتہائی مختصر و جامع الفاظ میں تمام اشکالات کا ازالہ اور حقائق کا اثبات کیا گیا ہے اس کا لوہا دور حاضر کے سب ہی محققین نے مانا ہے اور اللہ نے اس ترجمہ و تفسیر کو بے پناہ مقبولیت عطا فرمائی ہے اسی طرح علم حدیث میں مسلم شریف کی شرح ”فتح الملہم“ بھی آپ کا عظیم کارنامہ ہے جو اگرچہ پایہ تکمیل کو نہیں پہنچ سکی تھی لیکن تین جلدوں میں اہم ترین مباحث حدیث پر مبسوط و محققانہ کلام کیا گیا ہے اس سے طالبان علم حدیث کو بڑی بصیرت حاصل ہو جاتی ہے،

حضرت مولانا کو اللہ تعالیٰ نے تحریر کے ساتھ تقریر کا بھی عجیب دلکش ملکہ عطا فرمایا تھا تقریر عوامی اجتماعات میں بھی علمی شاہ پاروں کا حسین گلدستہ ہوتی تھی اور نہایت مدلل و دلچسپ انداز ہوتا تھا علم و دین اور اجتماعیت و سیاست پر آپ کے بہت سے قیمتی خطبات کو قلمبند کر کے رسائل کی شکل پر طبع کیا گیا اور ان سے عوام و خواص استفادہ کرتے رہے اب عرصہ دراز سے یہ تمام رسائل ناپید تھے اور کچھ پرانے رسائل دستیاب بھی تھے تو ان کی کتابت و طباعت کا معیار بہت معمولی اور ان میں تصحیح کا کوئی اہتمام نہیں تھا۔

اس لئے ضرورت تھی کہ ان قیمتی رسائل و خطبات کو وقیع انداز میں نئی

تحقیق و تزیین کے ساتھ ایک کامل مجموعہ کی شکل میں شائع کر کے عوام و خواص کی نظر کیا جائے۔

لائق مبارک باد ہیں، عزیز مکرم مولانا خالد القاسمی دفاصل دیوبند، کہ انہوں نے دارالمؤلفین کے مجوزہ پروگرام اور نقشہ کے مطابق نہایت ذوق و شوق اور محنت کے ساتھ اس خدمت کو قابل قدر طریقے پر انجام دیا، تمام رسائل و مضامین کی تصحیح و تصحیح اور مراجعت کے بعد ان کی از سر نو تصحیح کی آیات و احادیث کی تخریج، مشکل الفاظ کی تشریح اور عبارت میں اضافات اور جدید قواعد املا، دکاما، بریکٹ وغیرہ لگا کر اس کام کو وسیع اور زود فہم بنادیا۔

خوشی ہے کہ دارالعلوم حیدر آباد نے اس مفید مجموعہ کی اشاعت کا ذمہ لیا ہے اور اس علمی خدمت کی انجام دہی کا شرف حاصل کر رہا ہے، اللہ تعالیٰ سب کی کاوشوں کو حسب مراتب قبول فرما کر اس مجموعہ کو ذریعہ افادیت و ہدایت بنائے۔

وحید الزماں کیرانوی

معتد دارالمؤلفین دیوبند۔ یوپی۔

عرض مرتب

دارالمؤلفین دیوبند سے وابستگی کے دوران احیائے علوم اکابر دیوبند سے متعلق جو تھوڑا بہت کام احقر سے ہو سکا، اس کا ایک حصہ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے پیش بہا علوم و افادات کی ترتیب و تحقیق سے متعلق تھا۔ حضرت مولانا عثمانیؒ کی تمام اردو تحریروں اور خورد و کلاں رسائل و مقالات کا احقر نے از سر نو مرتب کیا اور خوشی ہے کہ ان کا مجموعہ ”مجموعہ مقالات عثمانی“ کے نام سے منظر عام پر آ رہا ہے۔ ان مقالات و رسائل کی ترتیب و تحقیق کے وقت ہر رسالے کا از سر نو مسودہ بنایا گیا اور تمام ضروری اور جدید رموز اطلاق کی رعایت کے ساتھ ساتھ سابقہ نسخوں سے مراجعت کی گئی۔ پیرا گراف بناتے گئے اور جہاں جہاں ضرورت تھی نئے عنوان لگائے گئے اور آیات، احادیث، بیرونی عبارتوں کو اصل سے مراجعت کے بعد صحیح طور پر لکھا گیا، ارادہ تھا کہ ہر رسالے کے اخیر میں فرہنگ اصطلاحات کا اضافہ کیا جائیگا اور آیات، احادیث اور دیگر اقتباسات، جن کے حوالے پہلے سے مذکور نہیں ہیں، ان کے حوالے بھی اخیر میں درج کر دیے جائیں گے، ہر رسالے کی تشریح طلب ضروری اصطلاحات کی ایک فہرست بھی تیار کر لی گئی تھی اور ان میں درج آیات، احادیث اور دیگر اقتباسات کے حوالے بھی نوٹ کرتے گئے تھے، مگر ابھی ان کو آخری شکل دینے کی نوبت نہیں آئی تھی کہ احقر دہلی منتقل ہو گیا، جہاں کی مختلف النوع مصروفیتوں نے اسے پھر اس ن مہمت نہ دی، اور ادارہ نے بنیادی کام کی تکمیل ہی کو کافی سمجھتے ہوئے بغرض افادیت اس کی اشاعت کا فیصلہ کر لیا۔

تاہم ان اضافی چیزوں کے نہ ہونے سے اصل کتاب کی اہمیت و افادیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا جو ہنوز برقرار ہے۔

حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے ان رسائل و مقالات کی کسی زمانے میں کافی شہرت و افادیت تھی، اور ان کی افادیت میں آج بھی کوئی کمی یوں نہیں ہے کہ ان میں جن مسائل کو موضوع بحث بنایا گیا ہے، وہ نہ صرف آج بھی زندہ ہیں، بلکہ ان میں سے بعض کی شدت اور پیچیدگی میں نام نہاد دانشوروں اور اسلام مخالف عناصر کی کوتاہ اندیشیوں نے اور اضافہ کر دیا ہے۔

خدا کرے یہ مجموعہ مقبول و مفید ہو اور مرتب، محرک، ناشر سب کے لئے زائد آخرت بنے۔

خالد القاسمی

نئی دہلی

۵ جون ۱۹۹۲ء

مولانا شبیر احمد عثمانی

مہد سے لحد تک

مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا فضل الرحمن کے فرزندِ رشید اور مفتی عزیز الرحمن سابق مفتی دارالعلوم دیوبند اور مولانا حبیب الرحمن عثمانی سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند کے برادرِ خورد تھے، آپ کا آبائی وطن دیوبند تھا مگر ولادت ۱۳۰۷ھ مطابق ۱۸۹۱ء میں بجنور میں ہوئی جہاں آپ کے والد بہ حیثیت ڈپٹی مدارس مقیم تھے، سات سال کی عمر میں درجہ قرآن میں داخل کئے گئے اور ۱۳۲۱ھ مطابق ۱۹۰۳ء میں آپ نے دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کی، شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبند کے ارشد تلامذہ میں آپ کا شمار ہوتا تھا اور انہی سے آپ بیعت بھی تھے، فراغت سے دو سال قبل ۱۱۱۲ھ قعدہ ۱۳۰۷ھ مطابق ۱۸۹۱ء میں آپ کی شادی ہو گئی تھی، عمر بھر بے اولاد رہے اور اپنے چھوٹے بھائی بابو فضل حق عثمانی کے بچوں کو متبنی بنا کر پالا پوسا۔

درسیات سے فراغت کے بعد دہلی، مدرسہ فتح پوری میں صدر مدرس مقرر ہوئے ۱۹۱۱ء میں وہاں سے دارالعلوم دیوبند بلائے گئے، جہاں ایک عرصے تک وہ درجہ علیا کے ممتاز استاذ رہے اور آپ کے درسِ مسلم کو خاص شہرت حاصل ہوئی ۱۹۲۰ء میں دارالعلوم سے اختلافات کی بنا پر جب مولانا انور شاہ کشمیری اور مفتی عزیز الرحمن صاحب الگ ہو کر ڈا بھیل گئے، تو اساتذہ اور طلباء کی ایک جماعت بھی ان کے ساتھ ڈا بھیل گئی، انھی میں مولانا شبیر احمد عثمانی بھی تھے اور جامعہ اسلامیہ ڈا بھیل، سورت میں تدریسی خدمات انجام دینے لگے۔ ۱۳۲۲ھ میں حضرت کشمیری کی وفات کے بعد آپ کو جامعہ اسلامیہ ڈا بھیل کا شیخ

الحديث مقرر کیا گیا۔ ۱۹۳۵ء میں مولانا تھانوی اور دوسرے اکابر کے ارشاد پر دارالعلوم تشریف لائے اور ۱۹۴۴ء تک بہ حیثیت صدر، مہتمم اس کی خدمات انجام دیتے رہے، اس دوران جامعہ ڈابھیل سے بھی ان کا تعلق بہ دستورہ برقرار رہا۔

درس و تدریس، تصنیف و تالیف اور وعظ و خطابت کے علاوہ سیاست سے بھی علامہ عثمانی کا سرگرم تعلق رہا ہے اور حضرت شیخ الہند کے ارشد تلامذہ میں ہونے کی وجہ سے یہ ناگزیر بھی تھا، چنانچہ خلافت کمیٹی کے نہایت سرگرم رکن رہے اور ۱۹۳۵ء میں جنگِ ملتان کے تعلق سے ترکوں کے لئے چندہ جمع کرنے کی مہم میں نہایت سرگرمی اور گرم جوشی کے ساتھ حصہ لیا، علامہ عثمانی ایک طویل عرصے تک جمعیتہ علمائے ہند کی مجلس عاملہ کے بھی رکن رہے اور اس کے صفِ اول کے رہنماؤں، اور علمائے میں آپ کا شمار ہوتا تھا، لیکن آخر میں متحدہ قومیت کے نظریے اور کانگریس سے تعاون کے مسئلے پر جمعیتہ علمائے ہند سے اختلاف پیش آیا اور آپ اس سے علاحدہ ہو کر مسلم لیگ میں شامل ہو گئے، ۱۹۴۷ء میں جمعیتہ علمائے اسلام کا آپ کو صدر منتخب کیا گیا، تقسیم ہند سے قبل رمضان ۱۳۶۷ء میں مولانا عثمانی پاکستان تشریف لے گئے اور وہیں کے ہو رہے۔

پاکستان میں بھی آپ کی سیاسی، ملی اور دینی و علمی سرگرمیاں تاحیات جاری رہیں، جن کے پیشِ نظر وہاں کے لوگوں نے آپ کو شیخ الاسلام کا خطاب دیے چنانچہ آپ وہاں دستور ساز اسمبلی کے رکن اور دستور ساز کمیٹی کے صدر مقرر ہوئے اور آپ ہی نے بروقت توجہ اور جدوجہد کے نتیجے میں نواب زادہ لیاقت علی خان کی پیش کردہ قراردادِ مقاصد میں یہ یقین دہانی شامل ہوئی کہ پاکستان کے دستور کی بنیاد کتاب و سنت ہوگی، اس سے پاکستانی سیاست اور سیاسی حلقوں میں آپ کے اثر و رسوخ کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

جامعہ اسلامیہ بھاولپور، پاکستان کی ایک قدیم دینی، تعلیم گاہ ہے، اس کی انتظامی اور تعلیمی حالت ناگفتہ بہ ہو گئی تھی، ریاست بھاولپور کی وزارتِ تعلیم

نے علامہ درخواست کی کہ بھاؤل پور تشریف لائیں اور جامعہ عباسیہ کی اصلاح و ترقی کے لئے اپنے مشورے سے نوازیں، علامہ بھاؤل پور تشریف لائے اور وزارت تعلیم سے ابھی گفتگو شروع ہی ہوئی تھی کہ اچانک ۲۱/ صفر ۱۲۶۹ھ مطابق ۱۳ دسمبر ۱۹۴۹ء میں چند گھنٹے کی مختصر علالت کے بعد آپ نے داعی اجل کو لبیک کہا، جنازہ بھاؤل پور سے کراچی لایا گیا اور محمد علی روڈ پر واقع آپ کے قیام گاہ کے قریب ہی آپ کو سپرد خاک کیا گیا۔

مولانا عثمانی ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے، محدث، مفسر، متکلم و معقولی، مصنف اور خطیب ہر لحاظ سے آپ ایک خاص نمایاں اور بلند مقام کے مالک تھے، سیاسی، ملی و اصلاحی و سماجی کارناموں میں بھی آپ پیچھے نہ رہے، آپ کے علم و فضل کے آپ کے تلامذہ اور معاصرین ہی نہیں، آپ کے بزرگ اور اساتذہ بھی قائل و قدرداں تھے، جس کا انھوں نے بار بار اعتراف بھی کیا ہے۔

مولانا عثمانی کو حضرت نانوتوی کے علوم سے خاص دل چسپی تھی، ان کی تفہیم کا خدا نے ان کو ایک خاص ملکہ عطا فرمایا تھا اور ان سے استفادہ کرتے ہوئے وہ اسلامی حقائق و تعلیمات کو نہایت دل نشیں انداز میں ثابت کرتے ہیں، میرٹھ میں منعقدہ موتمر الانصار کے ایک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی نے، مولانا شبیر احمد عثمانی کو اپنے برابر کھڑا کر کے ایک مرتبہ فرمایا، "و میں اپنے چیلوٹوں کو بھی بڑا سمجھتا ہوں، اگر میرا کوئی معقد نہ مانے تو وہ جانے میں تو یہی خیال کرتا ہوں، یہ مولوی شبیر احمد صاحب، جن کی تقریر آپ نے سنی ہے، میرے چیلوٹے ہیں، مگر میں ان کو بڑا سمجھتا ہوں، ان کی ذات سے ہمیں امید ہے کہ یہ سب کچھ کر لیں گے، اب ہم کو موت کا ڈر نہیں رہا ہے کیوں کہ ہماری جماعت میں کام کے آدمی پیدا ہوتے جاتے ہیں، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا عثمانی کو کیا مقام حاصل تھا اور آپ کی ذہانت و فطانت اور علمی حیثیت کے عوام و خواص بلا آپ کے بزرگ تک کس طرح قائل و قدرداں تھے، خدامِ حرم کے علوم و افادات کو استفادے کی توفیق دے۔

الاسلام

(اسلام کے بنیادی عقائد)

افادات

حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ
ترتیب و تحقیق: خالد القاسمی

خدا کا وجود، توحید و رسالت، ملائکہ اور شیاطین
اور اسلام کے بنیادی عقائد پر، مدلل بحث۔

منتظم اشاعت

ناشر

دارالعلوم حیدرآباد، آندھرا پردیش © دارالمؤلفین دیوبند۔ یو پی
۲۳۷۵۵۴

باہتمام: وجید الزماں قاسمی کیرانوی
معتد دارالمؤلفین دیوبند

طبع اول ۱۳۱۳ھ ۱۹۹۲ء

قیمت رسالہ الاسلام ۱۰/-

فہرست مضامین، الاسلام

صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین	نمبر شمار
۳۹	<u>توحید</u>	۲۱	<u>الاسلام</u>	
۳۹	حضرت نانوتویؒ کے دلائل	۲۲	ماخذ تحریر	۱
۳۹	توحید کا اثبات اور توحید کی دلیل	۲۳	اصل الاصول	۲
	اول	۲۴	اسلام کا اعجاز	۳
۴۱	توحید کی دوسری دلیل	۲۴	کلمہ طیبہ اسلام کی جڑ	۴
۴۲	خدا کیا ہے؟	۲۶	<u>پہلا مضمون (وجود خدا)</u>	
۴۲	ایک شبہ اور اس کا جواب	۲۷	کو تاہ فہمی	۵
۴۲	کیا وحدت کی طرح کثرت بھی خدا	۲۷	مادین کا رد	۶
	کا وصف ذاتی ہے	۲۸	خواہشات کا اسیران	۷
۴۲	خدا تمام اوصاف وجودی کا حامل	۲۹	وجود خداوندی	۸
	اور جملہ اوصاف عدلی پاک ہے	۳۰	مادہ پرستوں کا مضحکہ خیز نظریہ	۹
۴۲	وجود عین ذات	۳۱	دلچسپ مثال	۱۰
۴۵	توحید کی تیسری دلیل	۳۲	عقلانہ زمانہ کی غلط فہمیاں	۱۱
۴۶	فاعل حقیقی صرف خدا ہے	۳۵	تساخ اور قدامت عالم کے	۱۲
۴۷	اسلام توحید خالص کا علم بردار	۳۵	خلاف وید کی شہادت	۱۳
	<u>نبوت</u>		مخلوق کی ذات و صفات ذات	
۴۹	اسباب نبوت	۳۷	وصفات خدا کا عکس	
۵۰	نماز و زکوٰۃ کا فلسفہ	۳۷	تقدیر	۱۴
۵۱	ضرورت نبوت			

صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین	نمبر شمار
۶۰	صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت	۵۲	شبہ نسخ اور اس کا جواب	۲۹
۶۱	آن حضرت کا حسن اخلاق	۵۲	ایک خلیفہ کا ازالہ	۳۰
۶۲	معجزہ علمی	۵۲	انبیاء، ملائکہ اور شیاطین	۳۰
۶۳	معجزہ قرآن	۵۳	ملائکہ اور شیاطین	۳۱
۶۳	خاتم الانبیاء	۵۵	فرشتہ اور شیطان کی تعریف	۳۲
۶۳	مسلمانوں کے تمدن کی کہانی	۵۶	نبی کی علامت	۳۲
۶۳	غیروں کی زبانی	۵۷	نبوت کی تین شرطیں	۳۳
۶۷	ڈاکٹر لی بان کا حقیقت افروز بیان	۵۸	معجزہ کیا ہے؟	۳۵
۷۱	ایک مرد اسلام کا کارنامہ	۶۲	حضرت محمد رسول اللہ	۳۶



الاسلام

یہ مبارک عنوان جس کی بہ قدر مناسب تفصیل لکھنے پر آج میری خوش قسمتی اور سعادت نے مجھ کو آمادہ کیا ہے، جس قدر اپنے تلفظ کی حیثیت سے چھوٹا، مختصر اور مفرد دکھائی دیتا ہے، اُسی قدر اپنے معنوی وسعت کے اعتبار سے تفصیل طلب اور دقت خیز ہے۔

اسلام کی تاریخ، اُس کی صداقت، اُس کے فوائد، اُس کے برکات اور اُس کی ترقی و تنزل کی داستان، بے حد پُرنتائج اور دل چسپ ہونے کی وجہ سے اگرچہ اس قلیل وقت میں پوری نہیں ہو سکتی، جو اس تحریر کے لکھنے میں اپنے پاس سے صرف کر سکتا ہوں لیکن محض یہ نیت کر کے کہ ایسے مقدس اجلاس کے سلسلہ مضامین کا اس طرح کے اہم اور ضروری عنوان سے خالی رہنا بھی شاید بہتر علامت نہ ہو، میں نے یہ کوشش کی ہے کہ اپنی بے بضاعتی اور کم مائیگی کا اقرار کر لینے کے بعد، بہ کمال اختصار اسلامی اصول کو جس طرح پرکھ میں سمجھا ہوا ہوں، اپنی قوم اور احباب کے رُو بہ رُو پیش کردوں۔ تاکہ ہمارا یہ مجمع، اسلام کے بابرکت تذکرے کے ثواب سے محروم نہ رہے۔ اور مولانا عبید اللہ صاحب کے حکم کی (جنہوں نے میرے دل میں اس مضمون کی تحریک پیدا کی) تعمیل نہ کرنے کا بھی مجھ کو گنہ گار نہ ہونا پڑے۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ مجھ سے پہلے سیکڑوں مُصنِّفین نے اس مضمون پر مُنتقل کتابیں لکھی ہیں، اور ہزاروں فضلاء اس عنوان پر خامہ فرسائی کر چکے ہیں، اور لاکھوں پیرایوں میں انہی مسائل کا اعادہ ہو چکا ہے، اور بے شمار آدمی اس موضوع پر اپنی جادو بیانی کا ثبوت دے چکے ہیں، یہ ایسی حالت میں ہماری اس ناچیز تحریر کی کوئی وقعت قائم ہونی نہایت مُشکل ہے، لیکن ہم خوش ہیں کہ ہم کو اپنے مضمون کی وقعت قائم کرنے کی غلش ہرگز

داسن گیر نہیں ہے اور نہ ہمارے دل میں یہ تمنا ہے کہ ہر ہر جگہ پر واہ واہ کے نعرے بلند کیے جاویں، یا اَحْسَنْتَ اور مَرْجَا کی صداؤں سے آسمان سر پر اٹھایا جاوے، یا بات بات پر سبحان اللہ اور الحمد للہ کا ورد پڑھا جاوے۔

ایک ہی آرزو | ہماری صرف ایک ہی آرزو ہے، اور اسی میں کامیاب ہونے کو ہم اپنی محنت کا اصلی صلہ سمجھتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ جو دلی خیالات ہم نہایت صفائی کے ساتھ عام پبلک میں پیش کریں گے، اگر سچائی اور راستی پر مبنی ہیں اور درحقیقت اُن خیالات کا ماننے والا نجات ابدی کا مستحق ہو سکتا ہے، تو اہل عقل اُن کی تصدیق فرما کر ہم کو راحت اور تسلی بخشیں۔ اور اگر فی الواقع اُن خیالات کو ہم نے اپنی غلطی سے دل میں جمایا ہے، یا اُن کے تسلیم کرنے میں اُوہام کی آمیزش لگی ہوئی ہے، یا کسی کی کورانہ تقلید اور بے جا حسن ظن کی وجہ سے اُنھوں نے ہمارے دل میں راہ پالی ہے، تو بے راہ نوازش ہماری غلطیوں پر ہم کو متنبہ فرما کر، ایک گم گشتہ راہ کی ہدایت کا اجر جو خدا کے یہاں سے مل سکتا ہے، اپنے فردِ حسنات میں درج کرنے کی کوشش کریں۔

ماخذ تحریر | سامعین کو یہ میں اطمینان دلانا ہوں کہ میری تحریر کا عام ماخذ، اگرچہ اکابر سلف کی تصنیفات سے باہر نہ ہوگا، لیکن اس کا پیرایہ بیان اور ترتیب دلائل جداولہ طرز پر ہوگی۔ اور شاید اصول اسلام کے ضمن میں بعض ایسے مضامین بھی نظر پڑیں گے، جن کی اس قدر تفصیل دوسری کتابوں میں نہ مل سکے گی، کیوں کہ اسلام کی فیض رسانی ہر خاص و عام اور ہر عالم و جاہل کے واسطے ہے، اور اُس کے اسرار اور فیوض عامۃ کسی شخص پر ختم ہونے والے نہیں ہیں۔

وہ اسلام، جس کے چشمے سے قطرہ قطرہ آبِ حیات بن کر نکلا ہے، جس کے خزانے میں سے علم و معرفت کے لعل و جواہر تقسیم ہوتے رہے ہیں، جس کی عالم گیر روشنی سے دُنیا کا ذرہ ذرہ جگمگا اٹھا ہے، وہ اپنے اخیر زمانے کے پیروؤں کو اپنی فیاضی سے محروم رکھے، اور اپنے ایک سچے مناقب و کمالات بیان کرنے والے کی کچھ بھی امداد نہ کرے،

مہ فرد: رجسٹر، اہل نامہ لے بٹکا ہوا

یہ بالکل قیاس سے باہر ہے۔ میں یقین کرتا ہوں کہ میری تقریر کا روشن عنوان، اس مضمون میں خود میری رہبری کرے گا، اور اگر کچھ نہیں، تو اس سے بھی کیا کم کہ ایک ایسے اولوالعزم مذہب کے نام لینے ہی سے میری تقریر کی کافی حد تک عزت کی جائے گی۔

اصل الاصول | یہ بالکل یقینی بات ہے کہ اسلام کے یا اور کسی مذہب کے غیر متناہی قُرودات کا احاطہ کرنا اور ہر ایک جُزئی جُزئی کو دلائل یا قیاسات سے ثابت کر دکھانا، مرنے دُشوار ہی اُمَر نہیں بلکہ فضول اور بے کار بھی ہے؛ کیوں کہ جب ایک مذہب کے تمام اصول بہ روئے عقل و انصاف تسلیم کر لیے گئے، تو قُرودات اور جُزیات کے منہ میں انکار کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ سکتی؛ اس لیے ہر مذہب دملت کی جانچ، اُس کے اصول اور کلیات ہی کی صداقت سے کی جائے گی، اور اُس کی حقانیت کی پُرستال کا ہمہ بہتر وہ آسان ذریعہ قرار پائے گا۔

اسی قید کو ملحوظ رکھ کر، ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ اسلام کے اصول، بلکہ دینی وقت کا لحاظ کر کے، اصلُ الاصول کہاں تک عقلِ صحیح اور فطرتِ سلیمہ کے زیرِ حمایت ہیں؛ وہ انسان کی فلاح و بہبود کی کس حد تک کفالت کر سکتے ہیں؛ دُنیا کے دوسرے شان دار مذاہب سے اُن کو کیا فوقیت اور امتیاز حاصل ہے؛ انھوں نے بندوں کے دلوں میں، خُدا کی کیسی قدر و منزلت قائم کرائی ہے اور پیغمبروں کا کس قسم کا احترام منوانے کی کوشش کی ہے؛ اگر ہم اپنی اس تحقیق میں، جس کا ہم ارمض نیک نیتی پر ہوگا، خاطر خواہ کام یاب ہو گئے؛ تو یوں سمجھو کہ ہم نے اپنی زندگی کا ایک بڑا بھاری فرض ادا کر لیا، اور بہت سے دوستوں کو، جو مجھ ہی جیسے ہوں، سخت محنت اور کد و کاوش اور دُرِ دُری سے نجات دے دی اور ہزار باندگانِ خُدا کو، تفتیشِ مذاہب میں ایک طویل جان کا ہی سے بچا دیا۔

ہاں، یہ بات بار بار یاد دلانے کے قابل ہے، کہ اس مختصر تحریر میں جو کچھ مذکور ہوگا، وہ طویل و عریض بیانات نہ ہوں گے، نہ کثیر الشہادہات کی رایوں کا استقصا اور

موازنہ کیا جاوے گا اور نہ بے انتہا کتابوں کے حوالے درج ہوں گے، کیوں کہ ان مباحث کے لیے ہم نے خود ایک ایسی مبسوط اور مستقل تصنیف کا ارادہ کر رکھا ہے جس کو ہماری اس تحریر سے وہی نسبت ہوگی، جو کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تقریرِ دل پذیر کو ان کی حجت الاسلام سے۔

اس تحریر میں جو کچھ خیال ہے، وہ صرف اتنا ہی ہے کہ اصول اسلام کی تشریح میں بعض کارآمد اور مفید عام مضامین، نہایت ایجاز کے ساتھ لکھ دیے جائیں جن سے ایک طرف تو علمائے مذہبی خیالات کا عام اندازہ ہو جائے گا، اور دوسری طرف اُس مفصل کتاب کی (جس کا قصد میں نے ابھی ظاہر کیا) نوعیت مضامین سے واقف ہونے اور طرز تحریر کے پرکھنے کا بھی مشتاقوں کے واسطے یہ تحریر ایک نمونہ بن جائے گی۔

اسلام کا اعجاز — دریابہ کوزہ | بلاشبہ اس قدر وسیع عنوان (اسلام) کو ان چند اوراق میں کھپا دینا، دریا کو کوزے میں بند کرنے سے ہرگز کم نہیں ہے، مگر اسلام کے تعجب انگیز اعجازوں میں سے یہ بھی ایک ہے، جس پر ڈاکٹر لی بان وغیرہ محققین یورپ نے بھی حیرت ظاہر کی ہے، کہ وہ جس قدر طویل ہے، اُسی قدر مختصر بھی ہے اور جتنا دشوار ہے، اتنا ہی آسان بھی ہے۔ اور جیسا کہ اُس سے ایک حکیم اور اُرسطو وقت فائدہ اٹھا سکتا ہے، ایسے ہی ایک عامی اور افریقہ کا ایک وحشی بھی اپنا کام نکال لیتا ہے۔

کلمہ طیبہ۔ اسلام کی جڑ | اسلام کے بزرگ و بار اگرچہ بہت دور تک پہلے ہوئے ہیں، مگر اُن سب کی جڑ صرف ایک کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے۔ انہی دو جملوں میں تمام اسلامی معتقدات کا خلاصہ اور لب لباب نکل آتا ہے۔ اور یہی کلمہ شریعت کا عطر، اسلام کا جوہر، ایمان کی روح، راستی کا نشان، ہدایت کی زندہ تصویر اور علوم حقائق کا سرچشمہ ہے۔ اسی کلمہ سے دائمی راحت حاصل ہوتی ہے۔ اسی سے رُوحی مسرت اور حقیقی آرام ملتا ہے۔ اسی کی بدولت، مسلمان خیر الائم کے لقب سے سرفراز کیے گئے ہیں اور اسی کے چھوڑنے سے آج اُن کو قعرِ مذلت میں گر ادیا گیا ہے۔

لیکن بب کہ یہ کلمہ، کل اہل اسلام کے نزدیک ایسی نعمتِ عظمیٰ اور رحمتِ کبریٰ تصور کر لیا گیا، تو نہایت ضروری ہے کہ اسلام پر مضمون لکھنے والا، اول اسی کی حقیقت واضح کرنے میں اپنا وقت صرف کرے اور جب تک اس کی کامل تحقیق سے فارغ نہ ہو جائے، اسی کو مَطْمَحِ نظر بنائے رکھے۔ چنانچہ میرا ارادہ بھی اس وقت یہی ہے کہ میں اس کلمے کی تحلیل و تقسیم کر کے، اس کے ہر جزو پر مستوعِبِ بحث کر دوں۔

جہاں تک غور کیا گیا، اس کلمے کے دو جز نظر آئے۔ اُن میں سے پہلا جزو جس کے معنی یہ ہیں کہ: ”اللہ کے سوا کوئی چیز معبود بننے کی صلاحیت و استحقاق نہیں رکھتی،“ فی الواقع تین مضمونوں پر مشتمل ہے: خدا کا موجود ہونا، اُس کا قابلِ عبادت ہونا اور اُس کی خدائی میں کسی کا شریک نہ ہونا۔

پہلا مضمون

یعنی خدا کا وجود

یہی وہ مضمون ہے جس کی تائید تمام ادیان و مذاہب نے یک زبان ہو کر کی ہے، اور جس پر بلا تکثیر اہل ہل کا اجماع منعقد ہو چکا ہے۔ ملاحدہ، جن کا دوسرا نام منکرین مذہب بھی ہے، زور و شور کے ساتھ اسی مضمون کی تردید پر تلے ہوئے ہیں۔ اور مادیین (میریٹسٹ) کے گرد و سب سے ہماری سب سے بڑی معرکہ آرائی اسی میدان میں ہو سکتی ہے۔

یورپ میں مادہ پرستوں کی جو جماعت تیار ہوئی ہے، اُس نے آج کل مذہبی دُنیا میں ایک عام ہل چل مچا رکھی ہے، اور نہایت بے باکی کے ساتھ اس کا اظہار کیا ہے کہ خدا کا وجود ہرگز کوئی واقعی وجود نہیں ہے؛ بلکہ وہ بھی اُن وہمی اشیاء میں سے ایک شے ہے، جن کو انسانی تخیل نے بد و فطرت میں، قوانینِ طبعیہ سے مرعوب ہو کر اختراع کر لیا تھا۔ رفتہ رفتہ اُس فرضی خدا نے لوگوں کے دماغوں پر، ایسا کچھ قبضہ اور اقتدار حاصل کیا کہ اُنھوں نے تمام اعمال و افعال اور تمام ارادوں کو بلکہ تمام کائنات کی عنانِ حکومت اُس کے ہاتھ میں دے دی، اور محض اپنی خوش اعتقادی سے یہ سمجھ لیا کہ دُنیا میں جو کچھ کرتا ہے، خدا ہی کرتا ہے۔ اور جس قدر حوادث پیش آتے ہیں، یا واقعات کا ظہور ہوتا ہے، یہاں تک کہ اگر پتا بھی ہلتا ہے اور ایک تنکا بھی اپنی جگہ سے سُڑک جاتا ہے؛ تو بغیر اُس کے حکم اور ارادے کے نہیں ہو سکتا۔

مادہ پرست کہتے ہیں کہ اہل مذاہب سے کوئی پوچھے، کہ تم کو ایک ایسی مافوق الفطرت ہستی کے ملتے پر کس چیز نے مجبور کیا ہے؟ کیا عالم میں جو حوادث واقع ہوتے رہتے ہیں، یا زمانہ جو پلٹیاں کھاتا ہے، یا وجود کی آمد و شد جو اکثر چیزوں میں مشاہدہ کی جا رہی ہے، اُنھارے

مہ MATERIALIST، مادہ پرست، دہریہ مہ بد و فطرت: آغاز فطرت، ابتدائے آفرینش

اس فرضی خدا کے سوا اور کسی سبب سے ربط نہیں کھا سکتے؛ یا مادہ، جو مع اپنی حرکت کے ازلی وابدی ہے، ان ضرورتوں کو سرانجام نہیں دے سکتا؛ یا خواہی نہ خواہی تم کو ایک موہوم اور خارج از عقل ہستی کے سامنے جیہ سالی ضروری معلوم ہوئی۔

کو تاہ فہمی اگر ہم سے پوچھو تو یہ سب خیالات، ارباب مذاہب کی نادانیت اور کوتاہ فہمی پر مبنی ہیں؛ کیوں کہ زمانہ حال کی تحقیقات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ عالم کے تمام سماوی اور ارضی اشیاء کی اصل دو چیزیں ہیں: مادہ اور اُس کی قوت (حرکت)، اور ازل سے دونوں تلازم کے ساتھ موجود ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ مادہ اور اُس کی حرکت میں انفصال یا جدائی ہو سکے اور ایک بغیر دوسرے کے پایا جائے۔

مادہ سے وہی اجزائے دیمقراطیسی مراد ہیں، جو اس خلا میں بھرے ہوئے ہیں اور جو اربعہ ذہنی قسمت قبول کر سکتے ہیں، لیکن خارجی تقسیم کا ان میں مساع نہیں؛ ارضی ذرات کو ایثر (ایتھر) سے تعبیر کرتے ہیں، اور ارضی کی دوامی حرکت کی وجہ سے، اجرام سماوی یعنی ستارے اور کائنات ارضی یعنی جمادات و نباتات اور حیوانات جو پہلے سے موجود نہ تھے، وجود میں آتے ہیں۔ اور ان چیزوں کا مادہ اور اس کی حرکت سے متناہی و بیابا ہے، جیسا کہ کوئی معلول اپنی علت سے بے اختیار بن جاتا ہے؛ چنانچہ ان اشیاء کی پیدائش میں، مادہ اور اُس کی حرکت کو نہ کسی قسم کا ادراک ہوتا ہے، اور نہ اُن میں قصد و ارادہ پایا جاتا ہے۔

اور جب ہم کراتِ عالم اور تمام مخلوقات کے وجود کو، مادہ اور اُس کی حرکت سے منسوب کر سکتے ہیں؛ تو نہ ہم کو کسی فرضی خدا کی حکومت مانتی پڑتی ہے، اور نہ اپنے کو مذہبی طوق و سلاسل میں پھانسنے کی ضرورت رہتی ہے۔ غرض، ہمارے نزدیک مادہ بھی قدیم ہے اور اُس کی حرکت بھی قدیم ہے، اور جو سلسلہ صورتوں کا مادے کے اندر قائم رہتا ہے، وہ بھی قدیم ہے، اگرچہ صورتِ شخصیت علاحدہ علاحدہ حادث ہے؛ اس حالت میں ہم کو خدا کے وجود کی اصلاً ضرورت نہیں، بلکہ مادہ اور اُس کے قوانین فطریہ ہی عالم کی ہستی اور بقا

کی دلیل ہیں، اور پورے طور پر ضمانت کر سکتے ہیں۔
مادی میں کارڈ ہم کہتے ہیں کہ بے شک مادی میں نے بہ زعم خود کائنات کے وجود کا ایک خاص سبب پیدا کیا، لیکن ابھی تک جس منتظم اور مرتب کائنات کے سبب کی ہم کو تلاش تھی، اُس میں کام یابی نہیں ہوئی۔ انہوں نے ہم کو ایک نہایت عظیم و حکیم اور بہ ہمہ صفت موصوف خدا سے علاحدہ کر کے، ایک ایسے خدا پر قناعت کرنے کی راے دی، جو بالکل اندھا بہرا، گونگا اور بے حس و بے شعور ہے جس کا کوئی کام نہ قصد و اختیار سے ہو سکتا ہے، نہ مصنوعات میں کسی قسم کی ترتیب اور تناسب پیدا کرنے پر وہ قادر ہے۔ نہ اُس میں سمجھ کا مادہ ہے، نہ وہ کسی قاعدہ قانون سے واقف ہے، نہ اُس کو امور انتظامیہ کی اطلاع ہے۔

حالاں کہ جس عالم کے فاعل کا ہم کو کھوج لگانا تھا، وہ عالم، کائنات کا ایک ایسا مجموعہ ہے، جس کے ہر ہر جزو میں بیش قیمت حکمتیں و دیعت رکھی ہوئی ہیں، جس کے عجیب و غریب اسرار کا مشاہدہ کرتے کرتے عقل انسانی ٹھک جاتی ہے، اور جس کے بہت تھوڑے حصے کا تتبع کرنے سے حکما کو، اور خصوصاً ان مادیوں کو، یہ اعتراف کرنا پڑا ہے کہ مظاہر فطرت کی جس قدر باریکیاں ہم معلوم کر سکے ہیں، وہ اُس سے بہت ہی کم ہیں جواب تک ہم کو معلوم نہیں ہو سکیں۔

علم تشریح، علم الافلاک، علم الحيوانات، علم نباتات اور علم طبقات الارض کے ماہرین سے دریافت کرو کہ جو راز ہائے قدرت تم نے موجودات عالم میں آج تک دریافت کیے ہیں وہ کس قدر ہیں اور ان کی حفاظت کے واسطے کتنے دفتر اور کتب خانے تم کو درکار ہوئے ہیں؟ پھر عالم کے احوال میں جو تفاوت اور حاجت مندی کے آثار پائے جاتے ہیں، اُس پر بھی ایک نظر ڈالو اور ہر ہر شے کی پستی و ذلت کو (جس سے خداے تعالیٰ کی پر حکمت جبروت کا سبق حاصل ہوتا ہے) بہ نظر تعمق ملاحظہ کرو، تاکہ تم کو یہ معلوم ہو کہ یہ کارخانہ یوں ہی بے سرا اور نجات و اتفاق سے پیدا ہونے کے قابل نہیں ہے۔

آسمان، چاند، سورج اور ستاروں کو دیکھیے کہ ایک حال پر قرار نہیں۔ کبھی عروج ہے،

مع تتبع: جائزہ لینا، تجزیہ کرنا مع قدرت و عظمت

کبھی نزل، کبھی طلوع ہے، کبھی غروب، کبھی نور، کبھی گہن۔ آگ کو دیکھیے کہ بے قرار ہے۔
تھکے نہیں تھکتی۔ ہوا کا یہ حال ہے کہ کبھی حرکت، کبھی سکون، اور حرکت بھی ہے تو کبھی شمال،
کبھی پورب اور کبھی پچیم کو ماری ماری پھرتی ہے۔ ادھر پانی کا کڑھ، ہوا کے دھکوں سے کہیں کا
کہیں نکلا جاتا ہے۔ اور زمین کو بھی پستی کے سوا، لاچار ری اس درجے کو ہے کہ اس پر کوئی روڑا
ہے، کوئی بھاگتا ہے، کوئی کھودتا ہے، کوئی بھرتا ہے۔ اسی طرح نباتات کبھی جھوٹے ہوتے
کبھی بڑے، کبھی ٹرہوتے ہیں کبھی خشک ہو جاتے ہیں۔ اور اس پر باد وجود ایک زمین،
ایک پانی اور ایک آفتاب ہونے کے، اس قدر مختلف پھول اور پھل لاتے ہیں کہ ایک دوسرے
سے کچھ بھی مناسبت نہیں رکھتا۔

علیٰ ہذا القیاس، حیوانات خصوصاً بنی نوع انسان، باوجودے کہ سب کے سب
اربع عناصری سے مرکب ہیں، شکل و شمائل، جو بو اور خاصیت مزاج میں اتنے مختلف معلوم
ہوتے ہیں کہ حد ادراک سے باہر ہے۔ اس کے علاوہ بھوک پیاس، صحت مرض، گرمی
سردی اور حرص و ہوا وغیرہ کے بہت سے مؤثران کے پیچھے ایسے لگا دیے ہیں کہ جس سے
شرفِ حیات بھی خاک میں مل گیا۔

خواہشات اور حاجات کا اسیر انسان | اور حضرت انسان کے پیچھے تو اتنا کچھ لشکر کا لشکر
اور حاجات کا متعین ہوا، کہ جس نے اس کی فہم و دانش کو ناچار کر کے، تمام شرافت و عزت
کو لمبا میٹ کر دیا۔ دوسرے حیوانات تو صرف کھانے پینے ہی کے محتاج ہیں، لباس،
مکانات، سواری، عزت، منصب، جاگیر، میٹھے، کھٹے، نمکین کی کچھ پرواہ نہیں رکھتے؛
لیکن انسان کو بغیر ان چیزوں کے بھی زندگی بسر کرنا محال یا دشوار ہے۔

بلکہ غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس چیز میں کوئی خوبی اور کمال زیادہ تر تھا،
اُسی کو اوردوں کی نسبت زیادہ قیودات میں پابند کر کے رکھا ہے۔ اور یہ ایسا ہی ہے جب
کہ بادشاہ اگر غریبوں کو قید کرتے ہیں۔ تو کئی کئی قیدیوں کو ایک محفظہ سپاہی کفایت
کرتا ہے۔ اور اگر بادشاہ یا امیر ان کی قید میں آجاتا ہے، تو گو اُسے تعظیم سے رکھیں،
لیکن اس پر بہت بہت پہرے اور بڑے بڑے بہادر حفاظت کے لیے مقرر کیا کرتے ہیں۔

وجہ خداوندی | بہ ہر حال، جب کہ ایسے ایسے اشرف اجزائے عالم، اس ذلت و خواری میں گرفتار ہیں جس کا ذکر اوپر ہوا، اور ایسے مجبور ہیں کہ ایک دم کو بھی ان قیودات کے شکنجوں سے وہ علاحدہ نہیں ہو سکتے، تو بلاشبہ ان کے سر پر کوئی ایسا منتظم حاکم ہے، جو ان سے ہر وقت قیدیوں کی مانند یہ سب بے گاریں لیتا ہے اور چن سے نہیں رہنے دیتا، تاکہ یہ مغرور نہ ہو جائیں اور آوروں کو ان پر بے نیازی کا گمان نہ ہو۔ بلکہ ان کو ایسا ذلیل و خوار دیکھ کر، یہ خود بھی اور دوسرے لوگ بھی خدا کو پہچانیں، اور سمجھ لیں کہ یہ اُس کے انتظام کی خوبی ہے کہ ان سے طرح طرح کے کام لیتا ہے اور ان پر قسم قسم کے احوال بھیجتا ہے۔ اور یہ بعینہ ایسا قہر ہے جیسا کہ ایک بیدار مغرور مدبر حاکم، اپنے ماتحتوں کو فارغ نہیں رہنے دیتا اور اس پر بھی کبھی کبھی تبدیل کرتا رہتا ہے۔ یورپ کا ایک محقق، راسین بھی انہی مناظر قدرت کو دیکھ کر کہتا ہے:

”اے آسمانوں، مجھ کو خبر دو! اے دریاؤ، مجھ کو بتاؤ! اے زمین، مجھ کو جواب دے! اے بے انتہا ستارو، تم بولو! کون سا ہاتھ ہے جس نے تم کو اُفق میں مقام رکھا ہے؟ اور شب چارہ! کس نے تیری تاریکی کو خوب صورت بنا دیا ہے؟ تو کس قدر پریشان ہے اور کس قدر عظمت مآب ہے؟ تو خود بتا رہی ہے کہ تیرا کوئی صانع ہے، جس نے تجھ کو بغیر کسی رحمت کے بنایا ہے۔ اُس نے تیری چھت کو فتنہ ہائے نور سے مرتع کیا ہے جس طرح کہ اُس نے زمین پر خال کافر شس بچھایا ہے اور گرد کو ابھارا ہے۔ اور مژدہ رساں سحر! اور نیر شکر فتنہ! او ہمیشہ روشن رہنے والے ستارے! او آفتاب درخشاں! سچ بتاؤ کس کی ادائے اطاعت کے لیے محیط کے گرد سے باہر آتا ہے، اور نہایت ہی فیاضی کے ساتھ اپنی روشن شعاعیں عالم پر ڈالتا ہے! اے پُر رعب سمندر! اے وہ کہ غضب ناک ہو کر زمین کو نکلانا چاہتا ہے! کس نے تجھ کو محبوس کر رکھا ہے، جس طرح شیر کٹہرے میں قید کر دیا جاتا ہے؟ تو اس قید خانے سے بے فائدہ نکل جائے

ۛ شب چارہ: چودھویں کی رات ۛ ۛ یعنی آفتاب درخشاں

کی کوشش کرتا ہے۔ تیری موجوں کا زور ایک حدِ معین سے آگے ہرگز نہیں بڑھ سکتا۔
ملین اڈورڈ کہتا ہے کہ:

”انسان اس وقت سخت حیرت زدہ ہو جاتا ہے، جب یہ دیکھتا ہے کہ ان
مگزّر اور ناطق مشاہدات کے ہوتے ہوئے، ایسے لوگ بھی موجود ہیں
جو یہ کہتے ہیں کہ یہ تمام عجائبات، صرف بخت و اتفاق کے نتائج ہیں، یا
دوسری عبارت میں یوں کہنا چاہیے کہ مادّے کی عام خاصیت کے نتائج
ہیں۔ یہ فرضی احتمالات اور عقلی گم راہیاں جن کو لوگوں نے علمِ المحسوسات
کا لقب دیا ہے، علمِ حقیقی نے ان کو بالکل باطل کر دیا ہے۔ فزیکل سائنس داں
کبھی اس پر اعتقاد نہیں لاسکتا۔“

ہربرٹ اسپنسر کہتا ہے کہ:

”یہ اسرار، جو روز بہ روز زیادہ دقیق ہوتے جاتے ہیں، جب ان پر زیادہ بحث
کرتے ہیں، تو یہ ضرور ماننا پڑتا ہے کہ انسان کے اوپر ایک ازلی وابدی قوت
ہے، جس سے تمام اشیاء وجود میں آتی ہیں۔“

پروفیسر لینا کہتا ہے:

”وہ خداے اکبر، جو ازلی ہے، جو تمام چیزوں کا جاننے والا ہے، جو ہر چیز پر
قادر ہے، اپنی عجیب و غریب کاریگریوں سے میرے سامنے اس طرح
جلوہ کر رہا ہے کہ میں مبہوت اور مدہوش ہو جاتا ہوں۔“

مادّہ پرستوں کا مضحکہ خیز نظریہ | اب ان سب کے جواب میں مادّہ پرست کہتے ہیں کہ یہ تمام عمدہ
انتظام اور مضبوط قاعدے، جو دنیا میں جاری ہیں، یہ سب بھی مادّہ اور حرکت کی ہی کارسازیاں
ہیں۔ اور مادّہ اگرچہ خود نہیں جانتا، مگر خود بہ خود اس سے بے سوچے سمجھے ایسے ایسے حیرت انگیز
قوانین اور اصول بن جاتے ہیں جن کی اس عالم کو ضرورت رہتی ہے اور جس پر نظامِ عالم کا دارومدار ہے۔
لیکن ان حضرات سے اگر کوئی یہ کہے کہ ہندوستان کے کسی گاؤں میں ایک بچہ پیدا ہوا
اور پیدا ہوتے ہی اُس نے نہایت فصیح و بلیغ تقریر شروع کی اور وہ علوم و معارف اس

کی زبان سے ظاہر ہوئے ہیں، جن کی خبر نہ ارسطو کو ہوئی تھی نہ افلاطون کو، نہ سیکن کا ذہن و باں تک پہنچا تھا اور نہ نیوٹن کا، نہ رازی کو وہ مضامین خواب میں نظر آئے تھے نہ امام غزالی کو، تو یہ لوگ ہرگز اُس کے بیان کی تصدیق نہ کر سکیں گے۔ بلکہ جو شخص اس عجوبہ زاقصے کی تصدیق کرے گا، اُس کو بھی ان لوگوں کے یہاں سے مجنوں، دیوانہ، خطی اور پاگل کا خطاب ملے گا۔

تو کیا اے عقل مندو! مادے کی وہ سحر کاریاں اس واقعے کی قدرت سے کچھ کم حیرت افزا ہیں! وہ سچہ جو ایک ناممکن انسان ہے، اُن امور کی قدرت نہ رکھے جن کو چند تعلیم یافتہ مرد انجام دے سکتے ہیں اور ایک جمادِ لایعقل جس کو ذرہ برابر بھی ادراک و شعور نہیں، تمام مخلوقات کی حفاظت اور زینت کے ایسے محکم دستور العمل تیار کرے جن کو دیکھ کر دُنیا کے عقلاً جیران ہیں اور جن کے اسرار و حکمت کی گہرائی کو سب مل کر بھی آج تک معلوم نہیں کر سکے!!

دل چسپ مثال | اگر اِس پر بھی آپ بھی کہے جاویں کہ نہیں کچھ ہی ہو، ان تمام قوانین کی وضع وہی مادہ کی بے اختیاری حرکت ہے، تو یہ قول علامہ حسین آفندی کے، ہماری اور آپ کی مثال، ٹھیک اُن دانشمندیوں کی سی ہوگی جو کسی نہایت رفیع الشان اور مضبوط کوٹھی میں داخل ہوئے۔ جس میں متعدد دکرے اور نشست گاہیں پائی جاتی ہیں۔ وہ دروازوں اور جنگلوں سے آراستہ ہو۔ اُس کے برآمدے اور ڈیوڑھیاں بہت اہتمام اور استحکام کے ساتھ بنائی گئی ہوں۔ اور کمروں میں اعلیٰ درجے کے فرش بچھے ہوئے ہوں، بڑے بڑے بلند تخت لگے ہوں، نہایت بیش قیمت برتن اُس کے چاروں طرف قرینے سے رکھے ہوں مختلف گھڑیوں، متعدد بمقیاس الحرارت و بمقیاس الہوا کے ذریعے اس کی دیواروں کی زیبائش کی گئی ہو۔ غرض، اُس میں بود و باش کرنے کے لیے جتنے سامان ضروری ہیں، سب ہی کچھ موجود ہوں۔ اس کے چاروں طرف نہایت خوب صورت سیرگاہیں نظر آتی ہوں۔

مگر اگر ایسی جہن بند کی گئی ہو، جن میں درختوں کا صف باندھ کر کھڑا ہونا لگا ہوں کو بھلا معلوم ہوتا ہو۔ قسم قسم کے پھولوں کی کیا ریاں موقع موقع سے بنائی گئی ہوں۔ اُس کی نہروں

عہ حیرت انگیز عہ حرارت پیا آلہ عہ آئہ باد بیا

اور جدوڑوں میں پانی شوخی سے بھرا ہو۔ اُس کے مستحکم بنے ہوئے حوض بآب بھرے ہوں۔ خلاصہ یہ کہ عیش و آرام کے سارے سامان مہیا ہوں، کہ جو انہیں دیکھے، یہی کہے کہ فلاں چیز فلاں حکمت پر مبنی ہے۔ اس چیز سے یہ فائدہ ہے۔ اس کی یہ ضرورت ہے۔ اس کا بنانے والا کیسا ذی اختیار اور خوش تدبیر تھا، جس نے کہ جو چیز بنائی ایک قرینے سے بنائی، اور جس شے کے لیے جو مقام تجویز کیا، اُس کے لیے وہی مناسب تھا۔

اب ایسے مقام پر پہنچ کر، اُن دونوں شخصوں میں سے ایک تو یہ کہنے لگا: ”کہ صاحب! اس میں ذرا شک نہیں کہ اس کا بنانے والا ان ساری عجیب و غریب متاعیوں پر خوب ہی قادر تھا، اور اُن کی تالیف و ترتیب کے طریقوں سے بھی بڑی واقفیت رکھتا تھا، جب اُس نے انتہا درجے کی حکمت کے موافق اس کو اس قدر مضبوط اور اُستوار بنایا۔ اور خوبی یہ کہ اُس کے تمامی لوازمات کامل طور پر مہیا کر دیے، تاکہ یہاں رہنا اور کما حقہ عیش و آرام سے بسر کرنا ممکن ہو، اور کوئی امر آسائش و راحت میں مُخل نہ ہونے پاوے۔ اس کے بنانے والے کو اگرچہ ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا نہیں، مگر یہ بالکل یقینی امر ہے کہ اُس میں علم و قدرت و تدبیر و حکمت وغیرہ اوصاف جن کی کہ اس کو کھٹی کے بنانے میں ضرورت پڑتی ہے، سب موجود تھے۔ باقی اس کو کھٹی کے ساز و سامان میں، اگرچہ بعض چیزیں ایسی بھی پائی جاتی ہیں، جن کی حکمت میری سمجھ میں نہیں آئی، لیکن اُن میں کوئی نہ کوئی حکمت ضرور ہوگی، اگرچہ میں اس کو دریافت نہیں کر سکا۔ کیوں کہ جن اشیاء کی حکمت میری سمجھ میں آگئی، میں نے اُس سے یہ اطمینان کر لیا ہے کہ اس کا بنانے والا بڑا حکمت والا ہے، تو اُس نے ان کو بھی خارج از حکمت و مصلحت نہ بنایا ہوگا۔“

اب دوسرا شخص اپنے ساتھی سے کہنے لگا کہ: ”اس کو کھٹی کے وجود کا سبب جو تم نے بتلایا، یہ درست نہیں، بلکہ ایک پہاڑی کی طرف (جو اس کو کھٹی کے پاس، استادہ تھی اور جس کی جڑ میں ایک پانی کا چشمہ جاری تھا) اشارہ کر کے کہا کہ اس پہاڑی کی چوٹی سے اس قطعہ زمین کی جانب، جس میں یہ کوکھی واقع ہے، ہمیشہ زمانہ قدیم سے ہوا چلا کرتی ہے یہی ہوا لاکھوں برس تک مٹی اور پتھروں کو پہاڑی سے منتقل کرتی رہی، اور وہ سب چیزیں اس

کی وجہ سے مختلف شکلوں پر اس قطعہ زمین میں جمع ہوتی رہیں، اور بارش کا پانی ہمیشہ اس میں کچھ تصرف کرتا رہا۔ کبھی اس کی شکل کچھ ہو گئی کبھی کچھ۔ اسی طرح کبھی وہ چیزیں مجتمع ہو گئیں اور کبھی پراگندہ۔ اور ان کی اوضاع و شکلوں میں ہوا اور بارش کی وجہ سے کچھ نہ کچھ تبدیلی واقع ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ کروڑوں برس کا زمانہ گزرنے کے بعد، اب کوٹھی کی باقاعدہ صورت بن گئی، جس میں کمرے، نشست گاہیں، دروازے، جنگلے، برآمدے، راستے، حوضیں اور نہریں سبھی کچھ پائی جاتی ہیں۔ رہا نہروں کا جاری ہونا، اُس کی یہ صورت ہوئی کہ اُس چشمے سے، جو کہ اس پہاڑی کے تلے میں واقع ہے، ہمیشہ پانی بہہ کر اس قصر کے صحن میں مختلف طریقوں سے جاری ہوا۔ اس لیے پانی سے اُس کی مٹی گنتی رہی، ہوا اور بارش کا اثر اُس کے راستے میں ہوتا رہا، شدہ شدہ لاکھوں برس کا زمانہ گزرنے کے بعد، باقاعدہ نہریں اور حوضیں جاری ہو گئیں اور اُس میں پانی اس موجودہ انتظام کے ساتھ بہنے لگا۔ اب اس کے برتن، گھڑیوں، فرش اور مختلف قسم کے مقیاسوں کو لیجیے۔ اُن کی یہ صورت ہوئی کہ مسافروں کا قافلہ جو کبھی اس پہاڑ پر سے اس زمین میں اُترا، تو قافلے والوں کی یہ چیزیں اتفاق سے چھوٹ گئیں اور ہوا ان کو مختلف طرح پر ادھر ادھر منتقل کرتی رہی، حتیٰ کہ سال ہا سال کے بعد، یہ نوبت پہنچی کہ فرش باقاعدہ بچھ گئے، برتن قطاروں میں آراستہ، گھڑیاں اور مقیاس دیواروں پر آویزاں ہو گئیں یہی حالت اُن درختوں اور پھولوں کی ہوئی، جو یہاں کی سیرگاہوں میں باقاعدہ لگے ہوئے ہیں۔ اُن کے بیج ہوا میں اڑ کر یہاں تک پہنچ گئے اور اس زمین پر جم کر اُگ آئے، اور ہوا کی وجہ سے ادھر ادھر منتقل ہوتے ہوئے باقاعدہ طور پر آراستہ ہو گئے اور موجودہ حالت پر نظر آنے لگے۔

اب وہ شخص جس کے دماغ میں کچھ بھی عقل اور سر میں کچھ بھی انصاف ہے، بے لاگ ہو کر ان دونوں بیانات کا فیصلہ کر دے اور بے تعصبی کی راہ سے بتا دے کہ اس کوٹھی کے تیار ہونے کا وہ سبب، جو پہلے آدمی نے بتلایا ہے، عقل کے نزدیک ماننے کے قابل ہے، یا دوسرے شخص کی بے ہودہ بکواس! اور اسی طرح عالم کی پُر اسرار ہستی کے واسطے، ایک

۱۔ اوضاع وضع کی جمع ہے، معنی: شکل، حالت۔ ۲۔ پیمانوں سے اکٹھی ۳۔ بکھری ہوئی

قادر مطلق اور علام الغیوب خدا کا اعتقاد رکھنا زیادہ قرین قیاس ہے، یا ایک جاہل اور ابلہ کا مادے کا! اور ایسی صورت میں ارب ہزار انسانوں کی رائے (جو آدم علیہ السلام کے عہد سے اس وقت تک گزرے ہیں، اور جن میں بڑے حکما اور اولوالعزم انبیاء بھی شامل ہیں) صحت اور واقعیت سے زیادہ قریب معلوم ہوتی ہے، یا ہزار دو ہزار غافل اور بدستوں کی؟

عقلائے زمانہ کی غلط فہمیاں | بلاشبہ ہمارے زمانے کے بعض عقلا سے سخت غلطی ہوئی، کہ انھوں نے ایسے ایسے علا درجے کے قوانین قدرت کو جن سے خداے تعالیٰ کی حکمتوں اور صنائعوں کی بوقلمونی ظاہر ہوتی ہے، خداے برتر کی امداد کا محتاج نہیں سمجھا، بلکہ صرف ان قوانین میں، جو حرکت مادہ سے پیدا ہوئی ہیں، باہم توافق، تناسب، ربط، اتحاد پیدا کرنے کے لیے خدا کے وجود کی ضرورت باقی رکھی۔ حالاں کہ اس تناسب و اتحاد کا باقی رکھنا بھی، اسی مادہ اور حرکت کو کچھ زیادہ مشکل نہیں تھا، جس نے ایسے غامض اور غیر متعین قوانین عالم میں جاری کر دیے ہیں۔

تناسخ اور قدامت عالم | تماشے کی بات یہ ہے کہ جیسا کہ مسلمانوں میں بعض علمائے مادہ کے خلاف وید کی شہادت پرستوں کی دھمکی سے مرعوب ہو کر، مادہ وغیرہ کو قدیم مان لیا، اُسی طرح بعض دوسری اقوام کے لیڈروں نے بھی یورپ کے ملحدوں سے ڈر کر، قدامت کے مسئلے کو جزو مذہب بنا لیا ہے اور اسی مسئلے پر تناسخ کی بھی نیوٹن جانا شروع کر دی۔ حالاں کہ دنیا کی وہ پُرانی کتاب، جس پر یہ لوگ نہایت زور و شور کے ساتھ ایمان رکھتے ہیں اور جس کو اہل ہند کی عزت افزائی نے الہامی کتاب بھی بنا دیا ہے، خوب پکار کر کہہ رہی ہے کہ خدا کی ذات و صفات کے سوا کوئی قدیم نہیں ہے۔ چنانچہ رگ وید منتر:

۱۰۱ شلوک: ۸ ادھیایے درک: ۱، کا جو ترجمہ خود سوامی دیانند جی مہاراج نے بھاشیہ

بھومکا میں کیا ہے۔ اُس کی حرف بہ حرف نقل یہ ہے:

”جس وقت یہ ذروں سے مل مل بنی ہوئی دُنیا پیدا نہیں ہوئی تھی۔

اُس وقت یعنی پیدائش کائنات سے پہلے است (غیر محسوس حالت) تھی، یعنی شونیہ اکاش بھی نہیں تھا، کیوں کہ اُس کا اُس وقت کچھ کاروبار نہیں تھا۔ اُس وقت ”ست پر کرتی“ یعنی کائنات کی غیر محسوس علت جس کو دست کہتے ہیں، وہ بھی نہ تھی۔ اور نہ ”پرنو“ (ذرے) تھے۔ ذرات، (کائنات) میں جو اکاش دوسرے درجے پر آتا ہے، وہ بھی نہ تھا۔ بلکہ اُس وقت صرف پر برہم کے سامنے (قدرت) جو نہایت لطیف اور اس تمام کائنات سے برتر پرہم (بے علت) اکارن ہے، موجود تھی۔

کیا رنگ وید کی اس صریح عبارت میں کوئی تاویل چل سکتی ہے؟ کیا کسی تاویل کرنے والے کے لفظی اُلٹ پھیر کچھ کام دے سکتے ہیں؟ کیا اس کے بعد بھی ان حضرات کے دواہم اصول: قدامتِ عالم اور تناسخ کی بیخ و بنیاد قائم رہ سکتی ہے؟ ہم کو افسوس ہے کہ اس قوم کے بیدروں کی کوشش، جو انھوں نے وید کی جدت طرازی میں کی تھی، بالکل رایگاں گئی، اور انھوں نے خدا کو لوہار، بڑھئی، گہوار کے ساتھ تشبیہ دینے میں فضول اپنا وقت ضائع کیا۔ ان کا خیال ہے کہ جس طرح بڑھئی، لوہار، ظروف ساز وغیرہ، اپنی ہر چیز کے بنانے میں مادے کی احتیاج رکھتے ہیں؛ اسی طرح خداوند کار ساز کے لیے بھی یہ ممکن نہ ہو گا کہ دنیا کے کارخانے کو بغیر کسی مادے کے بنادے۔

لیکن ان صاحبوں کو، یہ خیال نہیں رہا کہ بڑھئی، لوہار وغیرہ کو بغیر ہاتھ پاؤں اٹھانے جسمانی، لوہار وغیرہ سامان اور اوزاروں کے بھی کسی چیز کا بنانا محال ہے، حالانکہ خدا کی نسبت، خود بھومکا میں تسلیم کر لیا گیا ہے کہ اُس کو ان آلات کی ضرورت نہیں بڑھئی، لوہار وغیرہ کو جیسا کہ کسی چیز کے بنانے میں مادے کی ضرورت ہے، ایسے ہی دیکھنے میں آنکھ کی اور سننے میں کان کی اور بولنے میں زبان کی بھی ضرورت ہے، حالانکہ سیتا رتھ پرکاش کی تصریح کے موافق، حد اے عز و جل بغیر آنکھوں کے دیکھتا ہے، بغیر کانوں کے سنتا ہے اور بغیر زبان کے کلام کرتا ہے!

مع برتن بنانے والے، گہوار

تو ایسی حالت میں نہ معلوم ان حضرات کو دیکھتے تعلیم کے برخلاف، مادہ کو قدیم کہنے اور اُس پر تناسخ کا خیال باندھنے کی کیا ضرورت پیش آئی؟ کیوں صاف طور پر وہی نہ کہہ دیا، جو مسلمان وغیرہ کہتے تھے کہ خدا تعالیٰ کی ذات و صفات کے سوا سب اشیاء فانی اور حادث ہیں، اور سب چیزوں کا وجود خداے تعالیٰ کے اعتبار سے ایسا ہی عرضی و مُستعار ہے، جیسا کہ زمین و آسمان اور در و دیوار کا نور آفتاب کے نور سے، یا گرم پانی کی گرمی آگ کی حرارت سے۔

مخلوق کی ذات و صفات، اُس خداے واحد نے، اپنی قدرتِ کاملہ اور ارادہ تامہ ذات و صفات خدا و مولیٰ کا عکس سے ہر چیز کو نیست سے ہست کیا اور وہی اپنے اختیار سے جب چاہے گانیت کر دے گا۔ نہ اُس کو مادے کی احتیاج ہے، نہ اُس پر روح کی حکومت ہے، نہ اُس کے اختیارات محدود ہیں اور نہ اُس کا کوئی فعل حکمت سے خالی ہے۔ وہ تمام کمالات کے ساتھ موصوف اور مجملہ نقصانات اور عُیوب سے پاک ہے، کیوں کہ تمام کمالات وجود کے تابع ہیں اور وجود ہی اُن کا سرچشمہ ہے، اور تمام نقصانات عدمی ہیں اور عدم ہی اُن کا باعث ہوا ہے۔ تو جب خدا کا وجود غیر محدود اور اُس کا خانہ زاد ہے، کسی دوسری جگہ سے آیا ہوا نہیں اور نہ عدم کا اصلاً اس کے ساتھ اختلاط ہوا ہے، تو جملہ کمالات بھی اُس کے بے حدود بے پایاں اور غیر مُستعار ہوں گے، اور مخلوقات میں سے کسی مخلوق کے اندر جو کوئی بھی خوبی اور حُسن ہوگا، وہ سب اُس کے محاسن اور صفات کا پُر تو ہوگا۔

تقدیر پس جب ایسی ذات ستودہ صفات نے اپنے اختیار و قدرت سے دنیا کو بنایا ہے، تو یقیناً اس کی ایجاد و اتقا میں بے انتہا حکمتیں صرف ہوئی ہوں گی، اور بے شبہ بنانے سے پہلے ہی خداے تعالیٰ کے علم میں اس کا مُرَتَّب نقشہ اور ابتدا سے انتہا تک ہر ہر چیز کا اندازہ اور پیمانہ موجود ہوگا، جس کو غالباً اہل اسلام لفظ تقدیر سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور یہ تعبیر، اس اعتبار سے بالکل موزوں ہے کہ لغت میں اس لفظ کے معنی اندازہ ہی کرنے کے ہیں۔

بہر حال، اب تک جو کچھ ہم نے لکھا، اُس میں اگرچہ اثباتِ صانعِ عالم کے متعلق وہ زبردست استدلالات نہیں لکھے گئے جن کی تفصیل ہمارے مُتکلمین نے اپنی مبسوطات میں کی ہے، یا جن کو ان شاء اللہ اُسی مُفصل کتاب میں ہم درج کریں گے جس کا وعدہ پہلے ہو چکا ہے، لیکن تاہم ایک سچے، دل نشیں اور عام فہم طریقے سے جس قدر اس مختصر تحریر میں گنجائش تھی، عالم کے واسطے ایک جامع الکلمات فاعل کا ہونا ضروری قرار پا گیا۔ اور یہی وہ مدعا تھا جس کو ہم ثابت کرنا چاہتے تھے۔

اب جو گفتگو باقی ہے، وہ اس میں ہے کہ اتنی بڑی کائنات کے لیے کیا تنہا ایک خدا کا وجود کافی ہو سکتا ہے، اور اس سے ہماری سب حاجتیں پوری ہو سکتی ہیں؟ یا ہم کو مختلف ضروریات کے واسطے در در بھٹکنا پڑے گا، اور بہت سے خود مختار بادشاہوں کے سامنے گردن جھکانا ہوگی؟

توحید

یہی وہ بحث ہے جس کے ضمن میں اسلام کے چمکتے ہوئے امتیازات ظاہر ہوتے ہیں، یہی وہ مقام ہے جس میں اگر تمام مذاہب کے قدم لغزش کھا گئے ہیں اور یہی وہ موقع ہے جہاں پہنچ کر دین برحق کے کارناموں کی آزمائش ہوتی ہے۔ مگر قبل اس کے کہ ہم اس بارے میں مذہب اسلام کی خصوصیات کو نہایت غلی حروف کے اندر ظاہر کریں، یہ لازم خیال کرتے ہیں کہ جملہ مذاہب سے علاحدہ ہو کر، محض عقلی حیثیت سے اس مسئلے کو سمجھیں اور خداے کامل کے دریافت کرنے والی عقلوں سے دریافت کریں، کہ آیانی الواقع ایک ہی خدا ساری دنیا کا بلا مُشقت انتظام کر سکتا ہے؟ یا اُس کو اپنی حکومت کے برقرار رکھنے میں کسی یار و مددگار کی بھی ضرورت ہے؟

حضرت نانوتوی کے دلائل | جہاں تک فکر گئی، اس سوال کا جواب حکیم الامت حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے زیادہ پُر مغز اور جامع کسی نے نہیں دیا۔ اور مُصنّفین میں غالباً اس قسم کی فلسفیانہ بحث کو، اس قدر سلیس زبان میں کوئی نہیں سمجھا سکا، چنانچہ مولانا کے اُن مضامین کا ماحصل، جو تقریرِ دل پذیر میں ہے، درج ذیل ہے۔ شعر:

مُطرب از گفتمہ حافظ غزل نغز بخوان

تا بگویم کہ ز عہدِ طربم یاد آمد

توحید کا اثبات | جناب من! دنیا کے پیدا کرنے والے اگر دو یا دو سے زائد خدا ہوں گے تو ہرگز کوئی چیز بھی وجود میں نہ آسکے گی اور یہ سارا قدرتی کارخانہ بالکل دُرہم و برہم ہو جائے گا؟ کیوں کہ یہ بات تو یقینی طور پر تسلیم کی جا چکی ہے کہ جس چیز کو خدا کہا جائے، اس میں کسی طرح کی کمی اور نقصان نہ ہونا چاہیے۔ اگر ایسا ہو تو عام بندوں میں اور اس میں کوئی فرق نہیں رہ سکتا، اس لیے کہ بندے خدا بننے سے اس لیے محروم ہیں کہ اُن میں قسم قسم کے نقصانات پائے

جاتے ہیں، اور وجود کی باگ اُن کے قبضے میں نہیں ہے کہ جو خوبی اور جو کمال چاہیں، اپنے واسطے موجود کر لیں۔ اب اگر خدا بھی ایسا ہی مجبور و ناقص ہو، تو اُس کو کیا استحقاق ہے کہ ہمارا خدا بن بیٹھے؟

جب یہ بات قرار پائی، تو اب یہ تو کبھی نہیں ہو سکتا کہ آدمی مخلوق ایک خدا کی اور آدمی ایک کی، ورنہ ہر خدا میں نصفاً نصف خدائی کی کمی اور کسر ہوگی۔ اس بنا پر یہی کہنا پڑے گا کہ ہر ایک خدا پوری پوری خدائی کا مالک ہے۔ مگر اس صورت میں جیسا کہ کامل ہوگا، دوسرے پر اُس کی تاثیر بھی کامل ہی واقع ہوگی، کیوں کہ ممکنات اور خالق کی ایسی مثال ہے جیسی آفتاب یا چاند اور زمین و آسمان وغیرہ کی۔ آفتاب سے آفتاب کی طرح کا اور چاند سے چاند کی طرح کا نور پھیلتا ہے، اور زمین و آسمان، درود یوار، کوہ و اشجار وغیرہ میں سے ہر ایک شے کو حسب قابلیت منور کر دیتا ہے۔ اور چیزیں تو فقط نظر ہی آنے لگتی ہیں، لیکن آنے کا اتنے ہی نور سے کچھ اور حال ہو جاتا ہے۔ الغرض، جتنا چاند و سورج میں فرق ہے، اتنا ہی اُن کی شعاعوں میں اور اور چیزوں کے منور ہونے میں فرق ہے۔

تو جب خدا کا وجود بڑا ہی کامل ٹھہرا اور مخلوقات کے موجود کرنے میں اُس کی تاثیر بھی کامل ہوئی، اب اگر ایسے ایسے دو یا کئی خدا ہوں گے اور مخلوقات مشترک ہوگی، تو ہر طرف سے کامل ہی کامل وجود، ہر مخلوق کے پیمانے اور حوصلے کے موافق آئے گا، گز میں گز بھر بالشت میں بالشت بھر۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ ایک سانپ میں دو چیزیں، اور ایک سیر بھر کے برتن میں دو سیراناج، اور ایک جوتی میں ویسے ویسے دو قدم، اور ایک اچکن میں اُس کے موافق دو بدن، اور ایک نیام میں اُسی مقدار کی دو تلواریں، اور ایک مکان میں اُسی کی گنجائش کے موافق دو چند اسباب نہیں سما سکتے، اور دھینکا دھینگے سے ایک میں دو کوڑا نہ لگتے ہیں، وہ سانپ بزن وغیرہ ٹوٹ پھوٹ کر برابر ہو جاتے ہیں، اسی طرح اگر دونوں خداؤں کی طرف سے پورا پورا وجود ایک مخلوق میں سامنے لگے، تو بے شک وہ مخلوق معدوم اور نیست و نابود ہو جائے گی۔

ہاں اگر خدا کے وجود کا کامل ہونا ثابت نہ ہوتا، بلکہ اس میں نقصان اور کمی کا

احتمال ہوتا، تو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ جیسے دُورِ اِغول کا نورِ مل کر کامل نور ہو جاتا ہے، دُورِ خدا کا پُر تو مل کر کامل کو پہنچ جاتا ہوگا۔ مگر اس کو کیا کیجیے کہ خدائی کے واسطے کامل الوجود اور تمام الصفات لازم ہے اور تمام اہل مذاہب کو اس کا اعتراف کرنا پڑا ہے۔

توحید کی دوسری دلیل | اس کے علاوہ ہم یہ کہتے ہیں کہ وہ دُورِ وجود، جو دُورِ خداؤں کی جانب سے مخلوق کو عطا ہوئے، اگر ایک ہی خدا کے خزانے میں ہوتے، اور جو زور و قوت اور شوکت و خشمیت دوسرے کو حاصل ہے، وہ سب بھی اسی ایک خدا کے پاس ہوتے؛ تو بلاشبہ یہ سب مل کر، اس ایک تنہا خدا کی انفرادی قوت میں بہت کچھ اضافہ ہو جاتا۔ اس سے ثابت ہوا کہ ہر ایک خدا کے وجود میں فی الجملہ کوتاہی اور نقصان ہے، جس کی مکافات دوسرے کے وجود سے کی جاسکتی ہے۔ باوجودِ دے کہ اس کا اقرار کیا جا چکا ہے کہ خدائے پاک کی ذات، ہر قسم کے قصور و دُور سے مُبرا ہے، وہ بے عیب و بے نقصان ہے۔ سب چیزیں اس کے بھر دے پر قائم ہیں، وہ کسی کے سہارے کا محتاج نہیں۔ وہ سب کی اصل ہے اور سب اس کی فرع ہیں۔

اور کیوں نہ ہو؟ جس سلسلے کو دیکھیے، ایک ہی اصل پر قرار پکڑتا ہے۔ نورِ آفتاب اگرچہ ہزاروں مکالوں اور ہزار ہا روشن دانوں میں جُدا جُدا جلوہ گر ہے؛ لیکن ان سب متفرق اَنوار کو اُسی ایک آفتاب کے ساتھ رابطہ ہے۔ عدد کا سلسلہ گو ایک سے الٹی غیر النہایہ پھیلا ہوا ہے، کہیں دُویں، کہیں تین، کہیں چار، کہیں پانچ، کہیں بیس، کہیں سو، کہیں ہزار؛ اور اس پر کہیں جذر کہیں مجذور، کہیں حاصل ضرب کہیں مضروب فیہ، کہیں حاصل قسمت کہیں مقسوم علیہ وغیرہ؛ لیکن ان سب کی اصل وہی ایک کا عدد ہے۔ اگر ایک نہ ہو تو یہ سارا سلسلہ اعداد کا نیست و نابود ہو جائے۔ موجوں اور جابوں کے کارخانے کو دیکھیے، تو سب کی اصل وہی ایک پانی ہے۔ شاخوں کو دیکھیے تو سب کی اصل وہی ایک جڑ ہے۔ آدمی وغیرہ کو دیکھیے، تو سب کے سب ایک اصل ہیں، جس کو انسانیت وغیرہ کہتے ہیں، مشترک ہیں۔ اسی طرح جہاں نظر پڑتی ہے، کوئی ایسا سلسلہ نظر نہیں آتا جس کا کوئی سرِ مشا نہ ہو،

۱۔ وجود اور صفات دونوں لحاظ سے کامل ہونا۔ ۲۔ سب کی اصل اور قدر مشترک

اور پھر اُن سرمنشاؤں کو دیکھیے، تو اُن کا کوئی سرمنشا ہے، وہ علمِ جزا مثلاً ہم، تم، ہندو، مسلمان، یہود و نصارا وغیرہ میں آدمیت سرمنشا ہے۔ اسی طرح گھوڑوں میں کوئی اور سرمنشا ہے اور گدھوں کی اور اصل ہے اور کتوں کی اور اصل ہے۔ ان سب اصلوں کی اصل جان دار ہونا ہے۔ اُدھر نباتات کی علاحدہ اصل ہے اور ان کا جُدا ہی سلسلہ اور جُدا ہی سرمنشا ہے۔ پھر اُن کی اصل اور جان داروں کی اصل جسمیت کی زیرِ حکومت ہے۔ اسی طرح اوپر تک چلے چلو، آخر میں جا کر سارے عالم کا اشتراک وجود میں نکلتا ہے۔

خُدا کیا ہے؟ | لیکن چوں کہ شئی مُشترک، عینِ اشیاء مُتَعَدِدہ نہیں ہو سکتی؛ اس لیے یوں سمجھ میں آتا ہے کہ وجود، عینِ عالم اور عینِ موجودات نہیں (جیسا کہ اپنے موقع میں دلائل سے ثابت ہو چکا ہے)

بلکہ یہ ایں لحاظ کہ ایک شے کبھی موجود ہو سکتی ہے کبھی معدوم، یہ کہا جائے گا کہ وجود عالم ایک خارجی اور عارضی چیز ہے، اصلی اور ذاتی نہیں۔ جیسا کہ پانی اپنی ذات سے گرم نہیں ہے، اور آگ کی حرارت سے، جو کہ اُس کی اصلی اور ذاتی صفت ہے، اس میں عارضی گرمی پیدا کر سکتے ہیں، یا صاف و شفاف آئینے کا نور، جو آفتاب کے مقابل ہو، اصلی نہیں بلکہ آفتاب کا فیض ہے، جس کا نور اصلی اور ذاتی ہے۔

نملک اسی طرح عالم کے وجودِ عارضی کے لیے بھی، ضرورت ہے کہ وہ کسی ایسے موجود اصلی سے مُستعار ہو، جس کا وجودِ عرضی و مُستعار نہ ہو۔ پھر جیسے آفتاب سے گو ہزار ہا جگہ دھوپ پھیلے، پر سب کی سب ایک ہی آفتاب کا فیض ہے؛ یوں یقین کرنا چاہیے کہ تمام عالم کا وجود بھی ایک موجودِ حقیقی اور اصلی کا پُر تو ہے؛ اسی کو ہم خُدا سمجھتے ہیں، اور اُسی کی نسبت ہمارا یہ خیال ہے کہ اُس میں تعدد کی گنجائش نہیں۔

ایک شبہ اور اُس کا جواب | اب یہاں پہنچ کر، آپ شاید یہ بول اٹھیں کہ ہم نے مانا کہ موجودات کے وجود میں باہم اس طرح کا فرق نہیں جیسے دھوپ میں اور چاند کی چاندنی میں؛ سب کا وجود ایسا ہی یک سا نظر آتا ہے جیسے اس میدان کی دھوپ اور اُس میدان کی دھوپ۔ جس طرح ہر جگہ کی دھوپ کو، خواہ وہ میدان وسیع اور جنگل میں ہو یا صحن مکان

میں، دھوپ ہی کہا جاتا ہے؛ اسی طرح ہر چیز کے وجود کا نام بھی، خواہ وہ زمین و آسمان کا ہو یا چاند سورج کا یا انسان و حیوان کا، وجود رہتا ہے۔

لیکن اگر فرض کریں کہ آسمان پر ایسے ایسے کئی آفتاب ہوں، تو جس طور پر بہت سے ستاروں کا نور مل کر رات کو یکساں نظر آتا ہے، بالیقین اُن آفتابوں کا نور بھی مل کر یکساں نظر آئے گا۔ پس اگر عالم کے واسطے کئی صانع ہوں، اور سب کے وجود کا پُر نور مل کر اسی طرح یکساں دکھائی دیتا ہو تو کیا بعید ہے؟

اس شبہ کا جواب، اول تو وہی ہے جو اس تقریر کے شروع میں معلوم ہو چکا ہے کہ جس کارخانے کو دیکھیے، وہ کسی ایک چیز پر منقطع ہوتا ہے اور جس سلسلے کو دیکھیے، کسی ایک پر منتهی ہو جاتا ہے؛ چنانچہ دھوپوں کا آفتاب پر، سلسلہ اعداد کا ایک پر، موجوں کے قصبے کا پانی پر تمام ہونا، اور چند مثالیں ان کے سوا پہلے بیان ہو چکی ہیں، جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ جہاں میں جتنے پھیلاؤ ہیں، وہ کسی ایک شے کی طرف سمٹے چلے جاتے ہیں۔

اب ہم دریافت کرتے ہیں کہ پانی اور آفتاب وغیرہ اشیاء مذکورہ کی وحدت (یعنی ایک ہونے کی صفت) بھی من جملہ موجودات کے ایک ہی موجود ہے، اور اُن اشیاء وحدت کا وجود بھی عارضی طور پر ہے؛ کیوں کہ آفتاب اور پانی وغیرہ کے بہت سے ٹکڑے ہو سکتے ہیں۔ اگر اُن کی وحدت اصلی اور ذاتی ہوتی، تو وہ اُن سے کسی طرح زائل نہ ہو سکتی۔ نہ ان میں تقسیم جاری ہوتی اور نہ کثرت کی کسی نیچ گنجائش نکل سکتی۔ اس سے ظاہر ہوا کہ جیسا عالم کا وجود عارضی ہے، وحدت بھی اس کی عارضی ہوگی، اور یہ وحدت بھی اسی موجود اصلی کا فیض ہوگا جس کا فیض خود وجود عالم ہے، اور اُس کی وحدت بھی اسی طرح اصلی ہونا چاہیے جس طرح اس کا وجود اصلی ہے۔

کیا وحدت کی طرح کثرت بھی | اس موقع پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ جیسا کہ وحدت اقسام خدا کا وصف ذاتی ہے؟ | وجود میں سے ہے، ایسی ہی کثرت بھی ہے۔ اور عالم کا ہر قسم کا وجود عارضی فہم اور خدا کے وجود کا پُر نور ہوا، تو لازم آئے گا کہ وصف کثرت بھی خدا کے اندر پایا جاوے، اور وہ اس کے واسطے وصف اصلی اور ذاتی ہو۔

لیکن یہ مُخالطہ تم کو اس وجہ سے لگا کہ وحدت کی مانند کثرت کو بھی تم نے اقسام وجود میں شمار کر لیا، حالاں کہ کثرت کا مبنی عدم پر ہے۔ دیکھو، ہم جانتے ہیں کہ نورِ آفتاب ایک شے واحد ہے، لیکن اگر کسی دیوار میں ایک مکان کے دو روشن دان برابر برابر ہوں، تو درمیان میں اندھیرا ہونے کی وجہ سے ہر روشن دان کا نور علاحدہ علاحدہ معلوم ہوگا۔ غرض یہ کثرت اندھیرے کے سبب سے معلوم ہوتی ہے، اگر ادھر ادھر نور اور پیچ میں اندھیرا نہ ہو، مثلاً دیوار کو مکان میں سے اٹھا ڈالیں، تو سب جگہ نور ہی نور ہو جائے گا اور یہ فرق و امتیاز و تعدد، جس کا نام کثرت ہے، ذرا بھی باقی نہ رہے گا۔ اب چوں کہ اندھیرا نور کے نہ ہونے کو کہتے ہیں اور نہ ہونا ہی عدم ہے، تو معلوم ہوا کہ کثرت عدم کے باعث پیدا ہوتی ہے، وجود کے اقسام میں سے نہیں۔

خدا تمام اوصاف وجودی کا حامل | بہ ہر کیف، اس تقریر سے یہ ثابت ہو گیا کہ جو اوصاف اور جملہ اوصافِ عدمی سے پاک ہے | وجودی ہیں اور عالم میں پائے جاتے ہیں، وہ ضروری ہے کہ خدا تعالیٰ میں بھی ہوں، اور جو اوصافِ عدمی ہیں، وہ لازم ہے کہ خدا میں نہ ہوں۔
موجودِ اصلی میں تقسیم نہیں ہو سکتی | اور یہ بھی ثابت ہوا کہ جو موجودِ اصلی ہوگا، اُس میں کسی قسم کی تقسیم کی گنجائش نہ ہوگی، ورنہ وحدت، جو اوصافِ وجود میں سے ہے جیسا کہ ابھی مذکور ہوا، اس میں اصلی نہ رہے گی۔ حالاں کہ یہ محال ہے کہ وجود تو اُس کا اصلی ہو اور سب قسم کا وجود مخلوقات کو اس سے پہنچے اور ہر طرح کے وجود کا منبع اور معدن ہو، اور پھر اُس میں بعض انواعِ وجود کی اصلی نہ ہو۔

وجودِ عین ذات | اور یہ بھی ثابت ہوا کہ وجود اُس کا عین ذات ہے، اور ذات اس کی عین اوصاف ہے، اور اوصاف اُن کے عین وجود ہیں، ورنہ وحدتِ اصلی اور موجودیت ذاتی باقی نہیں رہ سکتی۔

اس وقت گو میں یقین کرتا ہوں کہ جو شبہ تم کو تعددِ صانع کے متعلق پیش آیا تھا، اس کا حل کافی حد تک ہو گیا ہے، بلکہ اُس کے ضمن میں اور بہت سے گراں قدر فوائد بھی اختصار کے ساتھ حاصل ہو گئے، لیکن میری یہ رائے ہے کہ ابھی اس مضمون کی کچھ اور

تشریح کروں، اور توحید کے بارے میں جو کچھ بھی شبہات ہوں، اُن کو بیخ و بن سے اکھاڑ ڈالوں۔
 گوشتش ہوش سنیں !

توحید کی تیسری دلیل | میں کہتا ہوں کہ کم از کم دو صانع ایجاد عالم میں شریک ہوں گے، تو وہ دونوں جیسا کہ صانع ہونے اور موجودِ اصلی ہونے میں شریک ہوں گے، ایسے ہی کسی نہ کسی امر میں علاحدہ بھی ہوں گے؛ کیوں کہ جہاں اشتراک کے ساتھ تعدد پایا جادے، تو وہاں لازمی بات ہے کہ کسی حیثیت سے ایک کو دوسرے سے علاحدہ اور ممتاز بھی سمجھا جائے مثلاً آدمی باوجود دے کہ آدمیت میں شریک ہیں، مگر بعض اوصاف میں مختلف بھی ہیں جیسا کہ شکل و صورت، قد و قامت، مکان و زمان، رنگ و روپ، خاصیت مزاج وغیرہ میں؛ اگر یہ علاحدگی اور فرق نہ ہو، تو تعدد ہرگز نہ ہو، وہی ایک آدمی رہے۔

اس وجہ سے ضروری قرار پایا کہ جو دو چیزیں کسی امر میں مشترک ہوں تو ان میں سے ہر ایک کے اندر بعض ایسی خصوصیات ہونی چاہئیں، جو دوسری میں نہ پائی جائیں؛ انہی خصوصیات کے مجموعے کو ہم اپنی اصطلاح میں ذات سے تعبیر کرتے ہیں۔ مگر ذات بے وجود کے معدوم محض ہے؛ کیوں کہ دنیا کی ہر ایک چیز وجود کے ذریعے سے ہی موجود کہلاتی ہے، البتہ خود وجود کو اپنے وجود ہونے میں کسی دوسرے وجود کی حاجت نہیں۔ اور یہ بالکل اس طرح ہے جیسا کہ ہر شے کو اپنے روشن ہونے میں نور کی حاجت ہے، مگر خود نور کو اپنی نورانیت میں دوسرے نور کی حاجت نہیں۔

اب اگر دو یا کئی صانع ہوں اور وہ دونوں وجود میں اشتراک رکھتے ہیں۔ تو اُن دونوں وجود کی ذات (یعنی وہ خصوصیاتِ خاصہ جن سے ایک کو دوسرے سے امتیاز حاصل ہے) وجود کے ماسوا کوئی اور چیز ہوگی۔ اور چوں کہ وجود کے سوا سب چیزیں اصل سے معدوم ہیں؛ اس لیے ہر ایک خدائی حد ذاتہ وجود سے بالکل خالی ہوگا اور ان پر وجود اسی طرح عارض ہوگا، جس طرح زمین و آسمان سب چیزیں تاریک اور مظلم تھیں، مگر آفتاب کے نور نے اُن سب کو روشن کر دیا۔ اس صورت میں ہم دونوں خداؤں کو کسی طرح مو

اصلی نہیں کہہ سکتے، بلکہ یہ دونوں بھی کسی ایسے موجودِ اصلی کے محتاج ہوں گے، جس کا وجود خود اس کی ذات کے اندر داخل ہو۔ اور ہمارا مقصد بھی تو حید سے صرف اتنا ہی تھا کہ موجودات کا سلسلہ ایک موجودِ اصلی پر ختم ہوتا ہے، چنانچہ یہ بات اس بات سے بہ خوبی حاصل ہو گئی۔

فَاعِل حَقِیقَتِی صَرَفِ خُدا ہے | کیوں کہ جب موجودات دُخداؤں سے مثلاً پیدا ہوئے، اور وہ دونوں ایک موجودِ اصلی میں شریک اور اصل سے معدوم ٹھہرے، تو یہ معنی ہوئے کہ موجودِ اصلی کا فیض، ان دونوں کے واسطے سے، اوروں کو پہنچتا ہے۔ جیسے پرنا لے کے وسیلے سے، چھت کا پانی نیچے آتا ہے اور آتشی شیشے کے طفیل سے، آفتاب کی سوزش دوسری چیزوں کو پہنچتی ہے اور قلعی دار آئینے کے صدقے سے، آفتاب کا نور اُن درو دیوار کو پہنچتا ہے جو آفتاب کے مُقابل نہیں ہوتے، ان تمام صورتوں میں سب کو معلوم ہے کہ چھت کا پانی، پرنا لے کی راہ سے آتا ہے، پرنا لے سے پیدا نہیں ہوتا، آفتاب کی سوزش، آتشی شیشے کی راہ سے آتی ہے، آتشی شیشے میں کچھ حرارت نہیں، آفتاب کا نور، آئینے کی راہ سے اشیاء کو پہنچتا ہے، آئینے میں ذرہ برابر نور نہیں۔

تو اسی طرح سے اگر بہت سے موجودِ اصلی اور بہ کثرت صانع موجود ہوں، تو تو حید میں کچھ رخنہ نہیں پڑ سکتا، بلکہ اور زیادہ مضبوط اور مستحکم ہو جاتی ہے کیوں کہ فلک یا زمانہ جو بہ اعتبار شہرت کے وقائعِ عالم کا فاعل گنا جاتا ہے، یا انسان و حیوان وغیرہ، جو ظاہر بینوں کو افعالِ اختیاریہ کے خالق معلوم ہوتے ہیں، یا دوا اور دعا وغیرہ، جو بہ نسبت اپنی تاثیروں کے موثر حقیقی سمجھے جاتے ہیں، یہ سب چیزیں اس وقت، بہ حیثیت اپنے فیوض کے، وسیلہ فیض اور واسطہ ایجاد سمجھی جائیں گی اور ان کے خالق ہونے کا شبہ، جو ظاہر برستوں کو پڑا ہوا ہے، بے محنت حل ہو جائے گا۔ اور اس وقت ہم بہ آوازِ دہل یہ نداءے سکیں گے کہ ماسوا خالقِ بزرگ کے، جو چیزیں ظاہر میں مصدرِ افعال یا مصدرِ تاثیرات نظر پڑتی ہیں، وہ سب خداے اکبر کے سامنے ایک کاری گر کے آلات کی طرح ہیں۔ بادی النظر میں اُن چیزوں سے کام ہوتا ہے اور حقیقت میں خدا کرتا ہے۔

اعلیٰ علیہ السلام، حضرات، جیسے نبی ہوں یا دلی، اور ادنیٰ درجے کے، مثلاً: دیو ہوں یا

پری، اوتار ہوں یا فلکِ دَوار، دوا ہو یا دُعا، پتھر ہو یا کوئی جان دار چیز زمانہ ہو یا مکان، چاند ہو یا سورج، ستارے ہوں یا اور کچھ؛ سب کے سب خدا کے سامنے ایسے ہیں، جیسے جیسے بڑھئی کے سامنے بسولا، نہانی، برما وغیرہ فرماں بردار ہوتے ہیں، کہ بے ہلاے اُس کے نہیں ہلتے اور بغیر اس کی مرضی کے کوئی کام نہیں کر سکتے۔

اور اس سارے سلسلہ عالم کی مثال ایسی ہے، جیسے کہ مشینوں اور کلوں کے کارخانے اور گھڑیوں وغیرہ میں بہت سی کلیں اور پُرمزے آگے پیچھے ہوتے ہیں، پھر اگر کوئی کام لینا منظور ہوتا ہے، اول کو ہلاتے ہیں اور پھر سب کلیں بہ ترتیب ہلتی ہیں، اور آخر میں جو کام مقصود ہوتا ہے وہ اخیر کی کل سے حاصل ہوتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ یہ کلیں خود بخود نہیں ہلتیں، کیوں کہ وہ بے حس و حرکت جمادات میں سے ہیں، اُن کے واسطے جب تک کوئی ذمی عقل اور صاحب ارادہ اور کام لینے والا نہ ہوگا، ہرگز کام نہ چلے گا۔

اسی طرح سلسلہ عالم کے واسطے، **عِلَّتُ الْعِلَلُ** اور فاعل حقیقی ایک خداے تعالیٰ ہے۔ کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ فعل اور حقیر سے حقیر سی چیز بھی اُس کے ارادہ اور مشیت کے بغیر وجود میں نہیں آسکتی، اور کس شے کو اس کی سطوت و حکومت کے آگے دم مارنے کی مجال نہیں جو کچھ وہ چاہے، اُس میں کوئی مُزاحمت نہیں کر سکتا اور مقرب سے مقرب بندے بھی اُس کے دربار میں بغیر اُس کی اجازت کے بے ہلا سکتے۔

یہی وہ عقیدہ ہے، جس کی طرف اسلام نے نہایت زور و شور کے ساتھ دعوت دی ہے یہی خیال آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کا سنگِ بنیاد ہے، اور اسی مضمون کی اشاعت تمام انبیاء کی بعثت کا مقصد اولین ہے۔

اسلام۔ توحیدِ خالص کا علم بردار | اس میں شک نہیں کہ دُنیا کے تمام مذاہب میں توحید کی فی الجملہ جھلک پائی جاتی ہے اور جن مذاہب میں شرکِ صحیح کی تعلیم موجود ہے، وہ بھی توحید کے بالکل ترک کرنے پر راضی نہیں ہوئے، بلکہ توحید کے چھوڑنے سے یہ بہتر سمجھتے ہیں کہ شرک کو توحید کے ساتھ جمع کر لیا جاوے، اگرچہ یہ اجتماع، اجتماعِ نقیضین ہی کیوں نہ ہو، لیکن

۱۔ اصل سبب ۲۔ دہد بہ ۳۔ مشین بل ۴۔ یہاں پر صحیح شرک کی صفت مجازی ہے مراد خالص شرک

یہ عزت خاص مذہب اسلام کو حاصل ہے کہ اُس نے بالکل خالص اور بے لوث توحید کی طرف لوگوں کو رجوع کیا اور شرکِ علی یا خنی کا تسمہ باقی لگا نہیں رکھا۔ اُس جہالت اور تاریکی کے زمانے میں جب کہ دنیا میں خالص توحید سے بڑھ کر کوئی گناہ نہ تھا، ہزاروں بندگانِ خدا کو توحید سے مانوس بنا دیا، اور آج تک کر دڑا کر دڑا انسانوں کے دلوں سے شرک فی الذات، شرک فی الصفات اور شرک فی العبادۃ کی ٹکنتوں اور کدورتوں کو دھو ڈالا۔

کیا اسلام کی اس بے غل و غش توحید کا مقابلہ، اُس قوم کی توحید کر سکتی ہے جس نے خدا کے سوا ہر ہر اینٹ پتھر کے سامنے گردن ڈال دی، اور آگ پانی وغیرہ کو بھی قابلِ پرستش سمجھا، اور اپنے ہاتھوں سے بنائی ہوئی مورتوں کو حاجت رُو اور مُشکل کش تصور کر لیا! یا اُس قوم کی، جن کے خدا کی تکمیل مادہ اور رُوح سے ہوتی ہے اور ان کا کم زور خدا، ان دونوں کے منشا کے خلاف نہ کبھی کوئی کارروائی کر سکتا ہے، اور نہ ان سے بگاڑ کر ایک دم اپنی خدائی کو قائم رکھ سکتا ہے!

یا اُس قوم کی، جن کا مثلتِ خدا، اپنی کُرسیِ عظمت سے اُتر کر، تام حوائج اور بشری خصوصیات کا محکوم بنا، اور بنی آدم کی خطائیں معاف کرنے کے واسطے اُس کو سخت تکالیف اور مشقتیں برداشت کرنا پڑیں! یا اُس قوم کی جن کا خدا خلقت کے بے سوچے سمجھے پیدا کرنے پر سخت نادم ہوا، اور دُنیا میں طوفانِ آجانے سے اُسے بے حد ملول ہونا پڑا، یہاں تک کہ روتے روتے اُس کی آنکھیں سوچ گئیں اور ملائکہ کو اُن کی عبادت کرنا پڑی۔ اور حضرت یعقوب علیہ السلام سے جب اُس کی کشتی ہوئی، تو انھوں نے اُس کو زمین پر ٹپک دیا۔

کیوں مُنہفوا کیا ایمان سے کہہ سکتے ہو کہ آج صحیح اور مکمل توحید، ان میں سے کس مذہب کی بہ دولت دُنیا میں نظر آ رہی ہے!

نبوت

ان تمام مراحل کے بعد، جو ہم نے یہاں تک طے کیے ہیں، سب سے زیادہ ضروری اور معرکہُ الارباحِ بحث جو باقی رہ جاتی ہے، وہ نبوت کی بحث ہے اور افسوس کہ جس قدر وقت اس بحث کے لیے ہم کو درکار ہے، اُس کا عشرِ عشر بھی ہمارے پاس موجود نہیں؛ لیکن اس پر بھی ہم نے یہ کسی حال مناسب نہیں سمجھا کہ اسلام کے اتنے بڑے رکنِ اعظم کو بالکل قلم انداز کر دیا جاوے۔ ہاں، یہ ممکن ہے کہ یہاں پر ایک اجمالی بحث اس کے متعلق لکھ کر تفصیلِ تام کو اُسی ضخیم کتاب کے اوپر اٹھارکھیں جس کی اُمید ہم پہلے دلاچکے ہیں۔ تاکہ ہمارے سامعین کے دلوں میں اگر کوئی گھبراہٹ اور تشویش پیدا ہو، تو وہ اُس سے اپنی تسکین کر لیں۔

اسبابِ اطاعت | نبوت کا عقدہ حل ہونے سے پہلے، ہر انسان پر یہ فرض ہے کہ وہ اسبابِ اطاعت پر غور کرے۔ یعنی یہ کہ ایک آدمی کی اطاعت دوسرے پر، عقلاً کن حالتوں میں اور کن وجوہات سے ضروری سمجھی جاتی ہے؟ اس بارے میں جہاں تک تائیل سے کام لیا گیا، کل تین سبب اس کے متعین ہوئے: جَلْبِ منفعت، دَفْعِ مَفْضَرَت اور عشق و محبت، چنانچہ نوکر اپنے اُقا کی اطاعت، ملازمت کی اُمید پر اور رعیت اپنے حاکم کی، اندیشہٴ تکالیف سے اور عاشق اپنے محبوب کی، بہ تقاضائے محبت کرتا ہے۔ اور اطاعت کی کوئی ایک فرد بھی ایسی نظر نہیں آتی، جو ان تینوں وجوہات سے خالی ہو۔

اب اگر یہ تینوں سبب ایک ہی شخص میں جمع ہو جائیں، تو فطرتِ انسانی یقیناً اس کی مدتِ و اطاعت کو فرضِ عین سے بھی بڑھ کر فرضِ عین قرار دے گی۔ پس جب کہ پچھلے اوراق میں، حق تعالیٰ شانہ کی نسبت، مدلل طریقے سے یہ طے ہو چکا ہے کہ دنیا کے تمام کام اُسی کے ارادہ

اور اختیار سے انجام پاتے ہیں اور ہر قسم کی داد و ستد، سلب و عطا اور نفع و ضرر اسی کے ہاتھ میں ہے اور ہر قسم کا کمال اور حسن و خوبی اُسی کی ذاتِ اقدس میں موجود ہے، اور اُس کے سوا کوئی عالم کا مُربی اور مُحسن بھی نہیں ہے، تو بے شبہ عقل کے نزدیک ایسے خدا کی اطاعت سے ہر مومن و مومنہ جائز نہ ہوگا، اور یہ لازم ہوگا کہ اُس کی خدمت گزاری میں آدمی مصروف رہے، اُسی کا ہر دم دھیان رکھے اور اُسی کی محبت میں اپنے کو دیوانہ بنائے۔ جیسے تو اُسی کے نام پر جیے اور مرے تو اُسی کا کلمہ پڑھتا مرے۔

عرض، کسی حالت میں اُس سے جُدا نہ ہو دے، اور ظاہر و باطن میں اُسی کا تابع فرمان بنا رہے۔ باطن کی فرماں برداری تو یہی ہے کہ دل میں خداے تعالیٰ کے متعلق یہ یقین ہو، کہ ہماری ہستی اُسی کی ہستی کے سامنے بالکل حقیر اور اُس کا وجود ہر طرح سے پر عظمت اور کامل و مکمل ہے۔ ہمارے ہر قسم کے نفع و نقصان کا اختیار اُسی کو ہے۔ وہ ہمارا حاکم، ہم محکوم ہیں۔ اُس میں اعلیٰ درجے کی شانِ محبوبیت موجود ہے۔

نماز و زکوٰۃ کا فلسفہ | اور ظاہری فرماں برداری، وہ افعال و حرکات ہیں، جن سے ہمارے انہی اندرونی جذبات اور باطنی اعتقادات کا سراغ ملتا ہے، اور خدا کی حکومت اور محبوبیت کا خیال اُن سے مُترشح ہوتا ہے۔ مثلاً خداے تعالیٰ کے سامنے، اُس کی خاص تجلی گاہ کی طرف ہاتھ باندھ کر کھڑا ہونا، اُس سے اپنے حال کے متعلق عرض و معروض کرنا، اُدھر سے کوئی حکم آجانے پر سر نیا زجھکا دینا اور اُس آستانے پر، اپنے کو ذلیل و حقیر سمجھ کر، ناک اور پیشانی رگڑنا، یہ سب آثارِ محکومیت اور آدابِ شاہی کے قائم مقام ہیں۔ علیٰ ہذا الفیحاء اپنے مال و دولت کو خدا کے بتلائے مصارف میں خرچ کرنا، اور ہر آمد و صرف میں اُس کے حکم کا منتظر رہنا، یہ بھی سراپاِ اطاعت ہونے کے لوازمات میں سے ہے۔

فلسفہ صوم و حج | پھر اگر خداے تعالیٰ کو محبوبِ حقیقی سمجھتا ہے، تو اس کے قرب و وصل کی فکر میں ہر ایک ماسوا سے بے زار ہو جانا، آب و طعام اور لذتِ جماع کو (جو کہ خلاصہ تمام کائنات کا

۵۰ داد و ستد: نوازنا اور محروم کرنا، دینا لینا

ہے) ترک کر دینا، اُس کے بعد تجلی گاہ ربانی کی طرف پا برہنہ، سر برہنہ لبیک لبیک کہتے ہوئے دوڑنا، اور وہاں پہنچ کر کبھی حالت شوق و وجد میں اُس تجلی گاہ کے گرد گھومنا، کبھی جنگلوں میں بھٹکتے پھرنا، کبھی دشمن محبوب کے خاص مقام پر سنگ باری کرنا اور کبھی جان و مال فدا ہونے کے لیے تیار رہنا، یہ سب محبت قلبی کی علامات اور عشق حقیقی کے ظاہری نشانات ہوں گے۔

ضرورت نبوت | الغرض، یہ امر تو اب عقلاً پایہ ثبوت کو پہنچ گیا ہے کہ دل سے، زبان سے، ہاتھ پاؤں سے، جس طرح بھی بن پڑے، آدمی اپنے خالق کی اطاعت کی طرف متوجہ رہے اور ہرگز اپنا روئے نیاز کسی دوسری جانب نہ پھیرے۔ لیکن سخت مشکل یہ تھی کہ کسی کی اطاعت، بغیر اس کے مقصود نہیں کہ ہم کو اُس کی پسندیدہ اور ناپسندیدہ باتوں کا علم ہو۔ اور خداے تعالیٰ کی نسبت یہ دریافت کرنا کہ وہ کن امور سے خوش اور کن امور سے ناخوش ہوتا ہے، ہر شخص کی قدرت سے باہر تھا، کیوں کہ محض اپنی عقل سے اگر ہم نے چند احکام معلوم کر لیے، تو اول تو تمام احکام کی تفصیل اس سے معلوم نہیں ہو سکتی، دوسرے یہ کہ خداے تعالیٰ شانہ ہماری عقل کا ہر بات میں پابند بھی نہیں ہو سکتا۔ اس بنا پر، خداے تعالیٰ کی اطاعت و عبادت بغیر اس کے ممکن نہیں کہ خود خداے برتر اپنی رضا و عدم رضا سے بندوں کو مطلع فرمائے۔

اور یہ خوب معلوم ہے کہ جب سلاطین دُنیا، اس تھوڑی سی نخوت و تکبر اور ذرا سے استغنا پر، ہر دکان دکان اور مکان مکان اپنے احکام سناتے نہیں پھرتے، اور نہ اُن کو یہ گوارا ہے کہ ہر گس و ناگس کو، اپنے مافی الضمیر کی اطلاع کے واسطے، شرف ہم کلامی بخشیں، تو کیا وہ احکام الحاکمین، درار الورا، ثم وراہ الورا، جس کو تمام عالم سے بالکل استغنا اور سب چیزوں کو اُس کی احتیاج ہے، ہر ایک عام و خاص اور ہر ایک رند و بازاری کو منہ لگنا اور اپنی مضموری یا ہم کلامی سے باریاب فرمانا پسند فرمائے گا؟

جب ایسا نہیں، تو بے شک خدا کے یہاں بھی کچھ لوگ ایسے خاص ہوں گے، جیسے کہ بادشاہوں کے یہاں وزیر یا نائب السلطنت یا دیسٹراے۔ اور جیسا کہ تمام سرکاری احکام بدعا یا

کے پاس انہی صاحبوں کے توسط سے پہنچتے ہیں، ایسے ہی خدا کے پیام اور اُوامر و نواہی، اُن معتمدین کے ذریعے سے ہم تک موصول ہوں گے، ہم انہی مُعتمدین کو انبیا، رسول اور پیغمبر کہتے ہیں۔ اور ہمارا خیال ہے کہ جس زمانے میں خدا تعالیٰ ضرورت سمجھتا ہے، ایسے رسولوں کو اُس زمانے کے مناسب ہدایت دے کر مبعوث فرمادیتا ہے۔

شُبہ نسخ اور اس کا جواب | یہاں پر شاید تم کو یہ شُبہ گزرے کہ مختلف قُرون میں جب انبیا علیہم السلام تشریف لادیں گے، اور ظاہر ہے کہ اُن میں سے موخر کی شریعت مُقدم کی شریعت کے واسطے ناسخ ہوگی، تو وہم یہ ہوتا ہے کہ پہلے نبی کے بھیجنے میں شاید خدا تعالیٰ سے کچھ سہو ہو گیا تھا، یا بھول چوک سے اُس کو نامناسب احکام دے دیے تھے، جو دوسرے نبی کے ذریعے سے اُس غلطی کی اصلاح کرائی گئی۔

مگر یہ شُبہ آپ کا، سراسر کم فہمی اور نادانی پر مبنی ہے۔ نسخ کے معنی صرف تبدیل احکام کے ہیں، یہ آگے آپ کا قیاس ہے کہ وہ تبدیلی پہلی غلطی کی اصلاح کی وجہ سے واقع ہوئی ہوگی۔ خداے برتر کی نسبت ایسا خیال باندھنا سخت گستاخی ہے

آپ نے بار بار دیکھا ہوگا کہ طبیب اگر کسی مریض کو مُسہل دینا چاہتا ہے، تو اُس کے لیے پہلے مُنفع کا نسخہ تجویز کرتا ہے، چند روز بعد وہ نسخہ بدل کر مُسہل کا نسخہ پلاتا ہے، تو کیا آپ نے اُس طبیب کی نسبت بھی یہی رائے قائم کی ہے کہ اُس سے مُنفع کا نسخہ دینے میں غلطی ہو گئی تھی، جس کی مُکافات وہ دوسرے نسخے سے کر رہا ہے؟ جب یہاں آپ نے ایسا نہیں سمجھا، تو خداے تعالیٰ کے معاملے میں آپ کو کس چیز نے مجبور کیلے کہ بلاوجہ ایک ایسا مُہمل خیال پیدا کر لیں؟ کیوں یہ نہیں مان لیتے کہ اُس نے بھی ہر زمانے کی طبیعت اور مزاج کا اندازہ کر کے، اُس کے موافق مختلف احکام جاری کر دیے ہیں اور اس میں کچھ مُضائقہ نہیں؟

ایک خلجان کا ازالہ | باقی یہ خلجان، کہ کیا خداے برتر اس پر قادر نہ تھا کہ ابتدا سے عالم میں ہی کوئی ایسی مُکمل کتاب ہدایت کے لیے نازل فرمادیتا، جس میں ہر زمانے کے تغیرات کی

رعایت کر لی جاتی، اور اس کی حاجت نہ رہتی کہ بار بار وہ اپنے سچے اہام میں دست اندازی کرے؟ اس کی بابت میں عرض کرتا ہوں کہ بے شک اگر خدا اس پر قادر تھا، تو کیا اس پر قادر نہ تھا کہ بغیر نطفہ اور خون بننے، رحم مادر میں پرورش پانے اور بہ تدریج نشوونما کرنے کے، ایک کامل و مکمل انسان دفعتاً پیدا کر دیتا؟ (جیسا کہ آریہ سماج اپنے چار ریشیوں کی نسبت کہتے ہیں) یا بغیر شخم ریزی اور آب پاشی وغیرہ سامان زراعت کے، خود بہ خود تمام نباتات کو زمین سے اُگا دیتا؟ اگر اُس نے باوجود قدرت کے ان جہانیاں میں (نحوذ باللہ) یہ درد سری اٹھائی، تو روحانیاں میں بھی اُس کو اپنی اسی عادت سے معذور سمجھنا چاہیے۔ اور اگر وہاں اس تدریجی ترقی میں کچھ خاص حکمتیں اور مصلحتیں متعلق ہو سکتی ہیں، تو یہاں اُسی قسم کی مصلحتوں کا لحاظ کرنے سے کون چیز مانع ہے؟

انبیاء، ملائکہ اور شیاطین | بہ ہر کیف، اس میں کچھ حرج نہیں بلکہ عین حکمت اور رحمت ہے کہ حق تعالیٰ سبحانہ، اُن مختلفہ شخم ہائے اخلاق کی (جو ازل سے قلوب بنی آدم کی زمیںوں میں ڈال دیے گئے ہیں) تربیت اور نشوونما کے واسطے اپنی رحمت کے بادل بھیجے، اور اُن بادلوں کے برسے سے جس زمین میں جیسا کچھ اچھا یا بُرا بیج بویا گیا ہے، اُس کی ترقی اور نشوونما حاصل ہو۔ وہ ابرہائے رحمت جیسا کہ بلالؓ و سلمانؓ کے کھیتوں کو سرسبز و شاداب کریں، ایسے ہی ابو جہل وغیرہ کے دلوں میں جو کفر و شقاوت کا بیج بکھیرا گیا ہے، اُس میں بھی جان تازہ ڈال دیں، انھی صحابہؓ کے معارف کو انبیاؑ کہا جاتا ہے، اُن کے اثر کو تقویت پہنچانے والوں کا نام ملائکہ ہے، اور اُن کی تدابیر میں رہ زنی کرنے والوں کو شیاطین کا لقب دیا جاتا ہے۔

ملائکہ اور شیاطین

ملائکہ اور شیاطین کا لفظ سن کر بعض مُبکرین کو شاید ہم پر غصہ آجائے، اور وہ اس قصور پر کہ ہم نے اُن کے نزدیک چند فرضی چیزوں کا نام لے دیا ہے، کہیں ہمارے تمام سابقہ بیانات کو واقعیت سے دُور نہ سمجھ بیٹھیں؛ اس وجہ سے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں لفظوں کی بھی کچھ مختصر تشریح کر دی جائے۔

یہ خوب یاد رہے کہ بہ اجماع اہل عقل و جہل انسانی کی ترکیب چند ایسے مختلف عُضروں سے دی گئی ہے جن میں سے ایک عُصر کی تاثیر دوسرے کی مخالفت اور مُتضاد ہے۔ مثلاً بدنِ انسان میں گرمی کے آثار پائے جانے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُس کے قوام میں کوئی حصّہ آگ کا موجود ہے، اور سردی کی کیفیات محسوس ہونے سے جزو ہوائی کا یقین ہوتا ہے اور خشکی سے جزو خاک کا ثبوت اور تری سے جزو آبی کا پتا چلتا ہے۔ گویا کہ مٹی، پانی، ہوا اور آگ میں سے ہر ایک کا بہ قدر مناسب حصّہ لے کر جسمِ انسان کا خمیر بنایا گیا ہے۔

اُس کے بعد جب مُکھ نے دیکھا کہ جو آدمی پیدا ہوتا ہے، اُس میں یہ چاروں اجزاء ضرور ملے ہوئے ہوتے ہیں؛ تو انھوں نے ایسے چار خزانوں کا کھوج لگایا جن میں یہ چاروں چیزیں الگ الگ بہ افراط موجود ہوں، اور جن میں سے قہورِ اقنور اے کر خداے تعالیٰ نے آدم کے بدن کو ترکیب دیا ہو۔ اس قسم کے چار خزانوں کے نام انھوں نے کُرّۃ ارض، کُرّۃ ماہ، کُرّۃ ہوا، کُرّۃ نار تجویز کیے اور اُن میں سے ایک ایک کو حرارت، برودت، رطوبت، بُبوست کا منبع اور معدن قرار دیا۔

ٹھیک اسی طرح رُوحِ انسان کی ترکیب اور اُس کا امتزاج، ایسے دو متضاد اور متعارض اجزاء سے واقع ہوا ہے، جس کی بنا پر کبھی انسان نیکی کی طرف مائل ہوتا ہے اور کبھی بدی کی طرف اُس کو رغبت ہوتی ہے۔ کیوں کہ جس طرح کسی نے خداے تعالیٰ کو

آدم کا خمیر بناتے نہیں دیکھا، بلکہ صرف یہ سمجھ کر کہ رطوبت اور یوسٹ مثلاً دو متضاد اثر ایک ہی چیز سے پیدا نہیں ہوتے، یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ یقیناً جسم کی ترکیب آب و خاک وغیرہ سے ہوئی ہے، اسی طرح طاعت و معصیت کی طرف میلان، جو ایک ہی آدمی سے مختلف اوقات میں مشاہدہ کیا جاتا ہے، اس کے بغیر جوڑ نہیں کھاتا کہ روح کی ترکیب بھی دو مختلف قسم کی اشیاء سے مانی جاوے۔

فرشتہ اور شیطان کی تعریف | اور جب یہ ہے، تو جیسا کہ عناصر جسم کے لیے علاحدہ علاحدہ چار مخزن تسلیم کر لیے گئے تھے، ایسے ہی اگر ان دونوں روحانی جزوں کے واسطے بھی مخلوقات میں بھی دو مخزن مان لیے جادیں، تو کیا استبعاد ہے؟ پس خدا کی وہ مخلوق جس میں ہمیشہ امور خیر اور نیکی ہی کی طرف توجہ پائی جاوے، اور اُن کا طبعی اقتضار طاعت ہی ہو، اور ان کی صرف یہی شان ہو کہ: لَا يَعْصُونَ اللَّهَ مَا أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ۔ اسی مخلوق کو ہم ملائکہ اور فرشتوں سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور ان کے مقابلے میں وہ گروہ، جس کی طبیعت میں معصیت ہی معصیت رکھی ہو اور اطاعت و عبادت سے اُن کا پیمانہ بالکل خالی ہو، اور اُن کی حالت محض: وَكَانَ الشَّيْطَانُ لِرَبِّهِ كَفُورًا ہی سے ادا کی جا سکتی ہو، ایسے گروہ کو ہم شیاطین کا لقب دیتے ہیں۔

اس پر بھی اگر ہم سے کوئی مہربان آریہ دریافت کرے، کہ اُن کی دلائل سے ایسی چیزوں کا وجود ثابت ہو سکتا ہے، مگر ہم نے اور کسی نے آج تک ان کو نہیں دیکھا اور رجحانِ باغیست ایمان لانے کو ہمارا دل گوار نہیں کرتا، تو ہم ان حضرات کی خدمت میں باادب گزارش کریں گے کہ آپ نے وہ تین حصے بہ ذاتِ خود روشن دنیا کے جو ہماری دنیا سے بالکل علاحدہ ہیں اور جن کا ذکر بجز روید کے تیسرے حصے میں موجود ہے، کب اور کس وقت اور کس جگہ مشاہدہ کیے ہیں؟ اور اگر کیے ہیں، تو کیا آپ دوسرے لوگوں کو اُن کا مشاہدہ کرانے کے لیے تیار ہیں!!

دیکھیے، اب آپ خود اُس منتر کا ترجمہ بھاشیہ بھومکام سے، میں ملاحظہ فرمائیے کہ ”گذشتہ و آئندہ و موجودہ جس قدر کائنات ہے، اس سب کو اُسی پرش کے ہا یعنی عظمت

کا نشان سمجھنا چاہیے ؟

یہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ محدود کائنات کو اُس کی عظمت کا نشان بنانے سے اُس کی عظمت محدود ہو جاتی ہے۔ اس کا جواب اسی منتر میں آگے دیتے ہیں کہ "اُس کی عظمت اس پر محدود نہیں، بلکہ اس سے بھی زیادہ اور غیر محدود ہے۔ پر کرتی سے کے کر زمین تک تمام لطیف و کثیف اکائیات اُس غیر متناہی قدرت والے ایشور کے ایک پہلو میں قائم ہے۔ اُسی کی ذات پر نور میں امرت (عالم عرفانی یا موکش کا سکھ) موجود ہے۔ یعنی تین حصّہ کائنات، عالم لطیف و روشن میں موجود ہے۔ گویا غیر روشن دنیا ایک حصّہ ہے اور بہ ذات خود روشن دنیا اس سے تنگنی ہے۔ اور وہ ایشور عین راحت، موکش سو روپ، حاکم کل، معبود کل، عین مسرت اور سب کو روشن و منور کرنے والا ہے۔"

اس عبارت کے سننے کے بعد بھی کیا ہندوستان کی پرجوش سوسائٹی کا کوئی جبر، جن و ملک یا بہشت و دوزخ کے وجود سے انکار کر سکے گا؟

نبی کی علامت

منکرین کے شبہات کا حل کرنے میں، چوں کہ اب ہم اپنے اصلی مقصد سے دور نکل گئے ہیں، اس لیے ہم کو اسی طرف پھر عود کرنا چاہیے اور یہ بتلانا چاہیے کہ کسی شخص کو رسول برحق ماننا کن شرائط پر موقوف ہے۔ آیا جو کوئی بھی نبوت کا دعو ازبان سے کرنے لگے، یا جو کوئی بھی دنیا کو چند عجیب و غریب تماشے دکھلا دے، یا جو کوئی بھی دو چار ہزار مرید جمع کر لے، اُسی کو ہم نبی اور پیغمبران لیں یا نبوت کے واسطے کوئی خاص معیار ایسا تجویز کیا گیا ہے، جس کے ذریعے سے ماہر طبیعوں کو اشتہاری حکیموں سے جدا کیا جاسکے، رہبر اور رہزن کے پہچاننے میں دھوکا نہ لگے اور محافظوں کی جماعت پر لٹیروں کا اشتباہ نہ ہو !

بلاشبہ غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے، کہ جب کہ انبیاء علیہم السلام خدا کے مُعتمد، اُس کے دکیل، اُس کے رازدار اور اُس کے نائب ہیں، تو اُن کی ذات میں ایسے پاکیزہ اوصاف اور حقیقی خوبیاں مجتمع ہونی چاہئیں، جو ایک ایسے بڑے باخبر شہنشاہ اعظم کی قربت حاصل

کرنے کے لیے درکار ہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ سلاطین دنیا بھی جن کو کچھ عقل ہو، باوجود اس مجازی حکومت کے اپنی مسندِ قُرب پر اُن لوگوں کو نہیں بٹھلاتے جو بے عقل، کج خلق، پست حوصلہ یا حکومت کے دشمن ہوں؛ چہ جائے کہ خداے برتر، اپنے منصبِ وزارت کے لیے ایسے لوگوں کا انتخاب کرے جن کی اخلاقی حالت نہایت پست، عملی حیثیت سے نہایت ذلیل اور عقلی قوتیں نہایت کم زور ہوں۔ وہ بجائے ہدایت پھیلانے کے، گمراہ کرنے میں زیادہ مُشتاق ہوں اور لوگوں سے بہ مقابلہ خدا کی عبادت کرانے کے، اپنی پرستش کے زیادہ مُتہنی ہوں۔ اگر نعوذ باللہ خدائے عزوجل ایسا کرے، تو یوں کہو کہ وہ خدا بالکل سفیہ اور جاہل اور بندوں سے عداوت رکھنے والا ہے جس کو اتنی بھی خبر نہیں ہے کہ میں جس شخص سے جو کام لینا چاہتا ہوں، وہ اس کی اہلیت نہیں رکھتا۔

نبوت کی تین شرطیں | تو اس صورت میں یہ واجب ہوا کہ انبیاء علیہم السلام کے دلوں میں، اولاً خدا کی محبت اور اخلاص اس درجہ ہو کہ ارادہِ معصیت کی گنجائش ہی نہ نکلے۔ دوسرے یہ کہ اخلاق پسندیدہ، جو اعمالِ حسنہ کی جڑیں، اُن کے اندر فطرتی طور پر راسخ ہوں تاکہ جو کام بھی وہ کریں، قابلِ اقتدا اور جو فعل بھی اُن سے سرزد ہو، باعثِ ہدایت سمجھا جائے۔ تیسرے یہ کہ فہم و فراست اُن کی تمام امتبیوں کے اعتبار سے اعلیٰ درجہ کی ہو، کیوں کہ کم فہمی فی نفسہ عیب ہونے کے علاوہ، اس وجہ سے بھی اُن کے حق میں مُضر ہے کہ کلامِ خداوندی کے اُسرارِ غامضہ کا سمجھنا اور دقیقِ علل پر مُطلع ہونا، اور ہر ایک ذکی و غبی کو احکامِ الہی دل نشیں طریقے سے سمجھا دینا، بغیر عقلِ صحیح اور فہمِ کامل کے ہرگز مُستصوّر ہی نہیں۔ یہی تین اصول ہیں، جو ایک مدّعی نبوت کی صداقت کا ہم کو ایسے زمانے میں پتہ دے سکتے ہیں، جس میں کسی نبی کی بعثت کا احتمال ہو سکتا ہو۔ باقی مُعجزات، وہ اگرچہ اصل نبوت کے اعتبار سے ضروری نہیں، لیکن مدّعی نبوت سے اُن کا صادر ہونا بے شک اُس کی راست بازی کی دلیل ہے۔

کیوں کہ اگر ایک شخص مثلاً سلطانِ روم کے رُوبہ رُود، لوگوں سے یہ کہے کہ میں سلطان

کا معتقد اور نائب ہوں، اور اس کی دلیل یہ بیان کرے کہ دیکھو، جس طرح میں اُن سے کہوں گا، برابر وہ اُسی کے موافق کریں گے اور جو فرمایش کر دوں گا، اُس کو پورا کر کے دکھلائیں گے، یہ کہ کمر سلطان کو کھڑا ہونے کی طرف اشارہ کرے اور وہ کھڑے ہو جائیں، پھر اُن سے بیٹھنے کو کہے اور وہ معاً بیٹھ جائیں۔ پھر اسی طرح لگاتار بہت سے کاموں کی خواہش ظاہر کرتا رہے اور وہ بھی ایک ذرا اُس کا خلاف نہ کریں اور فرض کر دو کہ وہ سب کام، سلطان کی عادتِ مستمرہ اور مزاج کے خلاف بھی ہوں، تو کیا کسی جاہل اور معاند کو بھی ایسی حالت میں، اُس شخص کے دعوے کی تصدیق میں کچھ تردد رہے گا، اور کوئی کیا بے وقوف بھی یہ حجت کرے گا کہ دعوا تو اُس کا محبوب اور مُعتمد ہونے کا تھا، اور اس کے معتقد ہونے اور سلطان کے کھڑے ہونے میں کوئی مُناسبت نہیں! اس لیے اُس سے اس پر کوئی استدلال نہیں ہو سکتا، تا وقتہ کہ سلطان اپنی زبان سے اُس کے معتقد ہونے کا اقرار نہ کر لے! ایسے مُہمل سے کہنا چاہیے کہ تصدیقِ دعوا دو طرح پر ہوتی ہے: ایک حالی اور ایک مقالی۔ تو گو اس جگہ زبانی اور قوی تصدیق سلطان کی جانب سے نہیں پائی گئی، مگر حالی تصدیق، جو اُس سے بھی بڑھ کر ہے، حاصل ہو گئی: یہی حال بعینہ انبیاء علیہم السلام کے معجزات کا ہوتا ہے کہ وہ اپنی نسبتِ خدا کا دزیر اور مُعتمد ہونے کا دعوا کرتے ہیں، اور خدا ہر وقت اور ہر جگہ اُن کے دعوا کو سناتا ہے۔ پھر وہ عادتِ اللہ کے خلاف بہت سے کاموں کی فرمایش کرتے ہیں، تاکہ اُن کے دعوے کی سچائی دنیا پر ظاہر ہو جاوے۔ اور خداے تعالیٰ، برابر اُن کے حسبِ مدعا اُن کی فرمایشوں کو پورا فرماتا رہتا ہے۔

تو کیا من جانب اللہ یہ اُن کے دعوے کی حالی تصدیق نہیں ہوئی؟ اور ظاہر ہے کہ جھوٹے آدمی کی تصدیق کرنا خود جھوٹ کی ایک قسم ہے۔ تو اس سے اُس بُدبختی کے کاذب ہونے کی صورت میں، خدا برتر کا کذب ثابت ہوا (نعوذ باللہ منہ!)، حالانکہ خداے تعالیٰ کا خالق کذب ہونا تو ضروری، لیکن قولاً و عملاً کاذب ہونا مُحال ہے۔

معجزہ کیا ہے؟ اب اگر کسی کو یہ وہم گزرے کہ یہ سب تقریر اُس وقت قابلِ تسلیم ہے، جب کہ معجزہ یا خوارقِ عادت کا وجود ممکن ہو، حالانکہ اُس کا امکان ابھی تک محلِ تردد میں ہے!

تو میں کہتا ہوں کہ ہم معجزہ اُسی کو کہتے ہیں، جو عقلاً محال نہ ہو لیکن خلافِ عادت ہو اور خلافِ عادت کے بھی یہ معنی ہیں کہ عام عادت کے خلاف ہو، کیوں کہ معجزہ بھی ہمارے نزدیک خدا کی خاص عادت ہے، جو خاص خاص اوقات میں خاص خاص مصلحتوں سے ظاہر ہوتی ہے۔ اور جیسا کہ زید مثلاً ہمیشہ سے قمیص پہننے کا عادی ہو، مگر عید کے روز ہمیشہ اچکن پہنا کرے، تو گو اچکن پہننے کو یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ زید کی عام عادت کے خلاف ہے، مگر ایک حیثیت سے یہ بھی اُس کی عادت میں داخل ہے۔ اسی طرح آگ سے کسی چیز کو جلا دینا، اگرچہ خدا تعالیٰ کی عام عادت ہے، لیکن بعض مواقع میں جب کہ کسی نبی کی تصدیق یا اور کوئی مصلحت ملحوظ ہو، تو آگ سے وصفِ احراں سلب کر لینا بھی اُس کی عادت ہے۔

کیوں کہ یہ ثابت ہو چکا کہ تمام اسباب و مسببات میں جو کچھ تاثیر ہے، وہ خدا کے ارادے سے ہے۔ وہ جب چاہے سبب کے وجود کو مسبب سے اور مسبب کے وجود کو سبب سے علاحدہ کر سکتا ہے، تو جب مشاہدے سے یا نہایت ثقیل ادویوں کے ذریعے سے یہ معلوم ہو جائے کہ ایک شخص نے دعوائِ نبوت کا کیا اور بہت سے معجزات دکھلائے، اور تمام عمر میں کسی ایک بات میں بھی اُس کے کہنے کے خلاف نہ ہوا، تو بے شک و شبہ ایسے شخص کو نبی سمجھنا چاہیے، کیوں کہ نبی کا ذب کی تصدیق خدا سے تعالیٰ قولاً و عملاً ہرگز نہیں کر سکتا، اور اگر وہ ایسا کرے تو دینِ من جملہ رحمت نہ ہوگا۔

مجھ کو افسوس ہے کہ ہمارے زمانے کے بعض عقلاً کو معجزات کے ممکن الوقوع ہونے سے انکار ہے، اور بظرفہ تماشا یہ کہ وقوع کی صورت میں وہ اُن کے نزدیک دلیلِ نبوت بھی نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ اُن کو اب تک یہ معلوم نہیں ہوا کہ موسیٰ کے نبی ہونے اور لاٹھی کے سانپ بن جانے میں کیا تعلق پایا جاتا ہے، جو ایک سے دوسرے پر استدلال ہو سکا (فاعتبروا یا اولی الابصار)

میرا قصد تھا کہ اس بحث کو نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کروں اور ان عقلاً کے خیالات

کی پوری جانچ کرتا، مگر تنگی وقت سے مجبور ہو کر، اس مسئلے کو بھی دوسرے مسائل کی طرح سے اُسی کتاب موعود کے حوالے کرتا ہوں خاص سرور کائنات آقائے نام دار محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور ختم رسالت کے متعلق کچھ تھوڑا سا لکھنا چاہتا ہوں۔

حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت

اُس بدیہی معیار رسالت کے مان لینے کے بعد، جو میں ابھی عرض کر چکا ہوں حضور پرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا ثبوت بالکل آسان ہو جاتا ہے، کیوں کہ آپ کے بے شمار علمی و عملی کارنامے اس وقت بھی دنیا کی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہیں، اور نہ تمام اولوالعزم انبیاء کے معجزات مل کر آپ کے معجزات کی ہم سری کر سکتے ہیں۔ آپ کے فہم و اخلاق کا موافق و مخالف کو اعتراف کرنا پڑا ہے، اور چار دائمت عالم میں آپ کی صداقت کا سکہ بیٹھ گیا ہے، اور دنیا کے ہر خطے میں آپ کا آفتاب فیض لمحہ افگن ہے۔

جب ایک غیر متعصب اور عقل مند آدمی، آپ کے احوال کا انبیاء سابقین کے احوال سے اور آپ کی تعلیم کا اُن کی تعلیم سے اور آپ کی قوت و ہمت کا اُن کی قوت و ہمت سے مقابلہ کرے گا، تو یہی اُس کے لیے ضروری ہے کہ آپ کی صداقت کا نہیں، بلکہ رسالت کا اور رسالت کا نہیں، بلکہ ختم رسالت کا زبان و دل سے اقرار کرے۔

عرب کی جہالت، درشت مزاجی، گردن کشی کو کون نہیں جانتا؟ جس قوم میں ایسی جہالت ہو کہ کوئی کتاب اُن کے پاس آسمانی ہو نہ زمینی۔ اور اُن کے اخلاق کا یہ حال کہ قتل و غارت وغیرہ ایک معمولی حرکت ہو۔ عقل و فہم کی یہ کیفیت کہ پتھر دلوں کو اٹھا لائے اور پوجے لگے۔ اور گردن کشی کی یہ ضرورت کہ کبھی کسی بادشاہ کی اطاعت قبول نہ کریں۔ جفا کشی کی یہ نوبت کہ ایسے ملک میں شاد و خرم عمر گزار دیں۔ ایسے جاہلوں اور خود سُر دلوں کو راہ پر لانا ہی دشوار تھا،

۴ چاروں طرف، مشرق و مغرب شمال و جنوب ہر طرف ۴ جگہ رہا ہے۔

چہ جائے کہ علم الہیات، علم معاملات، علم عبادات، علم اخلاق اور علم سیاست مدُن میں رشکِ حکمائے نام دار بنادیا! یہاں تک کہ دُنیا نے اُن کی اور اُن کے شاگردوں کی شاگردی کی۔ ڈاکٹر لی بان کہتا ہے:

”اُس پیغمبرِ اسلام، اُس نبی اُمّی کی بھی ایک حیرت انگیز سرگذشت ہے، جس کی آواز نے ایک قوم ناہنجار کو، جو اُس وقت تک کسی ملک گیر کے زیرِ حکومت نہیں آئی تھی، رام کیا اور اس درجے پر پہنچایا کہ اُس نے عالم کی بڑی بڑی سلطنتوں کو زیر و زبر کر دیا۔ اور اس وقت بھی نبی اُمّی اپنی خُبر کے اندر سے لاکھوں بندگانِ خدا کو کلمہٴ اسلام پر قائم رکھے ہوئے ہے۔“

اَلْ حُصْرَتِ كَا حُسْنِ اخْلَاقٍ | اگر انصاف کرو، تو آپ کے حُسنِ اخلاق کا اندازہ کرنے کے لیے ہی کافی ہے کہ آپ نہ کہیں کے بادشاہ تھے، نہ بادشاہ کے گھرانے میں پیدا ہوئے تھے، نہ کچھ زیادہ مال و دولت آپ نے جمع کر رکھا تھا، نہ باپ دادا نے کوئی اندوختہ میراث میں چھوڑا تھا، نہ آپ کے پاس کوئی تنخواہ دار فوج تھی، نہ اہلِ وطن آپ کے ہمراہ تھے، نہ قبیلہ والوں کو آپ کے مذہب سے ہم دردی تھی۔ ایسی بے کسی اور بے بسی کی حالت میں، آپ نے اُن تہذیبوں کو گواروں کو ایک صدائے نامائوس سے مخاطب کیا، کہ جس سے بڑھ کر اُس وقت ساری دنیا میں کوئی مکروہ آواز نہ تھی، اور نہ ایسی صدائیں والے سے زیادہ اُن کے نزدیک کوئی شخص اُن کا دشمن اور بدخواہ سمجھا جاسکتا تھا۔

یہ وہی لا الہ الا اللہ کی آواز تھی کہ جس نے دفعتاً تمام عرب میں تہلکہ ڈال دیا، جس سے باطل معبودوں کی حکومت میں بھونچال آنا شروع ہو گیا، اور جس کی چمک سے اس کُفر و جہالت کی تاریکیوں میں بجلی سی کوند گئی۔ گویا وہ ایک زور و شور کی ہوا تھی، جس کے چلتے ہی شرک و بُت پرستی کے بادل چھٹ گئے اور آفتابِ توحید ابر کے پردے سے باہر نکل آیا۔ یا ابابیل رحمت تھی جس کی بوجھار نے مخلوق پرستی کے سیاہ ہاتھیوں کے پر نچے اُڑا دیے، اور خدا کے گھر کو ان کی زد سے بچالیا۔

غرض کہ ایک ایسے بے یار و مددگار نے، ایسی سخت قوم کو، ایسی ظلمت کے زمانے میں، ایسے اجنبی مضمون کی طرف ابھارا اور چند عرصے میں اُن سب کو ایسا سُخڑا اور گردیدہ بنایا کہ جہاں آپ کا پسینا گرے، وہاں خون گرانے کے لیے تیار ہو گئے۔ گھر بار کو ترک کر دیا، زن و فرزند سے بگاڑ لی، مال و دولت کو سنگ ریزوں سے زیادہ حقیر سمجھا، اپنے بے گناہوں سے آمادہ جنگ و پیکار ہوئے، کسی کو آپ لے مارا کسی کے ہاتھ سے آپ مارے گئے۔

پھر دو چار روز کا دلولہ نہ تھا، بلکہ آپ کے بعد بھی اسی حالت پر استقلال کے ساتھ جمے رہے، یہاں تک کہ قیصر و کسریٰ کے تخت اُلٹ دیے، فارس و روم کو تم و بالا کر دیا۔ اس پر مُعاملات میں وہ شایستگی رہی کہ کسی لشکری نے سوائے مقابلہ جہاد کسی کی ایذا رسانی یا ہتک ناموس کو گوارا نہ کیا۔ یہ تسخیرِ اخلاق، بتلائیے اس سے پہلے زمانے میں بھی کسی سے ظاہر ہوئی!

اس پر بھی اگر کوئی یہی کہے کہ نہیں، اسلام بہ زورِ شمشیر ہی پھیلا ہے؛ تو فی الواقع اُس سے زیادہ کور چشم اور تنگ دل مُتَعَصِب کوئی نہیں ہو سکتا۔ کاش کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کو یہ لوگ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے پوچھتے اور وہ اپنے اسلام کا واقعہ ان کے سامنے بیان فرماتے، یا سلمان فارسی سے جا کر اُن کی داستان سنتے، یا عبد اللہ بن سلام کی خدمت میں اپنا اعتراض پیش کرتے اور ان کو اُس کا جواب سمجھاتے؛ معجزہ علمی | مگر یہ تو آپ کے اخلاق کی حالت تھی۔ باقی آپ کے علم و فہم کا نشان سب سے بڑا یہی ہے کہ آپ بہ ذاتِ خود اُرتی محض، جس ملک میں پیدا ہوئے، جہاں ہوش سنبھالا بلکہ ساری عمر گزاری، محکوم سے یک لخت خالی، نہ وہاں علومِ دینی کا پتہ نہ علومِ دنیوی کا نشان؛ پھر اس پر ایسا دین، ایسا آئین، ایسی کتاب لا جواب اور ایسی ہدایاتِ نبیات لائے کہ آج تک بڑے بڑے حکما اُس کا جواب نہیں لاسکے، بلکہ بڑے بڑے مدعیانِ عقل و تہذیب نے اُس کی داد دی۔

معجزہ قرآن | قرآن جیسا زندہ اور علمی معجزہ کس پیغمبر کو دیا گیا؟ جس کا مُقابلہ، کیا بہ اعتبار فصاحت و بلاغت کے اور کیا بہ اعتبارِ علم و مضامین کے اور کیا بہ اعتبارِ تحریف و تبدیل

سے محفوظ رہنے کے، دنیا کی کوئی کتاب نہیں کر سکتی اور نہ ان شاء اللہ کر سکے گی۔ قرآن کے حق میں ہم اس سے زیادہ اور کیا کہہ سکتے ہیں، جو خود قرآن تیرہ سو برس سے پکار پکار کر کہہ رہا ہے، یعنی یہ کہ جس میں ہمت ہو، وہ میرا جواب لکھ دے۔ مگر آج تک کسی کا حوصلہ نہ ہوا اور نہ ہوگا کہ اُس کی ایک چھوٹی سی سورہ کی نظیر بھی پیش کر سکے۔

اب میں اس کے سوا کیا کہوں کہ آل حضرت صلی اللہ علیہ وسلم جیسا کہ اپنی عادات و اخلاق میں تمام انبیاء علیہم السلام سے فائق تھے، ایسے ہی علوم کے بھی سارے مراتب آپ پر ختم کر دیے گئے تھے۔ کیوں کہ انبیاء سابقین میں نہ ایسا اعجاز علمی کسی کو دیا گیا اور نہ اُن کے اتباع میں کسی نے اُن علوم کے دریا بہائے، جو اہل اسلام نے بہائے ہیں۔

خاتم الانبیاء اور جب کہ صفت علم تمام اُن صفات کی خاتم ہے جو مورتی عالم ہیں، تو جس کا اعجاز علمی ہوگا، گویا اُس پر تمام کمالات علمی کا خاتمہ کر دیا جائے گا، اور اُسی کو ہمارے نزدیک خاتم الانبیاء کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ اور چوں کہ اُس کا دین قیامت تک رہے گا، اس لیے اُس کی کتاب کا بھی تا قیامت باقی رہنا ضروری ٹھہرے گا۔

باقی، قرآن کے سوا آپ کے جو اور علمی اور عملی معجزات ہیں، اُن کے بیان کی اس وقت بالکل گنجائش نہیں رہی۔ اور نہ میں قلتِ وقت کی وجہ سے، توریت و انجیل وغیرہ کی بشاراتِ آپ کی نبوت کے متعلق نقل کر سکا۔ جس کسی کو شوق ہو، اول مضمون کے واسطے حضرت مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کی حجت الاسلام، اور دوسرے کے لیے علامہ ابن القیم کی ہدایۃ الحیازی کا مطالعہ کرے۔

مسلمانوں کے تمدن کی کہانی غیروں کی زبانی | ہاں، البتہ اس اخیر موقع پر اتنا عرض کر دینا ضروری ہے کہ آپ کے بعد جو علوم و فنون دُنیا میں مسلمانوں کے ذریعے سے پھیلے اور تمدن کے شعبوں کو ترقی ہوئی، اُس کا بھی قدرے اندازہ غیروں کی زبانی ہے ہم سامعین کو کرا دیں؛ تاکہ جو لوگ مسلمانوں کو علم اور تمدن کا دشمن بتاتے ہیں اور پھر اس دشمنی کو اُن کی مذہبی تعلیمات کا نتیجہ سمجھتے ہیں، وہ بھی اپنی کم فہمی اور کوتاہ نظری سے کچھ شرابیں۔ ترقی علوم و فنون کے متعلق ان سیکلو پیڈیا میں لکھا ہے، جس کا خلاصہ نقل کرتا ہوں:

در ۱۲۹۰ء خلفائے عباسیہ کے عہد میں علم ادب و فنون حکمت کا ظہور ہوا، اور المنصور ۱۲۵۵ء کے ایام حکمرانی سے ہارون رشید ۱۹۸ء تک بڑی فیاضی سے اس کی تربیت ہوئی۔ بہت سے ملکوں سے اہل علم طلب کیے گئے اور بادشاہان سخاوت سے اُن کی بہت کچھ داد و بخش کی گئی۔ اہل یونان و شام و ایران قدیم کی عمدہ عمدہ کتابیں عربی میں ترجمہ ہو کر شائع اور مشہور ہوئیں۔ خلیفہ مامون نے سلطانِ روم کو ساڑھے بارہ من سونادینا اور ہمیشہ کے لیے صلح اس شرط پر منظور کی کہ لیو فیلسوف کو اجازت دی جاوے کہ چند عرصے کے لیے وہ یہاں آکر، مامون کو فلسفہ و حکمت سکھلا جاوے۔ فلسفہ حاصل کرنے کے لیے ایسی خطیر زحمت کرنے کی بہت کم مثال ملے گی۔ اس مامون کے زمانے میں بغداد، بصرہ، بخارا اور کوفہ میں بڑے بڑے مدرسوں کی بنیاد پڑی، اور اسکندریہ، بغداد اور قاہرہ میں عظیم الشان کتب خانے بنائے گئے۔ اسپین میں مدرسہ اعظم مقام قرطبہ کا، بغداد کی علمی شہرت کی ہم سری کرتا تھا۔ اور عموماً دسویں صدی میں جہاں دیکھو وہاں مسلمان ہی علوم کے حافظ اور سکھانے والے نظر آتے تھے۔ فرانس اور مالکِ فرنگستان کے جوق جوق طالب علم اُنڈلس کو آنے لگے اور ریاضی اور طب عربوں سے سیکھنے لگے۔ اُنڈلس میں چودہ مدرسے اور بڑے بڑے کتب خانے تھے، جن میں سے حاکم کے کتب خانے میں چھ لاکھ کتابیں جمع ہوئیں۔

یہ کیفیت ترقیِ علم کی، جب کہ اُس زمانے سے ملائی جاوے جو قبل زلزلہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے گزرا، تو ثابت ہے کہ جیسا کہ عرب فتوحات میں سبقت کرتے تھے، ایسے ہی ترقیِ علم میں بھی یہ لوگ تیز رفتار تھے۔ جغرافیہ، تاریخ، فلسفہ، طب، طبیعیات اور ریاضی میں مسلمانوں نے بڑا ہی کام کیا ہے۔ اور عربی الفاظ، جواب تک معلوم حکمیہ میں بولے جاتے ہیں اور بہت سے ستاروں کے نام وغیر ذالک، اس بات کی دلیل ہیں کہ یورپ کے اکتسابِ علوم پر قدیم سے

مسلمانوں کو بہت دخل و تصرف ہوا ہے۔ مگر بعد کے زمانے میں اس سے زیادہ جغرافیہ کا علم بہت کچھ یورپ کو حاصل ہوا۔ ایشیا اور افریقہ میں جغرافیہ کی بہت اشاعت ہوئی۔ اور علیٰ ہذا، جغرافیہ میں پُرانی عربی کتابیں اور سفر و سیاحت کے رسالے، تصنیفات ابوالفدا، ادریسی، لیو افریقا لوس، ابن بطوطہ ابن فضلان، ابن جبیر، البیرونی، النجم اور اُن کی تحریریں اب تک مفید اور گرامی قدر ہیں۔

علم تاریخ بھی محنت سے حاصل کیا گیا۔ اور قدیم عربی مؤرخ جس کا حال ہم کو ملتا ہے، محمد الکلبی ہے، جو ۱۱۷ھ میں گزرا۔ مگر اسی زمانے میں اور کئی مؤرخ گزرے اور دسویں صدی کے شروع سے تو عرب نے علم تاریخ پر بہت توجہ کی۔ اور جن لوگوں نے تمام جہان کی تاریخ لکھنے کا ارادہ کیا، اُن میں ادل سعودی طبری، حمزہ اصفہانی اور برطیکوس بطریق اسکندریہ ہیں۔ (مسعودی کی تاریخ کا نام مروج الذهب اور معدن الجواہر ہے) اس کے بعد ابوالفرج اور جارج اکاقین (ہردو عیسائی) اور ابوالفدا وغیرہ ہیں۔ نویں صدی نے جزیرہ سفلیہ کی تاریخ ایام سلطنت عرب کی لکھی۔ بہت سے ابواب تحریر تاریخوں کے، جن میں عیسائیوں کی جنگ مقدس کا بیان ہے فرانسیسی زبان میں نیز ترجمہ ہوئے ہیں۔ اور انڈلس میں مسلمانوں کی سلطنت کے حالات ابوالقاسم قرطبی تیسری وغیرہ نے متعدد کتابوں میں لکھے ہیں، جس کسی کو ان کے حالات دریافت کرنے کا زیادہ شوق ہو، تو قطر ہمیر کی تصنیفات خصوصاً وان ہمیر کی کتابوں سے رجوع کرے۔

عرب کے فلسفہ کو، جو یونانی الاصل تھا، قرآن سے وہی نسبت ہے جو اوسط زمانے کے معقولات کو عیسائیوں کی کتب مقدسہ سے تھی، یعنی فلسفہ کو دینیات کا خادم سمجھا جاتا تھا۔ عربوں نے ارسطاطالیس کی تصنیفات کو بہت پڑھا اور اس پر اُن کی بہت شہرت ہوئی، اور بالآخر تمام فرنگستان میں عربی زبان

سے لاطینی زبان میں ترجمے کے ذریعے سے اس کی اشاعت ہوئی۔ گو عرب کو خود ہی عہدِ عباسیہ میں ترجمے کے وسیلے سے حاصل ہوا تھا۔

منطق اور علم مابعد الطبیعہ پر زیادہ توجہ ہوئی اور مسلمانوں میں ابنِ طفیل یہ لوگ ہوئے ہیں: الکندی البصری، جو نویں صدی عیسوی میں تھا۔ افارابی جس نے ۱۰۰۰ء میں اصول میں کتاب لکھی۔ ابن سینا، جس نے منطق اور علم مابعد الطبیعہ اور طب کو جمع کیا، اور علمِ کیمیا اور تشخیصِ امراض و شناختِ ادویات بنانے میں بڑی ترقی کی۔ ابنِ سیمی، جس کی تحقیق کی بڑی شہرت ہوئی۔ الغزالی جس نے تہافتُ الفلاسفہ تصنیف کی۔ ابو بکر بن طفیل، جس نے اپنی ہی بن بھٹان میں انسانوں کا حیوان سے ظہور میں آنے کا مسئلہ بیان کیا، اور اس کا شاگرد ابنِ رشد، جو ارسطاطالیس کے مفسر ہونے میں بڑا مشہور اور گرامی قدر تھا۔ ان لوگوں کا اور ان کے مسلک کا بیان، شمول اور رُشتر کی کتابوں میں مُفصل ملے گا۔

بہت سے ان عرب فیلسوفوں میں بھی تھے۔ ان کے علمِ خواص ادویہ میں ہدایت کامل حاصل کرنے کو نیوست نے معلوماتِ جغرافیہ سے منسوب کیا ہے۔ علمِ طب اس حیثیت سے کہ وہ ایک علم ہے عرب ہی کی ایجاد ہے، جن کو نہایت قدیم اور وسیع ماخذ، یعنی ہندی طبیب شروع ہی سے مل گئے تھے۔ معجون بنانے کی کیمیائی ترکیب عربوں ہی نے ایجاد کیا، اور دواؤں کے مُرکب کرنے اور ششہ لکھنے کی ایجاد بھی اُنھی سے ہوئی اور مدرسہ سلرنو کے ذریعے سے یہ علم فرنگستانِ جنوبی میں پھیل گیا۔

دوا سازی اور قزلباش کی وجہ سے علمِ نباتات اور کیمیا کی حاجت پڑی اور تین سو برس تک کثرت سے ان علوم کی تحصیل ہوتی رہی، اور بغداد، اصفہان، فیروز آباد، بلخ، کوفہ، بصرہ، اسکندریہ، قرطبہ وغیرہ میں فلسفہ اور طب کے مدرسے جاری ہو گئے، اور طبابت کے ہر صیغے

میں بجز علم تشریح کے بڑی ترقی ہوئی۔ اس کے استثنائے وجہ یہ ہے کہ قرآن میں اجسام کی تشریح منع کی گئی ہے۔ علم طب میں یہ لوگ بڑے نامی مشہور ہوئے۔ ہارون کندی، ابن سینا، جس نے قانون لکھا اور عرصے تک اس فن میں یہی ایک کتاب درس میں رہی۔ علی بن عباس، اسحاق بن سلیمان، ابوالقاسم اور روس جس نے طب کی تکمیل کی۔ اور علی بن عیسیٰ وغیرہم۔

ریاضی میں اہل عرب نے بڑی ترقی کی اور الجبر اور المقابله کو بڑی ترقی دی۔ بغداد اور قرطبہ کے مدرسوں اور رصدگاہوں میں علم ہیئت کمال شوق سے پڑھا جاتا تھا۔ الحسن نے علم مناظر و مریا میں تصنیف کی اور نصیر الدین طوسی نے اقلیدس کا ترجمہ کیا۔ جیز بن عقیل نے بطلمیوس کے علم مثلث پر شرح لکھی، اور نظام بطلمیوس کی کتاب موتی کو الہادی اور سیومیوس نے عربی میں ترجمہ کیا۔ اور دسویں صدی عیسوی میں ابان بن زمین کے دائرہ عظیمہ کے ارتفاع پر نظر کی، اور محمد بن الجبر الثانی نے رفتار شمس کی دریافت کی۔ النیر جیوش نے ثوابت کے بیان میں کتاب لکھی اور ابوالحسن علی نے آلات علم ہیئت میں تصنیف کی۔ ”انتہی کلامہ“

ڈاکٹر لی بان کا حقیقت افروز بیان | یہ حالت، جوان سیکلو پیڈیا کے حوالے سے درج کی گئی، مسلمانوں کے علم و فضل کے متعلق تھی۔ اب اُن کی چند تمدنی خصوصیات کو بھی سن لینا چاہیے۔ فرانس کا مشہور و معروف محقق ڈاکٹر لی بان عربوں کی ملک گیری کی خصوصیات میں لکھتا ہے :

”یہ خلفائے راشدین جس خوش تدبیری کو کام میں لائے، وہ مافوق اُن کی سپاہ گری اور فن حرب کے تھے، جسے اُنھوں نے اس آسانی سے سیکھ لیا تھا۔ شروع ہی سے اُنھیں ایسے اقوام سے کام پڑا، جن پر سال ہا سال سے مختلف صورتوں میں مختلف حکومتوں نے ظلم کر رکھا تھا، اور اس مظلوم رعایا نے نہایت خوشی کے ساتھ ان نئے ملک گیروں کو قبول کر لیا جن کی حکومت

میں انھیں بہت زیادہ آسائش تھی۔

مفتوح اقوام کے ساتھ طریقہ کیا ہونا چاہیے، نہایت صاف اور صریح طور پر مقرر کر دیا گیا تھا۔ اور خلفائے اسلام نے ملک کے اغراض کے مقابل میں ہرگز بہ زور شمشیر دین کو پھیلانے کی کوشش نہیں کی، بلکہ یہ عرصہ اس کے کہ وہ بہ جبر اپنے دین کی اشاعت کرتے، جیسا کہ بار بار کہا جاتا ہے، وہ صاف طور پر کہہ دیتے تھے کہ اقوام مفتوحہ کے مذاہب و رسوم اور اوضاع کی پوری طرح سے حرمت کی جائے گی۔ اور اس آزادی کے معاوضے میں وہ ان سے بہت خفیف سا خراج لیتے تھے، جو ان مطلوبات کے مقابلے میں جو ان اقوام کے پُرانے حکام ان سے وصول کیا کرتے تھے، نہایت کم تھا۔

کسی ملک پر فوج کشی کرنے سے پہلے، عرب ہمیشہ ان کے پاس سفیروں کے ذریعے سے صلح کی شرائط بھیجا کرتے تھے۔ اور یہ شرائط، جن کا ذکر المکین نے کیا ہے، علی العموم اُسی قسم کے ہوا کرتے تھے، جو عمرو نے سلاطین ہندوستان غزہ کے سامنے، جو اُس وقت محصور تھا، پیش کیے تھے۔ اور یہ شرائط مغربیوں اور ایرانیوں دونوں سے کی گئی تھیں۔ وہ شرائط ذیل میں لکھی جاتی ہیں:

”ہمارے حاکم نے ہمیں حکم دیا ہے کہ اگر تم قانون اسلام نہ قبول کرنا تو ہم تمہارے ساتھ جنگ کریں۔ پس تم بھی ہم سے مل جاؤ اور ہمارے بھائی بن جاؤ، اور ہمارے منافع ہمارے منصوبوں میں شریک ہو جاؤ، اس کے بعد ہم تم سے کوئی بُرائی نہ کریں گے۔ لیکن اگر تم یہ کرنا نہیں چاہتے، تو تم ہمیں اپنی زندگی تک ایک سالانہ خراج بالالتزام دیا کرو۔ اس کے بعد تمہارے بدلے ہم تمام ان لوگوں سے لڑیں گے، جو تمہیں ستانا چاہیں یا کسی طرح تمہارے دشمن ہوں۔ اور ہم اپنے

معاہدے پر مضبوط رہیں گے۔ اگر تمھیں یہ بھی منظور نہیں ہے، تو پھر ہم میں اور تم میں بجز تلوار کے کوئی چیز نہیں رہتی، اور ہم تم سے اس وقت تک جنگ کرتے رہیں گے، جب تک اللہ تعالیٰ کے حکم کو پورا نہ کر لیں۔“

بیت المقدس کی فتح کے وقت حضرت عمر کا اخلاق ہم پر ثابت کر رہا ہے کہ ملک گیر ان اسلام مفتوح اقوام کے ساتھ کیا نرم سلوک کرتے تھے۔ اور یہ لوگ اُس مدارات کے بمقابل میں جو صلیبیوں نے اس شہر کے باشندوں سے کئی صدی بعد کی، نہایت حیرت انگیز معلوم ہوتا ہے۔ حضرت عمر اس شہر مقدس میں بہت تھوڑے استخاص کے ساتھ داخل ہوئے، اور آپ نے سفر و منس بطریق سے درخواست کی کہ مقامات مقدسہ کی زیارت میں آپ کے ہم راہ چلے۔ اسی وقت حضرت عمر نے منادی کرادی کہ میں ذقے دار ہوں کہ باشندگان شہر کے مال اور اُن کی عبادت گاہوں کی حرمت کی جائے گی، اور مسلمان عیسائی گرجوں میں نماز پڑھنے کے مجاز نہ ہوں گے۔

جو سلوک عمر و نے مصریوں کے ساتھ کیا، وہ اس سے کم نہ تھا۔ اُس نے باشندگان مصر سے وعدہ کیا کہ انھیں پوری مذہب کی آزادی، پورا انصاف، بلا رورعایت، اور جاہلاد کی ملکیت کے پورے حقوق دیے جائیں گے۔ اور اُن ظالمانہ اور غیر محدود مطالبوں کے عوض میں، جو شاہنشاہان یونان اُن سے وصول کیا کرتے تھے، صرف ایک سالانہ جزیہ لیا جائے گا، جس کی مقدار فی کس تقریباً دس روپے تھی۔ رعایاے صوبہ جات نے ان شرائط کو اس قدر غنیمت سمجھا کہ وہ فوراً عہد و پیمان میں شریک ہو گئے، اور جزیہ کی رقم انھوں نے پیشگی ادا کر دی۔

عثمان اسلام اپنے عہد پر اس درجہ مستحکم رہے، اور انھوں نے اُن رعایا کے ساتھ، جو ہر روز شاہنشاہ قسطنطنیہ کے عالموں کے ہاتھ سے انواع و اقسام کے مظالم سہا کرتے تھے، اس طرح کا عمدہ برتاؤ کیا کہ سارے ملک نے بہ کشادہ

پیشانی دین اسلام اور زبان عربی کو قبول کر لیا۔ میں بار بار کہوں گا کہ یہ وہ نتیجہ ہے کہ ہرگز بہ زورِ شمشیر حاصل نہیں ہو سکتا۔ اور عربوں سے پہلے جن اقوام نے بھر پر حکومت کی، وہ ہرگز یہ کام یا ہی نہ حاصل کر سکیں۔

عربوں کی ملک گیری میں ایک خاص بات ہے، جو اُن کے بعد کے ملک گیروں میں ہرگز نہیں پائی جاتی۔ اور اقوام نے بھی، مثل بربریوں (جنہوں نے روم کے ملک کو فتح کیا ہے) یا ترکوں وغیرہ کے، ملک گیری کی ہے لیکن اُنہوں نے کبھی کوئی تمدن نہیں قائم کیا، اور اُن کی ساری ہمت اسی طرف مصروف رہی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو، اقوامِ مفتوحہ کے مال سے فائدہ اٹھالیں۔ برخلاف اِس کے، عربوں نے قلیل زمانے میں ایک جدید تمدن کی عمارت کھڑی کر دی اور اُنہوں نے ایک گروہِ اقوام کو اِس جدید تمدن کے ساتھ اپنے مذہب اور اپنی زبان اختیار کرنے پر آمادہ کیا۔

عربوں کی صحبت کے ساتھ ہی مصر اور ہندوستان کی سی قدیم اقوام نے اُن کا دین، اُن کا لباس، اُن کا طرزِ معیشت بلکہ اُن کا طریقہ تعمیرِ تنک اختیار کر لیا۔ عربوں کے بعد بہت سی اقوام نے اُنہی خطوں پر حکومت کی ہے، لیکن بغیر اسلام کی تعلیم کا اثر اِس وقت تک ان ملکوں میں باقی ہے۔ کل مالک ایشیا و افریقہ میں مراکش سے لے کر ہندوستان تک، جہاں کہیں عرب پہنچے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُن کا اثر ان ملکوں میں ہمیشہ کے لیے قائم ہو گیا ہے بہت سے نئے ملک گیروں نے ان مالک کو عربوں کے بعد فتح کیا ہے لیکن وہ اُن سے عربوں کا مذہب اور عربوں کی زبان کو ہرگز نہ مٹا سکے۔ انتہی کلام۔

یہ شاید تمدن جس کا ذکر محقق موصوف نے کیا، چند ہی روز میں دریائے سندھ سے اندس تک پہنچ گیا۔ اور رفتہ رفتہ ہندوستان میں جو ہزار ہا معبودوں کا گھر تھا، مسلمانوں کے بابرکت قدم آئے اور اُنہوں نے اِس ظلمت کدے میں توحید کا چراغ روشن اور گویا بُت خانے کے اندر مسجد بنادی۔

ایک مرد اسلام کا کارنامہ | ۱۸۵۷ء عذرا کے زلزلے سے جہاں اور قومی عمارات گرنا شروع ہوئیں، یہ مسجد بھی انہدام کے قریب آ پہنچی۔ اس پر ایک طرف تو دشمنان اسلام نے اس کی بنیادیں نکال ڈالنے کا ارادہ کیا، اور دوسری طرف خود مسلمانوں نے اس کی اینٹوں سے اپنے رہنے کے مکانات تعمیر کرنا چاہے۔ اسی پر خطر وقت میں ایک مرد اسلام کو خداے تعالیٰ نے بھیج دیا، جس نے اُس مسجد کی عمارت کو زمانے کی دست برد سے بچایا اور پہلے سے بھی زیادہ رفیع الشان اور با عظمت بنانے کی کوشش کی چناں چہ وہ اپنی کوشش میں کامیاب ہوا۔ یہ رفیع المتزلزلت عمارت مدرسہ عربی دیوبند ہے، جس کا مفصل تذکرہ آپ میرے سوا اور لوگوں کی رپورٹوں میں پائیں گے۔ اور وہ مرد اسلام قدسی صفات حضرت مولانا محمد قاسم صاحب قدس سرہ ہیں، جنہوں نے اس مدرسے کی پنا ڈالی اور جن کے اسم گرامی پر ہی ہم اس تحریر کو ختم کر دینا چاہتے ہیں۔ شعر:

زباں پہ بارِ خدا یا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے میری زباں کیے

(شبیر احمد عثمانی معتمد جمعیت الانصار)

العقل والنقل

افادات

حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ
ترتیب و تحقیق: خالد القاسمی

عقل سلیم اور نقل صحیح میں اختلاف ممکن
نہیں، اسلام کا عقیدہ اور اس کی تعلیم جو ہم
یک منقول ہو کر آئی وہ صحت عقل کی بنیاد پر عقل
سلیم والوں کے لئے وجہ انکار و اختلاف
نہیں ہو سکتی۔

منتظم اشاعت

ناشر

دارالعلوم حیدرآباد اے، پی © دارالمؤلفین دیوبند۔ یو، پی
۲۳۵۵۴

العقل والنقل -

باهتمام: وحید الزماں قاسمی کیرانوی
معتد دارالمؤلفین دیوبند

طبع اول: ۱۴۱۳ھ ۱۹۹۲ء
قیمت رسالہ العقل والنقل: ۱۵/-

فہرست مضامین العقل والنقل

نمبر شمار	مضامین	صفحہ	نمبر شمار	مضامین	صفحہ
	مقدمہ	۷۷	۱۵	مجدد الف ثانی ^{۶۷}	۹۵
			۱۶	ابن خلدون	۹۶
۱	صدائے یورپ	۷۷	۱۷	شیخ شہاب الدین سہروردی	۹۹
۲	کیا جدید تحقیقات اسلام کے مخالف ہیں۔	۷۸	۱۸	علامہ الدین طوسی	۱۰۰
۳	قدیم علم کلام اور جدید دہن کے شبہات۔	۷۸	۱۹	فلاسفہ کی بے راہ روی	۱۰۱
۴	حق الفین کا استدلال	۷۹	۲۰	شاہ ولی اللہ دہلوی	۱۰۲
۵	علم کلام کا مقصد	۸۰	۲۱	امام غزالی کی دست گیری	۱۰۳
	العقل والنقل		۲۲	حضرت نانوتوی کی مشکل کشائی	۱۱۳
۶	اختلاف عقل و نقل	۸۳	۲۳	کائنات کا کوئی جز بے مقصد نہیں	۱۱۳
۷	توریت کی تضاد بیانی	۸۳	۲۴	تخلیق انسان	۱۱۳
۸	انجیل کی تضاد بیانی	۸۴	۲۵	انسان کے ترکیبی عناصر	۱۱۵
۹	امام غزالی کا کارنامہ	۸۵	۲۶	قوت عملیہ قوت عقلیہ کی محکوم ہے	۱۱۵
۱۰	حکماء اسلام کے چند متعارض اقوال	۸۶	۲۷	اعمال کی تقسیم نیک و بد	۱۱۶
۱۱	شیخ بوعلی سینا	۸۸	۲۸	دین برحق اور عقل سلیم میں موافقت	۱۱۶
۱۲	ابن رشد	۸۹		ضروری ہے۔	
۱۳	ابن تیمیہ	۹۰	۲۹	سلیم اور غیر سلیم عقل کی بحث ربط	۱۱۷
۱۴	محی الدین ابن العربی	۹۱	۳۰	قوت عقلیہ اور قوت عملیہ کا باہمی	۱۱۸
			۳۱	قوت عقلیہ کی علامات مرض	۱۱۹
			۳۲	مریض عقلیں	۱۱۹
			۳۳	نیک و بد کی تشخیص کے لئے	۱۲۱
				طبیعی ذوق کی ضرورت ہے	

نمبر شمار	مضامین	صفحہ	نمبر شمار	مضامین	صفحہ
۳۴	فاسمی علوم کی رہنمائی	۱۲۲	۴۰	خلاصہ بحث	۱۳۳
	نبوت کی بحث	۲۳	۴۱	سر سید کے اعتراض کا جواب	۱۳۴
			۴۲	اطبار روحانی	۱۴۰
۳۵	ہر عقل کی فطرت میں کیا خدا کا	۱۲۵	۴۳	سرخیل اطبار روحانی صلی اللہ علیہ وسلم	۱۴۲
	ادراک موجود ہے؟		۴۴	تعارض کے وقت عقل پر نقل کو	۱۴۹
۳۶	قربت خداوندی بقدر مناسبت	۱۲۶		ترجیح حاصل ہونے کی وجہ	
۳۷	وجود کائنات وجود خداوندی کا	۱۲۷	۴۵	تعارض کے وقت نقل پر عقل کو	۱۴۹
	پر تو			ترجیح حاصل نہ ہونے کی وجہ	
۳۸	خدا اور اس کے برگزیدہ بندوں	۱۲۹			
	کے تعلقات				
۳۹	مادیت اور روحانیت کا فرق	۱۳۱			

مقدمہ

الحمد لله وسلامٌ على عباده الذين اصطفى:

مذہبِ اسلام اور فلسفہ یونان میں جب جنگ ہوئی، تو مسلمانوں نے زبردست ہتھیاروں سے اُس کا قطعی فیصلہ کر دیا اور اسلام کو ایسے مضبوط فصیلوں اور دُندوٹوں سے محفوظ کیا، جن کے مقابلے میں اعلیٰ سے اعلیٰ قلعہ شکن توپیں بھی اپنا کوئی اثر نہ دکھلا سکیں۔ یہ کہنا مبالغے سے خالی ہے کہ مشکمیں نے مذہب کی سطح پر قائم رہ کر، حجت و استدلال سے متعلق جو کچھ اُصول اور قواعد وضع کیے، اُن سے تمام باطل توہمات کی قلعی کھل گئی، فلسفہ یونان کی مُلتع سازیوں کا طلسم ٹوٹا، مُعترضین کی اُبلہ فریبیوں کا پردہ فاش ہوا اور قیامت تک کے یہ مُخالفین کی نکتہ چینیوں کا سدِ باب کر دیا گیا۔ لیکن افسوس کہ ہمارے زمانے کے بعض کوتاہ نظروں کی تسلی اس پر بھی نہ ہوئی اور وہ علم کلام کو آج کی ضروریات کے حق میں ناکافی ہی سمجھتے رہے۔

صدائے یورپ | ابھی کچھ عرصہ ہوا، یورپ سے یہ صدا اُٹھی کہ علوم جدیدہ نے تمام مذاہب کی بنیادوں میں تزلزل پیدا کر دیا، اور مختلف ادیانِ عالم میں سے ایک مذہب بھی اُس کے مقابلے کی تاب نہ لا سکا۔ جن لوگوں کو ہر بات کی تصدیق کے لیے یورپ کی وحی کا انتظار رہتا ہے، بے چُون دچرا اس پر ایمان لے آئے اور ملک میں اس خیال کو اس قدر شہرت دی کہ اس سرے سے اُس سرے تک جا بجا یہی چرچا ہو گیا۔ علمائے یہ دیکھ کر کہ عام لوگ مذہب سے بد دل ہوئے جاتے ہیں، اس کی تحقیق کی طرف توجہ کی، مگر تفتیش کے بعد ثابت ہوا کہ اس دعوے میں، واقعیت کا بہت ہی کم حصہ شامل ہے۔

سہ دُندوٹ: مورچہ، پشتہ، سہ مکرد دغا

کیا جدید تحقیقات اسلام مخالف ہیں؟ | اس میں شک نہیں کہ علمائے سائنس نے مادیات اور طبیعیات کے متعلق بہت سی جدید باتیں دریافت کیں، علم ہیئت (علم الافلاک) میں مفید بیانات کا اضافہ کیا، صنعت و دست کاری کے عجیب و غریب کوششیں دکھلائے، روشنی اور بجلی وغیرہ کے متعلق جدید تحقیقات سے عالم کو منور کر دیا، لیکن انھوں نے یہ نہیں بتلایا کہ ان میں کون سی بات اسلام کے مخالف ہے؟ یا کس چیز کے ثابت ہونے سے کسی اسلامی مسئلے پر نقض وارد کیا جاسکتا ہے؟

فرض کر لو کہ عناصر کی تعداد (۶۴) سے بھی کچھ زیادہ ہے، یہ بھی تسلیم کر لو کہ زمین ساکن نہیں متحرک ہے، یہ بھی مان لو کہ کو ایک سیارہ سات میں منحصر نہیں، مگر کیا اس سے توحید کے ثبوت میں کچھ خلل آیا، یا نبوت کا دعوا باطل ہو گیا؟ کسی آیت قرآنی کی مخالفت ہوئی، یا حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کیا گیا؟ جب ان میں سے کچھ بھی نہیں، تو اب یہ دیکھو کہ علوم جدیدہ نے، اسلامی مسائل کے متعلق، ردایا قبول کس چیز کی زیادتی کی؟

اس کے جواب میں ان چند بوسیدہ اور پامال اعتراضات کے سوا کچھ نہیں کہا جاتا، جو محدث مادہ، ثبوت معجزات اور حشر و نشر وغیرہ کے متعلق عام طور پر زبان زد ہیں اور جن کو ہمارے زمانے کے بعض آزاد خیال موقنین نے اردو زبان میں ذرا سلجھا کر تحریر کر دیا ہے۔

قدیم علم کلام اور جدید | لیکن جن لوگوں نے علم کلام کی تکمیل کو، صرف شرح عقائد خیالی کے ذہن کے شبہات | دائرے میں محدود نہیں سمجھ رکھا، وہ خوب جانتے ہیں کہ علمائے اسلام

نے کہاں تک ان تمام شبہات کا رکیک اور بے جان ہونا ثابت کیا ہے اور کس خوبی اور بسط کے ساتھ ان اعتراضات کا رد لکھا ہے۔ کاش! میری اس تحریر کے پڑھنے والے، ابن حزم ظاہری کی بطل و تحمل، علامہ علاء الدین علی طوسی کی کتاب الذخیرہ، فاضل تفتارانی کی شرح مفاصد امام غزالی کی نہانۃ الفلاسفہ اور محققین فن کی نادر تصنیفات کا مطالعہ کریں، جس سے ان کے رُوبہ رُومیر سے اس بیان کی صداقت ظاہر ہو۔

اس بات کا کہ دینا، اس کے ثابت کرنے سے زیادہ آسان ہے کہ علوم جدیدہ کی روشنی میں تمام قدیم علوم ماند پڑ گئے۔ اُس کے مقابلے میں متکلمین کی تحقیقات بالکل بے کار ثابت ہوئیں

اور اُس کے دُنیا میں آنے سے مذہب کو موت کا سامنا کرنا پڑا۔ کیا یہ دعو ا کرنے والے ہم کو خاص اُن مضامین کی ایک فہرست دے کر ممنون بنا سکتے ہیں جن کو اسلام اور متکلمین اسلام کے دلائل کے مخدوش بنانے میں کسی قسم کا دخل ہو، اور جن کی صحت و سُقم پر قدیم علم کلام نے کافی طور پر بحث نہ کی ہو!

ہماری ایسے لوگوں سے، جو حال کے علما کو جدید حلوں کی مدافعت سے عاجز بناتے ہیں، یہ التجا ہے کہ وہ ضرور ہم کو ایسے مسائل کی مع اُن کے دلائل کے ایک فرد تیار کر کے عنایت فرمائیں، جن کا مقابلہ ہمارے ”بوڑھے اسلام“ سے نہ ہو سکا اور آخر کار ہمارے سی۔ ایس۔ آئی بہادر کو، اُس کے ”ضعف“ اور ”پیرانہ سالی“ پر رحم کھا کر، اُس میں بہت کچھ ”اصلاح“ کرنے کی ضرورت پیش آئی تاکہ یہ ترمیم شدہ اسلام، ”نوجوان یورپ“ کی نظروں میں وقیع اور با عظمت بن سکے۔

بہر حال، اپنی جہالت کی وجہ سے جس کا جو جی چاہے کہے، مگر انصاف یہ ہے کہ اسلامی عقائد کے متعلق متکلمین نے جس درجہ موشگافی، باریک بینی اور فلسفیانہ نکتہ رسی سے کام لیا ہے، اُس نے ہمیشہ کے لیے ہم کو، اندرونی اور بیرونی مخالفین اسلام کے پیچیدہ اعتراضات کے حل کرنے سے سُبک دوش کر کے، اُن کا ممنون احسان بنادیا۔ اور میں جرأت کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اب بھی دُنیا میں امام ابو الحسن اشعری اور ابوالنصور مائتیدی کے ایسے وکیل موجود ہیں، جو اسلامی مُعتقدات کے متعلق اُن تمام شبہات کا استیصال کرتے ہوئے جو کسی نئے سے نئے پیرایے میں ظاہر کیے جائیں، قدیم علم کلام کے کامل و مکمل ہونے کا ثبوت دے سکیں۔

مُخالفین کا استدلال | ہم نے اپنے اُن دوستوں کو، جو قدیم علم کلام کو اکثر ناقص بتلایا کرتے ہیں، بار بار یہ بھی کہتے سنا ہے کہ قدیم علم کلام میں صرف عقائد اسلام کے متعلق بحث ہوتی تھی؛ کیوں کہ اُس زمانے میں مخالفین نے اسلام پر جو اعتراض کیے تھے، عقائد ہی کے متعلق تھے لیکن آج کل تاریخی، اخلاقی، تمدنی، ہر حیثیت سے مذہب کو جانچا جاتا ہے۔ یورپ کے نزدیک کسی مذہب کے عقائد اس قدر قابل اعتراض نہیں، جس قدر اُس کے قانونی اور اخلاقی مسائل

۱۰ فرد: فہرست ۱۰ تحقیقی ۱۰ عقائد

ہیں۔ اُن کے نزدیک تعددِ نکاح، طلاق، غلامی، جہاد کا کسی مذہب میں جائز ہونا، اُس مذہب کے باطل ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ اس بنا پر علمِ کلام میں اس قسم کے مسائل سے بھی بحث کرنا ضروری ہے، اور یہ حصہ بالکل قدیم علمِ کلام میں موجود نہیں۔

علمِ کلام کا مقصد ہمارے ان احباب کا یہ کہنا بالکل سچ ہے کہ قدیم علمِ کلام کا تعلق صرف عقائد سے ہے، قانونی اور اخلاقی مسائل سے اُس میں مطلقاً بحث نہیں کی گئی، لیکن مُتکلمین یہ نہ کرتے تو کیا کرتے؟ علمِ کلام کا مقصد ہی عقائد تک محدود تھا۔ قانونی اور اخلاقی مباحث کے لیے اُس کی وضع ہی نہ تھی۔ ان چیزوں کے لیے دوسرے علوم کی حاجت تھی۔ چنانچہ فِرَیْقَتِ تَصَوُّفِ وَاَخْلَاقِ اور علمِ اَسْرَارِ الدِّین نے اس ضرورت کو رفع کیا اور اسلام کی تمام جزئیات، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، نکاح، طلاق، جنگ و جہاد کے مخفی اسرار اور حکمتوں کو نہایت تفصیل کے ساتھ ظاہر کر دیا۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رَحْمَةُ اللہِ اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رَحْمَةُ اللہِ علیہ کی قیمتی تصنیفات اس وقت بھی کثرت سے موجود ہیں جن کے مطالعے سے میرے اس بیان کی پوری تصدیق ہو سکتی ہے۔ اور اس عنوان کے ذیل میں جس سلسلہ مضامین کے لکھنے کا ارادہ کر رہا ہوں، اُس میں اس کا خیال رکھوں گا کہ حسبِ موقع ان بیش بہا تصانیف سے مفید اقتباسات حاصل کروں۔

کچھ کتاب کے بارے میں | بہ ہر کیف، علمِ کلام جس غرض کی تکمیل کے لیے مُدَوَّن کیا گیا ہے نزدیک اُس نے اُس میں پوری کامیابی حاصل کی۔ اور اب میرا قصہ ہے کہ میں اسلامی عقائد کے ہر باب کے متعلق، بہ صورتِ رسائلِ عدیدہ، یہ دکھلاؤں کہ علماء اسلام نے اُس کو تحقیق کی کس حد تک پہنچا کر چھوڑا ہے، اور اب ہم کو اُس میں کہاں تک ترمیم یا اصلاح کرنے کی ضرورت ہے۔ لیکن مجھ کو اپنے اصلی مقصد کے شروع کرنے سے پہلے، جیسا کہ چند اُن مُقَدِّمات کا ذکر کر دینا ضروری ہے جن کے بغیر ہمارا مقصد کامل طور پر اور آسانی کے ساتھ دل نشیں نہیں ہو سکتا، اسی طرح بعض اُن خطرناک غلطیوں پر مطلع کر دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے، جو اصول کے طور پر عام مسلمانوں میں تسلیم کر لی گئی ہیں اور جو آگے چل کر ہمارے ناظرین کو بعض

اصلی مقاصد کے سمجھنے میں مڑا رحم ہو سکتی ہیں لیکن جس اہم کام اور طویل الذیل سلسلے کا میں نے بیڑہ اٹھایا ہے اور جس کا آغاز بے نام خدا آج اس رسالے سے کیا جاتا ہے، وہ اُسی وقت انجام کو پہنچ سکتا ہے جب کہ اس مضمون کے پڑھنے والے کلمات خیر سے میری ہمت بڑھائیں اور خدا کی توفیق مشاغل حال رہے۔ اور عجیب نہیں کہ اگر اس ناچیز مضمون کا کوئی حصہ پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا، تو پھر ہم کو قدیم و جدید ہیئت کے مسائل کے موازنہ کرنے کی بھی اپنے دست رس کے موافق جرأت ہو، اور اگر زندگی ہے، تو ان شاء اللہ ہم علوم جدیدہ کے متعلق اپنی معلومات بڑھانے کی کوشش اور اس مقصد کی تکمیل کی ضرورت فکر کریں گے۔ شعر:

دور بمیریم، غدر ما بپذیر

اے بآرزو کہ خاک شدہ

اس سے قبل کہ توجید، رسالت اور جزا و سزا وغیرہ اسلامی اصولوں میں سے ہر ایک اصول کی، علاحدہ علاحدہ رسائل کے ذریعے سے، بلا مشابہت تحسب مفصل تحقیقات کی جائے، اس رسالے میں چند ایسے امور کا ذکر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے، جو ان مباحث میں امداد دینے کے علاوہ، اس موقع پر ایک خاص قسم کی دل چسپی سے خالی نہیں ہیں؛ کیوں کہ یہ امور، درحقیقت ایسے قوانین ہوں گے، جن کی صحت ان محسوسات اور بدیہیات پر مبنی ہوگی جو ہر طرح سے قابل اطمینان ہیں۔ اور انھی سچے قوانین کی میزان سے، ہم آئندہ چل کر اسلامی مسائل کی پوری پوری جانچ کر سکیں گے۔ گویا یہ مقدمات، ہمارے نزدیک ان اصول موضوعہ کے طور پر لکھے جائیں گے، جن کے سہارے ہمارے اکثر بیانات کی بنیادیں قائم ہوں گی۔

اب اگر کسی صاحب کو ان میں سے کوئی اصول مشتبہ یا غلط نظر آئے، تو وہ بہت شوق کے ساتھ اپنے اعتراض کو ظاہر فرمائیں؛ لیکن اپنے کسی ایک دعوے کے ثبوت میں بھی چند کہنے سال یورپ کا نام لینے پر اکتفا نہ کریں، تا وقتہ کہ ان کے پاس ایسی ہی کوئی دلیل قطعی نہ ہو، جیسا کہ ہم اپنے ہر ایک دعوے کے ساتھ ساتھ پیش کریں گے، یا جیسی دلائل قویہ کا وہ ہم سے خود مطالبہ فرمانے کو تیار ہوں گے۔

اور گروہ صاحب، صرف چند جرمنی اور فرانسیسی مصنفین کے اقوال یاد کر لینے ہی کو علوم جدیدہ میں ماہر ہونا تصور کرتے ہوں، تو بحمد اللہ ایسے مباحث سے بھی گوہم اپنے کو عاجز نہیں پاتے، مگر جب ایسے دور از کار فضولیات کا منظر سامنے ہوگا، تو ہماری طبیعت بھی صرف اسی قدر جواب کو پسند کرے گی کہ (شعر):

”مدعی گو برد و نکتہ بجا قلم فردش

کلک ما نیز زبانی و بیانی دارد

اس بے ایسے لوگوں کی خدمت میں ہم عرض کیے دیتے ہیں، کہ وہ بہ راہ کرم اپنا اور ہمارا عزیز وقت ہرگز ضائع نہ فرمائیں۔ بلکہ ذرا اسی دیر کے لیے سخن پروری، بہت دھرمی اور نفس پرستی کو فراموش کر کے اور آخرت کی عام جواب دہی کو پیش نظر رکھ کر، ٹھنڈے دل سے اُن قیمتی مطالب کے سننے میں مصروف ہو جائیں، جو بڑی غرق ریزی کے بعد جمع ہو کر، بنی نفع انسان کی ہم دردی کی خاطر منظر عام پر لائے جائیں گے۔

چوں کہ ان مضامین کا سلسلہ، اگر خدا کو منظور ہے، تو عرصہ دراز تک قائم رہے گا، اس لیے علم دوست احباب سے توقع ہے کہ اس سلسلے کے تمام رسائل کو ایک جگہ جمع کرنے جائیں تاکہ پہلے میں دوسرے کا یاد دوسرے میں پہلے کا کوئی حوالہ آئے، تو اُس مقام کو بے تکلف نکال کر دیکھ سکیں۔

اب ان تمام ہدایات کے بعد ہم اپنا اصلی مطلب شروع کرتے ہیں اور آرزو مند ہیں کہ اس کے پڑھنے والے، تمام پڑانے و سادس اور ادہام سے دل کو پاک کر کے اور لا تنظر اِلیٰ من قال و انظر اِلیٰ ما قال کو سامنے رکھ کر، نیک نیتی اور انصاف پرستی کی داد دینے کے لیے آمادہ ہو جائیں۔ و ما توفیقی اِلا باللہ، علیہ توکلْتُ و اِلیہ اُنِیب۔ شعر:

شہا! من از بعرض رسام سریر فضل

ملوک ابن جنابم و مسکین این درم

العقل والنقل

اختلاف عقل و نقل | تمام اہل فہم کے نزدیک، یہ مسلمات میں سے ہے کہ نقل صحیح یا عقل کامل کا اتباع انسان کے اولین فرائض میں سے ہے، اور انہی دونوں کی اطاعت پر اُس کے برگزیدہ کمالات اور حقیقی کام یا بیوں کے حاصل ہونے کا انحصار ہے۔ پھر ہر چند کہ اہل تحقیق کے نزدیک ان دونوں حاکموں (عقل و نقل) میں کبھی نزاع اور خصومت، بجز اس کے ممکن نہیں کہ یا نقل کی صحت مشکوک ہو، یا عقل کی سلامتی میں کچھ نقصان اور فتور واقع ہو جائے، مگر جب کبھی کسی وجہ سے کسی موقع پر ان دونوں میں خلافت محسوس ہوتا ہے، تو انسان کے خیالات میں سخت تڑاؤ اور تذبذب پیدا ہو جاتا ہے، اور دونوں جانبوں کی کھینچ تان سے اُس کو یہ دشواری پیش آتی ہے، کہ وہ ان میں سے کس کے حکم کو قبول اور کس کو رد کرے! اگر دونوں کی تعمیل کرنا چاہے تو اس کی کیا صورت ہو اور کسی ایک کو ترجیح دے، تو کیوں کر دے!

اس لیے سب سے پہلی مگر سب سے مشکل منزل (جس کے طے کیے بغیر ہم اپنے اصلی مُدعا تک نہیں پہنچ سکتے) یہ ہے کہ عقل و نقل کا یہ قدیم جھگڑا چکایا جائے، جس کی بدولت پچھلے زمانے میں سیکڑوں دانش مند آدمیوں کی قربانی ہو چکی ہے اور بہت سے بے قصور لوگ دار پر کھینچ دیے گئے ہیں۔ جب کبھی مُدعیانِ عقل نے قدم جمائے، اہل نقل کے استیصال میں تسمہ باقی لگا نہیں رکھا، اور جب نقل کے بے وقوف پیروؤں کا دور دورہ ہوا، تو انھوں نے بھی اپنے فریقِ مُقابل کے حق میں، سر قلم کرنے یا آگ میں جلا دینے سے کوئی کم سزا تجویز نہیں کی۔

غور طلب سوالات | اب دیکھنا یہ ہے کہ اس اختلاف عقل و نقل کی اصلی حقیقت کیا ہے؟ کیا اس خوف ناک نزاع میں کوئی صحیح صورت تطبیق کی ممکن ہے؟ یا کسی اہل مذہب نے ان دونوں میں تطبیق دینے کی کوشش کی؟ کیا ان تطبیق دینے والوں میں سے کوئی ایک شخص بھی اپنی سعی میں کام یاب ہوا؟ یہ وہ سوالات ہیں جن پر غور کرنا ہر ایک مذہب والے کا فرض ہے، اور اس وقت ہم اٹھی ہمت بالشان امور پر، کامل طریقے سے ایسے آسان پیرایے میں بحث کریں گے جس میں عام، خاص، عالم، جاہل اور ذکی، غنی سب مساوی طور پر حصہ لیں۔

عقل و نقل کی پرانی کش مکش | قدیم سے قدیم روایات پر عبور کرنے سے اس کا ثبوت ملتا ہے کہ عقل و نقل کی یہ نزاع اور باہمی کش مکش، کسی ایک قوم، ایک ملک اور ایک ملت کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ انسانی آبادی کے ہر طبقے اور ہر حصے میں دونوں قسم کی طبیعتیں ہمیشہ موجود رہی ہیں۔ جو زمانہ کسی قوم کے حق میں اعلیٰ درجے کی وحشت، بدویت اور عام تاریکی کا فرض کیا جائے، اُس میں بھی متہذّن اقوام کی مانند دونوں طرح کے خیالات پائے جاتے ہیں۔ بعض لوگ اپنی عقل کے ایسے پابند اور خیالات کے ایسے محکوم ہوتے ہیں کہ جو چیز ان کی عقل و ادراک سے خارج ہو، اُس کو وہ واقع میں موجود ہی نہیں سمجھتے۔ اور ان کے برخلاف، بعضوں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ جب وہ اپنے کسی نسبی بزرگ یا مذہبی مقتدا سے کوئی بات سُن لیں، تو بے چُون و چرا اُن کے حکم کے سامنے گردن ڈال دیں، بہ شرطے کہ اُس مقتدا کے مقتدا ہونے پر پورا اعتماد حاصل ہو چکا ہو۔

اس کے بعد دونوں گروہوں میں طعن و تشنیع کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ پہلا گروہ دوسرے کو سادہ دل، کم عقل اور بے وقوف سمجھتا ہے اور دوسرا پہلے کو بے ادب، مغرور اور نافرمان قرار دیتا ہے۔ رفتہ رفتہ دونوں میں کینہ اور بغض کی آگ بھڑک اٹھتی ہے اور زبان و دل سے گُذر کر ہاتھ پاؤں تک جنگ و جدل کی نوبت پہنچ جاتی ہے۔

توریت کی تضاد بیانی | یہ سب کچھ ہوتا ہے، مگر اس پر بھی امر متنازع فیہ کا نصفیہ نہیں ہوتا۔ بلکہ طرفہ ماجرا یہ ہے کہ بسا اوقات ایک ہی شخص اور ایک ہی کتاب کے دو قول اُس مسئلے میں متناقض پہلو رکھتے ہیں، اور ہماری حیرت اور تعجب کی اُس وقت کوئی انتہا نہیں رہتی، جب

ہم کو کسی ایک ایسی مذہبی کتاب میں، جو کسی فرقے کے نزدیک خطا و قصور سے بالکل پاک تسلیم کر لی گئی ہے، دو متعارض کلام اس بارے میں نظر پڑتے ہیں۔ جب ہم موسیٰ علیہ السلام کی کتاب کی ورق گردانی کرتے ہیں، تو امثال سلیمان کے تیسرے باب میں یہ عبارت لکھی ہوئی ملتی ہے کہ:

”اپنے سارے دل سے خداوند پر توکل کر، اور اپنی سمجھ پر تکیہ مت کر۔ اپنی ساری راہوں میں اُس کا اقرار کر، وہ تیری رہ نمائی کرے گا۔ اپنی نگاہ میں آپ کو دانش مند مت جان۔ خُداوند سے ڈر اور بدی سے باز رہ، یہ تیری ناف کے لیے صحت اور تیری ہڈیوں کے لیے ٹراوٹ ہے۔“

اور انھی امثال کے آٹھویں باب میں لکھا ہے کہ:

”کیا دانائی نہیں پکارتی اور کیا فہمید آواز بلند نہیں کرتی! وہ سڑک کے پاس اونچے مقاموں کی چوٹیوں پر اور چوراہے کے چوڑے پر کھڑی ہوتی ہے۔ وہ پھاٹکوں کے نزدیک شہر کے مدخل پر، جہاں سے دروازوں میں داخل ہوتے ہیں، چلاتی ہے کہ اے آدمیو! میں تمہیں بلاتی ہوں اور بنی آدم کی طرف آواز اٹھاتی ہوں۔ اے بے وقوفو! خُرد کو سمجھو اور اے جاہلو! سمجھنے والا دل پیدا کرو۔ سنو کہ میں لطیف مضمون کہتی ہوں، اور میرے لبوں سے، جب وہ کھلتے ہیں، تو سچی باتیں نکلتی ہیں کہ میرا منہ سچ سچ کہتا ہے۔ اور میرے لبوں کو شرارت سے نفرت ہے۔ میرے منہ کی ساری باتیں صداقت سے ہیں، اُن میں کچھ ٹیڑھا ترچھا نہیں۔ وہ سب، اُس کے نزدیک جو دانش رکھتا ہے، سیدھے ہیں اور اُن کے خیال میں جو حقیقت شناس ہیں، راست ہیں۔“

انجیل کی تضاد بیانی | اسی قسم کے متضاد بیانات انجیل مقدس میں بھی پائے جاتے ہیں۔ کسی جگہ اپنی عقل پر خدا کی بندگی کا دار و مدار رکھا ہے، اور کہیں انسانی عقل، انسانی حکمت اور انسانی ادراک کو بالائے طاق رکھنے کی ہدایت کی ہے۔ پادُل رسول نے جو خطر دمیوں کو لکھا ہے، اُس کے الفاظ یہ ہیں:

”غرض میں اپنی عقل سے خدا کی شریعت اور جسم سے گناہ کی بندگی کرتا ہوں۔“
 اس سے صاف ظاہر ہے کہ خدا کی شریعت کا اتباع وہ اپنی عقل کے بھروسے پر کرتے تھے۔
 لیکن اس کے خلاف انہی پاؤں رسول نے جو خط کرتھیں کو تحریر کیا ہے، اُس کی عبارت یہ:
 ”اور میری عبارت اور میرا وعظ، انسانی حکمت کے دل فریب بات کے ساتھ
 نہیں، لیکن رُوح اور قدرت کی دلیل کے ساتھ تھا؛ تاکہ تمہارا ایمان نہ انسانی
 حکمت سے، بلکہ خدا کی قدرت سے ثابت ہو دے۔ ہم کارہوں کے نزدیک
 حکمت کی بات بولتے ہیں، مگر اس جہاں کی اور اُس جہاں کے حاکموں کی فانی
 حکمت نہیں بولتے، بلکہ ہم وہ حکمت الہی بولتے ہیں، جو چھپی ہوئی ہے۔ یعنی وہ
 پوشیدہ حکمت جسے خدا نے زمانے کے آگے ہماری بزرگی کے لیے مقرر کیا تھا۔“
 پھر اسی صفحے پر لکھا ہے کہ:

”اب ہم نے نہ دنیا کی رُوح، بلکہ وہ رُوح جو خدا سے ہے، پائی؛ تاکہ ہم اُن
 رازوں کو، جو خدا نے ہمیں بخشے ہیں، سمجھیں۔ اور ہم اُن رازوں کو انسان کی
 سکھائی باتوں سے نہیں، بلکہ رُوح قدس کی سکھائی ہوئی باتوں سے، غرض
 روحانی چیزوں کو رُوحانی عبارت سے ملا کر بیان کرتے ہیں۔ مگر نفسانی آدمی
 خدا کی رُوح کی باتوں کو قبول نہیں کرتا کہ اُس کے نزدیک نادانی کی باتیں ہیں،
 اور وہ ان کو سمجھ نہیں سکتا کہ وہ رُوحانی طور سے بوجھی جاتی ہیں۔“

بعض متضاد اسلامی مضامین | شریعت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی دونوں قسم کے
 اور امام غزالی کا کارنامہ | مضامین موجود ہیں۔ ایک حدیث میں رسول کریم صلی اللہ
 علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ لوگ درجۂ عقل کے موافق جنت میں داخل ہوں گے۔ اور دوسری
 جگہ اهل الجنة بئد (یعنی اکثر جنتی لوگ بے وقوف ہوں گے) بھی مشہور ہے۔
 آپ کے بعد جو علما اور حکما آپ کی امت میں گزرے، اُن کے اقوال بھی اسی طرح بظاہر

متعارض رہے اور امام غزالی کے زمانے تک غالباً بہت کم عالمِ اِدھر متوجہ ہوئے، جنہوں نے اس عقل و نقل کے اختلاف پر باضابطہ اور مکمل بحث کی ہو اور تمام شبہات کو رفع کر کے یہ دکھلایا ہو کہ اس اختلاف کا اصلی منشا کیا ہے؟ دونوں فریق کے استدلالات کس درجے تک درست ہیں؟ اور انبیاء یا اکابرِ علماء کی کتابوں میں جو یہ ظاہر اختلافات معلوم ہوتے ہیں جن کی طرف ہم نے بھی اشارہ کیا ہے: اُن کے اجتماع اور تطبیق کی صحیح صورت کیا ہے؟ میرا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ امام غزالی سے پہلے کوئی شخص عقل و نقل کی تطبیق کی صورت سمجھے ہوئے نہ تھا، بلکہ یہ غرض ہے کہ اُن سے پہلے اس مسئلے کی خاص تشریح کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی کیوں کہ ہر ایک زمانے کے حکماء، اُنھیں اُمور کے بیان میں زیادہ تاکید و تفصیل سے کام لیا کرتے ہیں، جن میں کسی قسم کے خفا اور مغلطے کا اندیشہ ہو، یا وہ ایسے امراض ہوں جن کے اندر عام طبائع مبتلا پائی جائیں۔

تم خود اندازہ کر لو کہ والدین کی اطاعت اور اولاد پر ترحُّم اور شفقت، یہ دونوں چیزیں باوجود دے کہ مذہبی ضروریات میں سے ہیں، مگر اول چوں کہ ایک گوشتِ نفس کی خواہش کے خلاف، اور دوسرے نہ تنہا انسان بلکہ تمام حیوانات کی اقتضائاتِ طبعیہ ہی سے ہے، اس وجہ سے حکیم مطلق نے عقوق والدین کی خرابی اور ان کی اطاعت کی خوبی کو، بہ کثرات و مَرَاتِ اور بہ اجمال و تفصیل جس قدر مختلف عنوانوں سے تعلیم فرمایا ہے، رَحْمَ عَلَی الْاَوْلَاد کے احکام میں اُس کا عَشْرُ عَشْرِ بھی نہیں۔

ٹھیک اسی طرح، علمائے سلف کے زمانے میں چوں کہ عام طور پر مذہبی روایات کا اعتماد قائم تھا، اور زید، عمرو، بکر کی رائے اور خیال سے اُن روایات کا بدل ڈالنا کسی لہلہ مذہب کے نزدیک بھی روانہ تھا، اس لیے نہ عقل و نقل میں بہ کثرت نزاعات قائم ہوتے تھے، نہ علماء کو ان دونوں کے مُقَدِّمات فیصل کرنے کی نوبت آتی تھی اور نہ اس کی حاجت سمجھی جاتی تھی کہ ان دونوں کی تطبیق کے اُصول یا اختلاف کے اسباب بیان کیے جائیں۔

اس کے بعد جوں جوں زمانہ گزرا، فلسفیت اور اتحاد کا رنگ غالب آیا، عقول ناقصہ جزئیہ کی گرم بازاری ہوئی اور نقل کی قدر و منزلت گھٹی، اُسی قدر عقل و نقل کی منازعت بڑھتی گئی، امام غزالی کے زمانے تک اس کی ضرورت محسوس ہونے لگی کہ ان دونوں عقل و نقل کی موافقت و اتحاد کے واسطے کچھ آئین بتلائے جائیں، اور ان میں سے ہر ایک کے حدود کی تعیین و صاحت کے ساتھ کر دی جائے۔ چنانچہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اس پر قلم اٹھایا، اور انصاف یہ ہے کہ انھوں نے اپنے زمانے کی ضروریات کے موافق اس مقصد کی پوری تکمیل کر دی۔

لیکن چونکہ علمائے سلف کو اس تعیین و تفصیل کی حاجت پیش نہیں آئی تھی، اور علمائے مابعد نے امام صاحب ممدوح کی تشریحات پر حوالہ دینے کو کافی سمجھا، اس واسطے اُن سے پہلے اور اُن کے بعد اکثر ایسے ہی مبہم اور متعارض اقوال عقل و نقل کے بارے میں جمع ہوتے رہے، جس سے آج کل کے کوتاہ نظروں کو سادہ لوح عوام کے گم راہ کرنے کا خوب موقع پاتھ آیا، اور انھوں نے اپنے بزرگوں کے کلام کے وہ مختلف ٹکڑے جن کو امام غزالی نے احیاء العلوم وغیرہ میں عمدہ طور پر جمع کر کے دکھلادیا تھا، جاہ جا اپنے استشہاد میں پیش کر کے سیدھے اور سچے مسلمانوں کو طریق حق سے ہٹانا چاہا۔

عقل و نقل کے بارے میں علمائے اہل چنانچہ اب میں اس قسم کے اکثر کلام، حکماء اور علمائے حکماء اسلام کے چند متعارض اقوال | اسلام کی کتابوں سے انتخاب کر کے، ذیل میں نقل کرتا ہوں جن کو پڑھ کر ایک خالی الذہن آدمی سخت تحیر اور تذبذب میں پڑ جاتا ہے، اور اس کے بعد امام غزالی کی مفصل تقریر، اُن کی متفرق تصانیف سے اقتباس کر کے ہدیہ ناظرین کروں گا، جو اس حیرت اور پریشانی کو کافی حد تک مٹا سکے گی۔

البتہ یہ ضرور ہے کہ عقل و نقل کی جو مخالفت آج کل دیکھنے میں آرہی ہے، کہ عرصہ ہوا دونوں حکومتوں میں سفر اٹھ چکے اور اعلان جنگ ہو کر لگاتار معرکہ آرائی ہونے لگی، پھر

لڑائی بھی باقاعدہ نہیں، بلکہ زمانہ حال کی عقل نے غدر پر کمر بستہ ہو کر محض جابرانہ کارروائی شروع کر دی۔ چوں کہ یہ بہار یا خزاں، نہ امام غزالی نے دیکھی تھی اور نہ اُن سے پہلے کسی اور نے؛ اس لیے اگر زمانہ حال کی بعض خصوصیات پر نظر کر کے امام غزالی کی تقریر میں بھی کوئی کمی ہوگی، تو میں اُس کو آزادانہ ظاہر کروں گا۔ اور پھر کسی اور عالم کی تقریر اگر اُن کی تقریر سے زیادہ تسکین بخش سمجھی جائے گی، تو اُس کو سب سے اخیر میں درج کروں گا۔ تاکہ ہمارے رسالے کے وہ ناظرین بھی جن کے دلوں میں اس زمانے کی اندیشہ ناک آزادی کا کوئی اثر آیا ہو، اول سے آخر تک تمام آراء کا موازنہ کر کے نیک دلی کے ساتھ سچائی اور راستی کو قبول کر سکیں۔ واللہ دَرُمن قال:

دورِ عجیبے گردشِ ایں دائرہ دارد	وقتے است کہ گردوں بگذارد دوراں را
اکنوں اثرِ تربیتِ دہر بر آں است	تا صورتِ خرچہ رہد لطفہ کاں را
بر خاستہ زیں شور زمیں چند بُجائے	یکسر بکفِ غول ہوا داد عنان را
سیمرغِ خور و قوتِ پرواز گم نیست	بالِ و پرِ ایں ہچمداں ہمہ را

شیخ بوعلی سینا سب سے پیش تر ہم اُن حامیانِ عقل کی طرف رجوع کرتے ہیں جو عام طور پر فلاسفہ اسلام یا حکماء اسلام کے لقب سے مشہور ہیں اور جن کی زندگی کا اکثر حصہ عقل کی پیروی میں صرف ہوا ہے۔ شیخ بوعلی سینا اور ابن رشد اندلسی اس گروہ کے امام گزرے ہیں۔ شیخ نے اشارات کے آخر میں ایک مستقل باب اس کے لیے منعقد کیا ہے کہ انبیاء اور اولیاء کے بہت سے علوم، ممکن ہے کہ عقول متوسطہ کے مرتبے سے بالاتر ہوں، وہ درحقیقت صحیح ہوں مگر عام طور پر لوگ اُن کو نہ سمجھ سکیں۔ کیوں کہ جو چیز انسان میں علوم و ادراکات کی حاصل کرنے والی ہے، وہ ایک لطیف چیز ہے جس کو روح سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور جب علم کے حاصل ہونے کا مبنی وہی جزیرِ لطیف ٹھہرا، تو جس قدر جسم کی کثافت کو بہ ذریعہ مجاہدات اور ریاضات کے زائل کیا جائے گا، اُسی قدر روح کی لطافت میں ترقی ہوگی۔ اور لطافت کے بڑھنے سے علوم میں یقیناً وسعت پیدا ہوئی

جائے گی چوں کہ انبیا اور اولیا بھی ترک لذات اور گسر شہوات کے بعد جسمانی تعلقات سے بہت کچھ بیگانہ ہو جاتے ہیں، اس لیے اگر اُن کو بہت سی وہ باتیں معلوم ہوں، جو ہم کو نہ ہوں، تو یہ کوئی قابلِ استعجاب امر نہیں ہے۔ اس کے بعد شیخ کہتا ہے:

والعارفون الْمُتَنَزِّهُونَ، إِذَا
وُضِعَ عَنْهُمْ وَزُرُ مَقَارِنَةِ الْبَدَنِ
وَانْفَكُوا عَنِ الشَّوَاغِلِ، خَلَصُوا
إِلَى عَالَمِ الْقُدْسِ وَالسَّعَادَةِ
وَانْتَقَشُوا بِالْكَامِلِ الْأَعْلَى
وَحَصَلَتْ لَهُمُ اللَّذَّةُ الْعُلْيَا
وَقَدْ عَرَفَتْهَا. وَلَيْسَ هَذَا
إِلَّا لِيَذْأَذَ مَفْقُودًا مِنْ كُلِّ
وَجْهِ وَالنَّفْسُ فِي الْبَدَنِ، بَلِ
الْمُتَفَقِّسُونَ فِي تَأْمِلِ الْجَبَرُوتِ
وَالْمُعْرِضُونَ عَنِ الشَّوَاغِلِ يُصِيبُونَ
وَهُمْ فِي هَذِهِ الْأَبْدَانِ مِنْ هَذِهِ
اللَّذَّةِ حَظًّا وَافِرًا، قَدْ يَتِمُّكَ مِنْهُمْ
فَيُسْغِلُهُمْ عَنْ كُلِّ شَيْءٍ ۝

اور خدا کی معرفت رکھنے والے پاک بندے،
جس وقت اُن سے جسمانی تعلقات کا بار ہٹا کر دیا
جاتا ہے اور دنیوی مشاغل سے وہ علاحدہ ہو جاتے
ہیں، تو اُن کی توجہ خالص طور پر عالمِ قدس اور
عالمِ سعادت کی طرف مبذول ہو جاتی ہے اور
وہ اعلیٰ درجہ کے کمال کے ساتھ موصوف اور بڑی
لذت اٹھانے والے ہوتے ہیں، جیسا کہ تم پہلے معلوم
کر چکے ہو۔ اور یہ نہیں کہ جب روح بدن میں ہو، تو
وہ اس لذت سے بالکل محروم رہیں، بلکہ ایسے لوگ
جو خدا کی عظمت و جبروت کی فکر میں ڈوبے ہوئے
اور جسمی مشغلوں سے اعراض کرنے والے ہیں، وہ
ان اجسام میں رہ کر بھی اس لذت سے اُتنا براصہ
پا لیتے ہیں، جو اُن پر غالب آکر تمام اشیاء سے اُن کو
فارغ کر دیتا ہے۔

شرح اشارات محقق طوسی میں ہے:

جَلَّ جَنَابُ الْحَقِّ أَنْ يَكُونَ شَرِيعَةً
لِكُلِّ وَارِدٍ، أَوْ يُطْلَعَ عَلَيْهِ إِلَّا وَاحِدٌ
بَعْدَ وَاحِدٍ. وَلِذَلِكَ فَإِنْ مَا يَشْتَمِلُ

خداے تعالیٰ کی جناب، اس سے اعلیٰ اور ارفع ہے
کہ وہ ہر وارد و صادر کی گذر گاہ بن جائے، یا اس
پر مخصوص افراد کے سوا کوئی مطلع ہو سکے۔ اور اسی

وجہ سے صوفیوں کا طریقہ، غافل کے نزدیک مضحکہ خیز اور طالب کے واسطے عبرت انگیز طریقہ ہے۔ نوجوان کی باتوں کو سن کر اُن سے اعراض کرے، اُس کو چاہیے کہ وہ اس بارے میں اپنے نفس کا قصور سمجھے؛ کیوں کہ اس کو اُن سے مناسبت نہیں۔ اور ہر شخص کے واسطے وہی بات آسان ہوتی ہے جس کے لیے وہ پیدا کیا گیا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ خدا رسیدہ لوگ بہت کم پائے جاتے ہیں، اور اکثر لوگ باطنی طریقوں سے اس بنا پر انکار کرتے ہیں کہ وہ اُس کو نہیں جانتے۔ آدمی ہمیشہ نامعلوم باتوں کا دشمن ہوتا ہے۔ پھر یہ کمال، ہر ایک کو محض حاصل کرنے سے حاصل نہیں ہوتا، مادقتے کہ اُس کا جو ہر طبیعت فطرتاً اُس کے مناسب نہ ہو۔

عليه هذا الفتن، ضحكة للمغفل وعبرة للمحصل؛ فمن سمعه فاشمأز عنه، فليتهيم نفسه لعلها لا تناسبه، وكل ميسر لما خلق له. والمراد ذكر قلة عدد الواصلين إلى الحق والإشارة إلى أن سبب إنكار الجمهور للفتن المذكور في هذا النمط، هو جهلهم بها، فإن الناس أعداء ما جهلوا؛ وإلى أن النوع من الكمال ليس مما يحصل بالاكْتِسَابِ المحض بل إنما يحتاج مع ذلك إلى جوهر مناسب له بحسب الفطرة.

ان دونوں عبارتوں سے، شیخ اور علامہ طوسی کا یہ مطلب ہے کہ اگر انبیا اور اولیاء سے بعض ایسے امور منقول ہوں، جو ہماری عقل کے دائرے سے باہر ہیں، تو ہم کو اُن کی اس بنا پر تصدیق کرنا چاہیے کہ اُن کے نفوس، بہیمیت کی ظلمات اور بشریت کی کدورت سے پاک و صاف ہوتے ہیں اور ہم کو یہ سعادت حاصل نہیں ہوتی۔

لیکن شیخ کی اس تقریر سے اس کا کوئی جواب نہیں نکلا کہ اس صورت میں ہندوستان کے جوگی، نصارا کے راہب اور پہلے زمانے کے اشتراقیوں کے تمام علوم کیوں قابل تسلیم نہیں ہیں؟ جب کہ روحانیت کی ترقی کا مدار تجرُّد اور ترک دنیا پر ہو، تو ان لوگوں کا تجرُّد انبیا

۱ شرح اشارات طوسی، مطبوعہ مصر ص ۳۹

۲ حیوانیت، شہوت پرستی

اور اویا کے تجرّد سے کیوں کم ہے؟ بلکہ یہ ظاہر یہ لوگ بہت زیادہ آدمیوں کی مُجاسّت سے مُتّفق اور انسانی جذبات کے فنا کر دینے والے نظر آتے ہیں۔ چوں کہ اس حیثیت سے شیخ کی تقریر بالکل ناقص ہے، اس لیے اب ہم شیخ کو چھوڑ کر دوسرے علما کے اقوال کا مختصر انتخاب درج ذیل کرتے ہیں۔

ابن رشد قاضی ابن رشد اندلسی، جس نے امام غزالی کی کتابوں کا رد لکھا ہے اور جس کو اہل یورپ مسلمانوں کا سب سے بڑا فلسفی خیال کرتے ہیں، ایک مقام پر لکھتا ہے کہ خدا سے برحق نے اپنی سچی کتاب میں، ہم کو جاہ جاقیاس اور استدلال کے طریقے پر توجہ دلائی ہے اور ہر چیز کو عقل سے دریافت کرنے کے لیے آمادہ کیا ہے:

وَإِذَا كَانَتْ هَذِهِ الشَّرَاطِعُ
حَقًّا وَدَاعِيَةً إِلَى النَّظَرِ
الْمُؤَدِّي إِلَى مَعْرِفَةِ الْحَقِّ
فَإِنَّا مَعَشَرَ الْمُسْلِمِينَ نَعْلَمُ
عَلَى الْقَطْعِ أَنَّهُ لَا يُؤَدِّي النَّظَرُ
الْبُرْهَانِي إِلَى مُخَالَفَةِ مَا وَرَدَ بِهِ الشَّرْعُ
فَإِنَّ الْحَقَّ لَا يُضَادُّ الْحَقَّ يَس
اور جب یہ شریعت سچی ہے اور لوگوں کو اس غورو فکر کی طرف بتا رہی ہے، جس سے خدا کی معرفت حاصل ہو، تو ہم مسلمانوں کا قطعی یہ عقیدہ ہونا چاہیے کہ دلیل اور بُرہان سے شریعت کے خلاف کبھی ثابت نہیں ہو سکتا۔ (کیوں کہ شریعت بھی سچی ہے اور دلیل بھی سچی)، اور ایک سچی بات دوسری سچی بات کی مُخالف نہیں ہو سکتی۔

دوسرے موقع پر صوفیوں کے روحانی طریقے کا ذکر کر کے لکھا ہے:

وَنَحْنُ نَقُولُ: إِنَّ هَذِهِ الطَّرِيقَةَ وَإِنْ
سَلَّمْنَا وَجُودَهَا، فَإِنَّهَا لَيْسَتْ عَامَّةً
لِلنَّاسِ بِمَا هُمْ نَاسٌ، وَلَوْ كَانَتْ هَذِهِ
الطَّرِيقَةُ هِيَ الْمَقْصُودَةُ بِالنَّاسِ،
ہم کہتے ہیں کہ اس طریقے کے وجود سے اگرچہ ہم کو انکار نہیں، مگر اس میں شک نہیں کہ یہ طریقہ لوگوں میں عام نہیں ہو سکتا پس اگر اسی طریقے کا رواج پانا شریعت کا مقصود ہوتا، تو فکر اور استدلال کا وجود

مہ مُجاسّت، ہم نشینی

مہ دیکھو فلسفہ ابن رشد مطبوعہ مصر ص ۱

لَبَطَلَتْ طَرِيقَةَ النَّظَرِ وَلَكَانَ وَجُودَهَا
بِالنَّاسِ عِبْثًا؛ وَالْقُرْآنُ كُلُّهُ إِنَّمَا دُعَاءٌ
إِلَى النَّظَرِ وَالْإِعْتِبَارِ وَتَنْبِيْهِ عَلَى
طُرُقِ النَّظَرِ

بالکل باطل اور عبث قرار پاتا؛ حالاں کہ سارا
قرآن قیاس اور استدلال کی طرف
بلا رہا ہے اور نظر کے طریقوں پر متنبہ
کر رہا ہے۔

ابن تیمیہ | اس کے مقابلے پر علامہ ابن تیمیہ رسالہ الفرقان میں لکھتے ہیں:

فَمَنْ جَرَّبَ مَا يَقُولُونَ (أَيُّ الْأَنْبِيَاءِ)
وَيَقُولُهُ غَيْرُهُمْ، وَجَدَ الصَّوَابَ مَعَهُمْ
وَالْخَطَأَ مَعَ مُخَالَفِهِمْ كَمَا قَالَ
الرَّازِي مَعَ أَنَّهُ مِنْ أَكْثَرِ النَّاسِ
طَعْنًا فِي الْأَدِلَّةِ السَّمْعِيَّةِ حَتَّى
ابْتَدَعَ قَوْلًا مَا عُرِفَ بِهِ قَائِلٌ مَشْهُورٌ
غَيْرُهُ، وَهُوَ أَنَّهَا لَا تُفِيدُ الْيَقِينَ. وَمَعَ
هَذَا، فَإِنَّهُ يَقُولُ: لَقَدْ تَأَمَّلْتُ
الطُّرُقَ الْكَلَامِيَّةَ وَالْمَنَاهِجَ الْفَلَسَفِيَّةَ
فَمَا رَأَيْتُهَا تَشْفِي عَمَلًا وَتَرْوِي غَلِيلًا
وَوَجَدْتُ أَقْرَبَ الطُّرُقِ طَرِيقَةَ
الْقُرْآنِ، أَقْرَأُ فِي الْإِتْبَاتِ: إِلَيْهِ
يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ. الرَّحْمَنُ عَلَى
الْعَرْشِ اسْتَوَى. وَأَقْرَأُ فِي النَّفْيِ: لَيْسَ
كَمِثْلُهُ شَيْءٌ. وَلَا يُحِيطُونَ بِهِ عِلْمًا.
وَمَنْ جَرَّبَ مِثْلَ تَجَرُّبَتِي، عَرَفَ

تو جو شخص انبیاء علیہم السلام کے ارشادات
اور لوگوں کے اقوال کا تجربہ کرے گا، وہ یقیناً
انبیاء کو حق پر اور ان کے مخالفوں کو خطا پائے گا۔
دیکھو، رازی جو سب سے زیادہ سمعی روایات
کو غیر معتبر ٹھہرانے والے ہیں، یہاں تک کہ
انہوں نے ایک ایسی بات کہی، جو ان سے پہلے
کسی نے بھی نہیں کہی تھی۔ یعنی یہ کہ روایات
سے کبھی یقین کا مرتبہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس
رازی کو بھی یہ کہنا پڑا کہ میں نے فلسفہ اور عظیم کلام
کے طریقوں میں بہت تامل کیا، مگر ان کو ہرگز ایسا نہ
پایا جو ایک مریض کو شفا بخشے، یا کسی پیاسے کو
سیراب کر سکیں۔ ہاں، تمام راستوں میں نزدیک تر
راستہ قرآن کا ہے کہ ثبوت کی جانب میں ہم یہ
آیتیں پڑھ لیتے ہیں: إِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ
الرَّحْمَنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوَى. اور نفی میں: لَيْسَ
كَمِثْلُهُ شَيْءٌ اور لَا يُحِيطُونَ بِهِ عِلْمًا اور جو

مَثَلْ مَعْرِفَتِي. وَأَيْضًا فَمَنْ اعْتَبَرَ مَا
عِنْدَ الطَّوَائِفِ الَّذِينَ لَا يَعْتَصِمُونَ
بِتَعْلِيمِ الْأَنْبِيَاءِ وَارْشَادِهِمْ وَأَخْبَارِهِمْ
وَجَدَ هُمْ كُلَّهُمْ حَاضِرِينَ ضَالِّينَ
شَاكِينَ مُرْتَابِينَ أَوْ جَاهِلِينَ
جَهْلًا مُرَكَّبًا. ۴

کوئی مجھ جیسا تجربہ کرے گا، وہ بھی میری
طرح اس بات کو سمجھ لے گا۔ اور نیز جو شخص
اُن لوگوں کے اقوال میں غور کرے گا، جنہوں
نے انبیاء کی تعلیمات اور روایات سے استدلال
نہیں کیا، تو وہ اُن کو تحقیر، شک، گم راہی اور
جہل مرکب میں مبتلا پائے گا۔

محمی الدین ابن العربیؒ | شیخ اکبر محی الدین ابن العربی رحمۃ اللہ علیہ نے جن الفاظ سے
اپنے ایک خط میں امام فخر الدین رازی کو نصیحت فرمائی ہے، وہ اس سے بھی زیادہ صاف
اور کھلے ہوئے الفاظ ہیں۔ وہ امام رازی کی حمیت دینی کا شکریہ ادا کر کے تحریر فرماتے ہیں کہ:
اب عقل مند کے لیے مناسب ہے کہ وہ خدا کے
جود و کرم کی خوش بوؤں سے فائدہ اٹھائے اور
نظرِ استدلال کی قید میں نہ پھنسا رہے کیوں کہ
وہ اس طرح ہمیشہ مشتہ حالت میں رہتا ہے۔
چناں چہ مجھ سے تمہارے ایک دوست نے، جو
مجھ سے ملا اور تمہارے ساتھ حسن عقیدت رکھتا
تھا، یہ بیان کیا کہ اُس نے تم کو ایک روز روتے
ہوئے دیکھا۔ جب اُس نے اور حاضرین نے رونے
کی وجہ دریافت کی، تو تم نے یہ جواب دیا کہ ایک
مسئلہ جس پر تیس برس سے میں اعتقاد جمائے
ہوئے تھا، اسی وقت ایک دلیل سے مجھ کو غلط
ثابت ہوا۔ اس کے بعد مجھ کو کیا اطمینان ہے کہ

فَإِذَنْ يَنْبَغِي لِلْعَاقِلِ أَنْ يَتَعَرَّضَ
بِنَفَحَاتِ الْجُودِ وَلَا يَبْقَى مَاسُورًا فِي
قَيْدِ نَظَرِهِ أَوْ كَسْبِهِ، فَإِنَّهُ عَلَى شُبْهَةٍ
فِي ذَلِكَ، وَلَقَدْ أَخْبَرَنِي مَنْ أَلْفَتْ
بِهِ مِنْ إِخْوَانِكَ مِمَّنْ لَهُ فِيكَ نِيَّةٌ
حَسَنَةٌ، إِنَّهُ رَأَى وَقَدْ بَكَيتَ يَوْمًا،
فَسَأَلَكَ هُوَ وَمَنْ حَضَرَهُ عَنْ بُكَائِكَ
فَقُلْتَ: مَسْئَلَةٌ اعْتَقَدْتُهَا مِنْذُ
ثَلَاثِينَ سَنَةً، فَتَبَيَّنَ لِي السَّاعَةَ بَدِيلٌ
لَا حَاجَ لِي إِلَيْهِ عَلَى خِلَافِ مَا كَانَ
عِنْدِي، فَبَكَيتُ وَقُلْتُ لَعَلَّ
الَّذِي لَا حَاجَ لِي أَيْضًا يَكُونُ

۴ دیکھو رسائل ابن تیمیہ مطبوعہ مصر صفحہ ۱۱

مثلاً الاول :-

جو تحقیق مجھ کو اب ظاہر ہوئی ہے، وہ بھی پہلے کی طرح غلط نہ ہوگی!

یہ خود تمہارا قول ہے اور واقعی وہ شخص جو عقل اور استدلال کے مرتبے سے آگے نہیں بڑھا، نامکن ہے کہ سکون و اطمینان اور راحت حاصل کر لے، بالخصوص خدا تعالیٰ کی معرفت میں۔ تو اے برادر! پھر بھی تم کیوں اس گرداب (فکر و نظر) میں پڑے ہوئے ہو اور کیوں ریاضات، مجاہدات، مکاشفات اور خلوات کا وہ طریقہ اختیار نہیں کرتے، جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشروع کیا ہے؟ اور جس کا نتیجہ یہ ہے کہ تم بھی وہ چیز حاصل کر لو، جو اُس بندے نے کی، جس کی نسبت خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے اُس کو خاص اپنے پاس سے رحمت اور علم عطا کیا۔

مجدد الف ثانی^{۱۲} | حضرت شیخ احمد صاحب سرہندی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ اس مضمون کو ان الفاظ میں ادا کرتے ہیں:

یعنی مقصود یہ ہے کہ لوگ اپنے اعتقادات میں ایسے مضبوط ہوں، اور ایسے یقین اور اطمینان حاصل کریں، جس کو کوئی شک ڈالنے والا زائل نہ کر سکے اور وہ کسی کے شبہات پیدا کرنے سے جاتا نہ رہے؛ کیوں کہ استدلال کے پاؤں لکڑی کے ہوتے ہیں اور

فہذا قولک، ومن المَحال علی الواقف بمرتبة العقل والفکر أن یستریح أو یسکن ولا سیما فی معرفة اللہ تعالیٰ۔ فما بالک یا اخی! تبقی فی هذه الورطة، ولا تدخل طریقَ الرِّیاضات و المَکاشفات والمُجَاهَدات والخلوات التي شَرَعَهَا رَسُولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، فتتال ما نال من قال فیہ اللہ سبحانہ عبدًا من عبادنا اتیناه رحمةً من عندنا وعلمناه من لدنا علماً^{۱۳}

بلکہ مقصود آنست کہ نسبت بہ معتقدات یقینی و اطمینان حاصل کنند کہ ہرگز بہ مشکوک زائل نہ گردند، بہ ایرادِ شبہہ باطل نشود، چہ پای استدلال چوبین است و مُستدل بے تمکین الابد کو

اللہ تطمئن القلوب۔ ۴

مُسَدِّل ذرا سی دیر بھی نہیں ٹھہر سکتا۔ خوب اگلا بھاؤ
کہ اللہ کے ذکر سے ہی دل مطمئن ہوتے ہیں۔

ایک اور موقع پر ارشاد فرماتے ہیں:
وچنانچہ طورِ عقل وراے طورِ جس
است کہ انچہ جس مُدَرک نشود، عقل
ادراکِ آں می نماید، چنانچہ طورِ نبوت و
راے طورِ عقل ست، انچہ بعقل مُدَرک
نشود، بتو سئل نبوت درک می درآید۔ و
ہر کہ وراے طورِ عقل طریقے از براے
معرفت اثبات نمی نماید، فی الحقیقت منکر
طورِ نبوت ست و مُصادِم بداہت بہ
ذرا اور آگے چل کر لکھتے ہیں:

وبالجملہ، طریقِ ریاضت و مجاہدات
در رنگِ طریقِ نظر و استدلال وقتے
اعتبار پیدا کنند کہ مقرون بتصدیقِ انبیا
بود علیہم الصلوٰۃ والتسلیمات یہ

اور حاصل یہ ہے کہ ریاضات اور مجاہدات کا طریقہ بھی
نظر اور استدلال کے رنگ میں، اُس وقت قابل
اعتبار اور اعتماد کے ہے جب کہ اُس کی تصدیقِ انبیا
علیہم الصلوٰۃ والسلام کے ذریعے سے ہو چکی ہو۔

ابن خلدون علامہ ابن خلدون بھی مجتہد صاحب کے پورے ہم زبان ہیں۔ وہ مجتہد
صاحب سے ذرا زیادہ تشریح کے ساتھ اپنے مُقدمہ تاریخ میں تحریر کرتے ہیں:
فَاذْنَمِ ادْرَاكَكَ وَمُدْرَاكَاتِكَ فِی

۴ دیکھو مطبوعاتِ مجتہد صاحب، مطبوعہ دہلی صفحہ ۳۳ جلد ۱-۱۲

۵ دیکھو مکتوباتِ مجتہد صاحب صفحہ ۱۲-۳ جلد ۳-۱۲

۶ دیکھو مکتوباتِ مجتہد صاحب صفحہ ۱۲-۳ جلد ۳-۱۲

الْحَصْرِ، وَاتَّبِعْ مَا أَمَرَكَ الشَّارِعُ بِهِ مِنْ اعْتِقَادِكَ وَعَمَلِكَ، فَهُوَ أَحْرَصُ عَلَى سَعَادَتِكَ وَأَعْلَمُ بِمَا يَنْفَعُكَ، لِأَنَّهُ مِنْ طَوْرِ فَوْقِ إِدْرَاكِكَ وَمِنْ نِطَاقٍ أَوْسَعَ مِنْ نِطَاقِ عَقْلِكَ. وَلَيْسَ ذَلِكَ بِقَادِحٍ فِي الْعَقْلِ وَمَذَارِكِهِ بَلِ الْعَقْلُ مِيزَانٌ صَحِيحٌ، فَلَحْظُهُ يَقِينٌ لَا كِذْبَ فِيهَا. غَيْرَ أَنَّكَ لَا تَطْمَعُ أَنْ تَزِنَ بِهِ أُمُورَ التَّوْحِيدِ وَالْآخِرَةِ وَحَقِيقَةَ النَّبَوَّةِ وَحَقَائِقَ الصِّفَاتِ إِلَهِيَّةِ وَكُلِّ مَا وَرَاءَ طَوْرِهِ، فَإِنَّ ذَلِكَ طَمَعٌ فِي مُحَالٍ. وَمِثَالُ ذَلِكَ مِثَالُ رَجُلٍ رَأَى الْمِيزَانَ الَّذِي يُوزَنُ بِهِ الذَّهَبُ فَيَطْمَعُ أَنْ يَزِنَ بِهِ الْجِبَالَ. هَذَا لَا يُدْرِكُ عَلَى أَنَّ الْمِيزَانَ فِي أَحْكَامِهِ غَيْرُ صَادِقٍ وَلَكِنَّ الْعَقْلَ قَدْ يَقِفُ عِنْدَهُ وَلَا يَتَعَدَّى طَوْرَهُ، حَتَّى يَكُونَ لَهُ أَنْ يُحِيطَ بِاللَّهِ وَبِصِفَاتِهِ، فَإِنَّهُ ذَرَّةٌ مِنْ ذَرَّاتِ الْوُجُودِ الْحَاصِلِ مِنْهُ. وَتَفَقَّنْ

میں خطا دار سمجھو کہ جو ہم جانتے ہیں، تمام موجودات اسی میں منہر ہے) اور شارع علیہ السلام کے بتلاتے ہوئے اعتقادات اور اعمال کا اتباع کرو۔ کیوں کہ وہ تم سے زیادہ تمہارے ہی خواہ اور سود و بہرہ کو سمجھنے والے ہیں۔ اُن کا علم تمہارے علم سے اوپر اور ایسے ذریعے سے حاصل ہونے والے ہیں، جو تمہاری عقل کے دائرے سے وسیع تر ہے۔ باقی ہمارے اس کہنے سے عقل اور اس کی معلومات میں کوئی نقص پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ ہم عقل کو ایک میزانِ صمیم سمجھتے ہیں، جس کے احکام یقینی اور جھوٹے سے پاک ہیں۔ ہاں، یہ میزان اتنی بڑی نہیں ہے کہ تم اس سے توحید و آخرت کے امور اور نبوت و صفاتِ الہیہ وغیرہ کے حقائق کو وزن کرنے لگو۔ یہ تو ایسا ہی ہے، جیسا کہ کوئی شخص ایک سونے کا ترازو کے تولنے کا ارادہ کرنے لگے۔ تو یہ نہ کہا جائے گا کہ ترازو وزن بتلانے کے اعتبار سے درست نہیں ہے، بلکہ یہ کہیں گے کہ ہر ایک میزان کے واسطے ایک حد ہے، جس کے آگے وہ کام نہیں رہ سکتی، اسی طرح میزانِ عقل بھی ایک خاص موقع پر ٹھہر جاتی ہے اور یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ اُس سے آگے بڑھ کر، خدا کی ذات و صفات کا احاطہ کر لے۔ کیوں کہ خود عقل بھی وجود کے اُن ذرات میں کا

فِي هَذَا يَغْلُظُ مَنْ يُقَدِّمُ الْعَقْلَ
عَلَى السَّمْعِ فِي أَمْثَالِ هَذِهِ
الْقَضَايَا، وَقُصُورَ فَهْمِهِ
وَأَضْمَحَلَّاءَ رَأْيِهِ، فَقَدْ تَبَيَّنَ
لَكَ الْحَقُّ مِنْ ذَلِكَ ۖ

دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

وَقَدْ تَنْبَهَ لِذَلِكَ زَعِيمُهُمْ
أَبُو عَلِيٍّ بَنُ سِينَا فَقَالَ فِي
كِتَابِ الْمَبْدَأِ وَالْمَعَادِ: إِنَّا
الْمَعَادَ الرُّوحَانِيَّ وَأَحْوَالَهُ هُوَ
مِمَّا يَتَوَسَّلُ إِلَيْهِ بِالْبَرَاهِينِ
الْعَقْلِيَّةِ وَالْمَقَارِيسِ؛ لِأَنَّهُ عَلَى
نَسَبٍ طَبِيعِيَّةٍ مُحْفُوظَةٍ
وَوَتِيرَةٍ وَاحِدَةٍ، فَلَنَّا فِي الْبَرَاهِينِ
عَلَيْهِ سَعَةٌ. وَأَمَّا الْمَعَادُ الْجِسْمَانِيُّ
وَأَحْوَالُهُ، فَلَا يُمَكِّنُ إِدْرَاكَهُ بِالْبُرْهَانِ
لَأَنَّهُ لَيْسَ عَلَى نَسَبٍ وَاحِدَةٍ. وَقَدْ
بَسَطْتَهُ لَنَا الشَّرِيعَةُ الْحَقَّةُ الْمُحَمَّدِيَّةُ،
فَلْيَنْظُرْ فِيهَا وَلْيَرْجِعْ فِي أَحْوَالِهِ إِلَيْهَا ۖ

ایک ذرہ ہے، جو خدا کی طرف سے فائز
ہوتے ہیں۔ اسی جگہ سے تم ان لوگوں کی غلطی،
کم فہمی اور رے کی کم زوری کو معلوم کرو، جو
عقل کو اس قسم کے معاملات میں سمعیات
پر ترجیح دیتے ہیں۔

اور رئیس الفلاسفہ ابو علی سینا نے بھی اس بات
پر متنبہ ہو کر، کتاب البدو والمعاد میں کہہ دیا
ہے کہ: روح کو عذاب و ثواب ہونے پر تو ہم
دلائل اور قیاسات قائم کر سکتے ہیں کیوں کہ ایسا
ہونا مضبوط قانون طبعی اور ایک خاص طریقے کے
تحت میں داخل ہے، تو اس کے اندر بُرہان سے
ثابت کرنے کی گنجائش نکل سکتی ہے، مگر جسمانی
اعادہ اور جزا سزا کا محض استدلال سے جاننا
ہرگز ممکن نہیں کیوں کہ وہ کسی خاص نسبت اور
قاعدے کے نیچے واقع نہیں ہے۔ لیکن شریعت
محمدیہ حق نے اس کے حالات تفصیل کے ساتھ
بیان کر دیے ہیں، جس کا جی چاہے اس کی طرف
رجوع کر کے دیکھ لے۔

جو معلوم نہ ہو ذریعہ عقل کے بلکہ بہ ذریعہ کشف کے معلوم ہوں، ان کی بابت کہتے ہیں:

۱۲ دیکھو مقدمہ ابن خلدون مطبوعہ مصر صفحہ ۳۸

۱۳ دیکھو مقدمہ ابن خلدون معری صفحہ ۴۵

ثُمَّ إِنَّ هَذَا الْكَشْفَ لَا يَكُونُ صَحِيحًا
كَامِلًا عِنْدَهُمْ إِلَّا إِذَا كَانَ نَاشِئًا
عَنِ الْإِسْتِقَامَةِ لِأَنَّ الْكَشْفَ قَدْ
يَحْصُلُ لِصَاحِبِ الْجُوعِ وَالْخَلْوَةِ
وَمَنْ لَمْ يَكُنْ هُنَاكَ إِسْتِقَامَةً
كَالسَّحَرَةِ وَالتَّصَارُفِ وَغَيْرِهِمْ مِنْ
الْمُرْتَاضِينَ. وَلَيْسَ مُرَادُنَا إِلَّا الْكَشْفُ
النَّاشِئُ عَنِ الْإِسْتِقَامَةِ، وَمِثْلُهُ أَنَّ
الْمَرَأَةَ الصَّقِيلَةَ إِذَا كَانَتْ مُحَدِّبَةً أَوْ
مُقَعَّرَةً وَخَوَذَى بِهَا جَهَةَ الْمَرْتَى، فَإِنَّهُ
يَتَشَكَّلُ فِيهَا مَعُوجًا عَلَى غَيْرِ صُورَتِهِ، وَإِنْ
كَانَتْ مُسَطَّحَةً تَتَشَكَّلُ فِيهَا الْمَرْتَى صَحِيحًا.

پھر یہ کشف بھی صحیح اور کامل اُس وقت تک نہیں
ہوتا، جب تک کہ استقامت (یعنی شریعت کے
احکام پر پورا پورا عمل) نہ ہو، ورنہ یوں تو بہت
سے ریاضت اور خلوت سے صفائی قلب حاصل
کرنے والوں کو بھی کشف ہونے لگتا ہے، جیسا
کہ ساحرین، نصائر اور ریاضت کرنے والے
اور ان دونوں کی مثال ایسی سمجھو کہ ایک
صاف آئینہ تو متحد ب اور مقعر د ادنچا
نیچا ہو، اُس میں کسی چیز کا عکس بھی بڑھا
بڑھ چھا پڑتا ہے، اور ایک آئینہ مسطح د بول
ہو، اس میں شکل بھی سیدھی اور صحیح صحیح
دکھائی دے گی۔

شیخ شہاب الدین سہروردی | حضرت شیخ شہاب الدین صاحب سہروردی رحمۃ اللہ
علیہ تحریر فرماتے ہیں کہ: عقل اور استدلال کے طریقے سے جو علم حاصل ہوتا ہے، وہ ایسا یقینی
نہیں ہوتا جس کا ازالہ نہ ہو سکے۔ ”تو گویا اس میں ایک قسم کا تردد اور اضطراب رہتا ہے
اور صوفیہ کرام کے علوم بالکل قطعی اور یقینی ہوتے ہیں، یعنی ناپائیدار نہیں ہوتے۔ اُن میں اگر
کوئی شک و شبہ پیدا کرنا چاہے، تو ہرگز پیدا نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ وہ تو ایسا ہے کہ گویا
اپنی آنکھوں سے ایک چیز دیکھ لی اور اپنے کانوں سے کوئی بات سُن لی، چنانچہ عوارف
میں لکھتے ہیں:

تو یہ اضطراب اور تردد، جو طبیعتوں میں دیکھتے
ہو، یہ بھی جہل کی ایک قسم ہے۔ اس اعتبار سے

فَمَا اضْطَرَابُ الطَّبَائِعِ إِلَّا ضَرْبٌ مِنَ
الْجَهْلِ، فَكُلُّوْبُ الصُّوفِيَةِ وَاعِيَةٌ

لَا نَهْمَ زَهْدٍ وَفِي الدُّنْيَا بَعْدَ أَنْ
أَحْكَمُوا أُسَاسَ التَّقْوَى، فَبِالتَّقْوَى
زَكَّتْ نَفُوسُهُمْ وَبِالزُّهْدِ
صَفَّتْ قُلُوبُهُمْ، فَلَمَّا عَدَمُوا
شَوَاعِلَ الدُّنْيَا بِتَحْقِيقِ
الزُّهْدِ انْفَتَحَتْ مَسَامٌ بَوَاطِنُهُمْ
وَسَمِعَتْ آذَانَ قُلُوبِهِمْ۔

صوفیوں کے قلوب بہت محفوظ ہوتے ہیں۔ کیونکہ
انہوں نے تقویٰ اور طہارت کی بنیاد کو مضبوط
کر کے، زہد اور ترک دنیا اختیار کیا۔ تو تقویٰ
کی وجہ سے دل صاف ہو گئے۔ اور جب غیبی
مشاغل کو انہوں نے فنا کر دیا، تو اُن کے باطن
کے مسامات کھل گئے اور اُن کے دل کے
کان سننے لگے۔

علامہ الدین طوسی^{۷۲} | متکلمین کی جماعت میں، علامہ علاء الدین علی الطوسی (المستوفی
۷۸۶ھ) نے سلطان محمد فاتح کے حکم سے جو کتاب حکما کے رد میں لکھی ہے، اُس کے
مقدمے میں یہ بتلایا ہے کہ ہماری عقل بہت سی اشیاء کی حقیقت دریافت کرنے سے قاصر
رہتی ہے، بلکہ بڑے بڑے حکما محسوسات کی ماہیت معلوم کرنے سے عاجز ہوتے ہیں؛ تو ہم کو
چند ایسے امور کے تسلیم کرنے میں کوئی عذر نہ ہونا چاہیے جن کی باریکیوں کو اگرچہ ہم نے خود نہیں
سمجھا، مگر خدا کے ایسے سچے رسولوں نے ہم کو خبر دی ہے جن کی صداقت پر سیکڑوں آیات
بیانات گواہی دے رہی ہیں۔

کیا ہماری آنکھوں نے اُن تمام چیزوں کو دیکھ لیا ہے جن کو وہ دیکھ سکتی ہیں؟ یا ہمارے
کانوں نے اُن تمام آوازوں کو سُن لیا ہے جن کو وہ سُن سکتے ہیں؟ یا ہمارے ہاتھوں نے تمام اُن
جیزوں کو چھو لیا ہے جن کو وہ چھو سکتے ہیں؟ یا ہماری زبان نے تمام اُن الفاظ کو ادا کر دیا ہے جن کو
ہم ادا کر سکتے ہیں؟ پھر جب ہمارے ان حواس اور ان قوتوں نے اپنے مقدورات پر
پورا پورا احاطہ نہیں کیا، تو کیا وجہ ہے کہ ہماری عقل قوت کو اپنی ساری معلومات پر کامل
تعمُّر اور قبضہ حاصل ہو جائے! یہاں تک کہ خدا کی ذات و صفات کے مسائل بھی اُس کے
قابو میں آجائیں، اور حقائق اشیاء میں سے کوئی حقیقت ایسی نہ رہے جو اُس کی دست رس سے

اچھوتی ہو!

ہم دیکھتے ہیں کہ پانی، آگ، ہٹی وغیرہ وہ اجسام، جو ہر ذرت ہم کو نظر آتے ہیں، اُن کی حقیقت کے دریافت کرنے میں بڑے بڑے فلاسفر متحیر ہیں۔ افلاطون کہتا ہے کہ یہ بسیط اجسام ہیں اور ارسطو کی جماعت کہتی ہے کہ نہیں، ہٹیوں اور صورت سے مرکب ہیں۔ دیمقراطیس کہتا ہے کہ یہ اجسام ایسے ذرات سے مرکب ہیں، جو نہایت چھوٹے اور نہایت سخت ہونے کی وجہ سے قابل تقسیم نہیں ہیں۔ پھر اجزائے جسم کے متناہی اور غیر متناہی ہونے کی حیثیت سے نظام کچھ کہتا ہے اور متکلمین کچھ۔ اسی طرح عقل اور نفس ناطقہ کے بارے میں ہر ایک کا مذہب جداگانہ ہے، اور ایک جو دلیل قائم کرتا ہے، دوسرا اُس کو رد کر دیتا ہے۔

بہلا وہ نفس، جو ہر وقت ہمارے پاس رہتا ہے اور وہ اجسام، جو شب روز ہمارے استعمال میں آتے ہیں، جب اُن کی حقیقت معلوم کرنے میں اُن اذکیا کا یہ حال ہے، تو غیب کے اسرار اور ملکوت کے دقائق تک اُن کی رسائی کی کیوں کراُمید ہو سکتی ہے؟ سولے اس کے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات و افعال کی صحیح کیفیت کو وہی شخص سمجھے، جس کی تائید خدا کی جانب سے کی گئی ہو یا ایسا شخص اس کی اطلاع کرے، جس کے مبعوث بن اللہ ہونے پر ہزاروں علامات ظاہر ہو چکی ہوں، ورنہ جو احمق نبوت کے انوار سے مستفید ہوئے بغیر محض اپنی عقل پر بھروسہ کر کے الہیات کے گنہ تک پہنچنا چاہے گا، اُس کے ادھام یقیناً اُس کی عقل سے سخت مزاحمت کریں گے اور اُس کو وہی اور عقلی چیزوں کے تمیز دینے میں ایسی دشواری پیش آئے گی، جس کے انسداد کی کوئی تدبیر اُس کے پاس نہ ہوگی۔ ارسطو کا یہ قول نہایت انصاف پر مبنی ہے کہ الہیات کے مسائل میں، دلائل سے یقین کا مرتبہ حاصل نہیں ہو سکتا۔

فلاسفہ کی بے راد روی | باقی جن حکمانے انبیاء کی تقلید چھوڑ کر، ان مسائل میں انہماک پیدا کیا، اُس کی وجہ یہ ہوئی کہ خدا تعالیٰ نے اُن کو فطرتاً ذہین بنایا تھا اور اُن کی عقلوں میں ایک قسم کی تیزی پیدا کی تھی جس کی وجہ سے اُنھوں نے ہندسہ اور حساب وغیرہ علوم میں، ایسا

کامل دست گاہ پیدا کر لی کہ اس اعتبار سے اُن کی جس قدر تعظیم کی جاتی، تھوڑی بقی بسیکن افسوس! اُنھوں نے خدا کے اس انعام کا شکریہ ادا نہیں کیا اور وہ اس کے پورے پورے مصداق بن گئے، ع

اے روشنی طبع! تو برمن بلا شُدی

اُنھوں نے ایسے قی و دق میدان میں قدم رکھنے کی جُرأت کی کہ جو اُن کی فہم و فراست کی سرحد سے بالکل خارج تھا۔ یہاں تک کہ وہ خود بے راہ ہوئے اور اُردوں کو گم راہ کیا۔ اب اُن کے اس حال سے، ہر ایک انسان کو چاہیے کہ عبرت حاصل کرے اور کسی ایسے رسول کے اقوال پر جس کی راست بازی دلیلوں سے ثابت ہو چکی ہو، بے چون و چرا اعتماد کر کے اپنے دل کو ان اضطرابات اور شکوک و اُدہام سے رست گاری دے۔ وَاللّٰهُ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ۔ شاہ ولی اللہ دہلویؒ اب یہاں پہنچ کر، ہم کو چاہیے تھا کہ ہم قلم کی باگ امام غزالی کی تقریر کی طرف پھیر دیتے، جس کا حوالہ ہم بہت دُور سے دیتے چلے آ رہے ہیں، کیوں کہ اس وقت ہم حکما اور متکلمین، صوفیہ اور متورخین، سب کے کلاموں کے انتخاب سے فارغ ہو چکے ہیں اور ہماری تحریروں کے پڑھنے والوں میں جو تحریک اس مسئلے کی بابت ہم پیدا کرنا چاہتے تھے، وہ بھی غالباً پیدا ہو چکی ہے۔ لیکن بڑی کوتاہی ہو گئی، اگر ہم اس موقع پر شاہ ولی اللہ صاحب جیسی یگانہ عصر کو فراموش کر جائیں جن کی نسبت مشہور ہے کہ متاخرین میں اُن سے بڑھ کر کوئی اس مسئلہ (عقل و نقل) کا سمجھنے والا پیدا نہیں ہوا، اور نہ اس اخیر دور میں اُن سے زیادہ کسی نے شریعت کے اسرار اس قدر تفصیل کے ساتھ بیان کیے۔ وہ اپنی مشہور کتاب حُجَّةُ اللہِ الْبَالِغَةِ میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

قد يُظَنُّ أَنَّ الْأَحْكَامَ الشَّرْعِيَّةَ	بکمی یہ خیال کر لیا جاتا ہے کہ شریعت کے احکام
غَيْرُ مُتَضَمِّنَةٍ لَشَيْءٍ مِّنَ	عقلی مصالح پر مشتمل نہیں ہیں، اور نہ اعمال میں
الْمَصَالِحِ وَأَنَّهُ لَيْسَ بَيْنَ الْأَعْمَالِ	اور اُن کی پاداش میں کوئی خاص مُناسبت ملحوظ ہے۔

۱۔ یہ سب تفصیل کتاب الذخیرہ مطبوعہ دائرۃ المعارف ص ۱۰۹ میں مذکور ہے ۱۲

۲۔ سورہ بقرہ۔ آیت ۲۱۳

و بین ما جعلَ اللہُ جزاءً لها
مناسبة، وَأَنَّ مَثَلَ التَّكْلِيفِ
بِالشَّرَائِعِ كَمَثَلِ سَيِّدٍ أَرَادَ أَنْ
يَخْتَبِرَ طَاعَةَ عَبْدِهِ، فَأَمَرَهُ
بِرَفْعِ حَجَرٍ أَوْ لَمَسِ شَجَرَةٍ مِمَّا
لَا فَائِدَةٌ فِيهِ غَيْرَ الْاِخْتِبَارِ
فَلَمَّا أَطَاعَ أَوْ عَصَى جُوزِيَ
بِعَمَلِهِ، وَهَذَا ظَنٌّ فَاسِدٌ
تُكْذِبُهُ السُّنَّةُ وَالْإِجْمَاعُ الْقُرُونِ
الْمَشْهُودُ لَهَا بِالْخَيْرِ

پھر ایک ورق کے بعد یہ بھی لکھتے ہیں:

نعم كما أُوجِبَتِ السُّنَّةُ هَذِهِ
وَانْعَقَدَ عَلَيْهَا الْإِجْمَاعُ فَقَدْ
أُوجِبَتْ أَيْضًا أَنْ نَزُولَ الْقَضَاءُ
بِالْإِجْبَابِ وَالتَّحْرِيمِ سَبَبٌ عَظِيمٌ
فِي نَفْسِهِ، مَعَ قَطْعِ النَّظَرِ عَنْ تِلْكَ
الْمَصَالِحِ، لِإِتَابَةِ الْمُطِيعِ وَعِقَابِ
الْمَعْصِي، وَأَنَّهُ لَيْسَ الْأَمْرُ عَلَى مَا ظَنُّ
مَنْ أَنَّ حُسْنَ الْأَعْمَالِ وَقُبْحُهَا
بِمَعْنَى اسْتِحْقَاقِ الْعَامِلِ الثَّوَابَ وَ
الْعَذَابَ عَقْلِيَّانِ مِنْ كُلِّ وَجْهِ، وَأَنَّ

اور یہ کہ انسان کو خدا کی جانب سے احکام
شرعیہ کا مکلف بنانا، ایسا ہے جیسا کوئی آقا
اپنے غلام کی فرماں برداری کا امتحان کرنا چاہے
اور اُس کو کسی پتھر کے اٹھالانے یا کسی درخت
کے چھونے یا کسی اور ایسے کام کا حکم کرے،
جس میں اُس کی آزمائش کے سوا کوئی فائدہ نہ
ہو، اب اگر اُس غلام نے اطاعت کی یا نہ کی،
تو اُس کو ایسی ہی بدلہ دیا گیا۔ شریعت کی بابت
یہ خیال بالکل فاسد ہے، جس کی تکذیب سنت
رسول اللہ اور قرون اولیٰ کے اجماع نے کی ہے۔

ہاں، جیسا کہ سنت اور اجماع سے یہ ثابت
ہوا، اسی طرح یہ بھی ثابت ہوا ہے کہ خدا
کی طرف سے محض کسی چیز کے وجوب یا حرمت
وغیرہ کے متعلق حکم کا نازل ہونا بھی، مصالح
عقلیہ سے قطع نظر کر کے، نیکوں کو ثواب اور
گنہگاروں کو عذاب دینے کا بڑا سبب ہے۔
اور ایسا نہیں جیسا کہ بعضوں کا گمان ہے کہ
اعمال کا حسن و قبح، یعنی ان کے کرنے نہ کرنے
پر عذاب و ثواب کا استحقاق، محض عقل سے
ثابت ہو سکتا ہو، باقی شریعت کا کام اس طیب

الشرع وظیفته، الإخبار عن
خواص الأعمال على ما هي
عليه دون إنشاء الإيجاب
والتحريم، بمنزلة طبيب يصف خواص
الأدوية وأنواع المرض، فإنته
ظن فاسد تمجده السنة بآدئ الرأي.

کی طرح، جو دواؤں کے خواص اور مرض کے
اقسام کو بیان کرتا ہے، صرف یہ ہو کہ وہ
اعمال کی واقعی خاصیتوں کو ظاہر کرے، نہ یہ کہ
وہ اپنی طرف سے کسی چیز کو واجب یا حرام بنائے۔
اس قسم کے خیالات، بالکل فاسد ہیں، جن سے
کھلے طور پر سنت رسول اللہ نفرت کرتی ہے۔

امام غزالی کی دست گیری | یہ تمام اقوال، جو یہاں نقل کیے گئے، اُن مستند علما کے
اقوال ہیں، جو بہ لحاظ اپنے فضل و کمال کے، اُمتِ محمدیہ کے آفتاب اور ماہِ تاب شمار کیے گئے
ہیں اور جن کی فضیلت، خواہ کسی حیثیت سے ہو، چار دانگ عالم میں تسلیم کی جا چکی ہے لیکن
ان متفرق اقوال اور پراگندہ مضامین سے ایک کم علم آدمی بجائے اس کے کہ کچھ فائدہ اٹھائے،
سخت پریشانی میں پڑ جاتا ہے اور وہ متعین نہیں کر سکتا کہ میں ان میں سے کس بات کو لوں
اور کس کو چھوڑ دوں۔ اسی تذبذب کے عالم میں امام غزالی آتے ہیں، اور احیاء العلوم
وغیرہ کے ذریعے سے اُس کی دست گیری کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ:

”گھبراؤ نہیں! یہ سب باتیں درست ہیں۔ یہ بھی سچ ہے کہ کسی مذہب حق
کے تمام احکام عقل کے مطابق ہیں، اور یہ بھی ایک اعتبار سے صحیح ہے کہ نبوت
اور ولایت کا مرتبہ عقل سے بالاتر ہے، یہ بھی غلط نہیں کہ ہر ایک علم عقل ہی
کے ذریعے سے حاصل ہو سکتا ہے، اور اس کہنے میں بھی کچھ حرج نہیں کہ بعض
علوم عقل کے سوا اور کسی طریقے سے بھی حاصل ہو جاتے ہیں، اس کو بھی ہم
تسلیم کرتے ہیں کہ شریعت کے تمام احکام عقلی مصالح پر مبنی ہیں، اور یہ کہنا
بھی بے جا نہیں کہ محض عقلی مصالح کسی چیز کے فرض کرنے یا حرام کرنے
کے لیے کافی نہیں۔“

ممکن ہے کہ تمہاری کم زور طبیعت ان مُتضاد بیانات کو دیکھ کر گھبرا اٹھے اور تم ان بیچ دار مُتقدّمات کو کوئی منطقی طلسم سمجھنے لگو۔ مگر جو جامع مانع تقریر ہم عن قریب درج کریں گے، اُس کو پڑھ کر تمہاری تسلی ہو جائے گی اور تم یقین کر لو گے کہ ان اقوال میں لفظی نزاع کے سوا، کوئی حقیقی اختلاف سمجھنا ہمارے فہم کی نقصیر ہے۔

تم سب سے پہلے اس پر غور کرو کہ ان کو قدرت نے دوسرے حیوانات سے کون سی امتیازی حالت عطا کی ہے؟ کیا قدرت، ارادہ، خوف، رجاء، شہوت، غضب، یہ صفات جو انسان میں رکھی ہوئی ہیں، اور حیوانات میں نہیں ہیں؟ یا آنکھ، ناک، کان، زبان، دست و پا، جو اعضا انسان کو عنایت کیے گئے ہیں، اور وہ کو نہیں دیے گئے؟ یا حس مشترک، خیال و ہم، حافظہ وغیرہ حواس باطنہ، جو انسان میں ودیعت کیے گئے ہیں، دوسروں کے حصے میں نہیں آئے؟

تم یقیناً کہو گے کہ ان سب چیزوں کے اعتبار سے، انسان کو کوئی فضیلت اور جانوروں پر حاصل نہیں ہے۔ بلکہ بسا اوقات بعض جانوران بعض قوتوں میں انسان سے بڑھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ تو پھر وہ کیا خصوصیت ہے جس کی وجہ سے انسان کی شرافت جانوروں کے مقابلے میں تسلیم کر لی گئی؟ اور وہ کیا علامات ہیں، جو انسان کے روشن چہرے کے امتیازی خطاخال ہیں؟ اس کے جواب میں ہم مجزآن دو چیزوں کے کسی کا نام نہیں لے سکتے، جن کا اختصار علم اور ارادہ کے دو چھوٹے چھوٹے لفظ کرتے ہیں اور جن کی تشریح میں ہم کو اپنے ناظرین کے وقت کا ایک مُعتد بہ حصّہ لینا پڑے گا۔ علم سے ہماری مراد وہ علم ہے کہ جس کی بہ دولت دُنیا اور آخرت کے حالات مُکشف ہوتے ہوں، اور وہ کائنات کے حقائق کو اُن کی اصلی صورت میں ہمارے سامنے پیش کرتا ہو۔ اور ارادہ کے لفظ سے ہم نے اُس ارادہ کا قصد کیا ہے، جو نفسانی خواہش

کے اشارے پر نہیں، بلکہ علم کے اشارے پر چلنے والا ہے۔ کیوں کہ جو ارادہ قوتِ شہوانی کی تحریک سے پیدا ہوتا ہے، وہ تو تمام حیوانات میں موجود ہے۔ ہر جان دار بھوک اور پیاس کے وقت دانہ پانی کی طلب میں دوڑتا ہے، شہوت کے غلبے کے وقت اُس کے فرو کرنے کا ارادہ کرتا ہے، اپنے دشمن کے مقابلے میں پوری طاقت اور زور آزمائی دکھلاتا ہے، تو کیا ان سب حالتوں میں ارادہ نہیں پایا گیا! لیکن ہاں، وہ ارادہ نہیں جو افرادِ انسانی کی خصوصیات میں سے ہے۔ انسان کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ شہوانی میلان کے خلاف بھی اگر اُس کی عقل ہدایت کرے حرکت کر سکتا ہو اور اپنے فعل و ترک میں جی چاہنے نہ چاہنے کا پابند نہ ہو۔

یہ ارادہ اور وہ علم جس کا ذکر پہلے ہوا، بزرگ ترین مخلوقات یعنی انسان کے ساتھ مختص ہیں اور انھی دونوں میں سے، انسان حیوانات سے اور بڑا آدمی بچوں سے بہ اعتبار اپنے کمال کے پہچانا جاتا ہے۔ بچہ جب اپنی پیدائش کے مدارج طے کرتا ہو رحمِ مادر سے باہر آتا ہے، تو وہ نہ بھلے بُرے، نیک بد اور نافع مضر کی تمیز رکھتا ہے اور نہ اُس کا کوئی ارادہ کسی قانونِ عقل کا تابع ہوتا ہے۔ اور جوں جوں اُس کے قوا میں نشو و نما، اُس کے علم میں ترقی، اُس کی معلومات میں وسعت پیدا ہوتی جاتی ہے، اُسی قدر اُس کے افعال و اعمال فہم و دانش کے قاعدوں میں منضبط ہوتے جاتے ہیں۔

اب اگر اُس کا علم سچا ہے اور اس کی عقل نے جو فتوے نافذ کیے ہیں وہ صحیح ہیں، تو اُس کے سب عمل درست ہو سکتے ہیں، اور اگر اس کی عقل نے لغزش کھائی، نافع کو مضر، مضر کو نافع، یا نیک کو بد، بد کو نیک سمجھ لیا، تو ہرگز توقع نہیں کہ وہ اپنی حرکات و سکنات میں گنجِ ردی و غلطی سے محفوظ رہے۔ اس صورت میں ہر انسان پر واجب ہے کہ وہ صحیح علم کے حاصل ہونے کے ذرائع سوچے اور تازہ رست اپنے اندر اُن کے پیدا کرنے کی کوشش کرے۔

لیکن جس حد تک غور کیا گیا، علم کی حقیقت اس سے زیادہ معلوم نہیں ہوئی کہ کسی چیز کا نقشہ ایسی طرح ہماری عقل میں کھینچ جائے، جیسا کہ آئینے میں کسی شے کی تصویر نظر آنے لگتی ہے۔ دیکھو، اگر کوئی شخص ہماری نظر سے گزرا، یا ایک شان دار مکان ہم نے کسی جگہ دیکھا اور کچھ دیر کے بعد ہماری آنکھوں سے اوجھل ہو گیا، تو پھر جب کبھی اُس شخص یا اُس مکان کو دیکھتے ہیں، فوراً شناخت کر لیتے ہیں کہ یہ وہی شخص اور وہی مکان ہے۔ اگر ہمارے پاس کوئی ایسا نقشہ جو اُس مکان یا اُس شخص پر پورا پورا منطبق ہو، موجود نہ ہوتا، تو وہ اور کون سا معیار تھا جس کے ذریعے سے اسی مدت کے بعد ہم کو یہ شناخت ہو گئی !

اس سے صاف طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ آدمی کا ذہن (عقل) مثل ایک آئینہ کے ہے، اور اس میں جو معلومات حاصل ہوتی ہیں، وہ اُس عکس کے مانند ہیں جو کسی شے کے محاذات کے وقت آئینے میں دکھائی دیتا ہے۔ اتنا فرق ہے کہ آئینے میں صرف اُن اشیاء کا عکس پڑتا ہے، جو آنکھوں سے نظر آنے کے قابل ہوں، اور ذہن میں ہر قسم کی چیزیں منقش ہو جاتی ہیں مثلاً کسی اسپیکر کی ایک لمبی چوڑی تقریر تم نے سنی اور اُس کے مضامین کا خلاصہ تم نے اپنے ذہن میں ملحوظ رکھا، تو اب جب کبھی کوئی شخص وہ تقریر کرے گا تم فوراً سمجھ جاؤ گے کہ یہ بعینہ وہ مضامین ہیں، جو فلاں اسپیکر نے بیان کیے تھے۔ اگر اُن مضامین کا کوئی فوٹو تمہارے پاس نہیں تھا، تو تم نے یہ کیسے جانا کہ وہ اور یہ تقریر ایک ہی ہیں ! اس سے بدیہی طور پر معلوم ہوا کہ ہمارے ذہن میں اُن مضامین کا کوئی خا کا موجود تھا، حالانکہ ابھی مضامین کا عکس اگر ہم آئینے میں لینا چاہیں، تو بالکل ناممکن ہے !

غرض، آئینے میں اور ذہن میں اتنا تفاوت ہے کہ ایک میں مخصوص چیزوں کا عکس آتا ہے اور دوسرے میں ہر چیز کا؛ مگر دونوں میں اس قدر اشتراک ہے کہ اُس میں بھی کسی چیز کی تصویر حاصل ہوتی ہے اور اس میں بھی۔ اب اگر کوئی چیز آئینے میں منعکس ہونے کے قابل ہو، لیکن منعکس نہ ہو، تو جہاں تک تتبع اور استقرار سے معلوم ہوا، اس کے پانچ وجوہات ہو سکتے ہیں:

یہ کہ وہ جوہر (لوہا) جس سے آئینہ بنتا ہے، اُس نے ابھی تک صیقل ہو کر آئینے کی صورت اختیار نہیں کی؛ یا آئینہ بن چکا، مگر رنگ آلود ہو گیا؛ یا صاف و شفاف ہے، مگر جس چیز کا عکس اُس میں لینا چاہتے ہو، وہ اُس کے مقابل نہیں؛ یا مقابل ہے بھی، مگر آئینے کے اور اُس شے کے بیچ میں کوئی دوسری شے حائل ہے؛ یا عکس لینے والے کو یہ معلوم نہیں کہ اس صورت کا عکس کس جہت میں ہو کر لیا جاسکتا ہے۔ ان سب حالتوں میں اشیائے مطلوبہ کا عکس آئینے میں نہیں آ سکتا۔ اور اگر ان موانع میں سے کوئی مانع موجود نہ ہو، تو پھر محال ہے کہ محسوسات کی صورت اُس میں ظاہر نہ ہو۔

تھیک اسی طرح انسان کے قلب (عقل) کی حالت ہے۔ کبھی تو اب ہو گا کہ خود قلب ابھی ناقص ہے اور انعکاس کی پوری قابلیت اُس میں پیدا نہیں ہوئی، جیسا کہ شیر خوار بچے کا قلب، کہ وہ معقولات کے علم سے بالکل خالی ہوتا ہے؛ اور کبھی معاصی اور ناپاک افعال کے ارتکاب سے قلب پر ایک قسم کی کدورت اور ظلمت چھا جاتی ہے، جس کی وجہ سے اُس کی پوری جلا اور صفائی باقی نہیں رہتی، اس لیے اُس میں لطیف اور باریک چیزوں کا انعکاس نہیں ہوتا، اور خدا کی ذات و صفات اور غیب کے اسرار سے یہ قلب بالکل عاری رہتا ہے۔ اس قلب کے رنگ چھڑانے کی،

اس کے سوا کوئی تدبیر نہیں کہ وہ ہمہ تن خدا کی اطاعت کی طرف توجہ اور مشتغاف
شہوات سے پورا پورا اعراض کرے، اور مجاہدات کا وہ طریقہ اختیار کرے،
جو اس فن کے تجربہ کاروں نے، ناجائز خواہشات کے استیصال کے واسطے
تلقین کیا ہے۔ وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا اور
مَنْ عَمِلَ بِمَا عَلَّمْ وَرَّثَهُ اللَّهُ عِلْمَ مَا لَمْ يَعْلَمْ میں اسی راز کی طرف
اشارہ ہے۔

لیکن کبھی آدمی کا قلب، گناہوں کی آلائشوں سے پاک و صاف ہوتا ہے
اور پھر بھی اُس میں علوم ذات و صفات اور حقائق اشیاء مرئسم نہیں ہوتیں۔
اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اس کی توجہ ان چیزوں کی طرف کابل نہیں ہوتی،
بلکہ وہ آفات نفس کے جانتے یا طُرُقِ معاش کے بُہتا کرنے میں مثلاً مصروف
ہوتا ہے۔ تو وہ چیزیں، جن کی طرف اُس کے قلب کو توجہ نہیں ہے، اسی طرح
مُنعکس نہیں ہو سکتیں جس طرح آئینے میں وہ صورتیں، جو اُس کے محاذی نہ ہوں
ہاں، قلب کبھی صاف بھی ہوتا ہے اور توجہ بھی کامل ہے، مگر وہ فاسد
عقائد، جو تقلید یا حُسنِ ظن کی بنا پر دل میں پہلے سے راسخ ہیں۔ حقائق کے
انعکاس کے لیے حجاب بن جاتے ہیں۔ اور جیسا کہ آئینہ اور شے مطلوب کے
درمیان اگر کوئی شے حائل ہو جائے، تو اُس کا عکس اس میں نہیں پڑتا؛ ایسے
ہی حجاب کے وقت ہماری عقل حقیقی علوم کے حاصل کرنے سے قاصر رہتی ہے۔
اور کبھی علم کے یہ تمام سامان جمع ہوتے ہیں، مگر جن حاصل شدہ علوم پر
یہ علم مُتفرع ہوتا ہے، اُن میں مناسب ترتیب قائم کرنی ہم کو نہیں آتی، اس لیے
ہم علم سے محروم رہتے ہیں۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ایک شخص اپنی گدی کے
پچھے کا حال آئینے میں دیکھنا چاہے۔ اب اگر وہ آئینے کو آنکھوں کے سامنے

رکھتا ہے، تو پیچھے کا حال اس میں کھل نہیں سکتا، اور اگر پیچھے لے جاتا ہے، تو گواہِ انعکاس ہو جاتا ہے، مگر آنکھیں اُس عکس کو دیکھ نہیں سکتیں۔ اُس وقت یہ شخص، باوجود تمام اسباب مہیا ہو جانے کے، عکس کے دیکھنے سے اس لیے محروم ہے کہ اس کو اُس عکس کے لینے کا طریقہ معلوم نہیں۔ اگر کوئی اس کو یہ بتا دے کہ ایک آئینہ پیچھے لے جاؤ اور ایک آئینہ اس آئینے کے محاذات میں اس طرح سامنے رکھو کہ جو عکس اس آئینے میں پڑے، اُسی عکس کا پر تو دوسرے آئینے میں بھی آجائے، تو اس طریقے کے معلوم ہونے سے اُس کی ساری مشکل حل ہو جائے گی، اور جو وقتیں اس عکس کے لینے میں وہ اٹھا رہا تھا، وہ یک نخت جاتی رہیں گی۔

یہی حال بعینہٴ انسان کے قلب کا سمجھو اور یقین کر لو کہ یہی اُمور ہیں، جو اکثر حقائق کی معرفت سے ہم کو بے بہرہ رکھتے ہیں۔ اگر یہ موانع نہ ہوں، تو بے شک ہر قلب، اُس فیضِ علم کے حاصل کر لینے کی پوری قابلیت رکھتا ہے، جو فیاضِ ازل کی طرف سے بغیر کسی بخل کے ہر وقت اور ہر آن جاری ہے۔

تو جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ سچے مذہب کے احکام عقل کے مطابق ہوتے ہیں، اُن کا یہ قول اس اعتبار سے بالکل صحیح ہے کہ ایک کامل اور صاف و شفاف عقل جس میں حقائق کے انعکاس کی سب شرائط موجود ہوں، ہرگز خدا کے حکم کے خلاف حکم نافذ نہیں کر سکتی۔ اور جنہوں نے یہ کہا ہے کہ احکامِ خداوندی کو اپنی عقل کی میزان میں نہ تولو، اُن کی غرض یہ ہے کہ ہماری زندگی آلود عقلوں میں خدائی اُسرار کا انعکاس نہیں ہو سکتا۔

اسی طرح جس فرق کا یہ خیال ہے کہ حقائقِ نبوت اور حقائقِ صفاتِ الہیہ ہماری فہم و ادراک سے بالاتر ہیں، وہ عام فہم اور ادراک کے لحاظ سے بالکل سچ کہتے ہیں۔ اور جس شخص کا یہ قول ہے کہ نہیں، یہ چیزیں بھی بہ ذریعہٴ عقلِ انسانی کے دریافت ہو سکتی ہیں، تو اُس کا مدعا بھی غلط نہیں ہے۔ وہ بجا طور پر عقلِ انسانی اُسی کو قرار دیتا ہے، جس میں نفسانی کہ درتیں اور آلائشیں نہ ہوں۔

عرض، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد کہ لوگ درجاتِ عقل کے موافق جنت میں جائیں گے، اس پر محمول ہے کہ حقیقی عقل کو جس قدر ترقی ہوگی، جنت کے دروازوں سے قُرب ہوتا جائے گا۔ اور یہ مقولہ کہ اکثر اہل جنت بے عقل ہوں گے، اس میں وہ لوگ مُراد ہیں جو دنیا کے کاموں میں مُتوجہ نہ ہونے کی وجہ سے اہلہ سمجھے جاتے ہیں، اور علیکم بدین العجائز کا خطاب بھی اُنھی سے ہے، جن کے دماغ دقیق اُسرار کے متحمل نہیں ہو سکتے۔

اب تم پھر ایک دفعہ ان مُتعارض اُقوال کو یاد کرو، جن کے سُلجھانے میں تم سخت پریشان تھے اور جن کی کوئی درست توجیہ تم سے نہ بن پڑتی تھی۔ اور اخیر میں امام صاحب کی اس زیریں نصیحت کو خوب یاد رکھو کہ:

ہ عقل کو نقل سے استغنا اور نہ نقل عقل سے بے نیاز ہے۔ جیسا کہ عقل کو معزل کر کے محض تقلید کی طرف بُلانے والا جاہل ہے، اسی طرح وہ شخص بھی دھوکے میں ہے، جو قرآن و سنت کے انوار سے علاحدہ ہو کر صرف اپنی عقل پر بھروسہ کرے۔ تو تم کو ان دونوں گروہوں میں سے کسی میں بھی داخل نہ ہونا چاہیے، بلکہ عقل و نقل کا جامع بننا چاہیے۔ کیوں کہ معلوم عقلیہ عقل کی غذا اور اور معلوم شرعیہ اس کی دوا ہیں، اور جو مریض دوا کا استعمال نہ کرے، اُس کو بخدا کے استعمال سے نقصان پہنچ جاتا ہے یہی حالت دل کے امراض کی ہے کہ اُن کا علاج شرعی دواؤں سے، یعنی اُن عبادات اور اُعمال سے ہی ہو سکتا ہے، جن کو انبیاء علیہم السلام نے اس کام کے لیے ترکیب دیا ہے۔ پس جس کا دل بیمار

فلا غنى بالعقل عن السماع، ولا غنى بالسماع عن العقل، فالذاعى الى محض التقليد مع عزل العقل بالكلية جاهل، والمكتفى بمجرد العقل عن أنوار القرآن والسنة مغرور، فيأياك أن تكون من الفريقين وكن جامعاً بين الأصلين، فإن العلوم العقلية كالأغذية والعلوم الشرعية كالأدوية، والشخص المريض يستضر بالغذاء متى فاتته الدواء، فكذلك أمراض القلوب لا يمكن علاجها إلا بالأدوية المستفادة من الشريعة وهي وظائف العبادات والأعمال التي ركبها

ہو اور وہ طب شرعی کے بہ موجب اُس کا معالجہ بھی نہ کرے اور علوم عقلیہ کو اپنے حق میں کافی سمجھے وہ اسی طرح ہلاک ہو گا جس طرح بیمار آدمی غذا سے ہلاک ہو جاتا ہے۔ باقی جو لوگ سچے علوم عقلیہ کو علوم شرعیہ کے خلاف تصور کرتے ہیں اور دونوں میں تطبیق کو محال سمجھتے ہیں، یہ اُن کا خیال اس وجہ سے ہے کہ اُن کی بصیرت کی آنکھیں اندھی ہیں، (خدا کی پناہ

الأنبياء صلوات الله عليهم لإصلاح القلوب، فمن لا يدأوى قلبه المريض بمعالجات العبادۃ الشرعية واكتفى بالعلوم العقلية استضرَّ كما يستضرُّ المريض بالغذاء، وظنَّ من يظنُّ أنَّ العلوم العقلية مناقضة للعلوم الشرعية وأنَّ الجمع بينهما غير ممكن، ظنَّ صادراً عن عي في عين البصيرة۔ نعوذُ بالله منه۔

امام غزالی کی مذکورہ تقریر اور چند شبہات یہاں تک ہم نے امام غزالی کی تقریر کا حاصل نقل کر دیا ہے۔ امام صاحب کی تقریر اگرچہ نہایت صاف، نہایت سلیس، نہایت عام فہم اور نہایت پُر اسرار ہے؛ لیکن اس میں چند ایسے اقناعی مقدمات بھی ہیں، جن کا انکار کر دینا ہمارے ایک بے باک حریف سے کچھ مستبعد نہیں ہے۔

ہم امام صاحب کے اس قابل قدر بیان کی بہت کچھ عزت کر سکتے ہیں، لیکن ہمارا ظاہر پرست اور آزاد منش مقابل، اس پر یہ نکتہ چینی کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اگر ہم ذہن میں صورتوں کا انعکاس تسلیم کر لیں، تو جو شرائط آئینے میں انعکاس کے واسطے قرار دی گئی ہیں، اُن سب کا ذہن میں پایا جانا کیوں ضروری ہے؟ یہ ہم نے مانا کہ ذہن میں اور آئینے میں ایک حد تک مشابہت پائی جاتی ہے، مگر ان دونوں میں تفاوت بھی بے انتہا ہے، جس کا اعتراف تم بھی پہلے کر چکے ہو۔ اب اگر اس تفاوت کی بنا پر، بعض وہ شرطیں جو آئینے میں ضروری ہیں، حصول علم میں ضروری نہ ہوں یا اس کے برعکس، تو کیا مضائقہ ہے؟

اس کے سوا یہ بھی ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ اعمال بد کی مباشرت یا گناہوں کے ارتکاب سے قلب پر کسی قسم کی تاریکی آجاتی ہے۔ اول تو ہم اعمال کی تقسیم نیک و بد کی طرف تسلیم ہی نہیں کرتے۔ دوسرے، معاصی میں ملوث ہونا بے شک قوت عملیہ کے سست یا فاسد ہونے کا نتیجہ ہے، لیکن قوت عملیہ کا اس اثر بد سے متاثر ہونا بہ ظاہر

کوئی معنی نہیں رکھتا۔ نیز بقول قاضی ابن رشد اندلسی کے، قرآن پاک نے جاہ جاقیاس اور نظر کے طریقوں پر متنبہ کیا ہے اور خود بھی مختلف مواقع میں استدلال سے کام لیا ہے۔ پس اگر شریعت کے احکام عقول عامہ سے بالاتر تھے، تو قرآن نے ہم سب کو عقل سے کام لینے اور غور کرنے کی طرف کیوں توجہ دلائی؟ اور بہ قول سرسید کے، ہر انسان کو ایسے احکام کا مُکلف بنانا کیوں کر صحیح ہو، جو اُس کی سمجھ سے باہر تھے؟ حالاں کہ انسان اپنے ذی عقل ہونے کی وجہ سے ہی تکلیف شرعی کا مستحق ہوا ہے!

حضرت نانوتوی کی مشکل کشائی | یہ اور اسی قسم کے اور شبہات ہیں، جن کو سن کر ہم صرف اتنا ہی کہنا چاہتے ہیں کہ (شعر):

چوں بشنوی سخن اہل دل گو کہ خطاست
سخن شناس نئی دبر خطایں جاست

اور بہ پاس خاطر معترض، امام صاحب کے جادۂ اعتدال سے ہٹ کر یا آگے بڑھ کر، اُس زبردست فاضل کی تقریر کی طرف رجوع کرتے ہیں، جس کی تصنیفات میں جتنا غور کرو، و تنہا ہی اُس کی وہی دانش مندی اور صادق البیانی کا اعتراف لازم ہے۔ یہ وہ فاضل ہے کہ جس کو اگر ہم اپنے عہد کا شیخ اکبر، امام غزالی اور شاہ ولی اللہ سب کچھ کہ دیں تو بے جا نہیں۔ اور یہی وہ فاضل ہے، جس نے علم کلام کی ایک ایسے انوکھے طرز میں بنا ڈالی، جو (ان شاء اللہ) قیامت تک کے واسطے پتھر کی لکیر ہے، اور جس پر ہمارا ناز کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔ اس فاضل نے جس کو عام طور پر مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے، اپنی مختلف کتابوں میں جو مفید بیانات درج کیے ہیں، وہ اس مسئلہ عقل نقل میں ہماری بہت زیادہ مشکل کشائی کرتے ہیں۔ اور اب ہم ذیل میں جو کچھ لکھیں گے، وہ تمام تراہنی تصانیف سے ماخوذ ہوگا۔ (شعر)

مطرب ترانہ دگر از پردہ ساز کن

زیرا کہ حرف عشق نمی دارد انتہا

کائنات کا کوئی جزو بے مقصد نہیں | صحیفہ عالم کا وسیع مطالعہ کرنے سے، یہ بات بخوبی

روشن ہو چکی ہے کہ رہ قول طبعیین کے فطرت نے اور بہ خیال اہل مذاہب کے (دُنیا کی کوئی چیز بے کار نہیں بنائی، اور جوں جوں تحقیقات کا دائرہ وسیع ہوتا جاتا ہے، دُوں دُوں ہر ایک چھوٹی بڑی چیز کے منافع ہم پر ظاہر ہوتے جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے کائنات کا ہر جزو بیش قیمت حکمتوں کا مجموعہ ہے۔

لیکن اس کے ساتھ ہی، ہر شے کا تعلق کسی نہ کسی ایسی ایک یا چند اغراض سے بھی ہوتا ہے، جن کی کمی زیادتی پر اُس شے کا کال اور نقصان منحصر ہے اور جن کو ہم اُس شے کے اصلی اغراض کہہ سکتے ہیں۔ مثلاً حیوانات میں گھوڑے کی مدح و ذم اور اس کا محسن و قبیح رفتار پر موقوف ہے، اگرچہ وہ گدھے کی طرح پالان بھی اٹھا سکتا ہے، اور گائے بکری کی طرح اُس کو ذبح کر کے کھا بھی سکتے ہیں اور اُس کا دودھ بھی پی سکتے ہیں، لیکن یہ اُس کے دودھ کی افراط، یا بدن کی فرہی، یا بار برداری کی طاقت، اُس کی قدر و قیمت میں اسی طرح کچھ زیادہ دخل نہیں جس طرح گائے اور بھینس میں چون کہ مقصودِ اعظم دودھ بھی وغیرہ ہے، اس لیے اُن کی تیز رفتاری اور قدم بازی کا کوئی اثر اُن کی بھلائی بُرائی پر نہیں پڑتا۔

یا گلاب کے پھول کی حسن و خوبی اُس کے رنگ و خوش بو سے ہے، ذائقے سے کچھ بھی غرض نہیں ہوتی، یا آئینے کے ذائقے سے سروکار ہے، اس کے رنگ اور خوش بو سے چنداں تعرض نہیں کیا جاتا، ایسے ہی کتاب سے اگرچہ ہم کسی وقت نیکیے کا کام لے سکتے ہیں، لیکن غرض اصلی اُس سے پڑھنا ہی ہوتا ہے، یا ضرورت کے وقت کپڑوں کو جلا کر کھانا پکا سکتے ہیں، مگر اہم مقصد ان سے یہی ہے کہ وہ آدمی کے بدن کی پردہ پوشی اور زینت کا سبب بنیں۔

تخلیق انسان کا مقصد | غرض تمام عالم کے اجزا پر نظر ڈالی جائے، ہر موقع پر یہی شان نظر آئے گی۔ پھر ناممکن ہے کہ انسان جو ہمیشہ اپنے اشرف المخلوقات ہونے کا دعوٰی کرتا ہے، کسی ایسی غرض اعلیٰ اور مطلب اعظم سے خالی ہو جس کے ہونے نہ ہونے پر اُس کی بھلائی

برائی موقوف ہو اور جس کے ذریعے سے وہ مدح و ستائش یا ہجو و مذمت کا مستحق سمجھا جائے۔ بے شک اس مقصدِ اعظم کے متعین کرنے میں ہم کو سخت دشواری پیش آئے گی، لیکن ہم اس عقدے کو خود اعضاءِ انسان کی بناوٹ اور اُس کے قوا کی ترکیب سے حاصل کریں گے، اور ہم یقین کرتے ہیں کہ خود انسان زبانِ حال سے اس مقصد کی جستجو میں ہماری رہنمائی کرے گا۔

انسان کے پانچ ترکیبی عناصر | ہم جب اس معجونِ مرکب (انسان) کی اندرونی و بیرونی حالتوں پر غور کرتے ہیں، تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان پانچ چیزوں سے اُس کی ترکیب عمل میں آئی ہے: عقل یعنی قوتِ علمیہ، شوق یا خوف، ارادہ اور اختیار، قدرت اور طاقت، ہاتھ پاؤں آنکھ ناک وغیرہ اعضاءِ جسمانی، چُناں چہ جس قدر کام انسان کرتا ہے، اُن میں یہ پانچوں آلات اپنا اپنا عمل کرتے ہیں۔

فرض کرو کہ ایک شخص شب کے وقت ایک جنگل میں چلا جا رہا ہے۔ اُس نے دُور سے اپنے راستے پر کسی جانور کو دیکھا، جس کی نسبت کبھی تو اُس کا خیال ہوتا ہے کہ یہ شیر ہے اور کبھی سمجھتا ہے کہ کوئی بیل کھڑا ہے۔ اب فطرتاً انسان کا پہلا کام یہ ہے کہ وہ اپنے نفع اور ضرر کے پہلوؤں کو سوچے۔ اگر اُس پر ضرر کا پہلو متعین ہو گیا، یعنی یہ کہ پھاڑ کھانے والا شیر ہے، تو طبعاً اُس پر ایک قسم کے خوف یا اجتناب کی کیفیت طاری ہوگی اور اس کی وجہ سے وہاں سے بھاگنے کا ارادہ کرے گا، اور اس ارادے سے اُس کی قدرت اور طاقت تحریک میں آئے گی۔ اور اگر اعضاءِ جسمانی قابو میں ہوئے، تو اُسے پاؤں وہاں سے بھاگنا شروع کر دے گا۔ اور اگر یہ شخص اُس جانور کو شیر نہ سمجھتا، یا شیر سمجھ کر ایذا پہنچانے والی چیز نہ تصور کرتا، تو برابر اپنے شوق میں اُدھر بڑھا چلا جاتا۔

قوتِ عملیہ قوتِ عقلیہ کی محکوم ہے | اس سے یہ امر بدیہی طور پر ثابت ہوا کہ شوق اور خوف، ارادہ اور اختیار، طاقت اور قدرت اور ہاتھ پاؤں وغیرہ (جن کے مجموعے کو ہم قوتِ عملیہ سے تعبیر کرتے ہیں)؛ سب کے سب عقل یعنی قوتِ علمیہ کے محکوم اور زیرِ فرمان ہیں۔ اور جب عقل مفرد (قوتِ علمیہ) کا کام نافع و مضر کی شناخت، نیک و بد کی تمیز، اور قوتِ عملیہ کا کام

حسب اشارہ عقل کسی عمل کا وجود میں لانا ٹھہرا، تو اول کی حکومت اور دوسرے کی محکومی کے لحاظ سے، ان دونوں کے مجموعہ یعنی انسان کا کل کام یہ ہوا کہ وہ سوچ سمجھ کر مفید مشاغل میں پڑے اور مضر کاموں سے بچے۔ اور یہ اُسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ دنیا میں اعمال کی تقسیم نیک و بد یا نافع و مضر کی طرف ہو سکتی ہو۔ کیوں کہ اگر عملی دنیا سے بھلے بُرے کا فرق بالکل اٹھا دیا جائے، تو قوتِ علیہ کے کارناموں کے لیے کوئی میدان ہاتھ نہ آئے گا، جیسا کہ ہم ابھی بتلا چکے ہیں کہ قوتِ علیہ صرف یہی کام کر سکتی ہے کہ مفید اور بہتر کاموں کا ناقص اور مضر کاموں سے انتخاب کرتی رہے۔ اور قوتِ علیہ کی اس کارگزاری کے لیے دو قسم کے اعمال کا اُس کے سامنے پیش ہونا ضروری ہے۔

اعمال کی تقسیم نیک و بد | اب چوں کہ یہ ثابت ہو گیا کہ اعمال کی دو قسمیں کیے بغیر انسان کی خلقت ہی بے کار رہتی ہے، تو اس کا بھی سراغ نکل آیا کہ تمام عالم ہمیشہ سے اس پر متفق کیوں ہے کہ اعمال دو طرح کے ہوتے ہیں: نیک اور بد؛ یا دوسرے الفاظ میں: نافع اور مضر یہاں تک کہ جو لمجہ کسی مذہب کے قائل نہیں، وہ بھی افعال و اعمال کی اس بدیہی تفریق کو تسلیم کرتے ہیں۔

اب جو کچھ گفتگو باقی ہے، وہ صرف اس میں ہے کہ اعمال میں نیک و بد اور نافع و مضر کی تعیین کس طور پر کی جائے۔ یعنی یہ کس طرح معلوم ہو کہ یہ فعل اچھا ہے یا بُرا، اس سے راحت پہنچے گی اُس سے تکلیف؛ لیکن خوش قسمتی سے جو تقریر مرقوم ہوئی، اُس سے اس سوال کا جواب بھی کافی حد تک نکل آیا۔ کیوں کہ جب عقل یا قوتِ علیہ اس لیے پیدا ہوئی ہے کہ وہ بھلے اور بُرے یا مفید اور مضر اعمال میں امتیاز قائم کرے، تو یقیناً قدرت نے اُس میں اس امتیازِ صحیح کا ملکہ ودیعت کیا ہوگا۔ اس وجہ سے یہی رائے مضبوط معلوم ہوتی ہے کہ عقل سلیم جس کام کا حکم کرے، وہ نافع ہو اور جس سے وہ انکار کرے یا گریز، اُس میں کوئی مضرت ہو۔

دینِ برحق اور عقل سلیم میں موافقت ضروری ہے | یہاں سے اس کی بھی قوی اُمید ہوتی ہے کہ اگر خدا کی جانب سے بندوں کی ہدایت کے لیے کچھ احکام نازل ہوں (جن کے مجموعہ کو مذہب کہتے ہیں)، تو وہ بھی موبہ و مُعقل کے موافق ہوں، ورنہ خدا سے برتر کی دانائی اور متانت پر یہ

الزام عائد ہوگا کہ اُس نے عقل کو بھی ہمارے قوا پر حکومت عطا کی، تاکہ وہ سب اُس کے اشاروں پر کام کریں، اور رسول کو بھی حاکم بنا کر بھیجا، تاکہ اُس کی اطاعت کی جائے۔ اور ساتھ ہی دونوں کو متضاد بلکہ متناقض احکام بھی دے دیے، جن میں سے ایک کو قبول کرتے ہیں تو لازمی طور پر دوسرے سے سرتابی کرنی پڑتی ہے۔

غرض، اب نہایت باوثوق طریقے سے یہ طے ہو گیا کہ سچا مذہب وہی ہے، جو عقل سلیم کے مطابق ہو۔ اور یہ قول قاضی ابن رشد کے، ہر اس شخص کو جس کے پاس عقل سلیم موجود ہے، اپنی عقل سے کام لینا اور نظر و فکر کے صحیح طریقوں سے غور کرنا چاہیے۔

اور بے شک تمام قرآن اور تمام احادیث کا یہی منشا ہے کہ وہ عقل کے دستور العمل کے موافق تعلیم دیں، اور ہر انسان کی عقل، جب تک کہ وہ، گرد و پیش کے خیالات سے متاثر نہ ہو اور جب تک کہ عقلی صحت کا زائل کر دینے والا کوئی مرض اُس کو لاحق نہ ہو، اُنھی سچے اعمال کی ہدایت کرے گی جن کے رواج دینے کے واسطے خدا کے صادق القول پیغمبر مبعوث ہوئے ہیں۔ سلیم اور غیر سلیم عقل کی بحث | لیکن ان تمام مراحل کے بعد بھی ہم کو جس مرحلے کا طے کرنا ہنوز باقی ہے، وہ یہ ہے کہ عقل کے ساتھ سلیم کی قید بڑھانے سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ بعض عقلیں غیر سلیم بھی ہوتی ہیں۔ اور جب سلیم کے معنی تن درست کے قرار دیے گئے ہیں، تو غیر سلیم اُس عقل کو کہیں گے جو مریض اور بیمار ہو۔ تو یہ ہم ابھی تک نہیں سمجھ سکے کہ تن درست (سلیم) عقل کون سی ہے اور بیمار کون سی؟ آیا عقل کو بھی کوئی مرض لگ سکتا ہے؟ اور اگر بالفرض لگ سکتا ہے تو اُس کا علاج کیا ہے؟ اُس کے واسطے طبیب کون ہے اور اُس کے مرض کی علامات کیا ہیں؟

صرف یہی استفسارات میں جواب باقی رہ گئے ہیں، اور انھی کے حل ہو جانے پر اس بحث کا خاتمہ بھی ہو سکتا ہے۔ مگر آپ کو ان سوالات کا جواب سننے سے پہلے چند مختصر امور کا ذہن نشین کر لینا ضروری ہے:

آلات اور فاعل کا فرق | اول یہ کہ جو کام، ایسے آلات کے ذریعے سے کیا جائے جن میں احساس اور ادراک نہ ہو، تو اُس کام کا نفع نقصان ان آلات کی طرف منسوب نہیں ہوتا

بلکہ اُس شخص سے تعلق رکھتا ہے جو اُن آلات سے یہ کام لینے والا ہے۔ مثلاً بڑھئی کے کام میں سبوتا آتا ہے، اگر اُس کی دھار بھڑ جائے یا لکھنے میں کاتب کے قلم کی نوک ٹوٹ جائے، تو یہ سب بڑھئی اور کاتب کا نقصان سمجھا جائے گا، بسولا اور قلم کے حق میں نہ کوئی نفع مُستصوّر ہے نہ کوئی نقصان، کیوں کہ نفع نقصان کا وجود درحقیقت راحت اور تکلیف سے وابستہ ہے اور راحت اور تکلیف کو وہی اشیاء محسوس کر سکتے ہیں، جن میں ادراک اور شعور ہو۔

بہ ہر حال، جب آلات کا نفع و ضرر اصل فاعل کا نفع و ضرر ٹھہرا، تو قولِ علیہ کے کاموں میں جو کچھ نفع یا نقصان ہوگا، وہ فی الواقع عقل اور روح کا ہوگا کیوں کہ ادراک و شعور عقل و روح ہی کا خاصہ ہے، اور سب قوتیں اُس کے آگے بہ منزلہ آلات کے ہیں جیسا کہ ہم ابھی تحقیق سرچکے ہیں

قوتِ عقلیہ اور قوتِ عملیہ کا باہمی ربط | دوسری بات یاد رکھنے کے قابل یہ ہے کہ قوتِ عقلیہ اور قوتِ عملیہ کے مابین، قدرت نے کچھ ایسا مستحکم ربط پیدا کیا ہے کہ اُن میں ہر ایک کے آثار دوسرے تک مُتعدی ہوتے ہیں۔ قوتِ عقلیہ کے آثار قوتِ عملیہ میں ظاہر ہوتے ہیں، کچھ تو وہی ہیں جن کا تعلق صفتِ حکومت سے ہے، یعنی تمام قوائے عملیہ کا بہ مقتضائے محکومیتِ عقل کے ایک اشارے پر حرکت میں آ جانا۔ اور بعض آثار ایسے ہیں جن میں عقل کی اس حکومت کو کچھ دخل نہیں، جیسے غصے کے وقت چہرے کا تڑپنا اور آنکھوں کا سرخ ہو جانا، یا خوف کے وقت جسم کا کانپنا اور رنگ کا اڑ جانا، ان حالتوں میں جب کسی اشتعال انگیز یا ہیبت ناک چیز کا ادراک عقل کو ہوا، تو فوراً بلا ارادہ اور بلا اختیار غصہ یا خوف کے آثار جسم پر ظاہر ہو گئے، دراصل حالے کہ حکومت کی حیثیت میں قصد اور اختیار کا پایا جانا ضروری تھا۔

علیٰ ہذا القیاس، قوتِ عملیہ کی طرف سے بھی جو اثر عقل و روح تک پہنچتا ہے، دوسرے طرح کا ہوتا ہے: ایک تو وہی بہ لحاظ محکومیت اور آلہ بننے کے، قوتِ عملیہ کے تمام منافع اور مضار کہ عقل کے واسطے ثابت ہونا، دوسرے بعض کیفیاتِ بدنی سے عقل و روح کا بے اختیار کُلفت یا راحت اُٹھانا۔ چنانچہ میل کچیل اور بول و براز سے جو کچھ نفیس طبعوں کو کدورت، یا بُخار، دردِ سرد وغیرہ میں کُلفت، یا بدن کی صفائی کی لذت اور عافیت میں راحت ہوتی ہے،

نقصان ۵۰ تکلیف

وہ سب اسی قسم میں داخل ہے۔

اب جائیں سے ان پنہانی تعلقات، تاثیر و تاثر اور فعل و انفعالات کے سلسلے کو دیکھ کر، ہم کو قطعی طور پر یہ یقین ہو گیا کہ قوتِ عملیہ کے بعض اعمال، قوتِ علمیہ (یا عقل و روح) کے حق میں مفید اور بعض مضر ہوں گے، اور کوئی ایک فعل بھی قوتِ عملیہ کا اس نفع و ضرر سے خالی نہ ہوگا۔

قوتِ عقلیہ کی علامات مرض | پس ایسا کابل آدمی جس کی روح کی صحت، و عقل کی سلامتی دلائلِ قویہ سے ثابت ہو چکی ہو، اعمال کے حسن و قبح کے متعلق کچھ فتویٰ نافذ کرے اور ہم اپنی قوتِ عملیہ کی کارروائی اُس کے خلاف پائیں، تو ہم کو اطمینان کر لینا چاہیے کہ ہماری قوتِ علمیہ مضر یا بہ الفاظِ دیگر مرض میں مبتلا ہے۔ اور اُسی تاثیر و تاثر کے قانون کے موافق جو قوتِ علمیہ اور عقل کے درمیان بھی ثابت ہو چکا ہے، یہ کہنا پڑے گا کہ قوتِ عملیہ یعنی عقل ابھی اپنی اصلی حالت پر نہیں ہے، بلکہ بیماری میں پھنسی ہوئی ہے، کیوں کہ اگر عقل تنِ درستی کی حالت میں ہوتی اور پوری قوت کے ساتھ صحیح احکام نافذ کرتی، تو قوتِ عملیہ جو ہر طرح سے اُس کی محکومی اور زیرِ دست ہے، ہرگز اُس کی مدد و حاکمی نہیں کر سکتی تھی۔

اس سے بھی زیادہ ضعیف اور اضمحلالِ عقل کا اُس وقت ظاہر ہوتا ہے، جب کہ وہ خود بھی کسی عمل کے فوائد یا نقصان سے واقف ہو، اور شہوت کے غلبے یا کسی نفعِ جزئی منجمل سے متاثر ہو کر، اپنے اصلی حکم کے خلاف قوتِ عملیہ سے عمل درآمد کر دے؛ حتیٰ کہ عقل کی قمارست سے عقل ایسی پاگل بن جائے گی کہ اُسی مرض کو صحت سمجھنے لگے، چناں چہ ہر زمانہ اور ہر قوم کے حالات کا متبع کرنے سے، یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اُس میں اکثر افراد اس کے روحانی مرض میں مبتلا ہوتے ہیں۔

مریضِ عقلیہ | دور کیوں جاتے ہو! اپنے زمانے ہی کے حال کا مشاہدہ کرو کہ اکثر لوگ ایسی موٹی موٹی باتوں میں جن کے پھلے بُرے سے سب واقف ہیں، جان بوجھ کر خلافِ عقل عمل درآمد رکھتے ہیں۔ اور خاص وہ امراض، جو تنِ دق کی طرح مریض کو بھی کم محسوس ہوتے ہیں، اُن کی تشخیص تو کوئی طبیب ہی کر سکے تو کر سکے! پھر اکثر روح کا یہ حال ہے کہ چپ سے تاجباتِ ان علتوں میں گرفتار رہنے کی وجہ سے، صحت کی لذت سے آشنا ہی نہیں ہوتیں

اور کینہ، حسد، بغل، تکبر، خود پسندی وغیرہ امراض، جن کو وبائی امراض کہنا چاہیے، نہایت کثرت سے وقوع میں آتے رہتے ہیں۔

جس قوم کو چاہیے دیکھ لیجیے کہ شادی، غمی اور سوائے ان کے اور معاملات میں ، ایسی ایسی فیود اور رسومِ قبیحہ کے پابند ہیں کہ جن نقصانات کا دل و جان سے اقرار کیا جاتا ہے۔ اسی طرح ہر فرقہ، ایک جدا ہی عقائد پر دل جماعے بیٹھا ہے۔ اگر ان سب سے فرقوں میں سے کسی ایک کو بھی حق پر قرار دے دیں، تب بھی اکثر لوگ تو باطل پر ہی نکلیں گے۔

پھر اکثر اقوام کی بعض عادتیں ایسی خلافِ عقل ہیں کہ جن کی قباحت تمام اہل مذاہب کے نزدیک مُسَلَّم ہے۔ ہندوستان کے رائگھر، گوہر اور افغانستان کے کوہستانیوں اور عرب کے بُدوؤں میں، چوری قزاقی اس درجہ مُرَّج ہوئی ہے کہ رواج کی رُو سے اُن کے خیال میں مُوجبِ طعن و تشنیع نہیں رہی۔ طوائف کی قوم میں، زہنا کی اس درجہ ترقی ہے کہ معیوب ہونے کے بجائے، اس کو اپنا ہنر سمجھنے لگیں۔ بینیوں کی بُزدلی اور سُجِّل ضربُ المثل ہو گیا ہے اور دوسری بعض قوموں میں شراب نوشی، بے پردگی اور ترکِ ناموس کی یہ نوبت پہنچی ہے، کہ اُس کے نتائج بد برابر دیکھتے ہیں مگر زبان پر نہیں لاتے۔ غرض، مختصر لفظوں میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ آدے کا آدا بگڑا ہوا ہے، جس کی اصلاح کی توقع بھی بہت کم ہو سکتی ہے۔

مجدد الف ثانی کا قول بجا ہے | ایسی اتر حالت میں، جب کہ کوئی عقل بھی (الّا ما شاء اللہ) مرض سے خالی نہیں ہے، مجتہد صاحب نے اگر یہ فرمایا کہ نبوت کا راستہ عقل کے راستے سے علاحدہ ہے، تو ہمارے نزدیک بہت بجا فرمایا ہے کیوں کہ بیمار کی طبیعت بسا اوقات ایسی انشیا کی طرف راغب ہو جاتی ہے جو اُس کے لیے مضر ہیں اور اُن چیزوں سے نفرت کرتی ہے، جو فی الواقع اُس کو طبعاً مرغوب ہیں۔ بخار والا اکثر کھانے سے مُمتنفر ہو جاتا ہے۔ اور دُنبَل کی سُلن یا خارِ شس کی نوچ میں انسان اپنے بدن کے تراشنے اور کھال کے نوچنے پر بے اختیار مائل ہوتا ہے لیکن وہ نفرت اور یہ رغبت، دونوں بے محل ہیں جس کا باعث یہی مرض ہوا ہے۔

ۛ ایک نو مسلم قوم جو پہلے راجپوتوں میں شمار ہوتی تھی۔ ۛ فیس، درد

اب اگر مجدد صاحب یا اور کوئی عالم یہ حکم صادر فرمادیتے، کہ مذہب مرغوباتِ عقلِ سلیم کے مجموعے کا نام ہے (اور درحقیقت ہے بھی ایسا ہی)، تو ان مریضِ عقلوں کے واسطے آزادی یعنی مُطلق العنانی کا اچھا خاصا بہانہ ہانڈ آجاتا، اور وہ ہرگز تن درست اور بیمار عقل میں تفریق قائم نہ رکھتیں؛ جس سے دنیا میں ایک فسادِ عظیم برپا ہو جاتا اور ہدایت کے بجائے گم راہی پھیل جاتی۔

نیک و بد کی تشخیص کے لیے | بہ ہر حال، جب کہ اس امر کا باد رکھ لینا بالکل آسان
طیب حاذق کی ضرورت | ہو گیا کہ اکثر انسانی عقلیں، مبتلائے امراضِ رہنے کی وجہ سے، اس پر قادر نہیں ہیں کہ وہ تینوں اور اطمینان کے ساتھ، تمام اخلاق و اعمال میں نیک کو بُد سے اور مُفید کو مُضر سے تمیز دے سکیں؛ تو ناچار اس بارے میں کسی ایسے طیب حاذق کی طرف رجوع کرنا ضروری قرار پایا؛ جس کی رائے کبھی غلطی نہ کرتی ہو، جو اپنے مریضوں پر پورا پورا رحم کھانے کے علاوہ، تمام دواؤں کے خواص اور اوزان سے واقف ہو، جس کو مختلف دواؤں اور غذاؤں کی تاثیرات کے باریک سے باریک فرق معلوم ہوں اور جس کی نظر میں ہوسموں کے اختلاف اور روح کی ترکیب سے کامل طور سے حادی ہو۔

لیکن ایسا طیب، اُس حکیم علی الاطلاق کے سوا کوئی نظر نہیں آتا، جس کے سہارے تمام عالم کی ہستی قائم ہے، جس کی ذات ہر قسم کے عیوب اور امراض سے پاک ہے، اور جس کے وجود اور کمالات کو عن قریب ایک مستقل رسالے میں ہم روشن دلائل سے ثابت کریں گے۔

دُنیا میں جس قدر ہادی آئے، جن مقدس بندوں نے اپنی نبوت کا سکہ بٹھلایا، جتنے سچے شریعتوں کے تبلیغ کرنے والے گزرے، وہ سب کے سب اُسی حکیم مطلق کے مَطَب کے نسخہ نویس اور تربیت یافتہ تھے۔ اُنھوں نے ہمیشہ اُسی روحانی کالج کی اُسنادِ فضیلت لوگوں کو دکھلائیں، اور اسی حکیم برحق کے عطایے ہوئے اعزازی تنے اور نشانات پیش کیے۔ تاکہ اللہ کی مخلوق ماہرِ طبیبوں کو اِستہاری حکیموں سے جدا

کر سکے، رہبر اور زہ زن کے پہچاننے میں دھوکا نہ لگے اور محافطوں کی جماعت پر ٹیڑوں کا اشتباہ نہ ہو۔

ہم جب نبوت کی ضرورت اور نبی کے تعین پر مبسوط بحث کریں گے، اُس وقت اُن علامات کا تفصیلاً ذکر کریں گے، جن سے کسی خاص شخص کی نسبت یہ دریافت ہو سکے کہ وہ خدائی مدرسے کا اعلیٰ تعلیم یافتہ اور دنیا میں حکیم علی الاطلاق کی نسبت کا واقعی مستحق ہے۔ مگر اس موقع پر، نہایت اختصار کے ساتھ صرف اتنا ذکر کرنا چاہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کے فیوضات اخذ کرنے اور اُس کے علوم و کمالات کا منظر بننے کے واسطے انسان میں عادتاً کن شرائط کی ضرورت ہے ایسا بہ الفاظ دیگر، حق تعالیٰ کے مدرسے میں طب روحانی کا حصول کس استعداد پر موقوف ہے!

بلاشبہ اس قسم کے عمیق مباحث میں دخل دینے کا ہم کو کچھ استحقاق نہیں ہے، اور جس وادی میں ہم قدم زن ہونے کا ارادہ رکھتے ہیں، اُس کو بہ آسانی قطع کر لینے کا خیال، محض ہماری فکر کی خارج از حوصلہ بلند پروازی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ لیکن افسس نادانف مسافر کو راستے کی مشکلات کی کیا پرواہ ہو سکتی ہے، جس کی دست گیری کے واسطے ایک اعلیٰ درجے کا مبصر اور تجربہ کار بادی موجود ہو!

قاسمی محکوم کی رہ نمائی | ہم پہلے بھی جن تیرہ و تاریک راہوں کو طے کر کے اس مقام تک پہنچے ہیں، اُن میں کو گزرنے والا آسان نہ تھا اگر قاسمی تصنیفات ہمارے لیے مشعل راہ نہ ہوتیں۔ اور اب بھی ان شاء اللہ آپ دیکھیں گے کہ اُنھیں کی روشنی میں، منزل پیش آمدہ کے مہالک و خطرات کا مقابلہ کرتے ہوئے، ہم اپنے مقصد اعلیٰ پر صاف جا پہنچیں گے۔ وہ ذات بابرکات، جس کی قوت قدسیہ نے شریعت صادقہ کے بیچ درجہ اور نظری در نظری اسرار کو بھی بڑھت کی حدود کے قریب لا رکھا ہے، اگرچہ وہ خود دُنیا سے اُٹھ گئے مگر اُن کی قیامت تک نہ مٹنے والی یاد گاریں ہماری رہ نمائی کے واسطے زندہ جاوید ہیں۔

ۛ مہالک قبلہ کی صحیح، معنی، پر خطر مقامات، مراد جہزات

اس میں ہرگز مُبالغہ نہیں کہ اگر حضرت مولانا محمد قاسم (روحی دُارِ داحکم فداہ) کی مشہور کتابوں پر میری دسترس نہ ہوتی، تو میں ہرگز اس طرح کے نازک مسائل پر بے خوف و خطر قلم اٹھانے کی جُرأت نہ کر سکتا؛ اس لیے یہ سخت احسان فراموشی اور خیانت مُتصوّر ہوگی کہ میں کسی ایسے مضمون کو اپنی طرف منسوب کر کے، جو درحقیقت حضرت مرحوم کی تصانیف سے اخذ کیا گیا ہو، اپنی غیر واقعی عظمت و تَفوّق کا ثبوت پیش کر دوں۔ میں اس سے زیادہ اپنے کو خوش قسمت اور فائز المرام بنانے کی تمنا نہیں رکھتا، کہ مولانا کے عالی مضامین میرے پیرایہ بیان میں اس طرح ادا ہو جایا کریں، کہ اُن کی تعبیر میرے مدعا کے واسطے مُفید اور صحیح ہو اور اپنے قُصورِ فہم یا پریشانیِ تقریر کی وجہ سے، دلائل کی تقریبِ ناتمام نہ رہے۔ چنانچہ اس وقت بھی جس بحث کا آغاز کیا جاتا ہے، اُس میں میرا صرف اسی قدر شُرف ہوگا۔

نبوت کی بحث | یہ بحث جس کی ابتدا سے آج ہماری تحریر کی دوبارہ ابتدا ہوئی ہے، فی الحقیقت نبوت کی بحث ہے۔ اور ہم کو ہٹ دھرمی اور دھینگا دھینگلی سے نہیں، بلکہ حق پرستی اور انصاف کے ساتھ یہ دکھانا ہے کہ وہ پُر عظمت و جلال مفہوم، جس کے لیے نبی، رسول، پیغمبر وغیرہ الفاظ وضع کیے گئے ہیں، کیا خارج میں واقعی طور پر اُس کے کچھ افراد موجود ہیں؟ یا وہ بھی مَن جملہ اُن شان دار تخیلات کے ایک تخیل ہے جن کو مغلوبِ انیم لوگوں کے دماغ، فرصت اور تنہائی میں میٹھ کر اختراع کرتے رہا کرتے ہیں؟

اس آخر احتمال کو سُن کر جس سے شانِ نبوت میں سخت مُلحدانہ گستاخی ہوتی ہے، ہم کو اندیشہ ہے کہ شاید کوئی جوشیلے مسلمان، ہمارے ایمان میں تردّد پیدا کر کے ہم پر ہی نہ بگڑ بیٹھیں؛ اس لیے ہم ایسے صاحبوں سے بہ ادب عرض کرتے ہیں، کہ وہ بجائے اس کے کہ اپنے قابلِ تعریف عہدے اور جوش کو ہم مسلمان ناقلین کے حق میں صرف کریں، بہتر ہو کہ اُن مُطلق العنان دہریوں کی سرکوبی کے واسطے استعمال فرمائیں، جن کی زبان سے مَا يَهْلِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ أَوْ رِوَانُ هِيَ الْآحْيَاءُ الدُّنْيَا وغیرہ الفاظ قرآنِ کریم نقل کیے گئے ہیں، اور

جن کی ایک بڑی بیماری تعداد آج کل یورپ میں زبانِ قال سے اور ہندوستان وغیرہ میں زبانِ حال سے، یہ صدائیں لگا رہی ہے کہ خدا کا وجود محض ایک فرضی وجود ہے، نبوت و رسالت صریح کی بیماری کے نام میں، اعجاز و کرامات اگلے زمانے کی نظر بندیوں کے افسانے ہیں اور وحی و الہام کی حقیقت دیوانوں کی بڑ سے کچھ زیادہ نہیں ہے۔

یہ لوگ صرف ایک عقل کے اور وہ بھی اپنی عقل کے مشورے کو ماننا چاہتے ہیں، اور اُن کے مذہب میں جادۂ عقل سے ایک ایچ ادھر ادھر ہٹنا، کفر و شرک یا کم از کم گناہِ کبیرہ کے برابر ہے۔ ہر ایسا شخص جس کو کبھی مشکل مسئلے کے متعلق افہام و تفہیم کا موقع ملا ہوگا، بہ شرطے کہ اُس کے بے وقوف مخاطب کے مسلمات بھی بہت ہی حقورے سے ہوں، اندازہ لگا سکتا ہے کہ ایک ایسے آزاد فریق کی بے قید شبہات سے، جس کا ذکر اوپر ہوا، عہدِ برآ ہونا کس قدر دشوار مرحلہ ہے۔ اور یہ کہ ہمارے مولائے روح (فداہ الی و اُمّی) نے ان اندہ سوں کے مقابلے میں کس درجہ ثبات و استقلال اور معقولیت سے کام لیا ہے۔

آزاد خیال گروہ سے ایک سوال | مولانا کا اس آزاد خیال گروہ سے صرف ایک سوال ہے۔ وہ یہ کہ تمام مخلوقات میں نیک و بد کا تفاوت، بھلے بُرے کا فرق اور اعلیٰ ادنیٰ کے امتیازی مدارج، جو ہماری تمھاری سب کی عقل نے قائم کر رکھے ہیں، اُس کا معیار اور پیمانہ عقل کے پاس کیا ہے؟ عقل نے جمادات سے حیوانات کو کیوں اچھا بنلایا ہے اور تمام حیوانات کے اعتبار سے انسان کو کیوں سب سے فضیلت عطا کی ہے؟ جہالت کے مقابلے میں وہ علم کی ہمیشہ مداح رہا کرتی ہے، اور ہمت و شجاعت کے کارناموں کو وہ جُبُن و نامردی کے برخلاف کس وجہ سے سر بلند رکھنا چاہتی ہے؟

المختصر، وجود کو عدم پر، وجودیات کو عدمیات پر، ہونے کو نہ ہونے پر، استغنا کو احتیاج پر اور راحت کو تکلیف پر کیوں ترجیح دیتی ہے؟ وہ کون سا نمونہ اُس کے پاس ہے، جس کے ساتھ مناسب و مُشابہ ہونے اور نہ ہونے کی وجہ سے وہ مخلوقات میں سے ہر

ایک چیز کو بھلا یا بُرا بنادینے کا استحقاق رکھتی ہے ؟

اگر تم ایک اچکن کا کپڑا کسی ہُشیار درزی کو قطع کرنے اور سینے کے لیے دو، یا بازار جا کر کوئی عمدہ ٹوپی اور خوب صورت جُوتی خریدنے کا ارادہ کرو، تو بے شک تم ان سب چیزوں کے حُسن و خوبی اور موزونیت و غیر موزونیت کو، اپنی اُن آنکھوں سے دیکھ سکو گے جو قدرت کی طرف سے تم کو ایسے ہی کاموں کے لیے عنایت ہوتی ہیں، لیکن اس دیکھنے کے اندر تم کو چند پیمانوں پر ان اشیاء کے مطابق کرنے کی ضرورت ہوگی۔ مثلاً اچکن کو تم اپنے بدن پر پہن کر، اور جوتی کو پاؤں میں ڈال کر، اور ٹوپی کو سر پر رکھ کر دیکھو گے، اگر ان میں سے کوئی چیز اپنے پیمانے پر پوری نہ اُترے، بلکہ ڈھیلی یا تنگ رہے، تو تم اُس کو ناموزوں سمجھ کر مُسترد کر دو گے۔ اور اگر اتفاق سے کوئی چیز خاطر خواہ اپنے پیمانے پر مطابق ہوگئی، تو پھر خود خیال کر سکتے ہو کہ تم کہاں تک اُس کی قدر دانی کے لیے تیار ہو گے۔

ٹھیک اسی طرح، عقل کے پاس بھی ہر نیک و بد کی تمیز کا کوئی پیمانہ اور بھلے بُرے کی شناخت کا کوئی معیار موجود ہونا چاہیے، کہ جس پر مُنطبق ہونے اور نہ ہونے سے وہ ہر ایک مخلوق کے حُسن و قبح کے مراتب دریافت کر سکے۔

ہر عقل کی فطرت میں خدا کا ادراک موجود ہے | غالباً ہر عقل کے جذرِ فطرت میں، جیسا کہ ہم عن قریب ثابت کریں گے، مخلوقات کے ماسوا ایک ایسی اعلیٰ ہستی کا ادراک موجود ہے، جو عین وجود ہونے کی وجہ سے عدمِ مستی کا شائبہ اپنے اندر نہیں رکھتی، اور اسی وجہ وہ ہر قسم کی احتیاجات سے بے نیاز ہے۔ وہ حُجّی ہے، عالم ہے، قادر ہے، مُتکلم ہے، ارادہ اور اختیار رکھتی ہے، غرض کہ تمام عمدہ صفات کی جامع اور ہر طرح کے عیب و نقور سے بری ہے۔ اب جس حد تک عقل اپنی رسائی اور صفائی کے موافق، کسی مخلوق کو اس ایک چیز سے مناسبت پاتی ہے، اُسی حد تک اُس کو اعلیٰ اور افضل جانتی ہے اور جو چیز اُس سے بعید المناسبت ہوتی ہے، وِتنا ہی عقل اُس کو پستی کی جانب دھکیلتی جاتی ہے۔ مثلاً وہ عقل

کی مرتبہ شناسی کا معیار جس کو دوسرے الفاظ میں ہم خداے عزوجل کہتے ہیں، چوں کہ وجود ہی وجود ہے، عدم کا اُس میں اصلاً اختلاط نہیں، اسی واسطے ہماری عقل موجودات کو ہمیشہ معدومات پر ترجیح دیتی ہے۔ پھر موجودات میں بھی جس شے میں خدائی صفات کا کم و بیش ظہور دیکھتی ہے، اُسی حیثیت سے اُس کے تفوق کو اُن اشیاء کے مقابلے میں تسلیم کرانے لگتی ہے، جن میں وہ صفات نہ پائے جاتے ہوں۔

دیکھو، چوں کہ ہم یہ جانتے ہیں کہ خداوند کریم زندہ ہے بے جان نہیں، اور اس باب میں ہم نے دیکھا کہ آدمی اور جانور خدا تعالیٰ سے زیادہ مناسبت رکھتے ہیں، مٹی، پانی، ہوا، آگ، شجر حجر وغیرہ نہیں رکھتے، تو ہم نے جان لیا کہ حیوانات کا رتبہ جمادات سے اونچا ہے۔ اس کے بعد خیال کیا کہ خداوند کریم عالم ہے، جاہل نہیں، اور ہر انسان باقی جانداروں سے علم و عقل میں ممتاز ہے، تو ثابت ہوا کہ ان جانداروں میں اشرف و افضل ہے۔ پھر ان بھی علم و اخلاق اور احوال و اعمال میں متفاوت اور کم و بیش ہیں، تو جو کوئی علم میں زیادہ ہو اور اخلاق مثیل قدرت، سخاوت، حلم، عفو وغیرہ کے، جو خدا تعالیٰ کے اخلاق ہیں، رکھتا ہو، وہ بلاشبہ اپنے اقربان سے فائق شمار کیا جائے گا۔

بہر کیف، جس چیز کو بھی عقل بھلایا بُرا کہنتی ہے، اُس کو ابتداءً یا بالآخر اُسے ایک نمونہ اور معیار پر مطابق کر کے دیکھتی ہے۔ البتہ چوں کہ باہم عقلوں میں تیزی اور صفائی اور توجہ کے اعتبار سے بے انتہا فرق ہے، اس لیے اس مُطابقت اور مُناسبت کے معلوم کرنے میں بھی بے حد تفاوت چاہیے۔

قربت خداوندی، بہ قدر مناسبت | اب تم خیال کرو کہ دنیا کی سب چیزیں، ارواح ہوں یا اجسام، اخلاق ہوں یا اعمال، معانی ہوں یا الفاظ، باوجودے کہ خداے برتر سے ایک قسم کی مناسبت رکھتی ہیں، کیوں کہ سب کی اصل وہی خالق بے نیاز ہے اور سب کا وجود اُسی کے وجود کا پُر ثمر ہے۔ لیکن پھر بھی اس مناسبت میں مخلوقات کے اندر زمین و آسمان کا تفاوت ہے۔

ارواح کو بہ سبب اپنی لطافت کے جو قرب و مناسبت جناب باری عزاسمہ سے

حاصل ہے، وہ اجسام کثیفہ کو نہیں۔ اور اجسام میں بھی مثلاً آگ ہو اسے لطیف ہے اور ہوا پانی سے اور پانی مٹی سے، تو اسی ترتیب سے ان میں سے ہر ایک کو خدا تعالیٰ شانہ کے ساتھ ایک طرح کا قُرب و مناسبت حاصل ہوگا۔ اور شاید اسی قُرب و بعد کا اثر ہے کہ لطیف چیزوں سے، باوجود اس نزاکت کے، وہ کارہائے نمایاں بن پڑتے ہیں کہ کثیف سے ہرگز نہیں ہو سکتے۔

برق، ایک پلک چمکنے میں آسمان سے زمین پر آتی ہے پھر آسمان پر اڑ جاتی ہے، اور اس سرعت سیر و سفر میں پہاڑ بھی اگر سامنے آجائے، تو اُس کی بھی ذرہ برابر حقیقت نہیں سمجھتی۔ شعاع شمس و قمر کا یہ حال ہے کہ سرعت برق بھی اُس کے سامنے گرد ہے۔ کہاں زمین، کہاں چوتھا آسمان! خیال کرتے ہوئے دیر لگتی ہے، پر اُس کو یہاں تک آتے دیکھیں لگتی۔ علیٰ ہذا القیاس، اپنی نگاہ کو دیکھو اور آوازوں کی تیز روی اور خیال و گمان کی سالی کو سوچو، جتنی لطافت بڑھتی جائے گی اُسی قدر زور اور قدرت زیادہ ہوگی، جس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ لطیف چیزیں، اپنے قُرب و مناسبت کی بدولت، خدا تعالیٰ کے فیضانِ کمالات سے وہ حصہ لیتی ہے، جو بعید المناست اشیاء کو نہیں مل سکتا۔ اور اس کی نظیر ظاہر میں بالکل اس طرح ہے کہ شمع کا نور اُس کے آس پاس کی چیزوں کو بہت زیادہ منور کرتا ہے، لیکن دور کی چیزیں اُس سے اتنی روشن نہیں ہوتیں۔

پس اگر وہ اخلاقِ حمیدہ (جو) حق تعالیٰ شانہ کی ذاتِ بابرکات میں موجود ہیں، قلیل کثیر کسی فردِ بشر کے نصیب ہو جائیں، تو بے شک بہ نسبت اُن افراد کے، جن میں یہ اخلاق نہیں، اُس شخص کو حق تعالیٰ سے بہ مقدارِ مطابقتِ اخلاق کے قُرب روحانی ہوگا، اور جو عنایاتِ خاصہ خداے کریم کی اُس کے حال پر مبذول ہوں گی، اور وہ کو بے سرنہ ہو سکیں گی۔

وجود کائنات، وجود خداوندی کے نور کا برتو | آپ عن قریب بہ وضاحت و تفصیل یہ معلوم کریں گے، کہ جیسے زمین و آسمان میں چار طرف نورِ آفتاب کا ظہور ہے، اور اُسی کے ذریعے سے آپ سُرُخ و سفید کا اور خوب صورت و بد صورت کا فرق قائم کرتے ہیں اور ہر صحن اور ہر روشن دان، ہر جگہ اور ہر مکان میں جُدی جُدی قطع سے وہی جلوہ گری کے ہوئے ہے، ایسے ہی تمام کائنات کا وجود، خداوندِ حقیقی کے نورِ وجود کی پر تو افشائی کا نتیجہ ہے۔

انسان اور آئینے میں مُماثلت | تو جس طرح آفتاب عالم تاب کو، باایں ہمہ غموم فیض، قلعی دار آئینے اور آتشی شیشے کے ساتھ وہ خصوصیتِ خاصہ حاصل ہے، کہ دوسرے اجسام کے ساتھ نہیں دیکھو، آتشی شیشے میں، سوائے روشنی کے، آفتاب کی جانب سے ایک خاص حرارت اور آتشی اثر کی بھی آمد ہے اور باقی اجسام کو، جو وہیں اُس کے پاس ہی رکھے ہوں، اس تاثیر کی مُطلق خبر نہیں، یا آئینہ قلعی دار میں، آفتاب کی روشنی کا اس قدر اظہار ہے کہ در صورتِ کہ دوسرے اجسام، آفتاب سے فیض یاب ہو کر خود ہی روشن ہو جاتے ہیں، یہ خود بھی سورج کی طرح چمک اُٹھتا ہے اور جو اجسام اس کے بالمقابل ہوں، ان پر بھی اپنا پرتو ڈالتا ہے۔ اسی طرح فیضِ خداوندی کو بھی عام و خاص سمجھنا چاہیے کہ یہ فرق، بجز فرقِ مُناسبت اور فرقِ قابلیت کے اور کیا ہوگا؟ ورنہ ظاہر ہے کہ جیسے آفتاب کو، آئینہ یا پتھر سب برابر یکساں ہیں، ایسے ہی خداے بے نیاز کو بھی تمام مخلوقات برابر ہیں، کسی سے بخل نہیں، البتہ مخلوقات کی قابلیت اور مُناسبت بے انتہا مختلف ہے۔ تو جو لوگ صاف باطن ہیں اور اپنے بنی نوع سے ایسے مُمتاز ہیں، جیسے آئینہ لوہے سے، یعنی جیسے آئینہ دراصل وہی لوہا ہے، جو میل کچیل کے دور ہو جانے کے باعث صاف و شفاف آئینہ بن گیا ہے، ایسے ہی وہ لوگ بھی مثل اور بنی آدم کے وہی حقیقت اور روحِ انسانی رکھتے ہیں، مگر اتنا فرق ہے کہ اُن کی ارواح، بہ وجہ نہ ہونے آلائشوں اور کہورتوں کے جو بہ سبب تعلقاتِ پنهانی کے ہوتی ہیں، پاک و صاف ہیں، وہ لوگ عجب نہیں کہ بہ نسبت اپنے بنی نوع کے زیادہ مُعزز و مُمتاز ہوں، اور بعضے ایسے فیض اُن کو خدا کی طرف سے پہنچتے ہوں کہ ہم کو تم کو اُن کی اطلاع بھی نہ ہو، یعنی ہم تم بہ ذاتِ خود اُن فیوضات سے محروم رہیں گواہی پاک دل لوگوں کے واسطے سے جن کے قلوب پر اول وہ فیض وارد ہوتے ہیں، صرف اُس قدر پہرہ یاب ہو جائیں جس قدر در و دیوار آئینہ مُنور سے، یا سیاہ و سبز وغیرہ اشیاء جو جلنے کے قابل ہوں، آتشی شیشے سے۔

غرض، ہو سکتا ہے کہ جیسے آفتاب کے مقابلے کے وقت، آتشی شیشہ یا آئینہ قلعی دار کے باطن میں، آفتاب کی طرف سے ایک فیض ایسی طرح آتا ہے کہ بہ ظاہر آتا ہو کچھ معلوم نہیں ہوتا

اور پھر اُس کے بعد حاصل ہو جانے کے وہ دونوں بھی بہ قدر طاقت اپنی فیض رسانی میں مُطلق کجکل و دریغ روا نہیں رکھتے، بلکہ ہر اُس چیز کو، جو اُن کے سامنے آتی ہے، اپنے حلقہ اثر میں داخل کرنے کے واسطے تیار رہتے ہیں؛ ایسے ہی کیا عجب ہے کہ بعض بنی آدم کے دلوں پر، جن کے دل جسمانی کثافتوں اور نفسانی کدورتوں سے پاک و صاف ہیں، ایسی حرارت محبت خداوندی نازل ہوتی ہو کہ اوروں کو اس کی خبر بھی نہ ہو۔ اور وہ خود آتش شیشے کی مانند اُس کو پی جائیں اور تھمٹل کر جائیں، لیکن دوسروں کے دلوں میں آگ لگا کر اور اُن کی ساری کدورتوں کو سوخت کر کے ایسا پاک و صاف کر دیں، جیسا لوہے کو بجلا کر صاف و شفاف آئینہ بنایا جاتا ہے۔ اور پھر اسی نور الہی سے، جو مثل آئینے کے خاص اُن کے دلوں پر اُترتا ہے اور اُترتا ہوا معلوم نہیں ہوتا، اوروں کا ظاہر مثل درود یار کے اور باطن مثل اُس آئینے کے جو خود آفتاب کے مُقابل نہ ہو، مگر اُس آئینے کے مُقابل ہو جو آفتاب کے مُقابل ہے، بہ کمال آب و تاب جگمگا اُٹھے، یعنی اُن کا فیض اُن لوگوں کو، جو اُن کی طرف صدق دل سے متوجہ ہوتے ہیں، ظاہر و باطن میں ایسا مالا مال کر دے کہ کدورت کا نام و نشان باقی نہ رکھے، اور عمدہ اعمال اور برگزیدہ اخلاق سے اُن کا اندرون و بیرون بہ خوبی آراستہ ہو جائے۔

خدا اور اُس کے برگزیدہ | ہماری خواہش اس وقت اپنے دوستوں سے، اس کے سوا
بندوں کے تعلقات | کچھ نہیں کہ خداے عز و جل میں (جو کہ مخزن کمالات ہے)
اور چند انسانوں میں، فقط ایک ایسے ہی خاص طرح کے تعلق کو مُستبعد نہ سمجھیں، جیسا کہ اُنھوں نے آتش شیشے وغیرہ کا آفتاب کے ساتھ مشاہدہ کیا ہے۔ اگر اُن کو خالق و مخلوق کے درمیان اس قسم کے پوشیدہ تعلقات کے ممکن التسلیم ہونے میں تاثر نہ رہا اور غالباً نہ رہا ہوگا، پھر ہم بہت ہی تھوڑے سے غور و فکر کے بعد اُن خصوصیات کو طے کر سکیں گے، جن سے کسی ایک یا چند مُعین اشخاص کی صداقت پر، جو کبھی اس تعلق کے مدعی رہے ہوں، کافی استدلال ہو سکتا ہو۔

دو واقعے | لیکن ہم ابھی تک تو اسی درطہ حیرت میں پڑے ہوئے ہیں کہ مثلاً دو پہر کا وقت

ہے، آفتاب ٹھیک نصف النہار پر ہے، کنکریاں، سنگ ریزے، درخت کی شاخیں، زمین کی ریت، سمندر کا پانی اور لوہے کے کالے ٹکڑے، غرض دنیا کی سیکڑوں ہزاروں چیزیں اُس کے سامنے پڑی ہوئی ہیں۔ سورج کی روشنی میں ہر ایک شے اُن میں سے الگ الگ دکھائی دیتی ہے، اور ہر ایک میں دھوپ کی کچھ نہ کچھ گرمی بھی محسوس ہو رہی ہے۔ لیکن انہی مختلف الانواع اشیاء کے بیچ میں اور انہی کالے سیاہ آہن پاروں کے قریب ایک شخص بیٹھا ہے، جس کے ایک ہاتھ میں آتش شیشہ اور دوسرے میں کوئی سیاہ یا سبز چادر ہے۔ اور جب وہ اپنے شیشے کو سورج کے رُوبہ رُوبہ کر کے چادر کو اس کے مقابلے پر لاتا ہے، تو اُسی وقت چادر میں آگ سلگ کر دھواں اُٹھنے لگتا ہے۔ اور جب شیشے کو سورج کے یا چادر کو شیشے کے سامنے سے سرکا دیتا ہے، تو وہ تاثیر آتشیں باقی نہیں رہتی۔

یہ سارا تعجب انگیز جبراً، جب ہم ایک انتہا سے انتہا جاہل اور متعصب آدمی سے بیان کرتے ہیں تو وہ بغیر کسی استعجاب کے اس کو تسلیم کرنے لگتا ہے۔ لیکن باوجود اس کے، وہ بہت افسوس ناک بے باکی کے ساتھ محال سمجھ کر تسخّر اڑانے کو جائز رکھتا ہے، جب ہم اُس سے یہ کہتے ہیں کہ ایک خُشک اور بے آب و گیاہ ریگستان میں، جہاں پر بہت سے ایسے مختلف مذاہب، مختلف الطبائع اور مختلف الانواع لوگ جمع تھے، جن کے پتھر پلے معبودوں کی مانند سخت و سیاہ دلوں پر، آفتاب کمالات کی شعاعیں بھی اپنا گہرا اثر نہ ڈالتی تھیں، جن کی تہہ بہ تہہ مادی کثافتوں کے نیچے اُن کی لطیف روحانیت نے اپنے کو چھپا رکھا تھا، اور جن کی جہالت آمیز حرکتوں اور غافلانہ بدستیوں سے دُنیا کے اخلاقی مرقع کی اصلی صورت ایسی بگڑ گئی تھی کہ پہچانی نہ جاسکتی تھی۔

دہاں پر ایک ایسا صفا کیش اور روشن ضمیر انسان ظاہر ہوا جس کے قالب میں فطری طور پر کمالات الہی سے استفادہ کرنے کی پوری استعداد و دلچسپی تھی، اور جس نے ہوش سنبھالتے ہی بغیر کسی ظاہری مُعَلِّم کے، تمام گرد و پیش کے خیالات سے علاحدہ ہو کر ایسی روش اختیار کی، جو سیدھے معبود حقیقی تک پہنچانے والی تھی۔ اس پاکیزہ سرشت انسان کو اپنے جزئی اخلاق اور برگزیدہ ملکات کی بہ دولت، جو بطن مادہ سے

اپنے ساتھ لایا تھا، اُس منج الکلمات خالق سے ایک خاص الخاص نزدیکی اور مناسبت قائم ہو گئی۔ اور جس وقت وہ خدا کا پاک طینت بندہ، تمام فانی تعلقات کو فراموش کیے ہوئے دل سے طلب صادق کے ساتھ خداے ذوالجلال کی جناب میں متوجہ ہو کر بیٹھا، تو نہ معلوم کس غیر محسوس راستے سے ایک ایسی گرم روشنی اُس کے قلب کی تہ میں اُتری کہ پھر جو دل بھی سامنے آیا، اُس کی ساری کدورتوں اور آلائشوں کو جلا کر کُندن بنا دیا۔

مادیت و روحانیت کا فرق | کیا کوئی عقل و انصاف کا حامی ان دونوں واقعوں میں جو ہم نے ذکر کیے، مادیت اور روحانیت کے فرق کے سوا اور کوئی فرق ہم کو ایسا بتلا سکتا ہے جس سے ایک واقعہ تو ہمارے احمق مخاطب کے نزدیک قابل تسلیم ٹھہرا اور دوسرے کی محال اور ناممکن سمجھ کر، ہنسی اڑائی گئی!

بلاشبہ آتشِ شیشے اور آفتاب کی مثال، ایک جسمانی مثال ہے جس کو ہم کسی روحانی مسئلے کے استدلال میں بہ قاعدہ منطق پیش نہیں کر سکتے، لیکن آپ اطمینان رکھیں کہ نہ ہم نے اس کو اپنا استدلال بنانا چاہا ہے اور نہ فی الحقیقت ہم کو بنانے کی ضرورت ہے۔

ہم اوّل تحریر میں یہ بتلا چکے کہ ہماری غرض اصلی اس موقع پر صرف اس قدر ہے کہ آپ خداے بزرگ اور اُس کے بندوں کے مابین ایک ایسے مخصوص تعلق کے ممکن ہونے سے انکار نہ فرمائیں، جس کے ساتھ حضرت ربُّ العزت کے بعض افاداتِ خاصہ وابستہ ہوں پس اگر آپ اس قسم کے تعلق کو ناممکن اور محال سمجھیں گے، تو درحقیقت مدعی آپ ہوں گے اور استدلال و بُرہان سے کسی بات کا ثابت کرنا بھی بہ حیثیت مدعی ہونے کے آپ ہی کا منصب ہوگا؛ کیوں کہ یہ بدیہی قاعدہ ہے کہ اگر کسی چیز کے وجود و عدم (ہونے نہ ہونے) کے متعلق نزاع ہو، تو اُس میں مدعی وجود کا ماننے والا سمجھا جاتا ہے، اور بہ خلاف اس کے، اگر گفتگو کسی چیز کے امکان و امتناع (ہو سکنے اور نہ ہو سکنے) میں ہے، تو اب مدعی وہ شخص ہے جو اُس کو ناممکن اور ممتنع سمجھے۔

اس اعتبار سے اگر میں بغیر کسی مزید توضیح کے یہ کہہ دیتا کہ بعض بنی آدم اور خداے عزوجل میں بعض ایسے تعلقات ممکن ہیں، جو اُس کے اور بنی نوع میں نہ پائے جاتے ہوں،

تو مجھ سے کسی قسم کے مطابہ دلیل کا استحقاق نہ تھا، بلکہ مجھ کو حق تھا کہ میں اپنے اُن مخالفوں سے، جو ایسے تعلقات کو محال کہتے ہوں، محبت طلب کروں۔ لیکن میں نے مناظرہ کے پہلو سے درگزر کر کے محض تقریب الی الفہم اور تسکین خاطر اور رفع اضطراب کے لیے، ایک محسوس و مشابہہ نظیر بھی اپنے مدعا کی تہرئاً پیش کر دی، تاکہ جو لوگ مادیات و محسوسات کے دائرے سے ایک قدم باہر نکلنے کے خوگر نہیں ہیں، وہ بھی ان غیر محسوس تعلقات کی نوعیت سے فی الجملہ واقفیت حاصل کر سکیں۔

آئینہ صفت انسان | یہ ایک اتفاقی اور بہت ہی فائدہ مند بات ہوئی کہ جب ہم خالق و مخلوق کے ان پنہائی تعلقات پر بحث کر رہے تھے، اور نظیروں اور مثالوں کے ذریعے سے ان کو دل نشیں کرتے جاتے تھے، تو اس کے ضمن میں ہم کو چند ایسے اصول و اسباب کے سراغ لگانے کا بھی موقع مل گیا، جن پر یہ تعلقات واقع میں متفرع ہوتے ہیں۔ کیوں کہ ہم نے یہ جان لیا کہ ان تعلقات خاصہ کی بنا اُس قُرب و مناسبت پر ہے، جو کسی انسان کو خدا تعالیٰ سے اپنی روحی لطافت میں کامل اور اخلاق حمیدہ سے متصف ہونے کی وجہ سے حاصل ہوتی ہے۔ اور اس لیے ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ جو شخص ان اعلیٰ اوصاف کے ساتھ موصوف، راستی کا حامی اور کمینہ اخلاق و ذمائم سے محجّر ہوگا، اُس کو بعید نہیں کہ بہ سبب قُرب روحانی کے، خدا سے عز و دخل کی جانب سے اندرونی طور پر اس قسم کے افاضات خاصہ ہوتے ہوں، جو اُس کے دوسرے بنی نوع کو نہ ہوں، اور وہ اُن اسرار الہی پر مطلع ہوتا ہو، جن کے دریافت کرنے سے اور لوگ عاجز رہ گئے ہوں، خدا سے اقدس نے اپنے کمالات کا اُس کو آئینہ بنالیا ہو، اور اسی ”دشان مرآتیت“ کی وجہ سے، اُس کے دل میں خدا تعالیٰ کے نہایت غامض اور دقیق مافی الضمیر بھی منعکس ہو جاتے ہوں۔

اگر فرض کر دو کہ ہم کو دنیا میں کسی معتمد ذریعے سے، ایسے ایک یا چند آدمیوں کو پہنچا لیا گیا جن میں یہ صفات اعلیٰ اور مکمل حیثیت کے اندر پائے جائیں، تو یقیناً یہی لوگ ہماری اُن بیمار عقلوں کے درد کا درماں بن سکیں گے، جن کے مرض کا مفصل تذکرہ ہم صفحہ ۴۴ میں کر چکے ہیں اور جن کی نسبت ہم نے کہا تھا کہ وہ مبتلائے امراض رہنے کی وجہ سے، اپنے نیک و بد

اور نافع و مُضر میں اُسی طرح صحیح تفریق نہیں کر سکتے، جس طرح ایک بیمار آدمی بخار کی وجہ سے عُمَدہ عُمَدہ کھانوں کو بُرا سمجھنے لگتا ہے، جو اُس کو طبعاً مرغوب ہیں۔ اور دُنبل کی کُلن بیا خارش کی نوچ میں اپنے بدن کے تراشنے اور کھال کے نوچنے پر بے اختیار مائل ہو جاتا ہے، حالاں کہ وہ حالتِ صحت میں اس حرکت کو ہرگز عزیز نہیں رکھتا تھا۔

خلاصہ بحث | یہ اُس خداے بے نیاز کا بہت بڑا احسان ہے کہ میں نے جس مقصد کے ثابت کرنے کے واسطے چلنا شروع کیا تھا، یہاں پہنچ کر میں نے اُس کو پایا، اور حضرت مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر کے آغاز سے انجام تک حسب ذیل نتائج برآمد ہوئے :

(۱) افعال انسانی میں نیک و بد کی تقسیم ہر فرد بشر کو، خواہ وہ کوئی مذہبی آدمی ہو یا دہری، ماننا ضروری ہے۔

(۲) عقل سلیم جس کام کو اچھا یا بُرا بتلائے، وہ ویسا ہی ہوتا ہے اور شریعت کے احکام بھی عقل سلیم کے مطابق ہوتے ہیں۔

(۳) عقل اور قوتِ عملیہ میں، اب رابطہ خاص ہے کہ ان میں سے ہر ایک کا اثر دوسرے تک پہنچتا ہے۔ اور حرکاتِ ناشایستہ اور افعالِ ذمیمہ کا کسی شخص سے سرزد ہونا، اس کی دلیل ہے کہ اُس کی قوتِ علمیہ (عقل) مریض یا کم زور ہے۔

(۴) عقلِ سقیم (مریض) جس شے کو نافع یا مُضر بتلائے، اُس پر اطمینان نہیں ہو سکتا۔ اس بارے میں عقل سلیم درکار ہے۔

(۵) ہر ایک چیز کے حُسن و قُبُح سے کا حقہ، خدا تعالیٰ ہی واقف ہو سکتا ہے، یا وہ شخص جس کو خدا تعالیٰ محض اپنے فضل و عنایت سے جس حد تک واقف کر دے۔

(۶) جس قدر کوئی عقل، لطیف یعنی نفسانی آلائشوں اور مادی کثافتوں سے پاک و صاف ہو کر اعلیٰ سے اعلیٰ اخلاق کے ساتھ مُزین ہوگی، اُسی قدر اس کو

خدا۔ عزوجل سے قُرب و تعلق حاصل ہوگا۔ اور ایسی ہی عقلوں کو ہم عقولِ سلیمہ کے نام سے یاد کرنے کے مستحق ہوں گے۔

ان صاف و صریح مگر مُہتمم باثبات نتائج کے سمجھ لینے کے بعد، صرف یہی نفع نہیں ہو کہ ہم ایک خاص مقصد میں بہ قدرِ ضرورت کام یاب ہو گئے، بلکہ امامِ غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر پر جو کچھ نکتہ چینیاں پہلے کی گئی تھیں، اُن میں سے اکثر کا جواب بھی ضمناً اسی بیان سے نکل آیا۔ چنانچہ ناظرین کو امامِ ممدوح کی تقریر اور اُس کے متعلق شبہات یاد ہوں گے، وہ خود ہماری تقریر پر مُکثر نظر ڈال کر، اُمید ہے کہ ہر ایک شبہ کا جواب دریافت کر لیں گے۔

سر سید کے اعتراض کا جواب | البتہ سر سید کے اس اعتراض کا جواب ہمارے مضمون میں ابھی تک نہیں آیا کہ جب عموماً لوگوں کی عقلیں، مُبتلائے امراض رہنے کی وجہ سے، صحیح و فاسد اور نیک و بد میں تمیز نہیں کر سکتیں اور نہ وہ ہر ایک بھلے بُرے کے پہچاننے کے واسطے کافی ہیں، تو ہم کو خدا تعالیٰ کی جانب سے احکامِ شرعیہ کا مُکلف بنانا کیوں کر صحیح ہوا؟ حالانکہ ان اپنے ذی عقل ہونے ہی کی وجہ سے، تمام حیوانات کے برخلاف، شرعیات کا مُخاطب قرار دیا گیا ہے؟

اس کا جواب، مختصراً تو صرف اتنا ہی ہے کہ شریعت نے جن چیزوں کے سمجھنے یا کرنے کی جس حد تک تکلیف دی ہے، اُن میں سے کوئی چیز بھی ہمارے حیطہٴ قدرت سے خارج نہیں ہے۔ اور ہمارے ذی عقل ہونے اور اپنے اُبنائے جنس سے مُمتاز بننے کا یہ نفع کافی ہے، کہ ہم خدا کی حدائی اور رسول کی رسالت پر مُطلع ہو کر، اپنے جملہ ارادات اور خُرکات و سکنات کی باگ اُن دونوں کے ہاتھ میں دے دیں، اور اجمالاً یہ جان لیں کہ جن دونوں کی صداقت کا ہم کو یقین ہو چکا ہے، وہ بلاشبہ ہمارے کامل خیر خواہ اور کامل حکمت والے ہیں، اور اُن کی ہر چھوٹی سی چھوٹی تعلیم پر کاربند ہونا، ہمارے لیے

حیطہٴ قدرت، قدرت و استطاعت کی حد اور احاطہ

فلاح و سود مندی سے خالی نہیں، اگرچہ ہم اُن نکل احکام، یا اُن میں سے بعض کی تفصیلی حکمتوں اور مصالح پر مطلع نہ ہو سکے ہوں۔

اور یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ ایک ماہر ڈاکٹر، جب کسی دوا یا غذا کے متعلق مُفید یا مُضر ہونے کا فتویٰ دیتا ہے، تو ہم خواہ اُس چیز کے خواص و کیفیات بلکہ نام سے بھی صحیح طور پر آشنا نہ ہوں، اور خواہ جس کے استعمال کا وہ حکم دیتا ہے، اُس سے نفرت اور جس سے وہ منع کرتا ہے، اُس کی طرف رغبت بھی ہو، مگر ڈاکٹر کی تجربہ کاری اور ذہنی خواہی پر اعتماد کر کے جس کو ہم نے محض ایک کم زور اور ضعیف گمان کے ساتھ تسلیم کر رکھا ہے، ہم اُس دوا یا غذا کے استعمال کی نسبت اپنا سابق رویہ بدل ڈالتے ہیں اور اس تبدیلی کے وقت بے چاری عقل کی ایک بھی نہیں سنتے۔ بلکہ یوں تاویل کر کے تسلی کر لیتے ہیں کہ ماقولوں کی پیروی بھی درحقیقت عقل کی ہی پیروی ہے، تو اس حیثیت سے گویا ہم نے عقل کے اشارے کے بغیر کوئی سنجش نہیں کی۔

بہی حال، بعینہ مذہب و شریعت کا ہے۔ لیکن ہم کو تعجب کے ساتھ افسوس ہوتا ہے کہ سرسید نے ایک بڑی منطقی سے اور عجیب گول مول الفاظ میں، لوگوں کے دلوں سے ہمارے اس صحیح خیال کو مٹانا یا کم از کم سُست کر دینا چاہا ہے، جس جگہ وہ یہ لکھتے ہیں کہ:

”ہمارا یہ اُصول، نہایت خنچا ہوا ہے کہ انسان، صرف بہ سبب عقل کے جو اُس میں ہے، مُکلف ہوا ہے۔ پس جس بات پر وہ مُکلف ہوگا، ضرور ہے کہ فہم انسانی سے خارج نہ ہو، ورنہ معلول کا وجود بغیر علت کے لازم آتا ہے، جو محال و مُمتنع ہے۔ پس جن اخلاق کے پکڑنے اور چھوڑنے پر انسان مُکلف ہے، وہ ضرور عقل انسان سے خارج نہیں۔“

(تہذیب الاخلاق، جلد دوم، مطبوعہ لاہور، مضمون: کائنات ۱۲۳)

سرسید سے ایک سوال | میرا سوال سرسید سے یہ ہے کہ جس عقل کو وہ تکلیف شرعی کے

تکلیف شرعی: شرعاً مُکلف ہونا

واسطے علت قرار دیتے ہیں، اُس سے کیا مراد ہے؟ آیا فقط قوتِ ادراک کا انسان میں موجود ہونا، یا اُس سے ہر چیز کو تفصیلاً جانتا! اگر پہلی صورت اختیار کی جائے، تو بعض احکام و اخلاق کے فوائد و عکس پر مطلع نہ ہونے سے علت و معلول میں جدائی کس طرح لازم آئی، اور اگر خدا تعالیٰ خواستہ سرسید نے دوسری شق کو لیا ہے، تو میں تسلیم نہیں کرتا کہ جو علت تکلیف کی سرسید نے قرار دی ہے، وہ صحیح ہے۔ اور آپ حیرت کریں گے جب یہ سنیں گے کہ جیسا کہ میں اس شق کو تسلیم نہیں کرتا، خود سرسید بھی اُس کے اعتراف کرنے پر تیار نہیں ہیں، چنانچہ اسی مضمون کے دوسرے حصے میں وہ لکھتے ہیں:

”اس بیان سے، جو ظاہراً بالکل سیدھا اور صاف ہے اور کج اور بیچ اس میں کچھ نہیں ہے، اتنی بات ثابت ہوتی ہے کہ کائناتِ فی نفسہ کوئی چیز نہیں ہے، اور نہ وہ ابتداء کسی مذہب کا اصل اصول قرار پانے کے لائق ہے، اور نہ وہ فی حد ذاتہ رہنما ہونے کے مستحق ہے۔ ہاں، بلاشبہ سچے اصول پر انسان کی طبیعت تربیت پا جائے، یا سچے خیالات سے اُس کی طبیعت موثر ہو جاوے اور طبیعت سچائی کے مطابق حالت پیدا کرے، تب وہ حالت طبیعت یعنی کائناتِ کارہنما ہوتا ہے۔“

(ایضاً تہذیب الاخلاق ص ۱۲)

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

”ہاں، یہ سچ ہے کہ قانونِ قدرت پر غور و فکر کرنے سے وہ صحیح اخلاق، جو انسان کی طبیعت کو ایسی حالت پر کر دیں جو کبھی دھوکا نہ دے دریافت کر سکتے ہیں، مگر کب جب کہ انسان کی معلومات کو ایک کافی ترقی، اور قوانینِ قدرت پر اور ان مختلف قوا کے اوپر، جو اُس کے بانی نے انسان میں رکھے ہیں، ایک معتد بہ آگاہی حاصل ہو، تمام انسان

ۛ کائناتِ (CONSCIENCE) اچھے بُرے کی تمیز، ضمیر، ایمان

ان دقائق پر نہیں پہنچ سکتے اور جو پہنچ سکتے ہیں، وہ محدود دے چند کے
سوا نہیں ہو سکتے اور وہ بھی نہ اپنی عمر میں، بلکہ پشتوں در پشتوں اور صدیوں
در صدیوں میں۔ پس اس لیے تاکہ اُس قادرِ مطلق کی حکمت بے کار نہ رہے
ضرور ہوا کہ وقتاً فوقتاً ملک اور زمانے کی حالت کے لحاظ سے، ایسے ہادی
پیدا کیے جائیں جن میں خلقی ایاب مادہ دیا گیا ہو اور جو اپنی فطرت کے اُن
سچے اخلاق کے بیان کا مخزن ہو۔

(ایضاً صفحہ ۱۲۳)

ان دونوں عبارتوں سے بھی اور اُن کی بعض اور تصریحات سے بھی، یہ ثابت ہو گیا کہ
جملہ احکام شرعیہ کی لُٹ اور علت کو سمجھ لینا، گو مطلق عقلِ انسانی سے خارج نہیں ہے، لیکن
ہر عقلِ شخصی کا یہ منصب بھی نہیں کہ ہر ایک حکم کی حقیقت اور گنہ کے سمجھ لینے کا وہ دعوٰ کر
بیٹھے۔ تو سرسید کے اُصول کے موافق سوال یہ ہے کہ سوائے اُن محدود دے چند انسانوں
کے، جو دقائقِ شریعت سے خبردار ہوں (جیسا کہ سرسید بہ زعم خود تھے)، اور لوگوں کو،
جو ایسے نہیں ہیں، مُکلف بنانا کیوں کر صحیح ہوا؟ حالاں کہ جن باتوں کے کرنے یا چھوڑنے
پر اُن کو آمادہ کیا جاتا ہے، وہ اُن کی عقلِ شخصی سے یقیناً خارج ہیں۔

مریضانِ عقل و ادراک اور | پس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا کہ ہم گرفتارِ ان
صاحبانِ عقلِ سلیم کی پیروی ہو اور ہوس اور مریضانِ عقل و ادراک، اُن اربابِ
عقولِ سلیمہ کو، جن کے کچھ کچھ اوصاف ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں، اِطبا سے روحانی سمجھ
کر اپنے لیے کم از کم اسی طرح موتِ دائمی اور ہلاکتِ ابدی سے نجات دلانے والا تصور
کر لیں، جیسا کہ ایک جاہل بیمار، جو بہ غرضِ تدادی کسی طبیبِ حاذق کے آستانے پر
حاضر ہو کر اُس کی نسبت خیال رکھتا ہے۔ اور جس طرح ایک مریض، اپنے مُعالجِ ڈاکٹر
کے کہنے سے، فقط اس اعتماد پر کہ وہ اُس کے خواص اور منافع و مضار سے کا حلقہ،

اگاہ ہوگا، کوئین کے (بلکہ نامعلوم الاسم دوا کے) کھانے کے لیے پلاپس وپیش آمادہ ہو جانا ہے (حالاں کہ ذاتی طور پر وہ اس سے کچھ واقفیت نہیں رکھتا، ٹھیک اسی طرح ارباب عقولِ سقیمہ کو لازم ہے کہ وہ ارباب عقولِ سلیمہ کے احکام کے سامنے بالکل گردن ڈال دیں، اور اُن شخصہ جات کے استعمال کرنے اور پرہیز کے قائم رکھنے میں جن کا ارباب عقولِ سلیمہ نے امر فرمایا ہو، ایک لمحہ کے لیے بھی توقف، تردد اور تنگ دلی کا دخل نہ دیں، بہ شرطے کہ طبیب اور اُن شخصہ جات کے بہ امر طبیب ہونے میں اُن کو کوئی شبہ باقی نہ رہ گیا ہو۔

فلا وربك لا يومنون
حتى يحكموك فيما شجر
بينهم، ثم لا يجدوا في
انفسهم حرجا مما قضيت
ويسلموا تسليما۔ نساء، آیت۔
پس قسم ہے تیرے پروردگار کی کہ یہ لوگ ایمان
سے ہرگز بہرہ یاب نہیں ہو سکتے، تاوقتے کہ تم کو (وایں
پیغمبر!) اپنے باہمی منازعات میں حکم نہ ٹھہرا دیں،
اور پھر تمہارے فیصلے کے سامنے بغیر کسی قسم کی
دلی تنگی کے گردن تسلیم نہ خم کر دیں۔

ایک شبہ اور اُس کا جواب | ممکن ہے کہ یہ سوال اٹھایا جاوے کہ جب ارباب
عقولِ سقیمہ کو، محض اپنی عقلوں پر اعتماد کرنا اور اُن کی ہدایات اور احکام پر چلنا
ہی روا نہیں رہا، اور نہ کسی شرعی معاملے میں اُن کے اقتضائاتِ عقلیہ کی توثیق اور
تصویب ضرور قرار دی گئی، تو آخر اس کے باور کر لینے کی ہی ہمارے پاس کیا ضمانت
ہے، کہ عقلِ سلیم و سقیم کے امتیاز اور طبیب و مریض کی تشخیص اور معالج و استعلاج
کی جستجو میں، وہی مریض عقلیں صحت و استقامت کے ساتھ ضرور کام یاب ہو جائیں گی،
اور اس کا احتمال باقی نہ رہے گا کہ جس شخص کو اُنھوں نے تن درست شمار کیا ہے، وہ
نی الحقیقت بیمار ہو اور جس کو اپنا نجات دہندہ طبیب سمجھے ہیں، وہ ایک نا اہل اور

ب کوئین: (QUININE) ایک مشہور انگریزی دوا جو بخار بالخصوص طیرا بخار
میں استعمال کی جاتی ہے۔ یہ یعنی عقلی تقاضوں کی سہ مریض، طالب علاج

خطرہ جان ہلا کو ہو !

لیکن ایسا سوال پیش کرنے والوں کو، تھوڑی دیر کے واسطے اس پر غور کرنا چاہیے کہ اگر کسی اجنبی بستی میں کوئی اجنبی طبیب آجائے، اور وہاں کے لوگوں سے اپنے فن کی حیثیت میں تعارف پیدا کرنا چاہے (حالاں کہ وہ لوگ نہ تو نظریاتِ طب سے خبردار ہیں، اور نہ انواعِ مرض سے واقفیت رکھتے ہیں، اور نہ اُن کے لیے طرقِ علاج کی صحت و غلطی کا دریافت کرنا آسان کام ہے)، تو ایسی صورت میں اُس طبیب کو اپنے مقصد میں کام یاب ہونے کے لیے کیا تدابیر اختیار کرنا پڑتی ہے !

یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ سب سے پہلے تو وہ مجامع و مجالس میں موقع بہ موقع اپنی طبِ دانی کا تذکرہ کرے گا، اپنے مطب پر ایک بڑا سا سائن بورڈ لگائے گا اور وقتاً فوقتاً اپنی اس نید کو، جو کسی محترم مدرسے سے اُس کو دستِ یاب ہوں گے، خواص کے رُوبہ رو پیش کرتا رہے گا۔ اور اس کے بعد کچھ لوگ تو عام چرچا سن کر اور محض شہرت پر ایمان لا کر، اور کچھ محض امتحان اور جانچ کرنے کی نیت سے، اور کچھ طبیبوں کے احوال و اطوار سے قدرے واقفیت رکھنے کی وجہ سے اُس کے پاس بہ غرضِ مُعالجہ آنے لگیں گے، اور بہت سے مریضوں کے پاس، اپنا اعتبار بڑھانے اور مطب کو چمکانے کے لیے، وہ بہ ذاتِ خود بغیر کسی قسم کی فیس اور مالی معاوضے کے، دُور دراز کے تعلقات جتلا کر چلا جائے گا۔

اب اس ساری جدوجہد اور دوا دوش میں اگر کچھ بیماروں کی شفا اُس کے ہاتھ سے مُقدّر ہے، تو وہ اُس کی اولیں کامیابی ہوگی۔ اور جوں جوں کہ یہ سلسلہ ترقی کرتا جائے گا، اُسی قدر اُس کی عزت اور مقبولیت کو چار چاند لگتے جائیں گے۔ انتہا یہ ہے کہ وہ کچھ زمانے کے بعد، شہرتِ عامہ کے اس درجے پر پہنچ جائے گا کہ مریضوں کو اُس کے یہاں پہنچنے کے لیے استدلال اور غور و فکر کی ضرورت باقی نہ رہے گی، اور عوام کے مُحاورات میں شفا و صحت تو اُس کی مُعالجانہ کوششوں کی طرف، اور موت و ہلاکت خالی بخت و اتفاق یا مشیتِ ایزدی کی طرف منسوب ہونے لگے گی۔ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر

یہ کہ دوسرے نئے طبیعوں کی مقبولیت کا معیار ہی اب اُس کی تسلیم و تصدیق قرار پائے گا۔

اُطباء روحانی | بعینہ اسی پر اُطباء روحانی (انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام) کے حالات کو قیاس کر دے۔ جب وہ عالم کی ہدایت کے لیے مبعوث ہوتے ہیں، تو سب سے اول وہ اپنے میں اللہ بشیر و نذیر ہونے کا نہایت زور و شور اور تحدی کے ساتھ دُعا کرتے ہیں۔ اور اپنی دعوت و تبلیغ کا غلغلہ اہل و عیال اور خویش و اقارب سے شروع کر کے مشارق و مغارب میں ڈال دیتے ہیں۔ جس کو سن کر کچھ لوگ تو اُن کے سابق چالیس سالہ زہد و ریاضت، پاک و صاف اخلاق، دیانت و راست بازی، اعراض عن المال و الجاہ، شرافت حسب و نسب اور روشن خوارق یا آیات بنیات وغیرہ امور کی وجہ سے، اور بہت سے محض ازراہ امتحان و تفتیش ہی فطرتاً اُن کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ اور بہت سے وہ خوش قسمت ہیں کہ خود انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام اپنی قوت قلبیہ اور ہمت باطنی کے زور سے، باذن اللہ اُن کو اپنی طرف جذب کر لیتے ہیں۔ اور اسی اثنا میں جب یہ لوگ روحانی امراض سے یکایک شفا یاب ہونے لگتے ہیں، اور اُن کے دلوں کی تاریکی دور ہو کر جمالِ خداوندی کا عکس اُن پر پڑنے لگتا ہے، تو وہ اپنے ہادی کی نسبت فوراً چلا اُٹھتے ہیں کہ، ما هذا بشرًا، ان هذا اِلا مَلَكٌ کَرِیْمٌ! اُس وقت ان مریضوں کو بھلا چنگا دیکھ کر اور ان کے حالات سابقہ میں ایسا انقلاب عظیم پا کر، اُوروں کے دل بھی نرمانے لگتے ہیں اور اُن کو ان کی صحت کی بحالی پر رشک آنے لگتا ہے، پھر تو مخلوقِ خدا فوج در فوج اور جُوق در جُوق ہو کر اُس پاک بندے کے گرد جمع ہو جاتی ہے، اور اپنے اپنے امراض کا مُرافعہ اُس کی طرف کرتی ہے۔ اور جیسے جیسے یہ سلسلہ وسیع تر ہوتا جاتا ہے، اندھوں کی آنکھیں کھلتی جاتی ہیں اور غافلوں کو عبرت حاصل کرنے کا موقع ہاتھ آتا رہتا ہے۔ اس کے بعد اُس کے طبیبِ حاذق (یا نبی مُرسل)

سرخیل اطباء روحانی (صلی اللہ علیہ وسلم) مثلاً سرخیل اطباء روحانی، جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم (جیسا کہ ہم نے اپنے رسالہ الاسلام میں نہایت مفصل بیان کیا ہے اور یہاں پر مختصراً ہم اپنے زمانے کے ایک (اصطلاحی) روشن خیال موقوف کے الفاظ میں لکھتے ہیں) ایک ایسے زمانے میں پیدا ہوئے، جب کہ دنیا ایک عجیب روحانی سکے کی حالت میں تھی، اور آپ ایسے ملک میں مبعوث ہوئے، جہاں اخلاقی تعلیم کا کچھ سامان نہ تھا، اور ایسی قوم کی اصلاح آپ کے ذمے کی گئی جو سوائے اوہام اور فاسد عقیدوں اور باطل خیالات اور غلط رایوں اور وحشیانہ اعمال اور بد اخلاقی اور نفاق اور جنگ جوئی کے کسی قسم کی اخلاقی خوبی نہ رکھتے تھے۔ مگر آپ کے الہامی بیان اور خدائی قوت نے اُن پر ایسی عجیب و غریب تاثیر کی کہ اُس سے اُن کی تمام ظاہری و باطنی حالتیں بدل گئیں، برسوں کے بہکے ہوئے خدا کی راہ پر چل نکلے اور مدتوں کے سوئے ہوئے غفلت کی نیند سے چونک پڑے۔ جو مشرک تھے وہ مؤجد ہو گئے، جو کافر تھے ایمان لائے، جو بُت پرست تھے وہ بُت شکن بن گئے، جو گمراہ تھے وہ خدا کی راہ دکھانے لگے۔ جاہلانہ حمیت اور وحشیانہ عصبیت کا اُن میں نام نہ رہا۔ خاندانی جھگڑے اور پشتینی عداوتیں جاتی رہیں۔ دماغ غرور و نخوت سے خالی ہو گئے اور اُن کے دل صبر و توکل، حلم و بردباری، زہد و پرہیزگاری اور جمیع اخلاقی صفات سے بھر گئے۔ آپ کی تعلیم و ہدایت نے ایک ایسا گروہ خدا پرست، پاک طبیعت راست باز، نیک دل لوگوں کا قائم کر دیا، جن کی کوششوں سے شرک و بُت پرستی کی آواز، جو جزیرہ گائے عرب میں گونج رہی تھی، بند ہو گئی اور اس کے بدلے ایک چون و بے چلوں، بے شبہ و بے نوسل خدا کی منادی پھر گئی۔ بتوں نے عدم کا راستہ لیا، بُت خانوں کا نشان مٹ گیا، آتش گدے ٹھنڈے پڑ گئے، تثلیث کا طلسم ٹوٹ گیا، اوہام پرستی کا باطل خیال باطل ہو گیا۔

یعنی واضح روشن

جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ، إِنَّ
الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوًّا
حق ظاہر ہو گیا اور باطل مغلوب۔ بلاشبہ
باطل مغلوب ہی ہو کر رہتا ہے۔

کیا اس سے اس امر کا مشاہدہ اور درخشاں ثبوت نہیں ملتا کہ آپ حقیقت میں سچے
رسول (طیب حاذق) اور خدا ہی کی طرف سے مویّد تھے اور نہ ان کا کام نہ تھا کہ
وہ انقلابِ عظیمِ عرب کی روحانی اور اخلاقی حالت میں پیدا کرتا، اور ایسے جنگ جو،
ستم پیشہ لوگوں کو، جو بات بات پر لڑتے اور جھگڑتے، اخوت کے ایک رشتے میں
باندھ دیتا، اور ان کی پشتینی عداوتوں اور کینوں سے اُن کے دلوں کو ایسا صاف
کر دیتا کہ اُس کا کچھ اثر باقی نہ رہتا، بلکہ دُنیا میں اُن کو اخلاق اور انانیت
کا نمونہ بنا دیتا۔

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کی ایسی عجیب و غریب تاثیر اور حیرت انگیز
نتائج کو دیکھ کر مُنکرین بھی اس بات کے مُعترف ہیں کہ درحقیقت یہ بات بشری قدرت
سے خارج تھی۔ چناں چہ کوئی اُن میں سے کہتا ہے کہ: ”وہ پیام جو آپ لائے، وہ
ایک سچا اور حقیقی پیام تھا، جس کا مخرج وہی ہستی تھی جس کی نگاہ کبھی کسی نے نہیں
پائی۔“ کوئی لکھتا ہے کہ: ”قرآن ہی کی تعلیم کا یہ اثر ہے کہ عرب کے رہنے والے ایسے
بدل گئے، جیسے کسی نے سحر کر دیا ہو۔“ مُنقصب سے مُنقصب عیسائیوں میں سے سخت
سے سخت مُنقصب یہ اقرار کرتا ہے کہ: ”دینِ مسیحی کی ابتدا سے آں حضرت صلی اللہ علیہ
وسلم کے وقت تک، کبھی حیاتِ روحانی ایسی برانگیختہ نہیں ہوئی تھی جیسی کہ اسلام
کی تعلیم سے ہوئی۔“

پھر کیا ایسے ایسے واشگاف ثبوتوں اور کھلی کھلی دلیلوں کے بعد بھی کوئی محروم
البصیرت ایسا نکلتے گا، جو باوجودِ دے کہ اپنے کو مرئض سمجھتا ہو اور کسی نافع اور باہر
طیب کی طرف رجوع کرنے کا خواہش مند بھی ہو، لیکن طیبِ عرب (نہیں، بلکہ طیبِ
عرب و عجم) کے ان چمکتے ہوئے کارناموں سے مُنہ پھیر لے اور اُس کی تجویز اور تشخیص
کے سامنے (جو لاریب خدا کی ہی تجویز و تشخیص ہے، بے چون و چرا اور بے ریب

وترد گردن ڈال دے اور کم از کم تجربہ ہی کے طور پر، اُس کی بتلائی ہوئی سدا یرد
معالجات و پرہیز پر چند روز عمل کر کے نہ دیکھے؟

عقل انسانی کی لغزشوں کی وضاحت | ایسے ہی کور باطنوں کی نسبت (جو ابھی
محی الدین ابن العربی کی زبانی | تک اسی طرح کی بدیہی صداقت کی تسلیم
کے واسطے نہایت پیچیدہ اور دور آزار مسائل و دلائل کی تلاش میں مقبول سرگرداں
رہ کر، عمر عزیز ضائع کر رہے ہیں اور دن سے زیادہ روشن واقعات کی طرف آنکھ نہیں
اٹھاتے) عارف باللہ حضرت شیخ محی الدین بن العربی قدس اللہ سرہ ارشاد فرماتے ہیں کہ:

”ہمارے نزدیک سب سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ انسان (ہر بات
میں) خدا کو چھوڑ کر، محض اپنی نظر و فکر کی ہی تقلید کرے، جالاں کہ وہ جانتا
ہے کہ اُس کی یہ فکر بھی، خود اُس کی ذات کی طرح ایک امر حادث اور مخلوق
ہے اور اُن تو اُمیں سے ایک قوت ہے، جو خداے تعالیٰ نے انسان کے اندر
ودیعت کی ہیں۔ (اُسے معلوم ہے) کہ اللہ تعالیٰ نے قوتِ مُفکرہ کو عقل انسانی
کے واسطے ایک خادم بنایا ہے، (لیکن اس پر بھی) عقل خود اُس کی خادم
بن کر چھپے ہوئی ہے۔ باوجودِ دے کہ وہ یہ بھی جانتی ہے کہ وہ قوتِ مُفکرہ
جو کچھ اُس کو عطا کرتی ہے، وہ اُس میں اپنے حدود مرتبے سے ذرا بھی تجاوز
نہیں کر سکتی اور وہ اُس سے عاجز ہے کہ کسی دوسری قوت کی سرحد میں قدم
رکھ سکے، مثلاً قوتِ حافظہ یا مُصَوِّرہ کا کام اُس سے نکل سکے، یا قوتِ مُتخیلہ کے
قائم مقام بن سکے، یا حواسِ خمسہ (لمس، طعم، شمع، سمع، بصر) میں سے
وہ کسی ایک کے فرائض کو انجام دے سکے۔

یہ سب کچھ ہے اور قوتِ مُفکرہ کی حدود و اختیارات کی یہ تنگی بھی سب
کو معلوم ہے، مگر اس پر بھی یہ کس قدر حیرت انگیز بات ہے کہ عقل انسانی،
اپنے پروردگار کی معرفت کے بارے میں، اُسی فکر ناقص کی تقلید پر اُڑی ہوئی
ہے اور اُس کا پروردگار خود جو کچھ اپنی کتاب میں اور اپنے رسول کی زبانی

اپنی نسبت بیان فرماتے ہیں، اُس کی تقلید سے برابر کتراتی ہے !
 عالم میں جو غلطیاں مختلف طرح کی پھیلی ہوئی ہیں، عقل کی یہ غلطی ان سب
 میں عجیب تر ہے اور تماشہ ہے کہ سوائے اُن محدود لوگوں کے جن کی بصیرت
 کی آنکھیں خدا تعالیٰ نے روشن کر دی ہیں، ہر صاحب فکر اسی عام غلط کاری
 میں مبتلا ہے۔ ہاں، ارباب بصیرت خوب جانتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ نے ہر چیز
 کی ایک خاص فطرت بنائی، (اور اُسی خاص فطرت کے اعتبار سے اُس
 شے کے عمل و حرکت کی حد بندی کر دی ہے)۔ مثلاً قوتِ سامعہ (یا کانوں) کی
 فطرت، مسموعات (آوازوں) کے ادراک سے تجاوز نہیں کر سکتی، اور عقل
 انسانی فقط اسی حلقے میں اُس کی محتاج اور آوازوں کی شناخت، حروف
 کے قطع و برید، الفاظ کے تغیرات اور لغات کی تقسیم میں اُس سے امداد کی
 طالب ہے۔ چنانچہ عقل انسانی قوتِ سامعہ ہی کے ذریعے سے پرندوں کے
 چہچہے، ہواؤں کی سائیں سائیں، کوڑروں کی چوچوں چوچوں، پانی کی خرخر، انسان
 کی چیخ و پکار اور دوسرے جانوروں کی بولیوں میں تفریق کرتی ہے؛ ورنہ
 عقل انسانی میں بجائے خود یہ قدرت کہاں کہ بغیر توشیح و سمیع کے، ان چیزوں
 کے باہمی امتیازات کو قائم رکھ سکے !

اسی طرح قوتِ بصرہ (آنکھوں) کو خیال کر دو کہ اُس کا دائرہ عمل محض
 مبصرات (دیکھائی دینے کے قابل چیزوں) تک محدود ہے۔ یعنی عقل کو اُس کی
 امداد کے بغیر سبزی کو زردی سے اور زردی کو سفیدی سے اور سفیدی کو
 سیاہی سے اور اسی طرح ہر ایک رنگ کو دوسرے رنگ سے جدا کرنا عاذاً
 ممکن نہیں۔

اور یہی حال ان دونوں کے مابین دوسری اُن تمام قوتوں کا ہے، جو اُس
 کے نام سے مشہور ہیں اور نیز قوتِ خیالیہ کا، جس کو اپنی کارگزاری میں کوئی خاص
 کی احتیاج ہے۔ کیوں کہ تنجیل فقط اُن چیزوں کے ساتھ ہی متعلق ہو سکتا ہے

جو حواس کے ذریعے حاصل ہوتی ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس، قوتِ حافظہ اگر خیال کی حاصل کی ہوئی اشیاء کو نہ رد کے رکھے، تو خیال کے خزانے میں کچھ بھی باقی نہ رہے۔ اس حیثیت سے جیسا کہ وہ حواسِ خمسہ کا محتاج ہے، ایسے ہی قوتِ حافظہ سے بھی بے نیاز نہیں۔

پھر قوتِ حافظہ کو بہت سے ایسے موانع پیش آتے ہیں، جو اُس کے اور خیال کے درمیان حائل ہو کر، قوتِ حافظہ کے ضعف اور اُس سے اُمورِ کثیرہ کے فوت ہونے کا باعث بن جاتے ہیں؛ اس لیے ایک قوتِ مدِکرہ کی حاجت ہوئی، جو قوتِ حافظہ کی مددگار بن کر، اُس کو وہ باتیں یاد دلایا کرے جن سے ذہل ہو گیا ہو۔

ان سب کے بعد قوتِ مُفکرہ خیال کی طرف متوجہ ہوتی ہے تاکہ قوتِ مُصورہ کے توسط سے خیال کے حاصل کردہ اُمور کو، اس طور پر ترکیب دے کہ اُس سے کسی دعواء کے متعلق ایسی دلیل پیدا ہو جاوے، جس کی انتہا ان مجسوتا اور بدیہیات پر ہوتی ہو، جو آدمی کی چمکت میں مرکوز ہیں۔ اس طرح سے جب فکر، دلیل کو ایک اچھی معقول صورت پر قائم کر دیتا ہے، تو اب عقلِ انسانی اُس بنی بنائی چیز کو لے کر دعوے پر منطقی کر دیتی ہے۔ لیکن وہاں سے یہاں تک پہنچنے میں، جتنی قوتوں کو کچھ بھی دخل رہا، اُن میں سے کوئی ایسی نہیں جس کے کام میں بہت سے موانع اور بہت قسم کی غلطیوں کا مشاغل نہ ہو، اور ایسے معیار کی ضرورت نہ پڑے، جو صحیح کو فاسد سے اور مغز کو پوست سے جدا کر سکے۔

پس تم غور کرو کہ عقل فی حد ذاتہ کس قدر جاہل، کیسی بے بس اور دوسری قوتوں کی کتنی حاجت مند ہے؛ اور ان قوتوں میں سے ہر ایک کو جو اعتلاط میں آتے ہیں اور جہاں تک اُس کے دائرہ عمل کی تحدید کی گئی، وہی سب پر روشن ہو گئی۔ لیکن اس پر جب اُس کو کوئی بات، اس مخدوش اور خطر

طریق سے بہت سی ٹھوکریں کھا کر حاصل ہوتی ہے اور اس کے مقابلے میں دوسری جانب خود خداوند رب العزت کوئی خبر دیتا ہے، تو یہ کہہ کر وہ خدا کی بتلائی ہوئی بات کو مال دیتی ہے کہ میرا غور و فکر اس کو رد کر چکا ہے۔ اللہ اکبر! یہ عقل خدا تعالیٰ کے مرتبے سے کس قدر جاہل ہے کہ اُس نے اپنے فکر ناقص کی تقلید میں خدا تعالیٰ پر جرح کرنے کو آسان سمجھا، حالانکہ تم پہلے سمجھ چکے ہو کہ عقل کے پاس بجائے خود کسی طرح کا اور کسی شے کا بھی علم موجود نہیں، اُس کا کام محض حواسِ خمسہ، قوتِ خیالیہ، قوتِ مصورہ اور علیٰ ہذا القیاس دوسری قوتوں کو عطا کیے ہوئے علوم کو قبول کرنا ہے، تو ایسی حالت میں اُس کے لیے نہایت ہی مناسب تھا کہ وہ بجائے قوتِ فکرِ وغیرہ اپنے عظام کے سامنے دستِ سوال دراز کرنے اور اُن کے عطایا کو قبول کرنے کے، اپنے آقارب العزت کے رُوبہ رُوبہ ہاتھ پھیلاتے اور اُسی کی بخششوں کو لے کر سر اور آنکھوں پر رکھتے۔

اور جب کہ اُسے معلوم ہے کہ اُس کا فکر خیال کا مُقلد ہے اور خیال حواسِ خمسہ کا، اور اس کے ساتھ ہی اُس کو اپنی امداد کے لیے قوتِ حافظہ اور مُذکرہ کی بھی حاجت ہے، اور یہ بھی علم ہے کہ یہ تُو اپنی اپنی سرحدِ فطرت اور دائرہ عمل سے باہر ایک قدم نہیں رکھ سکتے (مثلاً خوبصورت، بدصورت کے ادراک میں کانوں سے کام نہیں چل سکتا، اور آوازوں کے بُرے بھلے کو آنکھیں نہیں سمجھ سکتیں، خوش بو اور بد بو کا امتیاز زبان کے حد و عمل سے خارج ہے، اور تلخ و شیریں کی تفریق سے ناک کو کوئی سروکار نہیں اور علیٰ ہذا القیاس، خود عقل کو اپنی ذات کے اعتبار سے، اُن چند ضروریات کے سوا جن کا علم فطرتاً ہوتا ہے، اور کوئی چیز معلوم نہیں، تو بھلا تمام قوتوں کے اس طرح کی تنگ میدانی اور بے چارگی کے باوجود بھی، کیا وجہ ہے کہ ہماری عقل اُس شخص کے قول کو قبول نہیں کرتی، جو انسان میں

قوتِ مفکرہ کے سوا ایک اور ایسی قوت کا قائل ہے، جس کے احکام قوتِ مفکرہ کے احکام سے بالاتر ہوں اور جس کو اُن طریقوں کے استعمال کرنے سے، جو اس فن کے تجربہ کاروں نے لکھے ہیں، بہ موہبتِ الہی اہل اللہ (ملائکہ) انبیاء اور اولیائے کاملین اپنے اندر پاتے ہیں، اور کل کتبِ سماویہ جس کے وجود کی خبر دینے میں بہ آوازِ دہلِ ناطق ہیں۔ اس لیے تم کو چاہیے کہ اخبارِ الہیہ کے ماننے میں اپنی عقول (ناقصہ سقیمہ) کی کچھ پرواہ نہ کرو اور مخلوق کے مقابلے میں خالق کی تقلید کو بہتر سمجھو؛ کیوں کہ کثیر التعداد انبیاء و اولیاء نے اُسی چیز کو قبول کیا اور اُسی پر وہ ایمان لائے اور اُسی کی تصدیق کی، اور ہمیشہ وہ اُسی کو پسند کرتے رہے کہ اپنے رب کی معرفت میں خود اُسی کی تقلید کرنا، اپنے اوہام و افکار کی تقلید سے اولی و اُلفع ہے۔ پھر اد عقلِ منہن کر اخبارِ الہیہ سے انکار کرنے والے، تجھ کو کیا ہوا کہ خدا کے بارے میں تو خود خدا کی اور اس کے برگزیدہ بندوں کی نہیں سُننا، اور اپنے خیالات کے پیچھے پڑا پریشان ہو رہا ہے۔

دیکھو، جب یَا اَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا آمَنُوا کے سننے والوں کو یہ معلوم ہوا کہ علاوہ اُس ایمان کے، جو دلائل و انکار سے ہم کو حاصل ہو چکا، کوئی دوسرا ایمان بھی مطلوب ہے، تو انھوں نے معاریاضت، خلوت اور مجاہدہ کا طریق اختیار کیا اور خدا کو فراموش کرنے والے تعلقات کو یک لخت منقطع کر کے، دنیا میں رہ کر ہی وہ دُنیا سے الگ ہو بیٹھے اور دل کو سب جھگڑوں سے خالی اور قلب شوائبِ افکار سے پاک کر کے، خالص خدا کی طرف متوجہ ہوئے، کیوں کہ انبیاء و مرسلین سے یہی راستہ اُن کو معلوم ہوا تھا۔ اور انھوں نے سُن رکھا تھا کہ بندہ جب سارے دل سے خدا کی طرف متوجہ ہوتا ہے، تو حق تعالیٰ بھی اُس پر اپنی مہربانی اور رحمت کا سایہ ڈالتا ہے اور اپنے دامنِ عطوفت میں لے لیتا ہے۔

اس سے اُنھوں نے سمجھ لیا کہ خدا کی طرف جانے والوں کے لیے فکر کے راستے سے یہ راستہ زیادہ نزدیک ہے؛ کیوں کہ خود خداوندِ رب العزت اپنے رسول کی زبان سے یہ مُنادی کرادی کہ جو کوئی ہماری طرف پلک کر آتا ہے، ہم اُس کی طرف دوڑ کر جاتے ہیں، اور یہ کہ آسمان میں نہ زمین میں، بلکہ فقط قلبِ مومن میں یہ وسعت ہے کہ وہ ہماری عظمت و جلال کا تحمل کر سکے۔

اس بنا پر یہ لوگ، اپنے سارے دل سے خدا کی بارگاہ میں مُتوجہ ہوئے اور تمام قوا و افکار کے دھندل کو چھوڑ دیا۔ اُس وقت خدا تعالیٰ نے اپنے نور میں سے علمِ صادق کی ایک روشنی اُن کے دلوں پر ڈال دی، اور اُن کو خالص اپنا ہی والہ و شہید ابنا لیا۔ پھر کیا تھا، نظر و فکر کی وہ ساری کم زوریاں کا فور ہو گئیں، اور خالقِ اکبر کے ارشادات و قوانین کے سامنے اُنھوں نے اپنی عقلوں کے تیار کیے ہوئے قانون کو بھلا دیا۔

تم خود سوچو اور انصاف کرو کہ اگر ہر کس و نا کس، اپنی عقلِ شخصی کے بتائے ہوئے قانون پر چلنے کا مجاز کر دیا جاوے، جیسا کہ آزاد خیالی کے مدعی آج کل چاہتے ہیں، تو دنیا میں کیا کچھ خربطہ ہو اور ہزاروں لاکھوں خود تراشیدہ قوانین کی کش مکش میں (جو ہر گروہ اپنے پیمانہ فکر اور اندازہ فہم کے موافق تیار کر سکتا ہے)، لوگوں کی کیا کچھ دُشوار ہو جائے!

تعارض کے وقت نقل پر عقل کو | بہت سے لوگ یہ کہتے ہیں کہ جب عقل و نقل میں ترجیح حاصل نہ ہونے کی وجہ | مُزاحمت واقع ہو کرے، اُس وقت ہم کو یہ اختیار ملنا چاہیے کہ ہم عقل کے احکام کو، نقلِ صحیح کی تسلیم سے مُقدم سمجھیں؛ کیوں کہ نقل کے

ماننے کا اصل ذریعہ ہی عقل ہی ہے، تو خدا نخواستہ عقل کو بے اعتبار ٹھہرانے کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم عقل و نقل، دونوں کی طرف سے بدگمان ہو گئے ہیں۔

لیکن اس شبہ کا جواب، آپ کو ہماری تقریر سابق سے بہ وجہ احسن معلوم ہو چکا ہے۔ کیوں کہ ہم مدلل طور پر بتلا چکے ہیں کہ عقل سلیم و نقل صحیح میں تعارض ہو ہی نہیں سکتا۔ ہاں، اگر عقل کی سلامتی اور نقل کی صحت مخدوش ہو جاوے، تو بے شک ایسا ہونا ممکن ہے، مگر اُس وقت ہمارا پہلا فرض یہ ہو گا کہ یا تو اپنی عقل کو مرض سے چھڑانے اور سلامتی پر لانے کی کوشش کریں، اور یا نقل کے ثبوت کے واسطے کوئی قابل و ثبوت ذریعہ ہم پہنچائیں۔ و دونہ خراط القیاد۔ اس جواب کی پوری تفصیل، شیخ الاسلام

ابن تیمیہ نے اپنی بیش بہا اور ضخیم کتاب بیان موافقة صریح المعقول بصحیح المنقول میں لکھی ہے، جس کے جسنہ جسنہ اقتباسات بھی ہم باوجود قصد کے، تطویل کے خیال سے قلم انداز کر کے، آخر میں یہ گزارش کرتے ہیں کہ:

فکرو استدلال عبث نہیں! جو کچھ ہم نے اس مضمون میں یہاں تک بیان کیا ہے، اُس کا یہ منشا ہرگز نہیں کہ فکر و استدلال ایک محض عبث اور لغو چیز ہے، یا اُس سے تعرض کرنا کوئی شرعی گناہ ہے۔ لیکن ہاں، کسی فرد بشر کے واسطے ہم یہ جائز نہیں رکھتے کہ وہ اپنی عقل شخصی اور فکر ناقص کو اصل اصول ٹھہرا کر، انبیاء علیہم السلام کی پاک وصاف، صحیح و صادق اور بلند و برتر تعلیمات کو زبردستی اُن پر منطبق کرنے کی کوشش کرے، جس پر اکثر اوقات اُس کا ضمیر بھی خود اندر سے نفرب کر رہا ہو۔ اس کے برخلاف، نہایت ضروری ہے کہ انسان، خدا اور اُس کے رسولوں کے ارشادات کو اصل قرار دے کر اپنی عقلی معلومات کو اُن کے تابع بناوے اور جو کچھ وہ فرمائیں، اُس کو اپنے امراض مدعا کے حق میں اکسیر شفا تصور کر کے، سمعاً و طاعتاً کہتا ہو ابلا محجت و تکرار سر اور آنکھوں پر رکھتے۔

وَالَّذِينَ يُحَاجُّونَ فِي اللَّهِ مِنْ
 بَعْدِ مَا اسْتَجِيبَ لَهُ حُجَّتُهُمْ فَمَا
 دَاخِضَهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَعَلَيْهِمْ
 غَضَبٌ وَلَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ ۝۶۰

اور جو لوگ اللہ کے بارے میں نبی سے جھگڑا
 کرتے ہیں، جب کہ آدمی اُس کی بات
 قبول کر چکے، تو اُن کی مُجّت باطل ہے اور ان پر
 خدا تعالیٰ کا غضب ہے اور اُن کے لیے سخت عذاب۔

تنبیہ | جو کچھ ہم نے اس رسالے میں، اپنے نزدیک اختصار جامع اور متانت و
 معقولیت کے ساتھ لکھا ہے، اُس کا زیادہ تر زور (جیسا کہ ناظرین محسوس فرمائیں گے)،
 عقل کی صحت و سلامتی پر رہا ہے لیکن صحت و ضعف کے قواعد و شرائط وغیرہ سے یہاں
 مطلقاً بحث نہیں کی گئی، جس کے واسطے اول تو علم اصول حدیث کی کتابوں کا مطالعہ
 ان شاء اللہ کافی ہوگا، اور اگر وقت نے مُساعدت اور قادرِ مطلق نے امداد فرمائی، تو
 ہم ایک مُستقل رسالہ اس موضوع کے مُتعلق بھی لکھ کر، اہل ملک کے رُوبہ رُوبہ پیش
 کریں گے۔ جس میں مولانا عبد اللہ العمدی کے رسالہ علم الحدیث پر بھی بسوط تبصرہ
 کیا جاوے گا۔ وَمَا ذَلِكَ عَلَى اللَّهِ بِعَزِيزٍ، وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنْ الْحَمْدُ
 لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ۔

التراقیم :
 شبیر احمد عثمانی عفا اللہ عنہ
 دارالعلوم دیوبند
 ۲۲ ربیع الثانی ۱۳۳۳ھ

خوارق عادات

(اسلام اور معجزات)

افادات

حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ
ترتیب و تحقیق: خالد القاسمی

معجزہ تو ہم پرستی نہیں، یہ ایک حقیقت اور قدرت
انسانی کے عین مطابق، اللہ کی قدرت کا خاص
منظر ہے، موجودہ سائنسی دور میں معجزہ
خلاف عقل نہیں قانون قدرت کا علمی ظہور ہے

منتظم اشاعت

ناشر

دارالعلوم حمید آباد۔ آندھرا پردیش © دارالمؤلفین دیوبند یو پی

با اهتمام: وجید الزماں قاسمی کیرانوی
معتمد دارالمؤلفین دیوبند

طبع اول سلسلہ اجمہ ۱۹۹۲ء
قیمت رسالہ خوارق عادات ۸/۰

خوارق عادات

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضامین	صفحہ	نمبر شمار	مضامین	صفحہ
۱	ارشاد علامہ انور شاہ کشمیری	۱۵۶	۱۳	خوارق کا وجود دماغی ترقی کا	۱۴۲
۲	خوارق عادات اور قانون	۱۵۷	۱۴	سبب ہے۔	۱۴۲
۳	قدرت کا باہمی رشتہ۔	۱۵۷	۱۵	خوارق کا ماننا دہم پرستی نہیں	۱۴۲
۴	خوارق کا وجود قوانین فطرت کا	۱۵۸	۱۶	ساتس خوارق کے لئے راستہ	۱۴۲
۵	دشمن نہیں	۱۶۰	۱۷	صاف کر رہی ہے۔	۱۴۲
۶	معجزہ ایک قانون قدرت ہے	۱۶۱	۱۸	عادت عامہ اور خاصہ	۱۸۱
۷	معجزہ انسان کو عالم بالائی کی چمک	۱۶۱	۱۹	معجزہ کوئی فن نہیں	۱۸۲
۸	دکھاتا ہے۔	۱۶۲	۲۰	معجزہ ایسے حالات کے ساتھ	۱۸۵
۹	روح کے متعلق چار نظریے	۱۶۲	۲۱	آتا ہے جن میں شبہ کی گنجائش نہ رہے	۱۸۵
۱۰	روحانی مناظر کا انکار جہل ہے	۱۶۲	۲۲	معجزہ خدا کی طرف سے نبوت	۱۸۶
۱۱	ارواح مجردہ یا ایک لطیف	۱۶۵	۲۳	کی فعلی تصدیق ہے۔	۱۸۶
۱۲	روحانی عالم کا وجود	۱۶۸	۲۴	معجزہ، کرامت، ارہاس، کرامات	۱۸۹
۱۳	خوارق کے انکار کا سبب علمی	۱۶۹	۲۵	اور استدراج کا فرق	۱۸۹
۱۴	کم مائیگی ہے	۱۷۰			
۱۵	سچا مذہب قوانین فطرت کا	۱۷۰			
۱۶	وسیع النظر معلم ہے	۱۷۱			
۱۷	معجزات و خوارق کے انکار کا	۱۷۱			
۱۸	اصلی راز	۱۷۱			
۱۹	خوارق کو ماننے سے قوانین طبع	۱۷۱			
۲۰	کا اعتبار زائل نہیں ہوتا۔	۱۷۱			

ارشاد عالی

حضرت علامہ محمد انور شاہ صاحب کشمیری

الحمد لله وكفى وسلاماً على عباده الذين اصطفى .
 ایک مدت گزرتی ہے، کہ احقر نے مولانا علامہ العصر مولوی شبیر احمد صاحب عثمانی کی عالی خدمت میں عرض کی تھی کہ تفسیر قرآن، اس زمانے کی ضرورت کا لحاظ کر کے، جو بقاے دین محمدی کا واحد مدار اور دنیا کو اس کا انتظار ہے، اس کا ایک مقدمہ مسوط علاحدہ لکھا جانا چاہیے جس میں چند مسائل اور عقاید عقلی و نقلی سلف صالح اور اہل سنت و الجماعت کے طریقے پر کیے جاویں، مثلاً: مسئلہ تقدیر، خلق افعال عباد اور مسئلہ معجزات، جس میں اکثر یورپ کے جذبات کے مقلدین تحریف سے کام لیتے ہیں۔

سو، الحمد لله ولله المنة کہ جناب مشتطاب موصوف الصدور نے مسئلہ معجزات کو لکھ لیا ہے، اور ان شاء اللہ المستعان ایسا واقع ہوا ہے کہ احقر کے دائرہ تمنا سے بہت اعلیٰ و ارفع اور ایسا حاوی اور منضبط، کہ ہر ایک حق پسند سے یہ امید قائم ہو گئی کہ دیکھتے ہی ان شاء اللہ بدوں کسی تردد کے مطمئن ہو جائیں گے اور ایک بڑے مقدمہ تفسیر کا فیصلہ ہو جائے گا۔

حق تعالیٰ مولف علام کو جملہ اہل حق کی طرف سے جزائے خیر دے۔ واللہ ولی التوفیق

احقر محمد انور عفا اللہ عنہ

۱۵ ربیع الاول ۱۳۶۶ھ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ
حَامِدًا و مُصَلِّيًا و مُسَلِّمًا.

خوارقِ عادات اور قانونِ قدرت کا باہمی رشتہ

ہندوستان کی عام فضا، اگرچہ خدا کے فضل سے ابھی تک ایسی مسموم نہیں کہ خوارقِ عادات کا لفظ سننے سے لوگوں کو وحشت ہونے لگے، لیکن انگلش تعلیم و تربیت کے تیار کیے ہوئے نوجوانوں کی جماعت ایسی موجود ہے، جو ان چیزوں کا مذاق اڑاتی ہے۔ خواہ ملحدینِ یورپ کی کورانہ تقلید سے، یا نئی تعلیم کے خاص اثرات اور ماحول سے، یا محض ”ینگ مین“ کہلانے کے لیے خوارق سے تمسخر کرنا ان کا فیشن ٹھہر گیا۔

اردو زبان کی زُرُقِ برُوق تصنیفات میں چوں کہ بیش تر حصہ انہی صاحبوں کا ہے، اس لیے ان کے خیالات کے جراثیم پبلک میں بھی تیزی سے سُرایت کرتے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ چند پُرانے راسخُ الاعتقاد علماء کو مستثنا کر کے، ہمارے عربی مدارس کے بہت سے نئے تعلیم یافتہ بھی ”خوارق کے ذکر سے کچھ کترانے لگے ہیں، کہ مبادا ہم کو مُقَدَّم الذکر جماعت کی طرف سے ”احتمق“ اور ”دہم پرست“ کا خطاب دیا جائے!

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ کاتبِ سطور ایک ایسی جماعت سے تعلق رکھتا ہے، جو نہ صرف قدامت پسند ہے، بلکہ اپنی قدامت پسندی پر ناز کرتی ہے؛ لہذا اس مضمون کے لکھتے وقت اس کا کوئی غم نہیں کہ کچھ لوگ اپنی ”عقل“ کے نشے میں مجھے ”سادہ لوح“ ”دہم پرست“ یا ”پُرانی لکیر کا فقیر“ کہیں گے۔ یہ لوگ اپنے کو کتنا ہی عاقل سمجھیں، لیکن میری درخواست صرف یہ ہے کہ محصوم نہ سمجھیں۔ جو کچھ اُن سے کہا جائے، انہیں اختیار ہے رد کر دیں، مگر بغور سننے کے بعد رد کریں، اس مضمون میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں، یہ دعا نہیں کہ کوئی نئی تحقیق ہے، ہاں، طرزِ ادا اور ترتیب بیان ضرور نئی ہے۔

میں نے اسی موضوع پر پہلے بھی کچھ لکھا ہے، جو بعض رسائل کے ضمنی مباحث میں شائع ہو چکا ہے۔ لیکن اس وقت کلام کی ایک خاص نوعیت ہوگی، جو پہلے مضامین میں اس قدر اہتمام سے مرعی نہ تھی۔ اور وہ نوعیت یہ ہے کہ خوارقِ عادات (معجزات وغیرہ) اور قانونِ فطرت کے باہمی تعلق پر ایک صاف اور تیز روشنی ڈالی جائے، جو ہمارے اور مُنکرینِ خوارق کے اختلافات کے اصلی نقطہ بحث کو پوری طرح واضح اور آشکارا کر دے۔

خوارق کا وجود قوانینِ فطرت کا دشمن نہیں | موجودہ سائنس کی ساری عمارت کی بنیاد یہ ہے کہ فطرت یک ساں اور باقاعدہ کام کرتی ہے۔ اگر واقعاتِ عالم ایسے طور سے وقوع میں آئیں، جیسے مرض ”کابوس“ یا خواب بائے پریشاں میں واقع ہوتے ہیں، تو فطرت کا مطالعہ کرنا فضول ہوگا۔ اگر خوارق و معجزات کے پائے جانے سے فطرت کی یک سانی اور باقاعدگی میں فرق آئے اور قوانینِ قدرت میں بے ترتیبی اور گڑبڑی پیدا ہو، تو جو لوگ خوارق کے امکان پر غور کرنے سے انکار کرتے ہیں، اُن کو شاید معذور رکھا جائے۔

لیکن واقع اس طرح نہیں ہے۔ ہم معجزات و خوارق کو قوانینِ قدرت کے خلاف نہیں کہہ سکتے، بلکہ ہمارے نزدیک وہ ایک ایسی دیرکچی ہے، جہاں سے قدرت کا چہرہ زیادہ صفائی اور زیادہ قریب سے نظر آتا ہے۔ خوارق کا اُجھانا وقوع ہی وہ چیز ہے، جس سے ہم اُن مُنظم قوانینِ قدرت کے متعلق یہ یقین حاصل کرتے ہیں کہ وہ قوانینِ قدرت ہیں، کسی غیر قادر یا غیر مختار سستی سے یوں ہی بالاضطرار نہیں بن گئے ہیں۔

معجزہ قوانینِ فطرت | اگر کوئی احمق، کائنات کی پُر اسرار سستی میں نہایت محکم اور مرتب کی حمایت کرتا ہے | قوانینِ فطرت کی موجودگی سے انکار کرے، تو معجزہ بجائے اُس کی تائید کرنے کے، اُس کے رد کرنے کی کوشش کرے گا، کیوں کہ معجزہ اُسی وقت معجزہ کہلایا جاسکتا ہے، جب کہ دنیا میں تکوین کا کوئی ضابطہ اور قانون موجود ہو، پھر وہ (معجزہ) اپنے کو اس ضابطہ اور قانون سے اعلیٰ اور ارفع ثابت کرے۔

معجزات وغیرہ کے ماننے سے | اسی بے معجزات و خوارق کی حمایت کرنے والے بھی
دنیا کا نظام مختلف نہیں ہوتا | دنیا کو منظم اور مرتب مانتے میں اپنے مخالفین کے ہم نوا
ہیں اور اُن کے اعمال، تجاویز، توقعات اور سارے انتظامات بھی ایسے ہی مستقل،
ہموار اور یکساں ہیں، جیسے اُن کے، جو معجزات وغیرہ کو نہیں مانتے۔

معجزہ قانونِ قدرت کے مطابق ہے | معجزات وغیرہ اگر گاہ بہ گاہ وقوع میں آئیں، تو
وہ اُسی خَلّاقِ عالم کا کام ہوں گے، جو ہمیں روزانہ فطرت کے عمل کے معمولی عجائبات
دکھاتا رہتا ہے۔ اور جب ایسا ہے، تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ خود معجزات قانونِ قدرت کے
مطابق ہوں، البتہ وہ قانون، اُس قانون سے اعلیٰ ہوگا جس سے طبعی سائنس اُٹلتا ہے۔
معجزہ فطرت کے قوانینِ اصلہ کا محافط ہے | فطرت اور کائنات، دونوں کا یہ تقاضا ہے
کہ ہم خدا کی نسبت یہ خیال کریں کہ وہ اُتری و اِختلال کو نہیں، بلکہ اُمن و لُطم اور ترتیب
کو بالذات پسند کرتا ہے۔ لیکن جب انسان خدا کے بخشے ہوئے اختیارات کے غلط اور
بے موقع استعمال سے، دنیا کے اُمن و انتظام کو توڑتا ہے، تو بسا اوقات ایسے خوارق ظہور
پذیر ہوتے ہیں، جو ہماری پیدا کی ہوئی اُتری کا علاج اور فطری اُمن و انتظام کے
بحال کرنے کا سبب ہوں۔ اس صورت میں عام قوانینِ فطرت کی حفاظت کے لیے خوارق
کا ظاہر کرنا بجائے خود ایک قانونِ فطرت ہے۔

ہم یہ جانتے ہیں کہ انسانی ارادہ کے ذریعے سے قوانینِ فطرت کو توڑے بغیر، ہم فطرت
کے بعض کاموں میں تبدیلی کر سکتے ہیں۔ مثلاً جب کوئی بھول سرجن کام یابی سے مریض جسم
کی چیر بھاڑ کرتا ہے، یا کوئی طبیب ادویات کے ذریعے سے کسی بیماری کی رفتار کو
رودت ہے، اگرچہ بظاہر وہ مرض کے طبعی قوانین کے سلسلے میں خلل ڈالتا ہے جو اس کی
مداخلت کی عدم موجودگی میں اپنا پورا عمل کرتے، لیکن اس پر بھی ڈاکٹر اور طبیب کی یہ
مداخلت قوانینِ فطرت کے مخالف نہیں سمجھی جاتی، بلکہ اصلی اور حقیقی فطرت کی اعانت اور

خدمت سمجھی جاتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح کبھی کبھی خوارق کے ذریعے سے فطرت کے قوانین اصلہ کی حفاظت کرنا بھی خالق کائنات کی طرف سے اپنے بنائے ہوئے قوانین کا توڑنا نہیں، بلکہ اُن کو زیادہ مستحکم کرنا ہے۔

معجزہ ایک قانونِ قدرت ہے | خارجی فطرت میں ہمیں چار مختلف عالم نظر آتے ہیں، جن میں ہر ایک اعلیٰ، ادنیٰ پر مبنی اور اُس سے مُیتر ہے:

(۱) اول، بہ ظاہر بے ترتیب عالم، جس میں کیمیائی عناصر اور اُن کے مرکبات پائے جاتے ہیں، یا جسے ہم مُردہ مادہ کہتے ہیں، یہ عالم اپنے قوانین: جبرِ ثقیل اور جذب و اتصال وغیرہ کے ماتحت ہے۔

(۲) اُس کے اوپر مُترتب اور مُنظم عالم (نباتات وغیرہ) ہے، جس کی ساخت اُس پہلے بے ترتیب عالم سے ہوئی۔ اور اس لحاظ سے یہ قوانینِ مادہ کے ماتحت ہے۔ لیکن اس کے سوا اس میں فطرت کی ایسی پوشیدہ قوتیں اور شرائط پائی جاتی ہیں، جو بے ترتیب عالم کو معلوم ہی نہیں، بنا بریں یہ اور قسم کے قوانین کے تابع ہے، جن کا ادنیٰ طبقے سے کچھ تعلق نہیں، یعنی مُنظم قوانین۔

(۳) ان سے اوپر حیوانی زندگی ہے، جس کی خاص صفات و شرائط، نشو و نما، پرورش اور حرکتِ ارادیہ وغیرہ کے قوانین ہیں۔

(۴) اور اس سے بالاتر، انسان کی ذی عقل، مُدرک، اخلاقی اور ترقی کن زندگی ہے، جس کے قوانین پچھلے تینوں عالموں سے جُدا گانہ ہیں۔

عالموں کے اس سلسلے کا ہر اعلیٰ طبقہ، ادنیٰ طبقے کے لحاظ سے فوق العادہ اور اعجازی ہے۔ قدرت کے جو قوانین عالمِ جمادیا نیات میں دائر سائر ہیں، وہ حیوانات میں نہیں اور جو حیوانات میں ہیں، اُس سے بڑھ کر عالمِ انسان میں پائے جاتے ہیں۔

اگر فرض کرو، نباتات یا حیوانات میں ہماری باتیں سمجھنے کی قوت ہو اور ہم اُن کی دنیا میں جا کر اپنے انسانی کارنامے اور بنی آدم کے عجیب و غریب احوال اور وہ قوانین فطرت بیان کریں، جو عالمِ انسان میں کار فرمایں، تو یقیناً وہ اس ساری داستان کو

خلاف قانونِ فطرت قرار دے کر، ہمارا اُسی طرح مذاق اُڑائیں گے، جیسا کہ معجزات نہ ملنے والے معجزات کا اُڑاتے ہیں، کیوں کہ جو قوانین اُن نباتات جمادات کے دائرہ عمل میں عمل کر رہے ہیں، انسان کے متعلق قوانینِ فطرت اُن سے بہت زیادہ بلند اور رفیع واقع ہوئے ہیں جن کے احاطے کی ادنیٰ طبقے کی مخلوقات سے توقع کرنا سفاہت ہے۔

معجزہ انسان کو عالمِ بالا کی کمال آگے مذہب کی یہ تعلیم ہے کہ انسان بے ترتیب، با ترتیب، چمک دکھلاتا ہے حیوانی اور ذی عقل، چاروں عالموں کے اوپر اور اُن سے لطیف تر ایک اور عالم کا وجود تسلیم کرے، یعنی خالص روحانی اور نورانی عالم، جس کے چمکارے وقتاً فوقتاً ہم کو دکھائی دیتے رہتے ہیں۔

انسان چوں کہ چوتھے عالم (ذی عقل) اور اُس پانچویں عالم (روحانی) کی سرحد پر آباد ہے، اس لیے اُس کا تعلق ایک طرح سے دونوں کے ساتھ ہے۔ اعلیٰ اسی طرح اس کا ورثہ ہے جس طرح ادنیٰ، لیکن اعلیٰ کے ابھی صرف چمکارے ہی اُس کو حاصل ہیں۔ معجزات کا بڑا مقصد یہ ہے کہ اُس مزاج اور روح کے خلاف ہم کو آگاہ کریں، جو ان چمکاروں کو بے اعتبار سمجھتی اور اُن کا انکار کرتی اور ادنیٰ طبقے ہی میں زندگی بسر کرنا پسند کرتی ہے۔ تمام نوامیسِ فطرت پر ہمارا ان پست خیال کو تباہ نظروں کی بڑی فروگزاشت احاطہ نہیں اور نہ ہو سکتا ہے یہ ہے کہ انھوں نے سارے نظامِ عالم کو چند نوامیسِ طبعیہ میں مُنہجِ سمجھ لیا ہے، جو مادہ اور اُس کی قوت کے متعلق انھیں دریافت ہوئے ہیں۔ باوجودِ کہ سائنس کے بڑے بڑے اساتذہ یہ اعلان کر رہے ہیں کہ ہم کو ابھی تک کُل قوانینِ قدرت پر تو کھانا، اُس کے کس مُتحد بہ جتنے پر بھی احاطہ حاصل نہیں ہوا، لیکن اس پر بھی جب کبھی کوئی چیز ان کے محدود و محدودِ مذہرِ کائنات سے باہر ہوتی ہے، نہایت بے باکی اور دھڑائی سے اُس کی تکذیب پر تیار ہو جاتے ہیں۔

۱۔ سفاہت: بے وقوفی ۲۔ چمکارا: چمک، روشنی ۳۔ قوانینِ قدرت ۴۔ مُدركات: مُلک کی جمع: وہ قوت جس سے انسان اشیا کی حقیقت معلوم کر سکے یعنی عقل و ذہن۔

فلتات طبیعیہ | حالاں کہ اگر ہم نوا میں طبیعیہ کے اُسی نظام پر غور کریں، جو مادیات سے متعلق ہے، تو ”فلتات طبیعیہ“ کا ایک مُستقل باب ہے، جس کی ہزاروں جزئیات کا عام سُنن طبیعیہ اور مُقررہ قوانین فطرت سے علاحدہ ہونا، اُن قوانین کی یکسانیت اور انتظام کو سخت صدمہ پہنچانے والا ہے۔

دو تاریخی مثالیں | اس موقع پر فلتات طبیعیہ کی ایک دو تاریخی مثالیں ذکر کرتا ہوں، جو اس کُشک فلسفیانہ مضمون کے دوران میں نشاط اور دل چسپی پیدا کرنے کا موجب ہوں گی۔

ہنگری میں دو لڑکیاں پیدا ہوئیں، دونوں کے تمام اعضاء مُستقل اور الگ الگ تھے، لیکن دونوں کے سُرن (بچھاڑی) اس طرح ملی ہوئی تھی کہ مُخرج براز بالکل ایک تھا۔ اسی ایک راستے سے ہر ایک قضاے حاجت کرتی تھی۔ پیشاب گاہ دوسرے اعضا کی طرح مُجاہد تھی، اسی لیے جب ایک کو پیشاب کی ضرورت لاحق ہوتی تو دوسری سخت مُنقبض ہوتی۔ دوسری حاجات طبعیہ میں بھی کش کش ہوتی، جو باہمی تناظر کا سبب بن جاتی تھی۔ عمر کے چھٹے سال میں دویں سے ایک کے اعضا کسی مرض کی وجہ سے شل ہو گئے اور اُسی حالت میں عمر بھر رہی، لیکن دوسری کے اعضا پر اس کا کوئی اثر نہ تھا۔ بلوغ کی علامات دونوں میں بہ یک وقت ظاہر ہوئیں۔ جب بائیس سال کی عمر ہوئی، تو ایک کو سخت بُخار ہوا اور اسی میں انتقال ہو گیا۔ دوسری بھی اُس کے تین گھنٹے بعد مر گئی اور دونوں کو اکٹھا دفن کیا گیا۔

ایک چینی لڑکا جس کی عمر بارہ برس کی تھی، وہ اپنے سینے پر دوسرا بچہ اٹھاتے ہوئے تھا۔ اُس بچے کا سر اس کے سینے کے اندر چھپا ہوا تھا، پانی دھڑا اُس کے سینے سے گھسٹوں تک لٹکا رہتا تھا۔ اُس بچے میں کافی حس و شعور تھا، ذرا سا چھونے سے بھی متاثر ہوتا تھا۔ اور یہ اٹھانے والا لڑکا بھی اُس بچے کے دُکھ سے دُکھ اٹھاتا تھا۔

۱۰ فطری ضروریات، طبعی تقاضے ۱۱ نفرت

اس قسم کے سیکڑوں مُشاہدات انسائیکلو پیڈیا میں جمع کیے گئے ہیں جن کو حکما کی اصطلاح میں فُلتاتِ طبعیہ کہتے ہیں۔ ان کو دیکھ کر ایک عاقل مبصر اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ قوانینِ فطرت کا دائرہ اُس قدر تنگ نہیں ہے، جتنا کہ سائنس کے خام مدعی اُسے تنگ کرنا چاہتے ہیں۔

عالم ارواح | یہ تو مادیات اور جسمانیات کا حال تھا، لیکن اگر مادہ کی سرحد سے ذرا قدم باہر نکالا جائے، تو پھر ایک ایسا عالم سامنے آ جاتا ہے، جہاں ہماری وہ ادھوری توجہات بھی کچھ کام نہیں دیتیں، جن سے ہم ”فلتاتِ طبعیہ“ اور ”قوانینِ فطرت“ کی تطبیق میں کام لیتے تھے۔ یہ عالم، عالمِ ارواح ہے، جس کی طاقتوں اور نوامیس کا حال یورپ کے مُلحدوں کو ابھی تھوڑے عرصے سے کھلا ہے۔ یورپ و امریکا کے بڑے بڑے فلاسفر، جو مادہ اور اُس کی قوت کے سوا کسی دوسری قوت کا نام لینے والے کو دوہم پرست اور پاگل کہتے تھے، خدا کی شان کہ آج وہی، مُشاہدات و تجرباتِ متواترہ سے عاجز و مبہوت ہو کر، روح اور اُس کی عجیب و غریب طاقتوں کے ثابت کرنے میں پیش پیش ہیں۔

عالمانِ مسمُزِم ”تھیوسافیکل سوسائٹی“ اور ”سوسائٹی فار سائنیکل“ ریسرچ“ وغیرہ بہت سے گروہ پیدا ہو گئے ہیں، جنہوں نے روح کی ان طاقتوں پر تھوڑی بہت روشنی ڈالی ہے۔ اور اگرچہ یہ کام ابھی تکمیل کو نہیں پہنچ سکا، لیکن اس باب میں اب شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں رہی کہ نوا میں طبعیہ مادہ سے بالاتر اور عظیم تر اور بھی نوا میں جن کے سامنے مادہ اور اس کی قوتیں کچھ بھی وزن نہیں رکھتیں۔

روح کے متعلق چار نظریے | فرانس کے مشہور آفاق امام فلکیات و طبیعیات
کامل فلاسفیوں نے الجہول و المسائل الرُّوحیۃ کے نام سے ایک کتاب لکھی جس کے
کئی ایڈیشن چند روز میں ہاتھوں ہاتھ نکل گئے۔ فلسفہ حسیہ کا یہ فاضل، بہت سے
مُشاہدات اور قوانین و نوامیس پر غور و فکر کرنے کے بعد، ان چار نظریات پر پہنچا:

(۱) روح موجود ہے اور جسم سے علاحدہ مستقل وجود رکھتی ہے۔
(۲) روح ایسی خصوصیات اور قوا اپنے اندر رکھتی ہے، جن کی گہرائیوں تک

علم ابھی تک رسائی نہیں پاسکا۔

(۳) یہ ممکن ہے کہ رُوح، بُدُونِ مُسَاعَدَتِ حواس کے، بہت دُور کی چیزوں پر اپنا اثر ڈال سکے، یا اُن کے اثر کو قبول کر سکے۔

(۴) آئندہ آنے والے واقعات و حوادث، وقوع سے پہلے مُتَقَدِّر ہیں اور ایسے اسباب کے ساتھ اُن کی تحدید ہو چکی ہے، جو مستقبل میں اُن کو موجود کریں گے۔ رُوح بس اوقات ان واقعات و حوادث پر اُن کے وقوع سے پہلے مُتَطَّلِع ہو جاتی ہے۔

ان چاروں نظریات کے ثابت کرنے میں فاضل موصوف نے بہت مضبوط براہِ رجحان سے کام لیا ہے، جن کو سننے کے بعد ایک مُتَعَفِّفِ مَادَّہ پرست کو بھی مجالِ انکار نہیں رہ سکتی۔ روحانی مناظر کا انکار جہل ہے | اسی قسم کے دلائل و شواہد سے متاثر ہو کر، مسٹر پرنس کو کہنا پڑا کہ: ”میں اپنے یا اوروں کے تجربوں سے ایسے واقعات کا پیشِ آنا ثابت کرنے کی کوشش میں اپنا وقت ضائع نہ کروں گا۔ اس کام کا وقت گزر چکا۔ بُھڈب دُنیا کو یہ واقعات ایسے معلوم ہیں کہ ثبوت کی ضرورت نہیں۔ آج جو شخص رُوحانی مناظر کا انکار کرے، وہ مُنکرِ نہیں محض جاہل ہے، اور ایسے شخص کو روشن خیال بنانے کی کوشش بار آور ہونے کی کوئی امید نہیں۔“

اگرچہ عالمِ ارواح کے نوا میں مہمتہ ابھی تک رازِ ہائے سرِ بستہ ہیں اور اُس کا نظام، ہمارے مادیات کے نظامِ طبعی سے کہیں زیادہ وسیع اور لطیف ہے، تاہم رُوحانی مناظر کا جو ذخیرہ یورپ کی سوسائٹیوں نے اپنی مُستندِ پورٹوں میں جمع کر دیا ہے، وہ بھی بڑے بڑے ماہرِ انِ طبیعیات اور مُدِعیانِ ہمہ دانی کو حیرت زدہ اور خجل کرنے کے لیے کافی ہے۔ اور جس قدر فَلَائِتِ طبعیہ کا وجود، عام نوا میں طبعیہ : قوانینِ مادیہ کے سلسلے میں عجیب چیز ہے، اُس سے کہیں بڑھ کر نظامِ روحانی کا مُجَرِّعُ العقولِ اکشاف پرستارِ انِ نوا میں طبعیہ کے ایوانوں میں زلزلہ ڈالنے والا ہے۔

لے عیب جو، نکتہ ہیں۔ لے اہم قوانینِ قدرت

ارواح مجرّده یا ایک | روحانی قوتوں کی تحقیق کا جو سلسلہ جاری ہے، وہ ابھی
لطیف نورانی عالم کا وجود ختم نہیں ہوا۔ حال کے بڑے بڑے فلاسفہ اس جانب
 ترقی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ روحانی نظام صرف انسانی ارواح کے مجموعے
 سے عبارت نہیں ہے، جو انسانوں کے جسم کی تدبیر کرتی اور اُس سے جدا ہوتی رہتی ہیں،
 بلکہ بہت ممکن ہے کہ ان ارواح کے علاوہ، اور ارواح مجرّده یا کوئی لطیف نورانی مخلوق
 ایسی پائی جاتی ہو، جن کا ان ارواح انسانی سے زیادہ قریب کا رشتہ ہو۔

مسٹر مائرس، اپنی معلومات کی بنا پر، ارواح مجرّده کا صرف امکان تسلیم
 کرتے ہیں؛ مگر فریچ فیلسوف موسیو لونی نکلے ایک لطیف استدلال سے ان کا وجود
 ثابت کرنے پر زور دیتا ہے، چنانچہ لکھتا ہے کہ:

”ہمارے ارد گرد کی زندہ مخلوق میں نباتات سے لے کر انسان تک دائماً
 اوپر کو جانے والا سلسلہ ہے، جو بہندریج کمال حاصل کرتا جاتا ہے۔ کائی اور دیگر
 بحری روئیدگیوں کو، جو نظام نباتی کی ابتدائی حالت ہے، نقطہ روانگی ٹھہرا کر
 ہم نباتی دنیا کے کمال حاصل کرنے والے سلسلے میں سے گزر جاتے ہیں اور
 ابتدائی حیوانات، یعنی گھونگے اور دیگر نباتات نما حیوانات تک پہنچ جاتے ہیں،
 اور وہاں سے اعلیٰ تر حیوانات کے بے انتہا درجوں کو طے کرتے ہوئے انسانی
 قالب میں آ جاتے ہیں۔ اس سیر میں کا ہر ایک پایہ غالباً غیر محسوس ہے، اور ان
 تغیرات و درجات کی ترتیب ایسی عمدہ ہے کہ اُس نے درمیانی ہستیوں
 کے ایک غیر محدود سلسلے کو گھیر رکھا ہے، جس کا ایک کنارہ کائی ہے اور دوسرا
 کنارہ ہماری نوع انسانی، اور باوجود اس کے ہم ممکن سمجھتے ہیں کہ آئندہ ہم میں
 اور خدا میں درمیانی مخلوق کا کوئی واسطہ حاصل نہ ہو اور اس تدریجی ترقی کے
 سلسلے میں انسان اور خدا کے مابین ایک بڑا غار خالی پڑا رہ گیا ہو۔ ہم ممکن سمجھتے
 ہیں کہ تمام نیچریں چھوٹی سے چھوٹی نباتات سے لے کر نوع انسانی تک تدریجی اور
 بے شمار درجات کی ترتیب ہو۔ مگر انسان اور خدا کے درمیان صرف ایک

ناپید انکار جنگل ہو؟ بے شبہ یہ ناممکن ہے اور اگر کبھی مذہب یا فلسفے نے ایسی غلطی کی حمایت کی ہے، تو اُس کی وجہ صرف مظاہر قدرت کی نادانگی ہے۔ اس میں شک کرنا ناممکن ہے کہ جس طرح نبات اور حیوان اور انسان کے مابین دیکھا جاتا ہے، اُسی طرح انسان اور خدا کے مابین ضرور درمیانی مخلوق کی بڑی تعداد ہے، جس کی وساطت سے انسان اُس خدا تک پہنچتا ہے، جو اُس پر اپنی غیر محدود طاقت اور جلال سے حکومت کر رہا ہے۔ غرض، یہ تو ہم کو یقین ہے کہ ایسی درمیانی مخلوقات (یعنی جو انسان سے آگے لطافت کے تدریجی منازل طے کرتی ہوئی خدا تک پہنچتی ہے) موجود ہے۔ گو یہ ضرور ہے کہ وہ ہم کو نظر نہیں آتی، لیکن اگر ہم ہر ایسی چیز کے وجود سے انکار کریں، جس کو ہم دیکھ نہ سکیں، تو نہایت آسانی سے ہماری تکذیب ہو سکتی ہے۔ فرض کرو کہ کوئی علم مادیات کا عالم کسی تالاب سے ایک قطرہ پانی کا لے اور ایک جاہل کو دکھا کر کہے کہ یہ قطرہ، جس میں تم کچھ نہیں دیکھتے ہو، چھوٹے چھوٹے حیوانات اور نباتات سے بھرا ہوا ہے، جو بعینہ محسوس حیوانات اور نباتات کی طرح زندہ رہتے ہیں، پیدا ہوتے ہیں اور مرتے ہیں، تو وہ جاہل فوراً سر پھیر دے گا اور کہنے والے کو دیوانہ سمجھے گا۔ لیکن اگر اُس کی آنکھوں پر خوردبین رکھ دی جائے اور وہ قطرے کی تشخیص کرے، تو اُس کو اقرار کرنا پڑے گا کہ کہنے والا سچ کہتا تھا، کیوں کہ اب اُسی قطرے میں، جس کو وہ صاف سمجھتا تھا، اُس کی آنکھ سائنس کی مدد پا کر، چھوٹے پیمانے پر تمام دنیا کو موجود پائے گی۔ غرض، جہاں ہم کچھ نہیں دیکھتے، وہاں زندہ مخلوق کی بڑی تعداد موجود ہوتی ہے۔ اور یہ محض سائنس ہی کے امکان میں ہے کہ اس بارے میں عوام الناس کی آنکھوں کو روشن کرے۔

ہم چاہتے ہیں کہ ہم بھی اس حکیم کی حیثیت اختیار کریں۔ بے شک انسان اور خدا کے درمیان طبقہ جہلا کو اور اندھے فلسفے کو کچھ نہیں سوجھتا، لیکن

اگر ہم جسمانی آنکھوں کے بجائے رُوحانی آنکھ سے کام لیں یعنی عقل، قیاس، مُساوات اور تعلیم کو استعمال کریں، تو پُر اسرار مخلوق روشنی میں آجائے گی۔ اب اگر ایک ایسی مخلوق کا وجود تسلیم کر لیا جائے، جو انسان اور خدا کے درمیان واسطہ کا کام دے، خواہ وہ ملائکہ اللہ ہوں یا ارواحِ مُجَرَّدہ، تو نظامِ عالم میں مادیات، فَلَائِطِ طَبِیْعِیہ اور عالمِ ارواحِ انسانی کے نوا میں سے اوپر بہت سے دوسرے نامعلوم نوا میں قُدْرَت کا اقرار کرنا پڑے گا، جس کی ابھی تک ہم کو ہوا بھی نہیں لگی۔ پھر کس قدر شوخ چشمی اور دُھٹائی ہوگی کہ جو چیز ہمارے مادی علت و معلول کے سلسلے سے ذرا باہر ہو جاوے، ہم یہ کہہ کر اُس کی تکذیب کر دیں کہ وہ قانونِ قُدْرَت یا نوا میں فطریہ کے خلاف ہے!

تمام نظامِ عالم قُدْرَتِ الہیہ کے پنچے میں ہے

(الف) نظامِ طَبِیْعِی مادی (ب) فَلَائِطِ طَبِیْعِیہ

(ج) نظامِ رُوحانی (د) نظامِ مُلکُوتی

اور ان سب کے اوپر قُدْرَتِ الہیہ کا وہ زبردست پنچہ ہے، جس کی گرفت سے ان میں سے ایک چیز بھی ایک سیکنڈ کے لیے باہر نہیں ہو سکتی۔

اوست سلطان ہرچہ خواہ ادا کند

عالمے را در دے ویران کند

مذکورہ بالا نظامات میں سے کس کی طاقت ہے کہ وہ خدا کے دستِ قُدْرَت کو کسی حکیمانہ تصرف سے روک دے! ہم ابھی تک باوجود اس قدر اَدْعَاہِ عِلْم و تحقیق کے، (الف) نظامِ طَبِیْعِی مادی کے قوانین و نوا میں پر بھی پوری دستِ رس نہیں پاسکے، جیسا کہ خود ماہرینِ طَبِیْعِیات کے اعتراف سے ثابت ہوتا ہے؛ پھر ہم کو کیا حق حاصل ہے کہ جو چیز ہمارے زعم میں ان چند نوا میں طَبِیْعِیہ کے دائرے سے ادبھی ہو، اُسے جاہلانہ تہوّر کے ساتھ ٹھکرا دیں!

میں تو یہ کہتا ہوں کہ اگر فرض کیجیے کہ ہمارا علم، نظامِ طبیعی، نظامِ روحانی اور نظامِ ملکوتی کے تمام لوازم پر بھی محیط ہو جاتا (اگرچہ ایسا نہیں ہے)؛ تب بھی آگے بڑھ کر فاطرِ ہستی کی لامحدود قدرت کو ہم مُقید نہیں کر سکتے تھے، چہ جائے کہ صرف طبیعیات کے دس بیس قوانین پر مُطلع ہو کر یہ اعلان کر دیں کہ جو واقعہ ہمارے حلقہٴ علم سے خارج ہوگا، وہ واقعہ نہیں ہے۔

خوارقِ عادات یا معجزات و کرامات وغیرہ کا انکار، فی الحقیقت سببِ علمی کم مائیگی ہے | ہماری اسی تنگ نظری اور علمی کم مائیگی کا نتیجہ ہے:

إِذَا لَمْ تَرَ الْهَلَالَ فَسَلِّمْ لِنَاسٍ رَأَوْهُ بِالْأَبْصَارِ

ترجمہ: جب تم نے خود چاند نہیں دیکھا، تو تم کو اُن لوگوں کے قول پر اعتماد کرنا چاہیے جنہوں نے اپنی آنکھوں سے چاند دیکھا ہے۔

خوارقِ کاشفوتِ متواتر ہے | ہماری استدعا یہ ہے کہ خوارق کو جھٹلانے والے، تھوڑی دیر کے لیے ٹھنڈے دل سے اپنے علم و تحقیق کی حد اور قدرت اور قوانینِ قدرت کی پہنائیوں پر غور کریں، پھر یہ بھی دیکھیں کہ ان خوارقِ کاشفوت ہر زمانے میں، ہر جگہ، ہر قوم کے ہاں اور ہر عقیدہ اور مذہب کے پیروؤں کے نزدیک، کس قدر تواتر اور استفاضہ سے ثابت ہے، تو ان شاء اللہ اُن کو جُرأت نہ ہوگی کہ وہ ایک قلمِ خوارقِ عادات کے وجود یا امکان ہی سے انکار کر بیٹھیں۔ فادرہل نے ٹھیک کہا ہے کہ:

”دنیا کے تمام مذاہب میں، خواہ کسی کی بنیاد فلسفیانہ اصول پر ہو یا الہامی تعلیم پر، معجزات اس کثرت سے اور اس اختلافِ انواع سے مروی ہیں کہ سب کے لیے خاص اصول اور قوانین کی تلاش، انسان کے لیے کم از کم اس وقت تک ناممکن ہے۔ اور یہ بھی ضرور ہے کہ اکثر بلکہ تمام مذاہب میں، ملنے والوں کی خوش اعتقادی یا طرزِ ادا کی وجہ سے بہت سے غلط واقعات بھی

معجزات میں شامل ہو گئے ہوں گے۔ مگر عقل یہ دعوا کبھی نہیں کر سکتی کہ تمام قوانین قدرت معلوم ہو چکے ہیں، تاکہ جو واقعہ قوانین معلوم کے مطابق حل نہ ہو سکے، اُس کو غلط کہہ دیں۔ اور دوسری جانب مذہب یہ دعوا نہیں کرتا کہ تمام رطب و یابس اور تمام صحیح و غلط روایات کو یک سال سر آنکھوں پر رکھ لیا جائے۔ بلکہ ایسے موقع پر عقل جو کام کیا کرتی ہے، مذہب اُس سے زیادہ احتیاط کے ساتھ چلنے کو کہتا ہے۔

سچا مذہب قوانین فطرت | مذہب کو عقل سے ٹکرانے کی ضرورت نہیں۔ اگر عقل قوانین قدرت کا وسیع النظر مُعَلِّم ہے | کے احترام پر زور دیتی ہے، تو مذہب عقل کے اس جذبے کی قدر کرتا ہے۔ سچا اور صمک مذہب، فی الحقیقت قوانین فطرت اور سنن الہیہ کا وسیع النظر مُعَلِّم ہے، جو بار بار بتلاتا ہے کہ ”سُنَّةُ اللہ“ کو کوئی طاقت تبدیل نہیں کر سکتی۔ مگر ساتھ ہی مُتنبہ کرتا ہے کہ انسان کو سنن الہیہ اور نوامیس فطرت کا جو علم دیا گیا ہے، بہت تھوڑا ہے۔ وہ بس اوقات اُن کے سمجھنے میں ٹھوکر کھاتا ہے اور بہت دفعہ قوانین قدرت کے کسی اعلیٰ اور ارفع مظہر کو، اپنی حد پرواز سے باہر دیکھ کر خلاف قانون قدرت سمجھ بیٹھتا ہے اور روزمرہ کے معمول کے خلاف جو بات سُنتا ہے، اُسے یہ کہہ کر رد کر دیتا ہے کہ یہ سُنَّةُ اللہ کے مُخالف ہے، وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللہ تَبْدِيلًا۔

سُنَّةُ اللہ کے غیر متبدل | لیکن اگر سُنَّةُ اللہ کے غیر مُتبدل ہونے کا یہی مطلب ہو، تو ہونے کا غلط مطلب نہ لو! | دنیا کی تمام ترقیات کا دروازہ ہی بند ہو جائے۔ دیکھو، انسان نے ترقی کر کے حیوانی نظام کی جگہ اُس سے کہیں زیادہ طاقتور جمادی سسٹم قائم کر دیا ہے۔ ہزاروں سال کے بعد گھوڑوں، بیلوں، اونٹوں، ہاتھیوں کی جگہ بھاپ اور بجلی نے لے لی۔ اس کا یہ مطلب ہو گا کہ فاطمہ عالم نے دنیا کی عمر کا بہت ہی طویل حصہ گزر جانے کے بعد دماغی اور عقلی قوتوں کا ایسا جدید نظام پیدا کیا، جو چشمِ فلک نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا اور

اختراع و ایجاد کے ایسے انوکھے اصول کی طرف رہ بری کی اور اُس کے اسباب و وسائل فراہم کر دیے، جن کے نتائج کو اگر اب سے دوچار صدی پہلے کوئی ذکر کرتا، تو خالص مجنوں یا وہم پرست سمجھا جاتا۔

تو کیا ایسے تھرتی عوایل اور موہوب قوا کو، جو ان ایجاداتِ بدیعہ اور دماغی ترک تازیوں کے اسبابِ قریبہ یا بعیدہ ہیں، بے شمار قرون و ادوار گزر جانے کے بعد پیدا اور اکٹھا کر دینا سُنَّۃ اللہ کی تبدیل و تحویل اور قانونِ قدرت کا نقص و ابطال ہے!

معجزات و خوارق کے | معجزات یا خوارق کا انکار کرنے والے خواہ زبان سے نہ کہیں، انکار کا اصلی راز | لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ بے علم و بے شعور مشین کی طرح

گھومنے والے مادہ کے سوا، کسی ایسی ہستی کو عالم کی تخلیق و نظم میں دخل دینا گوارا نہیں کرتے، جو مواقع و محال اور آرمینہ و اُکرنہ کے اختلاف و تفاوت کی قادرانہ و حکمانہ رعایت کر سکے۔ اور جب کبھی وہ کائنات کے اس باقاعدہ عظیم الشان محکم اور منظم سلسلے کو

ایک علیم و حکیم، محیطِ کل اور قادرِ مطلق ہستی کی طرف منسوب کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں، اور ناچار اُن کو ایسی بڑی مضبوط مشین کے چلانے والے کا اقرار کرنا پڑ جاتا ہے، تو پھر اُن کی تمام تر کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنی اعلیٰ قابلیت اور ماہرانہ موقع شناسی کو مشین کے گھمانے اور پُرزوں کے رد و بدل میں، اُن کی خواہش اور رائے کے خلاف استعمال کر سکے، اور اس طور پر وہ ہمارے علم کو محدود اور ہمارے فہم کو ناقص یا نامکمل ثابت کر دے۔

خوارق کا قانون خود خوارق | لیکن انسان کی یہ جھوٹی شیخی، تنگ نظری اور غیر محدود کے مُسکروں نے بنوایا | تو انینِ قدرت کی مغرورانہ تکذیب ہی وہ چیز ہے، جو قدرت

کے اس عمل کو حق بجانب ثابت کرتی ہے کہ وہ گاہ بہ گاہ ایک ایسے نظامِ تکوین سے بھی دُنیا کو ردِ شناس کرے، جو ہمارے سمجھے ہوئے قوانین اور محدود و مضبوط کیے ہوئے قوانینِ طبعیہ

لے وہی صلاحیتوں کو لے حیرت انگیز ایجادات لے ترک تازی: دوڑ دھوپ احمد لے چاروں لفظ جمع ہیں، یعنی مواقعِ موقع کی، محالِ محال کی، آرمینہ زمان کی اور اُکرنہ مکان کی جمع ہے۔

سے بالاتر ہو، تاکہ اُن رعونت پسند گستاخوں کو بھی (معاذ اللہ قُدرتِ نامتناہیہ کو اس کے پیدا کیے ہوئے چند اسبابِ ظاہرہ کے زنجیروں میں جکڑ دینے کا خطر رکھتے ہیں) طوعاً و کرہاً یقین کرنا پڑے کہ اُن سے اور اُن کے ایتھر (مادہ) سے اوپر کوئی اور غالب و قاهرِ ہستی بھی ہے، جس نے تمام قوانینِ طبیعیہ اپنے ارادہ اور کامل اختیار سے وضع کیے ہیں اور وہی ہر وقت اُن پر پوری طرح قابو یافتہ ہے۔

پس ایک حقیقتِ ثابتہ کے مُنکر کو، اُس حقیقت کا منو ادینا جس کے انکار میں خسراںِ عظیم ہے، اور عاجز و کم مایہ مخلوق کو مُتنبہ کرنا کہ وہ اپنی حد سے گزر کر خالق کی قُدرتِ کاملہ اور علمِ محیط کا انکار نہ کر بیٹھے؛ کیا یہ خود عینِ قانونِ قُدت نہیں ہے؟

اگر سچ پوچھو تو جن چیزوں کو خوارقِ عادات کہتے ہیں، ان کا قانون خود خوارق کے مُنکروں نے بنوایا ہے۔ جب یہ لوگ عام قوانینِ فطرت کی اُجوبہ کاری کو خود مُقنن کی حکمت بالغہ، اختیارِ کامل اور شانِ خَلْقِ تعالیٰ و فعالِ کما یُرید کی طرف منسوب کرنے میں بھی تردد کرنے لگے، تو ضروری ہوا کہ ان قوانین کو ”قوانینِ قُدت“ ثابت کرنے کے لیے قُدت ہی کوئی سامان کرتی۔

چنانچہ ابتداءے آفرینش سے آج تک قُدت بے شمار خوارقِ ظاہر کرتی رہی جنہیں دیکھ کر خواہی منخواہی اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ جو فعل، جن وسائل کے ذریعہ عموماً ہوتا رہتا ہے، اُسے بلا واسطہ کرنے میں بھی قُدت کو کچھ تعب نہیں ہوتا۔

خوارق کو ماننے سے قوانینِ طبیعیہ | اس طرح کے خوارق، جو بہ ظاہر عام قوانینِ طبیعیہ کو
کا اعتبار زائل نہیں ہوتا | توڑنے والے ہیں، ہمارے دل سے ان عام قوانین کی
عظمت اُسی طرح زائل نہیں ہونے دیتے، جیسا کہ کروڑوں انسانوں کے دلوں سے یہ علم
کہ بہت دفعہ ٹرینوں کا تصادم ہو جانا ہے یا پٹری اُکھڑ جاتی ہے یا ریل ٹوٹ جاتے ہیں،
ریلوے کا اعتبار زائل نہیں کرتا کہ وہ اُس میں سفر کرنا چھوڑ دیں۔ پس خوارق کی موجودگی

لے غیر محدود قُدت و فطرت لے ثابت شدہ حقیقت لے قانونِ سز یعنی خدا، قانونِ فطرت کا خالق لے محنت و مشقت

میں بھی ہم عام قوانین طبعیہ سے اُسی طرح مُستفید ہو سکتے ہیں، جس طرح ہم ریل کے سفر سے، باوجود مذکورہ بالا حوادث کے، برابر مُنتمِع ہوتے رہتے ہیں۔

خوارق کا وجود دماغی | خوارق کا وجود ہمارے علمی اور دماغی ترقیات کے راستے میں کوئی رکاوٹ
ترقی کا سبب ہے | نہیں، بلکہ ٹھیک ٹھیک کہا جائے تو شبِ دیز فکر کے لیے ہمیں کام

دیتا ہے۔ اور اگر یہی فرض کر لیا جائے کہ وہ آپ کی ارتقائی کوششوں کے راستے میں حائل ہے، تو افسوس یہ ہے کہ اُس کا راستے سے ہٹا دینا بھی آپ کے قبضے میں نہیں!

خوارق کی انبیا کی طرف نسبت | تماشا یہ ہے کہ عام قوانینِ فطرت کی فضا میں جب
بعض غیر معمولی واقعات حسب اتفاق پیش آجائے

ہیں، تو ہم اُن کے ماننے والوں سے جنگ نہیں کرتے؛ لیکن اُسی کے مُشاہدہ کوئی چیز جو وزمرہ کے عام معمول سے ذرا مُستبعد ہو، اگر بڑے سے بڑے جلیلُ القدر پیغمبر کی طرف منسوب ہو جائے، تو فوراً شکوک و شبہات کی لہر ہمارے دلوں میں دوڑنے لگتی ہے اور اُس کی نفی کرنے کی ہر ممکن صورت پر ہم غور کرنے لگتے ہیں۔

فرانس کے مشہور و معروف فیلسوف کامل فلامریون نے اپنی کتاب الجہول والمسائل الروحیہ میں ایسی عورت کا ذکر کیا ہے، جس کا ایک پستان بائیں ران میں تھا اور وہ بچے کو اُسی سے دودھ پلاتی تھی۔ یہ عورت ۸۲ء میں پیرس کی جمعیۃ فضلہ کے رُوبہ رُوپیش ہوئی۔ پھر ایسے مُشاہدات بیان کئے ہیں کہ ایک مرد کے پیٹ سے تشرنج کے بعد لڑکا نکلا، جو اُس مرد کا تو اُم تھا۔ اُسی کے جسم میں مدتُ العمر مجبوس رہا، دائرہ ہی نکلی اور بوڑھا ہوا۔

اب فرض کیجیے کہ اسی طرح کے فلتاتِ طبعیہ کو اگر کوئی شخص یہ کہہ دے کہ فلاں پیغمبر کے اعجاز یا فلاں ولی کی کرامت سے فلاں زمانے میں ایسا ہوا تھا، تو مُنکرینِ اعجاز کسی نہ کسی عنوان سے اُس کی تردید پر فوراً کمر بستہ ہو جائیں گے۔

جاپان میں قیامت خیز زلزلہ آیا، کتنی ہی بستیاں تباہ ہوئیں اور کتنی ہی مُستحکم

لے شب دیز بُشکی گھوڑے یا سپارہ رنگ کے گھوڑے کو کہتے ہیں۔ سُلہ تو اُم، جُڑواں، ایک ساتھ پیدا شدہ بچے

عمارتیں منہدم ہو گئیں۔ چند سال ہوئے، ضلع ہردوئی میں بگولا اٹھا جس سے ایک جھیل کا پانی بالکل اڑ گیا اور دوسری جھیل بن گئی۔ اس طرح کے واقعات جو خوارق میں سے نہیں صرف قلیل الوقوع ہیں۔ ہم سنتے ہیں اور ایک منٹ کے لیے بھی ان کو غلط نہیں سمجھتے لیکن کیا قیامت ہے کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت کے وقت اگر معتبر سے معتبر راوی بھی یہ خبر دے کہ ایوان کسریٰ میں زلزلہ آیا، اُس کے چودہ گنگرے گر پڑے یا دریائے سادہ خشک ہو گیا یا فارس کی ہزار سالہ آگ بجھ گئی، نو مشیکین کو اُس کے ماتے میں پس و پیش ہونے لگتا ہے !

خیال کیجیے کہ زلزلہ کا آنا، کسی بڑی سے بڑی عمارت کا شکستہ ہونا، دریا کا خشک ہو جانا اور آگ کا بجھنا، ان میں سے کون سی چیز محال ہے ؟ یہ چیزیں تو فی حد ذاتہ خوارق میں سے بھی نہیں۔ پھر اگر یہی چیزیں سب سے جلیل القدر اور اولو العزم پیغمبر کے قرب و وجاہت ظاہر کرنے یا اُس کے عظمت و ابستقبل کی طرف اشارہ کرنے کے لیے حق تعالیٰ ظاہر فرماتا ہے، تو تم کو کیوں تردید ہونے لگتا ہے ؟

روح کے متعلق یہ ثابت ہو چکا ہے کہ اُس کے تاثیر و تاثر میں بعد مکانی یا زمانی خلل انداز نہیں ہوتا اور اس جو ہر لطیف و نورانی کو اپنے عمل میں مسافت جسمانی کی کچھ پرواہ نہیں؛ پس اگر روح محمدی صلعم کی نورانیت عظیم نے حضرت آمنہ کے لیے مکہ سے بصری تک روشن کر دیا تو اس میں کیا اشکال ہے ؟

کیا آپ یہ جانتے ہیں کہ خداوند قادر و توانا، نظام تکوین اور قوانین طبیعیہ کے استعمال میں کوئی تصرف آپ کی اطلاع اور مشورے کے بدون نہ کیا کرے ! (نعوذ باللہ!) اس کی اُمید آپ خدا سے تو کیا، اُس مسکین ایسے بھی نہ رکھیں، جو ہر قسم کے علم، شعور، قدرت اور ارادہ وغیرہ سے محروم ہے !

خوارق کا ماننا وہ پرستی نہیں ! آپ خوارق و معجزات کے ماننے والوں کو سادہ لوح۔

اور ”وہم پرست“ کہا کریں، لیکن تاریخی اوراق آپ کو بتلائیں گے کہ اسی قسم کے ”سادہ لوح“ اور ”وہم پرستوں“ نے دنیا کو حکیمانہ حقائق سے معمور اور وہم پرستیوں سے کفور کیا ہے۔ انہی ”وہم پرستوں“ میں ایسے ایسے عالی ہمت اور اولوالعزم انسان اُٹھے ہیں جنہوں نے بنی نوع انسان کی کایا پٹ کردی اور ادبام و تخیلات کا سارا تار و پود مکھیر کر رکھ دیا۔

صداقت کے اعلان بلاشبہ آج دنیا کی فضا بہت کچھ بدل چکی ہے، اور خوارق کا نام سے گھبرانانا چاہیے زبان پر لانا بڑی بہادری کا کام ہے، لیکن ایک صداقت کے ماننے اور اعلان کرنے میں آدمی کو گھبرانانا نہیں چاہیے۔ وہ وقت آنے والا ہے کہ یہی خوارق و معجزات کا مذاق اڑانے والے اُن چیزوں کے ثابت کرنے کے درپے ہوں گے جن کو آج رد کر رہے ہیں۔ صداقت ممکن ہے کہ اپنا صاف چہرہ دکھلانے میں کچھ تاخیر کرے، لیکن وہ ضرور ایک دن ایسی طرح منبجلی ہوگی کہ دیکھنے والے اُس سے آنکھیں نہ چُرا سکیں گے۔

انجام ہمیشہ صداقت کے ہاتھ ہے | دیکھو، دنیا کے سب سے بڑے موجد صلی اللہ علیہ وسلم نے جب نعرہ توحید بلند کیا، تو رُوئے زمین پر کوئی بھی ہم نوائی کرنے والا نہ تھا، لیکن فضا کے کعبہ سے توحید کا جو صور پھونکا گیا، آج ہم مندروں اور کلیساؤں میں اُس کی گونج محسوس کر رہے ہیں۔ آج جو اقوام دہل دولت توحید سے تہی دست ہیں، وہ بھی اندر ہی اندر اپنی محرومی اور تہی رستی کا ماتم کرتی ہیں اور موجدین کے رُوبہ رُوشرم سے اُن کو سر اٹھانا مشکل ہے۔ ہم کو یقین ہے کہ اسی طرح ایک دن پیغمبروں کے اعجاز اور اولیاء کی کرامات کا انکار کرنے والے بھی اپنے اُس جہل اور ضیق نظر پر پشیمان ہوں گے، جس کا نام انھوں نے علم رکھ چھوڑا ہے اور جسے وہ سائنس کی بڑی بھاری عقیدت مندی سمجھتے ہیں۔ وَصِیْعَلُمُ

الَّذِينَ ظَلَمُوا أَيَّ مُنْقَلَبٍ يَنْقَلِبُونَ |

سائنس خوارق کی تسلیم کے لیے | ہم نے احادیث صحیحہ میں اُن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ راستہ صاف کر رہی ہے | ارشاد پڑھا تھا: اِنِّیْ وَاللّٰہُ اَبْصِرُ مِنْ وَرَیِّکُمْ کَمَا

لے سخت بیزار لے جلوہ افروز لے تنگ نظری

أَبْصَرُ مِنْ بَيْنِ يَدَيَّ یعنی میرا دیکھنا سوا جہ پر موقوف نہیں، بلکہ پیٹھ پیچھے کی چیزیں بھی مجھے ایسے ہی نظر آتی ہیں، جیسے کہ سامنے کی۔ بہت سے مُتَفَلِسِفِین اس کو قانونِ فطرت کے خلاف سمجھ کر درجے تاویل ہو گئے تھے، لیکن حافظ ابن حجر وغیرہ محققین نے حدیث کو ظاہر پر حمل کر کے اُس کو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائص اور خوارقِ عادات میں شمار کیا۔

آج ہم دیکھتے ہیں کہ ایک انگریز باہر علمِ بصارت نے انسان کی جلد میں قوتِ باصرہ کے راز پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ انسان کے بدن کی جلد کے نیچے چھوٹے چھوٹے ذرات پائے جاتے ہیں، جو سارے جسم میں پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ ذرے ننھی ننھی آنکھیں ہیں۔ ان میں اسی طرح تصویر اُتر آتی ہے، جس طرح آنکھ کی پتلی میں اُتر آتی ہے۔ یہ خیال کہ ان کی کھال بھی اسی طرح دیکھتی ہے جس طرح آنکھیں کوئی نیا نہیں ہے۔ آپ جب کسی نابینا شخص کو بازار میں بھیڑ سے بچ کر گزرتے دیکھتے ہیں، تو تعجب کرتے ہیں کہ یہ تو اندھا ہے، اسے راستہ کس طرح سوجھتا ہے؟ ان کی پیشانی کی جلد کے متعلق یہ خیال ہے کہ اُس میں قوتِ باصرہ موجود ہے، یہ دماغ کو اسی طرح پیغام پہنچاتی ہے۔

ڈاکٹر فرگول کا بیان ہے کہ آج سے ہزاروں سال پیش تر آنکھوں کے بغیر پڑھنے کا ہنر اپنے کمال کو پہنچا ہوا تھا اور عام طور پر راج تھا۔ لیکن جب انسان کو یہ معلوم ہوا کہ وہ آنکھوں سے بھی وہی کام لے سکتا ہے، جو بدن کی جلد سے لیتا ہے، تو اُس نے جلد سے دیکھنے کا طریق ترک کر دیا اور بالآخر جلد سے دیکھنے کی قابلیت اُس میں سے مفقود ہو گئی۔ اگر اس جس انسان کو دوبارہ ترقی دی جائے، تو تعجب نہیں ہے کہ اس کے ذریعے سے اندھے بھی دیکھنے لگیں۔

بہر حال، سائنس کی ترقی خوارق کی تفہیم میں کچھ مدد دے رہی ہے، اور اسی لیے ہم یہ امید رکھنے میں حق بہ جانب ہیں کہ کچھ عرصے کے بعد ان شاء اللہ تعالیٰ سائنس کے پجاری خوارق کی تسلیم کے لیے گردن جھکا دیں گے۔

۱۷ مُواہجہ: رُوبہ رُود ہونا، آنے سامنے ہونا ۱۸ مُدعیانِ علم و فلسفہ

ابھی چند روز پہلے جب یہ سنتے تھے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے درخت جھک گئے، یا انھوں نے حضور کو سلام کیا، یا حضور کے ایما سے وہ اپنی جگہ سے سرک گئے، تو ملحدین ان قصوں کی "اساطیر الاولین" کہ کہہ ہنسی اڑاتے تھے، اور ان بیانات کو پرانے مسلمان کی خوش اعتقادی یا وہم پرستی پر حمل کرتے تھے۔ لیکن آج ماہرین علم نباتات نے نباتاتی زندگی کے جو حیرت انگیز حالات ظاہر کیے ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ درخت اور پودے فی الواقع زندگی کے وہ تمام حسیات و تاثیرات اپنے اندر رکھتے ہیں، جو ابھی تک ذی روح مخلوق کی خصوصیت سمجھے جاتے ہیں۔

ہر شخص، جو نباتاتی زندگی سے کچھ بھی واقفیت رکھتا ہے، جانتا ہے کہ پودے اور پھول بھی اپنی غذا کھاتے، اپنا پانی پیتے اور اپنی نیند سوتے ہیں۔ اُن میں بھی جنسوں کا وصل و جفت ہوتا ہے، ان کی بھی نسل چلتی ہے اور اُن پر بھی بڑھاپا آتا ہے اور وہ بالآخر موت کے چنگل میں پھنستے ہیں۔ لیکن بہت کم لوگ یہ یقین کرنے کے لیے تیار ہوں گے کہ پودے دیکھنے اور سننے کی بھی قدرت رکھتے ہیں، آپس میں بات چیت بھی کرتے ہیں، اُن پر عشق و محبت کا دار چلتا ہے، رنج و غم اُن کو بھی ستاتا ہے اور وہ بھی ہماری طرح جذبات و حسیات سے تاثیر پذیر ہوتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعض پودے اور پھول محض ہاتھ لگا دینے سے سُکڑ جاتے ہیں اور ذرا سے اشارے سے بند ہو جاتے ہیں، اس دُکئیِ ارحسی کی وجہ سے ایک پودے کا نام ہی جھوٹی مُوئی پڑ گیا ہے۔

یہ تو وہ حالات ہیں کہ ہر انسان اپنی چشمِ عریاں سے دیکھ سکتا ہے، لیکن آپ ہی کے ایک ہم وطن ماہرِ سائنس یعنی سر جگدیش چندر بوس نے اپنی مَدَدُ العُمر کے تجربات سے پودوں اور درختوں کے جو حالات اپنے ایجاد کردہ عجیب و غریب آلات کے ذریعے معلوم کیے ہیں، اُن سے علم نباتات میں حیرت انگیز انقلاب پیدا ہو گیا ہے۔

آپ تو پھول میں سوائے رنگ و بو کے اور کوئی رازِ فطرت نہیں پاتے، لیکن آپ

۷ اگلے لوگوں کی کہانیاں، (قرآنی تعبیر)

سرگندیش چندربوس کی جدید تصنیف کا اگر مطالعہ کریں، جو پلانٹس آٹو گرافس اینڈ ڈیر ریوولوشن PLANTS AUTO GRAPHS AND THEIR REVELATION کے نام سے حال ہی میں شائع ہوئی ہے، تو آپ کو معلوم ہو کہ اس ماہر فن نے پودوں پر کس کس قسم کے تجربات کر کے کیسے کیسے حیرت انگیز انکشافات کیے ہیں، اور ان سے فطرت کے کیسے کیسے راز ہلے سربستہ معلوم ہوئے ہیں۔ ان حالات کے دیکھنے اور معلوم کرنے سے بے اختیار زبان پر یہ شعر جاری ہو جاتا ہے:

برگ درختان سبز، در نظر ہوشیار
ہر درقے دفترے ست، معرفت کردگار

مختلف قسم کی ادویہ کا پودوں پر جینہ وہی اثر مرتب ہوتا ہے، جو انسان یا جانور پر ہوتا ہے۔ کلوروفارم، پودے کو بھی اُسی طرح بے ہوش کر سکتا ہے جس طرح ہمیں آپ کو۔ ایک ایسا آلہ سربوس نے بنایا ہے، جس سے پودے کی حالت خواب کا آپ بہ خوبی اندازہ کر سکتے ہیں۔ سب سے زیادہ ذہنی الجس پودہ مائی موزہ ہے کہ ایک ذرا سی بدلی چھا جانے سے وہ اونگھنے لگتا ہے اور شعاع آفتاب پڑنے سے فی الفور چاق و چوبند ہو جاتا ہے۔ حالت خواب و بیداری کے تجربے اس پودے پر خوب کیے جاتے ہیں۔ اس کے برخلاف جھنگا پھول کا پودہ ہے، جو دریاے گنگا کے کنارے بنگال میں زیادہ ہوتا ہے۔ یہ دن کے وقت خواب استراحت میں رہتا ہے اور شب میں اپنی پوری بہار دکھاتا ہے۔ افریقہ میں ناریل کے ایسے درخت ہیں، جو ساحل سمندر کی سخت اور تیز ہوا کی وجہ سے ایک طرف کو بالکل ٹھکے ہوتے ہیں، لیکن صبح کے وقت جب یہ ہوا نہیں چلتی، یہ درخت بالکل سیدھے کھڑے ہو جاتے ہیں اور اُس وقت ان کے پھل توڑنا بڑا دشوار کام ہے۔ لیکن وقت مقررہ پر یہ سب پھر جھک جاتے ہیں اور دوسری صبح کو پھر اُسی طرح سیدھے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

بنگال کے اُس تار کے درخت کا حال تو اکثر لوگوں کو معلوم ہوگا، جو کہ طلوع آفتاب کے ساتھ بیدار ہوتا اور تدریجاً زمین سے اُٹھ کر سیدھا کھڑا ہو جاتا تھا؛ لیکن جوں جوں سرج

ڈھلتا جاتا تھا، یہ درخت بھی ٹھکنے لگتا تھا اور غروب آفتاب کے ساتھ سربسجود ہو جاتا تھا۔ کیا نباتات کے متعلق یہ جدید انکشافات اور سربلوس کی تصانیف پڑھ کر کسی انصاف پسند طالب حق کو یہ خبر آت ہو سکتی ہے کہ سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے ان مُسند و مُعتبر حقائق کی تکذیب کر دے، جو نباتات میں حس و شعور، ارادہ، لطف اور جذباتِ غیبت وغیرہ کی موجودگی پر دلالت کرتے ہیں!

ہم اسلامی تاریخوں میں یا ساریۃ! الجبل کا مشہور واقعہ پڑھتے تھے، لیکن وائرلیس کی ایجاد سے پہلے ہمارے لیے یہ سمجھنا کس قدر مشکل تھا کہ شاید ایک روحانی وائرلیس ٹیلیفون کے ذریعے سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی آواز ساریہ رضی اللہ عنہ تک پہنچ گئی ہو۔

عالم گیر جنگ کے زمانے میں ایک لاسلکی پیام پڑوگریڈ سے لندن کو چلا، راستے میں بعض جرمن اُسے جذب کرنے لگے، اوپر سے ایک فرانسیسی طیارے نے ان جذب کرنے والوں پر بم پھینکا اور یہ جرمن اپنی سعی میں ناکام رہے۔ دیکھیے، یہ مادی واقعہ اس روحانی واقعے سے کس قدر مُشاہت رکھتا ہے کہ عرش سے جو لاسلکی پیام سرزمین حجاز کو جا رہا ہے، شیاطین اُس کو اُچکنا چاہتے ہیں، لیکن اوپر سے شہابِ ثاقب کا گولا اُن کا کام تمام کر دیتا ہے اور وہ ناکام یاب و نامراد دھکیل دیے جاتے ہیں۔

اس قسم کے ہزار ہا سائنٹفک شواہد و نظائر نے خوارق اور دیگر مشکل اور غامض مسائل کی تفہیم کے متعلق ہمارے کام کو بہت آسان کر دیا، اور قوانینِ قدرت کی نسبت اپنی تنگ نظری اور کم مائیگی کی بنا پر جو غلطیاں ہم کرتے رہتے تھے، اُن میں سے بہت سی اغلاط کی اصلاح کر دی ہے۔ اب قانونِ قدرت کا لفظ استعمال کرتے وقت ہم کو بڑی احتیاط کرنی پڑتی ہے، اور کسی چیز کو روزمرہ کے معمول کے ذرا خلاف دیکھ کر جھٹ پٹ یہ دعوا نہیں کر سکتے کہ وہ قانونِ قدرت کے خلاف ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ "قانونِ قدرت" کے اس لفظ سے بھی ہم کو بہت کچھ دھوکا دیا گیا ہے۔ یہ لفظ مرعوب کرنے والا تو بہت ہے، مگر ہم جس مضمون کو اس لفظ سے ادا کرنا

چاہتے ہیں، اُس کی یہ صحیح تعبیر نہیں۔ فی الحقیقت جس چیز کا نام ہم نے ”قانونِ قدرت“ رکھا ہے، وہ ”قانونِ عادت“ ہے۔

قدرت اور عادت | یہ دو لفظ ہیں، جن کا فرق اُن کے سادہ مدلول ہی سے ہویدا ہے۔ ایک کام کی قدرت (یعنی کر سکتا)، اور ایک اُس کی عادت (یعنی کرتے رہنا)، دونوں الگ الگ چیزیں ہیں۔

ہر انسان اپنے نشیں محسوس کرتا ہے کہ خورد نوش، لباس، سواری اور معاشرے کے متعلق جو امور اُس کی عادت میں داخل ہیں، وہ اُن کے خلاف پر بھی قادر ہے؛ گو اُن کے خلاف عمل کرنا اُس کی عادت میں داخل نہیں۔ اسی طرح جو لوگ خدا کی ہستی اور اُس کی قدرت کے قائل ہیں، اُن کو لامحالہ یہ تسلیم کرنا پڑا ہے کہ خدا کی قدرت ارادہ اور عادت، یہ تینوں ایک دوسرے سے بالکل متمیز ہیں۔ ضروری نہیں کہ جو کچھ خدا کر سکتا ہے، وہ سب کر ڈالے اور جو کر ڈالے اُسی کو بار بار ہمیشہ کرتا رہے۔ خدا کی قدرت اور عادت کو مترادف ثابت کرنے کی کوئی دلیل ہمارے پاس نہیں ہے، بلکہ ایسے دلائل موجود ہیں، جو قدرت اور عادت کے تفاوت کو بہ خوبی ظاہر کرتے ہیں۔

دیکھو، ہم اُس قادرِ مطلق کی یہ عادت برابر دیکھتے چلتے آتے ہیں کہ وہ بچے کو رحمِ مادر سے نکالتا ہے اور پھر بہ تدریج پرورش کرتا ہے؛ چنانچہ ہم میں سے کسی نے نہیں دیکھا کہ کوئی جوانِ انسان یوں ہی آسمان سے گرا دیا گیا ہو یا زمین سے اُگ آیا ہو، مگر اس کے باوجود ہم یقین رکھتے ہیں کہ اُس کی عادتِ مستمرہ کے خلاف، رحم اور لطف کے توسط کے بدون، انسان کو پیدا کرنا بھی خدا کی قدرت میں داخل ہے۔ آخر ابتداءے آفرینش میں جب انسان پیدا کیا گیا، تو یقیناً اُس کی کیفیت اس متعارف طریقہ پیدائش سے بالکل علاحدہ تھی اور تمام اقوام و ملل کو تسلیم کرنا پڑا ہے کہ اُس وقت ایک یا متعدد انسان، بغیر ازدواجی وسائل اور موجودہ قانونِ تناسل کے، جوانِ جوانِ محض خدا کی قدرت اور اُس کے ارادے سے پیدا ہو گئے۔

پس جو مذہب یہ تسلیم کرتا ہے، قطعاً حق نہیں رکھتا کہ وہ اس کے بعد قادرِ مطلق

کو اس ظاہری سلسلہٴ اسباب میں ایسا جکڑ بند کر دے کہ خواہ کیسی ہی حکمت اور مصلحت کا اقتضا ہو، مگر وہ ایک منٹ کے لیے ان اسباب کے سلسلے سے علاحدہ ہو کر کوئی چھوٹے سے چھوٹا کام کرنے سے بھی مجبور اور عاجز ٹھہرے ؟

سبب و مسبب اور علت و معلول کے تمام سلاسل کو کسی ایسی حد پر ختم کرنا ضروری ہے، جہاں خلاق عالم کا دستِ قدرت، اسباب و وسائط کو چھوڑ کر بہ راہِ راست کسی چیز کو موجود کرتا ہے۔ پھر کیسے دعا کیا جاسکتا ہے کہ ہزاروں یا لاکھوں سال گزر جانے کے بعد حق سبحانہ و تعالیٰ میں جو لم یزل ولا یزال ہے، (معاذ اللہ) وہ زور و قدرت باقی نہیں رہا جو اسباب سے الگ ہو کر اب کسی چھوٹی یا بڑی چیز کو ایجاد کر سکے۔

بلاشبہ اُس کے کمالات لازوال اور ہر قسم کے نقص و فتور سے بہ نکل منترہ ہیں، اور اُس کی قدرت میں یقیناً یہ داخل ہے کہ جب چاہے، سبب کو بدون مسبب کے اور مسبب کو بدون سبب کے پیدا کر دے۔ مثلاً آگ موجود ہو اور نہ جلانے، یا کوئی چیز جل جائے مگر آگ موجود نہ ہو۔ بے شک آگ سے جلانا اُس کی عام عادت ہے، لیکن اگر کبھی کسی مصلحت سے اس عادت کے خلاف ظاہر ہو، تو وہ بھی تحتِ قدرت ہے۔

خرقِ عادت، یعنی کبھی کبھی سلسلہٴ اسباب سے علاحدہ ہو کر محض قدرت واسعہ کے اظہار کے طور پر کام کرنا، قدرت کے خلاف نہیں ہو سکتا۔ ہاں، عام عادت اور معمول کے خلاف ہوگا، لہذا اس کو قانونِ عادت کے خلاف کہنا صحیح ہو تو ہو، مگر قانونِ قدرت کے خلاف قرار دینا اُس لفظ کا غلط استعمال اور مغالطہ آمیز تعبیر ہے۔

قدرت اور عادت دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ اسباب سے مسبب کا پیدا کرنا خدا کی عادت ہے اور بلا سبب کے مسبب بنانا قدرت کا کام ہے۔ اسباب کا سارا سلسلہ قدرت کا بنایا ہوا ہے، نہ یہ کہ قدرت اسباب کی بنائی ہوئی ہے، اور اسی لئے قدرت تو اسباب پر حاکم ہوگی، لیکن اسباب معاذ اللہ قدرت کے پاؤں میں زنجیر نہیں ڈال سکتے۔

عادتِ عامہ و خاصہ

معجزہ خدا کی خاص عادت ہے | قدرت اور عادت کی اس تفریق کے وقت ایک اور بات بھی یاد رکھنی چاہیے، یعنی جیسا کہ ہم مشاہدہ کرتے ہیں، عادت کی بھی دو قسمیں ہیں: (۱) عادتِ مستمرہ عامہ (۲) عادتِ موقتہ خاصہ۔

عادتِ عامہ مستمرہ سے میری مراد وہ عادت ہے، جس کا استعمال بہ کثرات و مرات جلد جلد اکثر اور بیش تر اوقات میں ہوتا رہتا ہے اور اس کے بالمقابل عادتِ خاصہ موقتہ وہ ہوگی، جس کا تجربہ گاہ بہ گاہ نادر مواقع میں ہوا کرے۔

مثلاً ایک شخص کو ہم دیکھتے ہیں کہ بڑا نرم خو، حلیم الطبع اور بردبار ہے، ہزار گالیاں سننے اور اشتعال دلانے پر بھی اُسے غصہ نہیں آتا، لیکن اس کے باوجود بارہا یہ بھی تجربہ کیا گیا ہے کہ جب کبھی مذہب پر حملہ ہو یا اُس کے سامنے پیغمبر علیہ السلام کی بات کی ادنیٰ اسی توہین کی جائے، اُس وقت غصے سے بے تاب ہو کر آپے سے باہر ہو جاتا ہے۔ تو توہین کے وقت اُس کی یہ سخت گیری اور دُرُشتی اگرچہ اُس کی عام عادت (بردباری اور عفو و درگزر) کے مخالف ہے، لیکن وہ بجائے خود اُس کی ایک خاص اور مستقل عادت ہے جس کے تجربے کا موقع گاہ بہ گاہ اُس کے اسباب مہیا ہونے پر ملتا رہتا ہے۔

یاد رکھو، جس چیز کا نام ہم معجزہ رکھتے ہیں، وہ بھی ایک فعل اللہ تعالیٰ کا ہے جو اُس کی عام عادت کے خلاف ہو، مگر عادتِ خاصہ کے خلاف نہیں ہوتا بلکہ اُس کے موافق ہوتا ہے؛ کیوں کہ خاص اوقات میں، مخصوص مصالح کی بنا پر، عام عادت کو چھوڑ کر خوارق و معجزات کا ظاہر کرنا، یہ بھی حق تعالیٰ کی خاص عادت ہے۔

سلسلہ اسباب و مسببات کا قائم رکھنا اگرچہ اُس کی عادت ہے، لیکن بار بار یہ بھی تجربہ ہو چکا ہے کہ جب اپنے سفر اور مقربین کی تصدیق کرانا ہوتی ہے، تو ان کے

ہاتھوں پر وہ غیر معمولی اعلانات ظاہر کرتا ہے، جس سے دنیا سمجھ لے کہ بے شک یہ اُس کے سفیر اور مُقَرَّب و مُتَحَدِّ ہیں، جن کے دعوے کی تصدیق و تنوُّیہ کے لیے وہ خلاف معمول چیزیں پیش کر کے ساری مخلوق کو اُس کے مثل لانے سے عاجز کر دیتا ہے۔

اور یہی ہونا بھی چاہیے۔ عقل اور فطرت کا فیصلہ بھی یہی ہے کہ خدا اپنے خاص وفادار بندوں کے ساتھ وہ معاملہ کرے، جو دوسروں سے نہ کرے۔ کیا ایک گاؤں کے مکھیا یا نبرد ار کے کہنے سے دائسراے وہ کام کر سکتا ہے، جو ایک صوبے کے گورنر کے کہنے سے کرتا؟ ماں، باپ، بیوی، اولاد احباب، اقارب، محکام، رعایا، غرض ہر ایک کے ساتھ انسان کا معاملہ اور اس کی عادت جُداگانہ ہوتی ہے، جو ثابت کرتی ہے کہ یہ حاکم ہے یہ محکوم ہے، یہ باپ ہے یہ لاڈلا بیٹا ہے۔ بسا اوقات جو بے تکلفی یا خلاف طبع اُمور کا تحمل آدمی اپنے مخلصوں اور دوستوں کی رعایت سے کر لیتا ہے، وہ ہرگز ساری دنیا کے دباؤ سے نہیں کر سکتا۔ ایک اُستاد کا خاص خاص شاگردوں کے ساتھ جو معاملہ ہوتا ہے، وہ تمام طلبہ سے مستثنا ہوتا ہے۔ ان سب صورتوں میں، عام عادت سے علاحدہ معاملہ کرنا ہی قرین قیاس اور عقل و فطرت کے موافق ہے، تاکہ تفاوتِ مراتب اور اختلافِ مدارج کے سمجھنے میں کوئی مُخالطہ اور اشکال نہ رہے۔

اس امر کو ملحوظ رکھ کر میں کہتا ہوں کہ معجزہ فطرت کا مُقتضا ہے، اُس کے مُخالف کیوں کر ہو سکتا ہے؟ بلکہ اگر معجزات ظاہر نہ ہوں، تو یہ حکمت کے خلاف ہو گا، سفاقت ہوگی۔ جو لوگ خدا کے یہاں وجیہ ہیں، اپنی جان، اپنی آبرو، ہتھیلی پر رکھ کر خدا کے لیے کھڑے ہوتے ہیں اور خدا ہی اُن سے یہ دعوٰی کراتا ہے کہ ”آج تمہاری سب کی نجات میرے اتباع میں مُنحصَر ہے۔“ ضروری ہے کہ اُن کی وجہ سے عام عادت سے بالاتر کارنامے خدا کی قُدرت کے ظاہر ہوں، جو کہ تمام دنیا کو اپنی نظیر پیش کرنے سے تھکا دیں اور تمام مخلوق کو عاجز کر دیں، یہی معنی ہیں معجزہ کے۔ یاد رکھیے کہ

لے تنوُّیہ، اعلان و اظہار، تعریف ۛ بلند رتبہ، معزز

معجزہ خدا کا فعل ہوتا ہے، اُس کو نبی کا فعل سمجھنا سخت غلطی ہے۔

خدائی فعل انسانی افعال | بلاشبہ خدائی فعل اور بندوں کے افعال میں نمایاں
سے بد امتیاز ہوتا ہے | امتیاز ہوتا ہے۔ خدائی کام کی نقل بندہ اُتارتا ہے،
لیکن عاقل مُبصر کو اصل اور نقل میں کبھی التباس بھی نہیں ہو سکتا۔

گلاب خدا کا بنایا ہوا ہے۔ اب تم بھی کاغذ وغیرہ کے پھول بناتے ہو۔ تمہارے
پھول پر پانی کا ایک چھینٹا پڑ جائے، تو تمہاری صنعت کا سارا پول کھل جاتا ہے، لیکن
قُدرتی پھول پر پانی گرتا ہے، تو اُس میں اور زیادہ صفائی اور تازگی محسوس ہوتی ہے۔
انسان جان داروں، درختوں، پھولوں کی تصویر کھینچ لیتا ہے، مگر مچھلی کی آنکھ، مکھی کا
کاپڑ، مچھر کی ٹانگ بلکہ ایک جو کا دانہ تمام عالم مل کر بھی نہیں بنا سکتا، لاکھوں مُحسِنِ
کر وڑوں بیل بوٹے دنیا کے صنّاع بناتے ہیں، مگر مچھر کا ایک پَر بنانے سے بالکل عاجز
ہیں۔ لَنْ يَخْلُقُوا ذُبَابًا وَلَوْ اجْتَمَعُوا لَهُ - (ج ۳)

اسی کا نام خدائی فعل ہے۔ اور جب ایسا فعل پُر وِیْن تو سَطُّ اُنْ اَسْبَابِ کے، جو
اُس کی تکوین کے لیے مُتعارف ہیں، کسی مدعی نبوت کے ہاتھوں پر ظاہر ہو، اُس کا نام
معجزہ ہو جاتا ہے۔

معجزہ کوئی فن نہیں | پس جب یہ ثابت ہوا کہ معجزہ اللہ تعالیٰ کا فعل ہے، جو پُر وِیْن
تعالیٰ اسباب کے ظہور پذیر ہو، تو دوسرے خدائی کاموں کی طرح اُس میں بھی کسی صنّاع
کی صنعت کو دخل نہیں ہو سکے گا۔ بنا بریں، تنجیم، کہانت، سمریزم، سحر، شعبدہ بازی
کی طرح معجزہ کوئی فن نہیں، جو تعلیم و درس سے حاصل ہوتا ہو۔ یہ فُنُونِ سِکھنے سے حاصل
ہو سکتے ہیں، لیکن معجزہ میں نہ تعلیم و تعلم ہے، نہ انبیا کا کچھ اختیار اس میں چلتا ہے، نہ معجزہ
صادر کرنے کا کوئی خاص ضابطہ اور قاعدہ اُن کو سکھلایا جاتا ہے کہ جب چاہیں ویسا
عمل کر کے ویسا ہی معجزہ دکھلا دیا کریں۔

لے کاری، گر، فن کار لے تخلیق، عدم سے وجود میں آنا لے یعنی اَسْبَابِ اختیار کیے بغیر

بلکہ جس طرح ہم قلم لے کر لکھتے ہیں اور یہ ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ قلم لکھتا ہے اور فی الحقیقت اُس کو لکھنے میں کوئی اختیار نہیں ہوتا، یہی صورت معجزہ کی بھی ہے۔ ایسا نہیں کہ انبیاء جس وقت چاہیں، مثلاً اٹھلیوں سے پانی کے چشمے جاری کر دیں، بلکہ جس وقت اللہ تعالیٰ کی حکمتِ نابغہ مُقتضیٰ ہوتی ہے، جاری ہو سکتے ہیں۔ برخلاف نئونِ سحریہ وغیرہ کے، جو تعلیم و تعلم سے حاصل کیے جاتے ہیں۔ اُن میں جس وقت چاہیں، قواعد مُقررہ اور خاص خاص افعال کی پابندی سے یک سال نتائج اور ایک ہی طرف کے آثار و کیفیات دکھلائے جاسکتے ہیں۔ مگر آج تک مُذعیانِ نبوت و اعجاز کی طرف سے کوئی درس گاہ معجزہ سیکھنے سکھانے کی نہ بنی، نہ کوئی قاعدہ اور ضابطہ مُتمہد ہوا، نہ کوئی کتاب تنجیم، مسمریم، سحر کی طرح معجزات سکھانے والی تصنیف کی گئی؛ بلکہ وہ خدا کا فعل ہوتا ہے، جو تمام دنیا کو تھکا دیتا ہے۔ اگر افعال میں سے ہے، تو اُس جیسے فعل سے دُنیا عاجز ہے اور اگر اقوال میں سے ہے، تو اُس جیسے کلام سے تمام دُنیا کے بولنے والے مجبور اور در ماندہ ہیں۔ رسول کے اختیار یا قدرت کو بھی اس میں پورا دخل نہیں۔ اسی واسطے انبیاء سے جب معجزات طلب کیے گئے، تو اُنھوں نے اللہ پر محوّل کیا۔ فرماتے ہیں:

وقالوا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتَّى
تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْأَرْضِ يَنْبُوعًا
أَوْ تَكُونَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّحِيلٍ
وَعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْأَنْهَارَ
خِلَالَهَا تَفْجِيرًا أَوْ تُسْقِطَ
السَّمَاءَ كَمَا زَعَمَتْ عَلَيْنَا
كِسْفًا أَوْ تَأْتِيَ بِنَاثِهِ وَالْمَلَائِكَةُ
قَبِيلًا أَوْ يَكُونُ لَكَ
اور وہ تم سے کہتے ہیں کہ ہم اُس وقت تک تم پر
ایمان لانے والے نہیں کہ یا تو ہمارے لیے زمین سے
کوئی چشمہ بہا کر لائے یا کھجوروں انگوروں کا تمہارا کوئی
باغ ہو اور اُس کے بیج میں تم بہت سی ٹہریں جاری
کر دکھاؤ یا جیسا کہ تمہارا خیال ہے، آسمان کے ٹکڑے
ہم پر لائے، یا خدا اور فرشتوں کو ہمارے سامنے
لا کھڑا کر دے، یا رہنے کے لیے تمہارا کوئی بِلّائی گھر ہو،
یا آسمان پر چڑھ جاؤ اور جب تک تم دہاں سے

یعنی بنایا گیا ۷ محوّل کرنا: حوالے کرنا

بَيْتُ مِنْ زُخْرَفٍ أَوْ شَرْقَا
فِي السَّمَاءِ وَلَسَنُ نُوْمِنَ
لِرُقَيْتِكَ حَتَّى تُنْزِلَ
عَلَيْنَا كِتَابًا نَقْرُوهُ
فَلِ سُبْحَانَ رَبِّيَ هَلْ
كُنْتُ إِلَّا بَشَرًا

رسولاً (بنی اسرائیل ۹۲)

جانتا ہے، ظاہر کرتا ہے۔

ایک کتاب اُتار کر نہ لاؤ کہ ہم آپ اس کو پڑھ بھی لیں،
ہم تمہارے پڑھنے کو بھی باور کرنے والے نہیں۔ کہہ دو راے
محمد صلعم! کہ میں رسول تو ہوں، مگر بشر رسول ہوں (خدا نہیں
ہوں یعنی معجزہ تو بشر کا فعل نہیں ہے خدا کا فعل ہے۔ میرے
قبضے میں یہ نہیں کہ جو چاہو تمہیں کر دوں، بلکہ جس قدر خدا
میری تصدیق کی علامات کے طور پر کافی اور مناسب
جانتا ہے، ظاہر کرتا ہے۔)

معجزہ کچھ ایسے حالات کے ساتھ آتا ہے | جب موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو دعوت
کہ اُس میں شبہ کی گنجائش نہ رہے | دی اور عصا کا معجزہ دکھلایا، اُس کا

جواب دینے کے لیے فرعون نے بڑے بڑے ساحروں کو جمع کیا اور وہ بھی موسیٰ علیہ السلام
کے مقابلے میں اپنی لالٹیاں اور رستیاں لے کر پہنچ گئے۔ وہ سمجھے ہوئے تھے کہ موسیٰ بھی
ہمارے ہم پیشہ ساحر ہیں، اسی لیے کہا: إِمَّا أَنْ تُلْقَىٰ وَإِمَّا أَنْ نَكُونَ
الْمُتْلِفِينَ۔ یعنی پہلے تم ڈالو گے یا ہم؟ مگر موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ: "تم پھینکو"۔
جب اُنھوں نے اپنی لالٹیاں اور رستیاں پھینکیں اور وہ چلتے ہوئے سانپ نظر آنے لگے،
تو: فَأَوْجَسَ فِي نَفْسِهِ خِيفَةً مُوسَى۔ موسیٰ علیہ السلام اپنے دل میں ڈرے؛ حالانکہ
اگر وہ بھی پیشہ در ساحر ہوتے، تو ڈر کی کوئی وجہ نہ تھی۔

شیخ اکبر فرماتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر یہ خوف کیوں طاری ہوا اور
کیوں طاری کیا گیا؟ یعنی خوف کا منشا کیا تھا اور اُس کے طاری کیے جانے میں کیا حکمت
تھی؟ اگر کہا جائے کہ سانپوں کی صورت دیکھ کر ڈر گئے، تو موسیٰ علیہ السلام جیسے پیغمبر
کو ان لالٹیوں اور رستیوں سے کوئی خوف نہیں ہو سکتا تھا۔ خصوصاً جب کہ اسی نوعیت
کے اعلیٰ خوارق کا تجربہ بھی دومرتبہ کر چکے تھے۔ پہاڑ پر جو واقعہ "القارِ عصا" کا ہوا، اُس پر
"لَا تَخَفْ" سن چکے تھے؛ کیوں کہ وہاں بھی خائف ہوئے۔ وَلَمْ يَدِرْ وَلَمْ يَعْصِبْ۔
جس کے جواب میں کہا گیا: لَا تَخَفْ، إِنِّي لَا يَخَافُ لَدَعَى الْمُرْسَلُونَ۔ اے موسیٰ! مت

ڈرو، یہاں انبیاء ڈرا نہیں کرتے۔ پھر دوسری مرتبہ فرعون کے سامنے لاطلی ڈال کر بھی دیکھ چکے تھے۔

شیخ فرماتے ہیں کہ پہلی دفعہ پہاڑ پر بشری خوف تھا، جو کہ وہیں نکل چکا تھا۔ اب دوسری دفعہ جو خوف ساحرین کے مقابلے میں طاری ہوا، یہ اس وجہ سے کہ موسیٰ علیہ السلام جانتے تھے کہ میرے ہاتھ میں کوئی طاقت اور قدرت نہیں، کہیں ساحرین کی اس شعبہ بازی کے سامنے حق کا کلمہ پست نہ ہو جائے اور بے وقوف لوگ ان جھوٹے کرشموں کو دیکھ کر فتنے میں نہ پڑ جائیں، چال چہ جواب میں ارشاد ہوا:

لَا تَخَفْ إِنَّكَ أَنْتَ الْأَعْلَىٰ ۝ ڈرو مت! تمھی سر بلند ہو کر رہو گے۔

یہ تو خوف کا منشا تھا، آگے اُس کی حکمت بیان فرماتے ہیں کہ جب ڈر گئے، اور ڈرے ہوئے آدمی پر خوف اور گھبراہٹ کے جو آثار پیدا ہوتے ہیں، اُن کو محسوس کر کے ساحرین سمجھ کہ یہ ہمارے پیشے کا آدمی ہرگز نہیں، یا کم از کم اس کو کوئی ساحر نہ عمل معلوم نہیں جس سے ہمارے مقابلے میں قلب کو مطمئن رکھ سکے، اس کے بعد موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا ڈالا، جو بآذن اللہ تمام جادو کے سانپوں کو نگل گیا، تو ساحرین نے یقین کر لیا کہ یہ سحر سے بالاتر کوئی اور حقیقت ہے، وہ سب بے اختیار سجدے میں گر پڑے اور چلا اٹھے کہ ہم بھی موسیٰ اور ہارون کے پروردگار پر ایمان لاتے ہیں۔ فرعون نے بہت کچھ دھکیاں دیں اور خوف زہ کرنا چاہا، مگر اُن کا جواب صرف یہ تھا:

فَاقْضِ مَا أَنْتَ فَاسِقٌ ۝ إِنَّمَا تَقْضِي هَذِهِ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا ۝ إِنَّا آمَنَّا بِرَبِّنَا لِيَغْفِرَ لَنَا خَطِيئَتَنَا وَمَا أَكْرَهْتَنَا عَلَيْهِ مِنَ السِّحْرِ ۝ وَاللَّهُ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ (طہ ۷۲)

جو کچھ تجھے فیصلہ کرنا ہے، کر گزر۔ تو اس سے زیادہ نہیں کہ صرف اسی دنیا کی (چند روزہ) زندگی کا فیصلہ کر سکتا ہے۔ ہم تو اپنے (حق) لایموت پروردگار پر ایمان لائے ہیں، تاکہ وہ ہماری خطائیں اور اُن ساحرانہ حرکتوں کو معاف فرمائے، جو تو نے ہم سے زبردستی کرائیں۔ اور اللہ سب سے بہتر اور ہمیشہ باقی رہنے والا ہے۔

اور جو لوگ ایسی آیاتِ بینات دیکھ کر بھی راہ حق پر ایمان نہ لائے، اُن کا حال یہ تھا:

وَحَبَدَ وَابْهًا وَاسْتَيْقَنَتْهَا
 أَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَعُلُوًّا .
 (نمل ۱۳)

انہوں نے ہماری آیات کا انکار کیا ظلم سے اور زیادتی
 انہوں نے ظلم سے، حالانکہ اُن کے دلوں کو (سچائی کا) پورا پورا
 یقین حاصل تھا۔

خود فرعون کو خطاب کر کے حضرت موسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں:

لَقَدْ عَلِمْتَ مَا أَنْزَلَ هَؤُلَاءِ
 إِلَّا رَبُّ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ بَصَائِرَ
 وَإِنِّي لَأَظُنُّكَ يَا فِرْعَوْنُ
 مَثْبُورًا . (بنی اسرائیل ۱۰۲)

تو خوب جانتا ہے کہ یہ آیات، آسمان و زمین کے
 پروردگار کے سوا کسی نے نہیں اتاریں۔ اور فرعون
 میں تجھے سمجھتا ہوں کہ تو اس علم کے باوجود
 ہلاکت میں گر چکا ہے۔

معجزہ خدا کی طرف سے | یہ ہیں سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ معجزہ فی الحقیقت حق
 نبوت کی فعلی تصدیق ہے | تعالیٰ کی طرف سے نبوت کی عملی تصدیق ہوتی ہے۔

جو شخص دعوا کرتا ہے کہ میں نبی ہوں، یعنی حق تعالیٰ نے مجھ کو اپنے فرامین و ہدایات
 پہنچانے کے لیے چھانٹ لیا ہے، نجاتِ ابدی سے بہرہ ور ہونا صرف میرے ہی اتباع میں
 منحصر ہے، میرے اتباع سے الگ ہو کر عذابِ الہی سے بچنے کی کوئی سبیل نہیں، یہ دعویٰ
 خدا تعالیٰ کے سامنے، اُس کی زمین پر، اُس کے آسمان کے نیچے بہ آواز بلند بار بار کرتا ہے
 اور یہ بھی کہتا ہے کہ اللہ جل شانہ میرے ہاتھوں اور زبان سے وہ چیزیں ظاہر فرمائے گا،
 جو اُس کی عام عادت کے خلاف ہوں گی اور دنیا اُن کی مثال لانے سے عاجز ٹھہرے گی
 پھر اُسی کے موافق مشاہدہ بھی کیا جا رہا ہو، تو یہ یقیناً خدا کی جانب سے اُس کے دعوے کی
 عملی تصدیق ہے۔ اور خدا تعالیٰ چوں کہ جھوٹی تصدیق نہیں کر سکتا، لہذا نبی کا دعوا معجزہ
 کے ظہور کے بعد سچا ثابت ہو جاتا ہے۔

اسی لیے ہم بلا خوفِ تردید یہ یقین رکھتے ہیں کہ حق تعالیٰ، جو تمام سچائیوں کا سرچشمہ
 اور صداقتوں کا خزانہ ہے، کسی انسان کو یہ دستِ رس نہ دے گا کہ وہ نبوت کا جھوٹا دعوا

۱ فرامین: فرمان کی جمع، احکام ۲ دعویٰ: دعوا کی جمع

کر کے برابر ایسے خوارق عادات دکھلاتا رہے گا کہ دنیا اُس کے مقابلے سے عاجز ہو جائے۔
فرد رہے کہ خدا ایسے حالات برروے کار لائے گا کہ اُس کی طرف سے جھوٹے دعوے
کی عملی تصدیق نہ ہونے پائے۔

فعلی تصدیق کی مثال | آپ جلسوں میں دیکھتے ہیں اور کونسلوں اور پارلیمنٹوں کا حال
سُننے ہیں کہ جب کسی مسئلہ، تجویز یا انتخاب پر بحث چھڑ جاتی ہے، تو فریقین کی پوری زور آزمائی
اور رد و کد کے بعد فیصلے کا مدار اس پر ہوتا ہے کہ رائیں شمار کر لی جائیں، جس کے لیے
شرکاء اجلاس سے ہاتھ اٹھوائے جاتے ہیں اور یہی ہاتھ اٹھا دینا یا نہ اٹھانا، اُس
ریزولوشن کی تصدیق و تائید یا تکذیب و تردید کے لیے کافی ہوتا ہے، زبان ہلانے
کی قطعاً ضرورت نہیں ہوتی۔

ایک شخص کی نسبت پبلک جلسے میں رائے لی جاتی ہے کہ آیا جمہور کو اُس پر
اعتماد ہے؟ اس پر ہاتھ اٹھا دیے جاتے ہیں۔ یہی اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ اُن
سب کی رائے اُس شخص کے حق میں ہے۔ ہم دن رات سیکڑوں دفعہ اپنے ہاتھ اوپر اٹھائیں،
اس کو کسی چیز کے ثابت کرنے یا نہ کرنے میں کوئی دخل نہیں، لیکن یہی ہمارا ہاتھوں کی وضع
طبعی اور ہیئت اصلی کے خلاف اوپر کو اٹھا دینا، جب کسی ریزولوشن کی تسلیم و انکار یا
کسی دعوے کی صحت و بطلان کی آزمائش کے موقع پر ہو، تو کسی غبی سے غبی انسان کو
بھی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہتی۔ اس وقت کھڑے ہوئے ہاتھوں ہی کے شمارے
رایوں کا شمار کر لیا جاتا ہے اور پھر بڑے نازک اور عظیم الشان مسائل کے فیصلے ہاتھ کی
اس غیر طبعی حرکت پر بے چون و چرا ہو جاتے ہیں۔

پس جس طرح ہاتھوں کا لٹکائے رکھنا آدمی کی عادت اور وضع طبعی کے موافق
ہے اور کبھی اوپر کو اٹھانا کبھی خاص ضرورت اور مصلحت سے ہوتا ہے، اور یہی غیر طبعی وضع
جب کسی ریزولوشن پر ووٹ لینے کے وقت اختیار کی جائے، تو اُس ریزولوشن یا
دعوے کی بے شک و شبہ تصدیق و تائید سمجھی جاتی ہے، ٹھیک اسی طرح حق تعالیٰ شانہ
کا جو فعل عام سنن طبعیہ کے سلسلے میں ظہور پذیر ہو، وہ اُس کی عام سنت اور عادت کہلاتی

ہے اور جو اسباب سے علاحدہ ہو کر کسی خاص مصلحت اور حکمت کے اقتضا سے ظاہر ہو، وہ خرقِ عادت ہے۔ اور یہی خرقِ عادت جب کسی شخص کے دعوائے نبوت اور متحدگی کے بعد اُس سے با اُس کے کہنے کے موافق صادر ہو، یہ معجزہ ہے کہ جو بنِ جانبِ اللہ اُس کے دعوے کی فعلی تصدیق ہے۔

معجزہ، کرامت، ارباص | لیکن اسی کے مشابہ کوئی خرقِ عادت اگر کسی نبی کے متعلق اُس کے دعوائے نبوت یعنی بعثت اور متحدگی سے پہلے ظاہر ہو، اُس کو ارباص کہتے ہیں اور اگر کسی غیر نبی کے ہاتھ پر، اتباعِ نبی کی برکت سے، اس قسم کے خارقِ عادات نشانات دکھلائے جائیں، تو اُس کا نام کرامت ہے۔

کرامت اور استدراج کا فرق | ہاں، ایک چیز ان تینوں کے ہوا اور ہے جس کو مُتکَلِّم کی زبان میں استدراج کہتے ہیں۔ یعنی وہ خوارقِ عادات، جو گاہ بہ گاہ کسی بدکار، گمراہ، فاسق یا کافر مُشرک اور مُکذَّبِ انبیاء کے ہاتھ سے ظاہر ہوتے ہیں، اگرچہ یہ خوارق بھی صورِ ثا اُن خوارق سے مُشابہ ہو سکتے ہیں، جن کا نام ہم نے کرامات رکھا ہے۔ لیکن سمجھنے والوں کے نزدیک ان دونوں میں ایسا ہی فرق ہے، جیسا کہ ایک نجیب الطرفین مولود اور ایک ولد الزنا میں، کہ بہ ظاہر دونوں بچے یک سال شکل و صورت رکھتے ہیں اور جتنی طور پر دونوں ایک ہی طرح کی حرکت و عمل کا نتیجہ ہیں۔ مگر محض اس لیے کہ اُن میں سے ایک بچہ فعلِ حرام کا نتیجہ اور دوسرا فعلِ مشروع و طیب کا ثمرہ ہے، ہم پہلے کے تولد کو مذموم اور قابلِ نفرت اور دوسرے کی ولادت کو محمود اور موجبِ مسرت و ابہاج سمجھتے ہیں۔

ٹھیک اسی طرح جو خوارقِ عادات، اتباعِ رسول اور خداے واحد کی پرستش کا نتیجہ ہوں، وہ کراماتِ ادبیا کہلاتی ہیں، جن کے مبارک و محمود ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ اس کے برخلاف جو خوارق، اتباعِ شیطان، عبادتِ غیر اللہ، فسق و فجور

لے چیلنج لے صحیح النسب لے محسوس طور پر، ظاہری شکل میں لے شرعی، قانونی اور محمود عمل

اور اخلاذ الی الارض کے ثمرات ہوں؛ اُن کا نام استدراج اور تصرفِ شیطانی ہے۔ اور اسی جگہ سے ہمارا یہ خیال ہے کہ ہم صرف کرامات سے ولی کو نہیں پہچان سکتے بلکہ ولی سے کرامات کو پہچانتے ہیں۔ اور یہ بڑے شکر کا مقام ہے کہ حق تعالیٰ نے محض اپنے فضل سے ہم کو اس قسم کے فُرُوقِ تلقین فرما کر التباسِ حق باباطل سے محفوظ رکھا ہے۔ واللہ ولی التوفیق۔

اللَّهُمَّ ارِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَارْزُقْنَا اتِّبَاعَهُ
وَارِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَارْزُقْنَا اجْتِنَابَهُ
بِحُرْمَةِ نَبِيِّكَ وَحَبِيبِكَ مُحَمَّدٍ
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ

۱۔ اخلاذ الی الارض: زمین سے چمٹ جانا، محبتِ دنیا (قرآنی تعبیر)
۲۔ فُرُوق: فرق کی جمع

مسئلہ تقدیر

افادات

حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ
ترتیب و تحقیق: خالد القاسمی

انسان مختار ہے یا مجبور؟ جبر و اختیار کی تشریح
افعال عباد کی حقیقت اور نوشتہ تقدیر کا
مطلب تخلیق عالم کی حکمت وغیرہ امور پر
حکمانہ بحث۔

منتظم اشاعت

ناشر

دارالعلوم حیدرآباد۔ آندھرا پردیش © دارالمؤلفین دیوبند۔ یوپی
۲۳۷۵۵۴

باهتمام : وحید الزماں قاسمی کیرانوی
معتد دارالمؤلفین دیوبند

طبع اول ۱۴۱۳ھ ۱۹۹۲ء
قیمت رسالہ مسئلہ تقدیر ۱۰/-

فہرست مضامین مسئلہ تقدیر

نمبر شمار	مضامین	صفحہ	نمبر شمار	مضامین	صفحہ
۱	مسئلہ تقدیر ایک اہم شبہ	۱۹۷	۱۰	نیچریوں کے لایعنی مفروضات	۲۱۳
	اور اس کا ازالہ			اعمال کے نتائج	۲۱۶
۲	انسان مختار ہے یا مجبور!	۱۹۸	۱۱	نوشتہ تقدیر مطابق	۲۱۹
۳	مسئلہ تقدیر کے متعلق	۲۰۱		استعداد ہے	
	معزلہ کے عقائد		۱۲	تین باتیں	۲۲۰
۴	ایک واضح مثال	۲۰۳	۱۳	تخلیق عالم کی حکمت	۲۲۳
۵	افعال عباد کی حکمانہ تشریح	۲۰۵	۱۴	جبر و اختیار کے درمیان	۲۲۰
۶	افعال عباد کے متعلق حضرت			پر حکمت راستہ	
	نانو توئی کی تحقیق	۲۰۷			
۷	فرقہ جبریہ کے عقائد	۲۰۸			
۸	مسئلہ کسب	۲۰۹			
۹	مسئلہ کسب کے متعلق ایک	۲۱۱			
	عام فہم مثال				



مسئلہ تقدیر

مسئلہ تقدیر پر ایک اہم شبہہ | فقال رجل يا رسول الله! أفلا ننتكل
اور اس کا ازالہ | علی کتابنا ۱۶۱۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو

فرمایا کہ سب کچھ پہلے سے متعین اور فیصل شدہ ہے، اس پر صحابہؓ کو یہ شبہہ ہوا کہ جب سب
کچھ طے شدہ اور متعین و مشخص ہو چکا، اور جو وہاں طے ہو چکا وہی واقع ہو کر رہے گا، پھر
عمل کرنے سے کیا فائدہ؟ کیوں کہ علم الہی میں جو متعین اور طے شدہ ہے، اُس کے خلاف
ہونا تو ممکن نہیں! عمل کرو یا نہ کرو، کم کرو یا زیادہ، اُسی کے مطابق ہو کر رہے گا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو جواب ارشاد فرمایا، اُس کا حاصل یہ ہے کہ تم عمل کرتے
رہو۔ کیوں کہ تم کو کیا خبر ہے کہ اللہ کے علم میں کیا چیز طے شدہ ہے! لہذا تم اپنا کام کرتے چلے
جاؤ، فضول بحثوں میں نہ پڑو۔ اور تم ناگزیر کرو گے وہی جو علم الہی میں طے ہو چکا ہے، پھر
ایسی بے کار بحثوں میں اُلجھنے سے کیا فائدہ؟

رہا یہ کہنا کہ کسی شخص کا جنتی یا جہنمی ہونا اور اسی طرح سعید و شقی ہونا جب پہلے
لکھا جا چکا ہے، تو عمل کی کیا ضرورت؟ تقدیر کا لکھا تو بہ ہر حال پورا ہو کر رہے گا! یہ
قلبتِ تدبیر کی دلیل ہے۔ کیوں کہ تقدیر میں جہاں یہ لکھا ہے کہ فلاں شخص جنتی یا سعید ہوگا،
وہیں یہ بھی لکھا جا چکا ہے کہ وہ شخص فلاں فلاں عمل کر کے اس نتیجے پر پہنچے گا۔ لہذا وہ
اعمال بھی مُقدّر ہوئے اور اُن کا صدور بھی تقدیر ہی کا ایک جزو ہوا۔ پھر اس کے خلاف
کیسے ہو سکتا ہے؟

پس یہ سوال کہ ہم عمل کیوں کریں؟ یا عمل میں زیادہ جان کیوں ماریں؟ اس کا جواب
یہ ہوگا کہ ہماری تقدیر میں جن اعمال کے ذریعے جنت میں پہنچنا یا درجاتِ عالیہ حاصل کرنا

لکھا ہے، اُن کا مُدور بھی ہم سے ضروری اور لا بُدھی ہے؛ جس طرح دُنیا میں ایک مُدتِ مُتَعَيَّنہ تک ہماری حیات جن اَسباب کے ذریعے مُقَدَّر ہے، اُن اَسباب کی مُباشَرَت بھی تقدیری طور پر ہمارے لیے ضروری ہے۔ تقدیر میں صرف نتائج و مُسَبَّبات ہی نہیں، اُن کے اَسباب و ذرائع اور مبادی بھی پہلے سے لکھے ہوئے ہیں۔ لہٰذا یہ سوال بالکل بے موقع ہے۔

خلاصہ یہ کہ جس شخص کا جنتی یا جہنمی ہونا مُقَدَّر ہے، وہ خواہ کتنی ہی بحث و تکرار کرے، اُس کی طبیعت آخر کار اُسی طرف چلے گی اور وہی اَعْمَالِ صَالِحہ یا اَعْمَالِ کُفْرِیہ اُس کے لیے آسان ہوتے چلے جائیں گے، جو اُس کے آخری نتیجے تک پہنچنے کے وسائل و ذرائع ہیں۔ اور ان اچھے بُرے اَعْمَال کی تفریق و امتیاز جن اَسباب پر مبنی ہے، مثلاً انزالِ کُتُب و اِرسالِ رُسُل وغیرہ، ان سب کا وقوع پذیر ہونا بھی ناگزیر ہوگا۔

بہر حال، جس طرح ایک شخص کا جنتی یا جہنمی ہونا مُقَدَّر ہے، اس کے مُناسِب اَعْمَال کا مُدور بھی مُقَدَّر ہے اور اچھے بُرے اَعْمَال کی تقسیم کے لیے کتابوں اور رسولوں کا آنا بھی مُقَدَّر ہے۔ یہ سب چیزیں ایک طے شدہ پروگرام کے مُطابِق ہو کر رہیں گے۔

انسان مختار ہے یا مجبور! خیر، یہ تو ایک سُوال و جواب کی تقریر و تشریح تھی، جو صحابہؓ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان پیش آچکا۔ اس کے بعد یہاں ایک دوسرا سُوال پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے یہ اَعْمَال، آیا ہمارے ارادہ و اختیار میں ہیں، یعنی ان کے مُدور میں ہمارے اختیار و ارادے کو کچھ دخل ہے، یا ہم بالکل مجبور محض و مُضطر ہیں!

یہ سُوال اس لیے ہو رہا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کے علم کے خلاف ایک ذرہ بھی نہیں ہل سکتا، ہر شخص وہی عمل کر سکتا ہے یا کر گیا جو عِلْمِ اِلهی میں پہلے سے مُقرر اور طے شدہ ہے، تو پھر یہ ظاہرِ عامل اپنے عمل میں مجبور و مُضطر ہوا، اور عامل کے اپنے ارادہ و اختیار کو کوئی دخل اُس کے مُدور میں نہ رہا۔ گویا بندوں کے سارے افعال اضطراری ہو گئے۔

لیکن فی الحقیقت یہی بات غلط ہے کہ علم الہی کی وجہ سے عامل کا ارادہ و اختیار سلب ہو جاتا ہے۔ بے شک ہر چیز اُسی طرح وقوع پذیر ہوگی جو علم الہی میں ازل سے طے شدہ ہے، ایک رتی برابر بھی اُس سے تخلف نہیں ہو سکتا؛ مگر یہ علم الہی ازلی ہمارے ارادہ و اختیار کو پھر بھی سلب نہیں کرتا، بلکہ اُن اُس کو اور زیادہ ثابت و مستحکم کرتا ہے۔ کیوں کہ علم الہی میں مثلاً ہمارے افعال اختیار یہ کے متعلق، یہ طے شدہ ہے کہ فلاں شخص اپنے ارادہ و اختیار سے فلاں عمل فلاں وقت میں کرے گا۔ بناؤ علیہ یہ ضروری اور لازم ہوگا کہ وہ شخص اپنے ارادہ و اختیار ہی سے وہ عمل انجام دے، ورنہ ایک چیز کا علم الہی کے خلاف واقع ہونا لازم آئے گا، جو محال ہے۔

علاوہ بریں، علم الہی میں کسی عمل کے مقرر و متعین ہونے کی وجہ سے، عامل کا سلب الارادہ و الاختیار نہ ہونا، ایک اور محبت سے بہ خوبی سمجھ سکتا ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے افعال و اعمال عباد کے متعلق بحث کو ملتوی رکھیے۔ میں پوچھتا ہوں کہ خود اللہ تعالیٰ کے جو کچھ افعال و تصرفات ہمہ وقت اس کائنات میں مشاہد ہیں، وہ سب اُس کے علم قدیم محیط میں پہلے سے ثابت ہیں یا نہیں؟ اگر نہیں ہیں تو جہل لازم آتا ہے۔ لہذا مانتا پڑے گا کہ خود اللہ تعالیٰ جو کچھ افعال اس دنیا میں کرتے ہیں، وہ سب علم قدیم میں پہلے ہی سے طے شدہ ہیں، کیوں کہ جہل مستع ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ خود اللہ تعالیٰ کا کوئی فعل، اُس کے علم ازلی محیط کے خلاف ہو سکتا ہے؟ اگر نہیں ہو سکتا، جیسا کہ ظاہر و مسلم ہے، تو یہاں بھی وہی بحث آگئی، جو تم افعال عباد کے متعلق کر رہے تھے کہ جبہ علم قدیم سے خلاف نہیں ہو سکتا، تو عامل اپنے عمل میں مجبور و مضطر ہوگا۔ اس بنا پر تو یہ لازم آتا ہے کہ بندے تو رہے ایک طرف، خود اللہ تعالیٰ بھی فاعل و مختار نہ ہو۔ تم نو افعال عباد کی فکر میں تھے، یہاں خود افعال باری کا اضطراری ہونا لازم آگیا۔

۱۔ یعنی با اختیار ہونا ۲۔ خدا کا علم جو قدیم ہے اور ازل سے ابد تک تمام چیزوں کا محیط ہے۔

پس ثابت ہوا کہ کسی فعل کے ساتھ علم الہی کے متعلق ہونے سے، فاعل کا مضطر اور مسلوب الارادہ ہونا لازم نہیں، خواہ وہ فاعل اللہ تعالیٰ ہو یا بندے ہوں۔ تو اصل بات وہی جو میں کہ چکا ہوں کہ علم ازلی قدیم، فاعل کے ارادہ و اختیار کی نفی نہیں کرتا۔ اسے ایک ناقص سی مثال سے سمجھیے۔ آپ جانتے ہیں کہ ریل گاڑیوں کی آمد و رفت تابع جہدِ امکان طے شدہ ٹائم ٹیبل کے بالکل موافق و مطابق ہوتی ہے۔ لیکن کیا اس ٹائم ٹیبل کو ریل کے چلنے اور اس کی حرکت میں ذرا سا بھی دخل ہے؟ ظاہر ہے کہ کچھ بھی دخل نہیں۔ تو یہ طور تقریب الی الفہم کے، علم الہی کو یہ طور اس ٹائم ٹیبل کے سمجھیے۔ فرق یہ ہے کہ ٹائم ٹیبل بنانے والوں کا علم چوں کہ محیط و کامل نہیں، وہ لوگ محض اپنے قواعد و اصول کی بنا پر طے کر لیتے ہیں کہ فلاں اسٹیشن پر گاڑی فلاں وقت پہنچے گی، اُن کو یہ خبر نہیں ہوتی کہ کسی دن درمیان میں لائن ٹوٹ جائے گی، یا انجن خراب ہو جائے گا، یا اور کوئی حادثہ پیش آئے گا، اس لیے گاڑی لیٹ ہو جائے گی۔ اس قسم کے عوارض و موانع جزئیہ کا علم محیط اُن کو نہیں ہو سکتا۔ لہذا کبھی کبھی ان عوارض و حوادث کی بنا پر اُن کے طے کیے ہوئے ٹائم ٹیبل سے تخلف ہونا ناگزیر ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا علم چوں کہ جزئیات پر ہو بہو جو جمیع تفصیلات محیط ہے، لہذا ذرہ برابر بھی اُس کے علم سے تخلف نہیں ہو سکتا۔ فرض کرو کہ ٹائم ٹیبل بنانے والوں کو بھی اگر ایسا ہی علم محیط حاصل ہوتا، تو تخلف ہرگز نہ ہوتا۔

یہ ہر حال، یہاں تشبیہ دیتے وقت تخلف و عدم تخلف کی بحث نہیں، بلکہ تشبیہ صرف اتنی بات میں ہے کہ انجن کی حرکت اور اسٹیم کے فعل میں اس ٹائم ٹیبل کو کوئی دخل نہیں۔ انجن، اسٹیم کی طاقت اور اپنی حرکت سے ڈرائیور کے ارادے کے موافق چلتا ہے، ٹائم ٹیبل کا اس حرکت کرنے میں کوئی دخل نہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا علم قدیم، فاعل کی قدرت و اختیار کو سلب نہیں کرتا، بلکہ علم تو معلوم کے تابع ہوتا ہے؛

کیوں کہ علم، اُس معلوم کے صحیح انکشاف ہی کا نام ہے، معلوم کے واقع ہونے میں علم کا کوئی دخل نہیں۔

مسئلہ تقدیر کے متعلق | یہاں تک حدیث اسباب کے متعلق گفتگو ختم ہوئی۔
معتزلہ کے عقائد | اب میں مستقل طور پر مسئلہ تقدیر کے متعلق کچھ مزید روشنی ڈالنا چاہتا ہوں

صحیح مسلم کی کتاب الایمان میں ایک روایت ہے، جس کا مضمون یہ ہے کہ ایک شخص حضرت ابن عمرؓ کی خدمت میں آیا اور عرض کیا کہ ہماری طرف کچھ لوگ ہیں جو علم میں اشتغال رکھتے ہیں اور اُس کی گہرائی میں گھستتے ہیں۔ وہ لوگ کہتے ہیں کہ: **أَنْ لَا قَدَرَ وَ أَنَّ الْأُمَرَائِفَ**۔ یعنی تقدیر کوئی چیز نہیں اور بندہ جو کچھ کام کرتا ہے پہلے سے اللہ تعالیٰ کو اُن افعال کا کوئی علم نہ تھا (معاذ اللہ)، کچھ نہیں جانتا تھا کہ بندے کیا کام کریں گے، بلکہ کسی بندے سے کوئی فعل صادر ہو چکنے کے بعد اللہ تعالیٰ کو اُس کا علم ہوتا ہے، جیسا کہ صدور افعال کے بعد ہمیں اور تمہیں بھی کچھ علم ہو جاتا ہے۔ الغرض، یہ لوگ اللہ سے علم قدیم مجیط کی نفی کرتے ہیں، افعال عباد کے وجود میں آنے سے پہلے اُن کا علم اللہ تعالیٰ کے لیے ثابت نہیں کرتے۔ یہ عقیدہ، بعض قدماء معتزلہ کا تھا جیسا کہ حافظ نے تصریح کی ہے۔ لیکن بعد میں معتزلہ نے اس عقیدے کو جس سے حضرت حق جل مجدہ کی طرف جہل کی نسبت آتی تھی جو اُس کی جناب رفیع میں سخت ترین گستاخی ہے، ترک کر دیا۔ کما صرح به القرطبی (فتح الملہم ص: ۱۶۱ ج: ۱) اب متاخرین معتزلہ کا عقیدہ یہ ہے کہ افعال عباد، وجود میں آنے سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ کے علم قدیم مجیط میں طے شدہ ہیں، اُس کو پہلے ہی سے سب کچھ علم ہے کون بندہ کیا کرے گا، جیسا کہ اہل السنۃ کا عقیدہ ہے۔ لیکن یہ متاخرین معتزلہ حق تعالیٰ کو جہل کے عیب سے منترہ سمجھتے ہوئے ساتھ ہی یہ کہتے ہیں کہ حق تعالیٰ عباد کا خالق تو

ضرور ہے، پر اُن کے افعال کا خالق نہیں، عباد اپنے افعال کے خود خالق ہیں خدا کا اس میں کچھ دخل نہیں ہوتا۔

اصل یہ ہے کہ بندے دونوں قسم کے کام کرتے ہیں، اچھے بھی بُرے بھی، طاعت اور عدل و انصاف کا بھی اُن سے صدور ہوتا ہے اور مظالم و معاصی کا بھی۔ اب اگر بندوں کے مجملہ افعال کا خالق باری تعالیٰ کو قرار دیا جائے، تو شر و روقبائح کی نسبت اُس کی طرف لازم آتی ہے جو محال ہے۔ اس سے بچنے کی تدبیر قہر و معجزہ نے تو، جیسا کہ ابھی گزر چکا ہے، یہ سوچی تھی کہ سرے سے علم باری ہی کا انکار کر دیا جائے، نہ رہے گا بانس نہ بچے گی بانسری، یعنی باری تعالیٰ نے سب مخلوقات کو پیدا کر دیا اور بندوں میں ہر قسم کے کام کرنے کی قدرت اور قوتیں بھی رکھ دیں، آگے چل کر بندے ان قوتوں کو کن کاموں میں استعمال کریں گے ماچھے میں بُرے میں، اس کا کوئی علم اُسے نہ تھا۔ اُس نے تو گویا بندے کے ہاتھ میں تلوار دے دی، آگے وہ شخص تلوار سے جہاد کرے گا، یا اسے کسی معصوم اور بے گناہ آدمی کی گردن پر چلائے گا! اس کی نہ باری تعالیٰ کو پہلے سے خبر تھی، نہ اس میں اُس کا کچھ دخل (العیاذ باللہ)

مُتأخّرین نے سمجھا کہ علم باری کا انکار کرنا تو بدترین جہل و حماقت ہے۔ ہاں، بندوں کے افعال کو انہی کی ذوات تک محدود رکھا جائے اور اُن کا رشتہ انتساب باری تعالیٰ سے منقطع کر لیا جائے، تو پھر ان کے بُرے بھلے کی ذمہ داری بھی انہی پر عائد ہوگی، شر و روقبائح کی نسبت خداوندِ قدوس کی طرف نہ رہے گی۔ اس لیے یہ دعوہ کر دیا کہ بندوں کے افعال، خود بندوں کی مخلوق ہیں، اُن کے صدور میں حق تعالیٰ کے ارادے اور مشیت کو کوئی دخل نہیں۔ گو خود بندے اور اُن کی تمام قوتیں اُس خدا کی پیدا کی ہوئی ہیں لیکن ان قوتوں سے اچھا یا بُرا کوئی کام کرنا، یہ بالکل تہ بندوں کے اختیار میں ہے۔ گویا جس تلوار سے وہ کسی بے گناہ کو قتل کرتا ہے، وہ خدا کی دی ہوئی ضرور ہے تاہم اُس

لے ذوات، ذات کی جمع ہے۔

تلوار کا چلانا بندے کا کام ہے جس سے خدا کے ارادے کا کوئی تعلق نہیں۔ اس طرح اس فعل کی برائی کا باری تعالیٰ کی جانب انتساب نہیں ہو سکتا۔

لیکن ان لوگوں نے اس پر غور نہیں کیا کہ ارتکابِ جرم کی طرح اعانتِ جرم بھی جرم ہے۔ خونِ ناحق کے تمامی اسباب و وسائل اور آلات و قوا، اگر ایک شخص نے قاتل کے لیے فراہم کیے اور قطعی و یقینی طور پر یہ جانتے ہوئے کیے کہ قاتل ان سامانوں اور قوتوں کو بے گناہوں کے قتل میں ہی استعمال کرے گا، باوجود اس کے کہ وہ قادر تھا کہ اگر چاہتا، تو یہ سامان اور قوت اس کے ہاتھ میں نہ دیتا، یا ایسا مفلوج کر دیتا کہ اسے قتل پر قدرت ہی نہ رہتی؛ تو عرفاً یا قانوناً کسی عاقل حکیم کے نزدیک ایسا شخص مجرم مذکور سے بالکلیہ بری نہیں سمجھا جاسکتا۔ البتہ اگر اُسے اسباب و آلات دیتے وقت یہ علم نہ ہوتا کہ لینے والا ان چیزوں کو کہاں استعمال کرے گا، تو بے شک معذور سمجھا جاسکتا تھا۔ اس اعتبار سے قدامے معتزلہ اپنی گمراہی میں دو رائے پیش تھے کہ انھوں نے شروع سے علم الہی تسلیم کرنے سے ہی انکار کر دیا۔

مُتأخرین، جب علمِ الہی کی ہمہ گیری اور احاطہ کو تسلیم کر چکے ہیں، تو اب عباد کو خالقِ افعال مان کر، بس اُن کے لیے قطعاً کوئی چارہ کار نہیں رہتا کہ اللہ کی طرف شرور کی نسبت سے انکار کر سکیں؛ کیوں کہ اس ظالم قاتل کو آخر پیدا تو اُسی نے کیا! اس کے بازو میں قوت اُسی نے رکھی جس سے وہ تلوار اٹھاتا ہے، اس کے اندر قدرت اور قوتِ ارادی اور تمام اسبابِ قتل اُسی نے پیدا کیے اور اُن پر اس ظالم کو دستِ رس دی! قطعی طور پر یہ جانے ہوئے کہ یہ ظالم ان سامانوں سے کام لے گا، ان حالات میں تمھارے زعم کے مطابق حق تعالیٰ کی تنزیہ و تقدیس کیسے قائم رہ سکتی ہے! حالانکہ اس تنزیہ و تقدیس کو قائم رکھنے کے لیے تم نے ایک خالق کے سوا کروڑوں خالقِ تجویز کیے تھے، یعنی ہر بندے کو مستقل خالق مانا تھا؛ پھر بارش سے بھاگ کر پرنالے کی پناہ لینے سے کیا فائدہ ہوا! جب کہ عباد کو اپنے افعال کا خالق بنا کر، اور ایک نوع کا بشرک اختیار کر کے بھی

نسبتِ شرور الی اللہ سبحانہ کا الزام جوں کا توں رہا!

لے (کر) اصل نسخہ میں سہواً اچھوٹ گیا ہے۔

ایک واضح مثال | مثال کے طور پر سمجھیے کہ فرعون کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا، اُسے تن درستی دی، ہر قسم کی علمی و عملی قوتیں اُس میں رکھیں، ساز و سامان، حشم و خدم، قوت و اقتدار اور ملک و سلطنت کے لوازم اُس کے قبضے میں دیے، جس کے غرور اور گھمنڈ انا ربکم الاعلیٰ کا دعو کر بیٹھا، حضرت موسیٰ کی دعوتِ حق کو ٹھکرا دیا، بنی اسرائیل پر ظلم کیے اور ظاہری اقتدار پر اتر کر کہنے لگا: الیس لی مُلکٌ مصر و هذه الانہر تجری من تَحْتِی، حالانکہ خداوندِ قدّوس، اپنے عظیم قدیم سے جانتا تھا کہ یہ ملعون ان تمام سامانوں اور قوتوں کو اس طرح کی شرارت و فساد اور اغوار و اضلال کے کاموں میں صرف کرے گا۔

اب مُتأخّرین مُعترزہ سے سوال یہ ہے کہ یہ سب باتیں جانتے ہوئے اسے پیدا ہی کیوں کیا؟ پیدا ہی نہ کرتے، یا پیدا ہونے کے بعد اندھا، لنگڑا، اپانج بنادیتے، یا اُس پر فالج گرادیتے، یا ساز و سامان کچھ نہ دیتے، ایک بھک مُنگا فقیر بنادیتے؟ مگر ان باتوں میں سے کچھ نہ ہوا، بلکہ اسباب و وسائل کی فراوانی انتہا کو پہنچا دی گئی۔ اور فرعون سے پہلے ابلیس کو دیکھیے، جو تمام شرور کا مادہ ہے۔ وہاں اس سے بھی زیادہ یہ صورت نمایاں ہے الغرض، محض افعال کا خالق مان کر بھی وہ عقدہ حل نہیں ہوتا، جس کے حل کرنے کے لیے اس عقدہ بشریہ کے ارتکاب کا تشبہل کیا گیا تھا۔ نسبت الشّرّ الی اللہ کا شبہہ بہ دستور باقی رہتا ہے اور تنزیہ کامل کی تصویر پوری نہیں ہوتی۔

الحاصل، جب مُتأخّرین مُعترزہ نے عظیم قدیم کو تسلیم کر لیا، تو اب ہم اُن سے پوچھتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کو پہلے ہی سے معلوم تھا کہ فلاں شخص یہ فساد اور شرارت و بغاوت کرے گا، تو اُس کو روکنے پر اللہ تعالیٰ کو قدرت ہے، تاکہ شرارت کر ہی نہ سکے یا نہیں؟ اگر قدرت نہیں، تو عجز لازم آتا ہے اور وہ ایسا بدترین عجز کہ خالق اپنی مخلوق کے اور خدا اپنے بندے کے مقابلے میں عاجز ٹھہرتا ہے۔ اور اگر روکنے پر قدرت ہے،

۱۔ اغوار و اضلال: گم راہ کرنا اور بھٹکانا ملہ خدا کی طرف شرکی نسبت سے یعنی مکمل پاکی اور بے عیبی

پھر نہیں روکتا بلکہ اُس کو شرارت کے سامان اور قوت سے امداد دیتا ہے، تو سِفہ لازم آئے گا۔ پس عِلْم قدیم کو مان لینے کے بعد اشکال سے چھوٹنے کی کوئی صورت نہیں؛ اس لیے امام شافعی نے فرمایا کہ: ”إِنَّ سَلَّمَ الْقَدْرِي الْعِلْمَ، لَخَصْمٌ“ علم کو تسلیم کر لینے کے بعد عجز یا سِفہ ضرور لازم آئے گا، جو سب کے نزدیک نقص ہے۔ افعالِ عباد کی حکیمانہ تشریح | اس کے بعد، ادھر بھی غور کرنا چاہیے کہ عباد کو اُن کے افعال کا خالق کہنا کہاں تک قابل قبول ہو سکتا ہے۔ کسی چیز کے خالق ہونے کے معنی بالارادہ وجود عطا کرنے کے ہیں۔ اب دیکھیے کہ مثلاً زید کا وجود خود اُس کے قبضے میں نہیں، خدا کے قبضے میں ہے اور اُسی کا عطا کیا ہوا ہے۔ اُس میں ادراک، احساس، تعقل، قدرت، قوتِ ارادی اور جوارح؛ یہ سب چیزیں جن سے وہ کوئی عمل کرتا ہے، خدا کی پیدا کی ہوئی ہیں۔

اور آگے چلیے، مراتبِ قصد (ہا جس، خاطر، حدیث النفس، ہم اور غزم) کو چھوڑ کر کسی خلِ اختیاری کے نفسِ صدور و وقوع کی کیفیت ملاحظہ فرمائیے۔ ابن سینا نے قانون میں لکھا ہے کہ: ”حرکتِ ارادی، جو اعضاء سے متعلق ہے، اُس کی تکمیل اُس قوت سے ہوتی ہے، جو دماغ سے بہ واسطہٴ اعصاب اعضاء میں پہنچتی ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ عضلات، جو اعصاب و رباطات وغیرہ پر مشتمل ہیں، جب سمٹ جاتے ہیں تو دوتر، جو رباط و عصب سے ملحقہ اور اعضاء میں نفوذ کیے ہوئے ہے، کھینچ جاتا ہے، جس سے اعضاء بھی کھینچ جاتے ہیں۔ اور جب عضلہ منبسط ہوتا ہے، تو دوتر ڈھیلا پڑ جاتا ہے اور عضو دور ہو جاتا ہے الخ۔“

اس تقریر سے معلوم ہوا کہ نفسِ انسانی، ادراک کے بعد کسی کام کا ارادہ کرتا ہے تو عضلات کو، جو جسمِ انسانی میں پانچ سو انتیس ہیں، کشش وغیرہ دے کر کسی عصب خاص کے ذریعے، جو سُتر ہیں، جس عضو کو چاہتا ہے خاص حرکت دیتا ہے، جس سے

فعل مطلوب وقوع میں آتا ہے۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ نفس انسانی کو سر سے لے کر پاؤں تک جس عضو کو حرکت دینا ہو، تو ضرور ہے کہ پانچ سو انتیس عضلات اور ستر اعصاب میں سے اُس عضلے اور اُس عصب کو حرکت دینا ہوگا، جو اس خاص عضو سے متعلق ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ قبل اس کے کہ کسی عضلے اور عصب کو حرکت دیں، اس کو معین کرنے کی ضرورت پڑے گی تاکہ خاص اُس کو حرکت دی جائے، جس کی طرف توجہ ہے۔ اور یہ معین کرنا، اس بات پر موقوف ہے کہ پیش تر تمام اعصاب و عضلات کو بالتفصیل جان لے۔ اس کی مثال بعینہ ایسی ہوگی، جیسے لکھنے کے وقت قلم کو حرکت دینے کے واسطے، پہلے چند انگلیوں کو متعین کرتے ہیں جن سے قلم کو حرکت دینا ہوتا ہے، پھر ان انگلیوں کو ارادہ و اختیار سے حرکت دیتے ہیں، جن سے قلم کو حرکت ہوتی ہے۔ اس موقع پر ہم اہل انشا سے درخواست کرتے ہیں کہ جس عضو کو چاہیں، بہ کثرات و مکررات حرکت دے کر، بہ غور و تعمق اپنے وجدان سے دریافت کریں کہ اس اختیاری حرکت کے وقت، کسی عضلے یا عصب کی طرف نفس کی ادنیٰ توجہ بھی ہوتی ہے، یا یہ معلوم ہوتا ہے کہ اندر کوئی عضلہ یا عصب بھی ہے، یا کسی چیز کو ہم کھینچتے ہیں جس سے وہ عضو کھینچتا ہے! کوئی اس کی گواہی نہیں دے سکتا کہ اندر وہی کیا کیفیت ہے اور عضلات کو اعصاب کیوں کر کھینچتے ہیں! میری دانست میں، اگر کوئی پوری پوری وجدانی حالت کی، ایمان سے خبر دے تو یہی کہے گا کہ اعصاب و عضلات کو میں تو نہیں کھینچتا، ہاں، اتنا معلوم ہوتا ہے کہ ہم فلاں عضو کو حرکت دینا چاہتے ہیں، پھر ہوتا یہ ہے کہ ادھر توجہ ہوئی اور ادھر اُس کو حرکت ہو گئی۔

یہاں یہ کہنا بے موقع نہ ہوگا کہ عصب و عضلے کو حرکت دینا بھی ہمارے اختیار سے باہر ہے؛ کیوں کہ اختیاری حرکت ہوتی، تو اُس کا علم و ارادہ بھی ضرور ہوتا ہے۔ اور یہ نہیں کہہ سکتے کہ حرکت کا ارادہ بعینہ عصب و عضلے کا ارادہ ہے؛ اس لیے کہ جب ہمارے وجدان ہی میں نہیں کہ عصب بھی کوئی چیز ہے، تو پھر یہ کیوں کر کہہ سکتے ہیں کہ اس کی حرکت کا ارادہ ہوا۔ پھر جب یہ حسب تحقیق، حکماء و اطباء سے یہ ثابت ہے کہ بغیر عضلات و اعصاب کی حرکت کے کوئی عضو حرکت نہیں کر سکتا، تو ضرور ہوا کہ وہی ملتفت الیہ بالذات ہو،

گو مقصود بالذات اُن کی حرکت نہ ہو۔

حاصل یہ ہے کہ فعل کے وقت تحریک وغیرہ جو ہوتی ہے، وہ یا خود بہ خود ہوتی ہے، یا ہمارے ارادے سے، یا حق تعالیٰ کے خلق سے، چوں کہ یہ مُسَلَّم ہے کہ کسی حادثہ چیز کا وجود بغیر کسی مُوجِد کے نہیں ہو سکتا، اس لیے خود بہ خود تحریکِ عضلات ہونا باطل ہے، اور تقریرِ سابق سے ثابت ہو چکا کہ حرکت ہمارے ارادے سے بھی نہیں ہوتی، تو اب وہ تیسری صورت باقی رہ گئی کہ حق تعالیٰ حرکت کو اَعْصَاب وغیرہ میں پیدا کر دیتا ہے اور یہ ہونا بھی چاہیے؛ اس لیے کہ حرکت ممکن ہے اور ممکن کو وجود اور عدم میں سے اُمراً الجائزین کو ترجیح دینا اور اُس کو واجب بالغیر بنانا حق تعالیٰ ہی کا کام ہے۔

الحاصل، فعل کے سلسلے میں، ہا جس سے لے کر وقوعِ فعل تک کوئی درجہ ایسا نہیں کہ حق تعالیٰ کا مخلوق نہ ہو۔ اس سے ثابت ہوا کہ جس طرح آدمی کی ذات و صفات مخلوقِ الہی ہیں، اسی طرح اُس کے جملہ حرکات و سکنات اور افعال بھی مخلوقِ الہی ہیں۔ مسئلے کی یہ حکیمانہ تقریر، فضیلتِ جنگ مولانا انوار اللہ خاں مرحوم نے اپنے رسالہ خلق افعال میں کی ہے۔

افعالِ عباد کے متعلق | حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمہ اللہ نے اسی مضمون
حضرت نانوتویؒ کی تحقیق | کو ایک عامیانہ مثال میں سمجھایا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ
دو شخص ایک کھیت کی پیداوار پر جھگڑتے ہوئے حاکم کے پاس آئے۔ اُن میں سے ہر ایک کا دعو ہے کہ کھیت کی یہ نیا رشدہ پیداوار میری ہے اور میں ہی اس کا مالک ہوں۔ اُن میں ایک سے حاکم نے پوچھا کہ زمین کس کی ہے؟ اُس نے جواب دیا کہ زمین میری نہیں، دوسرے کی ہے۔ بیج بھی اُسی کا تھا، آبِ پاشی بھی اُسی نے کی تھی، اہل بھی اُسی نے چلایا تھا، پلویا بھی اُسی نے کیا تھا، غرض جس قدر چیزیں اور کام اس کھیت کے تیلہ ہونے تک پیش آئے، سب دوسرے کے ہیں، البتہ ان سب سے جو پیداوار حاصل ہوئی، وہ میری ہے، میں صرف اُس پیداوار کے مالک ہونے کا مدعی ہوں۔

اب بتلایئے کہ کون سی دنیا کی عدالت ہے، جو اس مسخرے کے حق میں ڈگری دے گی؟

بس اسی طرح سمجھ لو کہ افعال عباد جن اشخاص، جن ٹوٹوں اور جن اسباب و آلات وغیرہ سے وقوع پذیر ہوئے، وہ سب من اولہا الی آخر حاجب خدا کی مخلوق ہیں، تو نفس افعال جو ان کا حاصل اور نتیجہ ہے، خدا سے ہٹ کر بندوں کی مخلوق کیسے بن جائیں گے!

مُعْزِلہ کا انجام | مُعْزِلہ نے خلق کے معنی میں غور نہیں کیا، ورنہ ایسا مضحکہ خیز دعوا ہرگز نہ کرتے۔ اس تمام تقریر سے میرا مقصود یہ ہے کہ یہ جو قُدمائے مُعْزِلہ نے علم ہی کا انکار کر دیا، یا اُن کے متاخرین نے افعال عباد کا خالق عباد کو قرار دیا، جس کے نتیجے میں اُن کو لاکھوں کروڑوں خالق حقیقی ماننے پڑے، اور ایک ایک بندہ کے حصے میں لاکھوں کروڑوں مخلوقات تسلیم کرنی پڑیں، جن کا عدد خدائی مخلوقات سے بھی زیادہ ہو جائے گا، اس گندے اعتقاد پر مُعْزِلہ کو کس چیز نے مجبور کیا! صرف اسی بات نے کہ ظلم کی نسبت اللہ کی طرف لازم نہ آئے۔ تو مجھے یہ دکھلانا ہے کہ بالفرض اگر تم اس سے بچ بھی گئے، تو کون سا تیرا را! اگر ظلم وغیرہ کی نسبت سے دامن بچایا، اُس سے زیادہ شنیع و قبیح چیزوں کی نسبت میں مبتلا ہو گئے، یعنی جہل یا عجز یا سَفہ! دھوپ سے بھاگ کر آگ کی پناہ لینا اس کو کہتے ہیں۔ پھر اس پر طرہ یہ کہ جس اعتراض سے بچنا چاہا تھا، وہ بھی قائم رہا، اس لیے علما نے لکھا ہے کہ بے شک مسئلہ تقدیر کے ماننے میں اشکالات اور دشواریاں ضرور ہیں، مگر اس کا نہ ماننا، ملنے سے بھی زیادہ مشکل ہے۔

فرقہ جبریہ کے عقائد | یہ تو مُعْزِلہ کا حشر تھا۔ ان کے بالمقابل ایک فرقہ جبریہ کہلاتا ہے، مُعْزِلہ نے تو عباد کو اپنے افعال کا خالق قرار دیا تھا، جبریہ کہتے ہیں کہ خالق ہونا تو کُجا، بندہ اپنے افعال میں بالکل مجبور محض ہے۔ اُس کے ارادہ و اختیار کو کوئی دخل اُس کے کاموں میں نہیں۔

ان لوگوں سے ہمارا سوال یہ ہے کہ تم بندہ کو اپنے افعال میں ایسا مجبور محض مانتے ہو جیسے اینٹ پتھر، حالاں کہ تم کو خود بھی انسانی حرکات میں فرق کرنا ناگزیر ہے مثلاً کاتب کے ہاتھ کی حرکت اور مُر تعیش کے ہاتھ کی حرکت میں فرق بدیہی ہے۔ آخر ان دونوں

حرکتوں میں فرق تم کو بیان کرنا ہوگا۔ اگر ان میں فرق کا انکار کرتے ہو، تو یہ محض مُکابّرہ اور بد اہمت کا انکار ہے، اور جس شخص کی بلا دلت اس حد تک پہنچ گئی ہے وہ قابلِ خطاب ہی نہیں۔

اس لیے کہا جاتا ہے کہ قدریہ تو بے ایمانی میں فائق ہیں، کیوں کہ اُنہوں نے اللہ کے سوا بے شمار خالق تجویز کر لیے، اور جبریہ حماقت و بلا دلت میں گوے سبقت لے گئے۔ کیوں کہ حرکت ارادیہ اور حرکت غیر ارادیہ اضطراریہ کھڑکیزہ المُرْتَعَش میں ایک جانور بھی فرق کرتا ہے۔ مثلاً ایک گتے کو آپ نے پتھر مارا، تو گتا اُس پتھر کی طرف بھونک کر نہیں جائے گا، بلکہ پتھر مارنے والے کی طرف متوجہ ہوگا، حالاں کہ اُس پر چوٹ پڑی۔ وہ پتھر ہی کی حرکت سے پڑی، لیکن وہ گتا بھی سمجھتا ہے کہ پتھر کی یہ حرکت قسری اور اضطراری ہے، اُس کا کوئی قصور نہیں۔ ایسا ہی اگر آپ نے سانپ پر لاٹھی یا شیر پر گولی چلائی، تو وہ سانپ اد شیر لاٹھی یا گولی چلانے والے پر آئے گا، لاٹھی یا گولی کے پیچھے نہیں دوڑے گا۔ گویا جانوروں کے نزدیک بھی حرکت ارادیہ اور حرکت اضطراریہ میں فرق ہیں اور علم ضروری سے ثابت ہے، تو ان کے درمیان کوئی ماہِ الفرق ہونا چاہیے۔

مسئلہ کسب | یہیں سے مسئلہ کسب سامنے آ جاتا ہے، جس میں بڑے بڑے لوگ ٹھوکر کھا گئے حتیٰ کہ بعض مُتکلمین نے یہ کہہ دیا کہ جبر و کسب تو اُٹم ہیں، دونوں میں کوئی واضح فرق نہیں۔ لیکن یہ بالکل غلط ہے اور دونوں میں فرق دامتیا بالکل بے غبار ہے۔ اس کی وضاحت کے لیے پہلے ایک مُقدمہ سمجھ لیجیے کہ اللہ تعالیٰ نے جو انسان کو پیدا کیا ہے، اُس میں کچھ قوائے ادراکیہ رکھتی ہیں جیسا کہ حواس اور عقل، اسی طرح کچھ قوائے عملیہ مثلاً قدرت، ارادہ اور مشیت بھی اُس میں ودیعت کی ہیں، جن کے ذریعے وہ اپنے جوارح (ہاتھ، پاؤں وغیرہ) کو حرکت دیتا ہے اور جیسا عمل چاہتا ہے کرتا ہے۔ مثلاً کتابت کے لیے ہاتھ ہلانا، ہر شخص سمجھتا ہے کہ یہ حرکت اُس کے ارادے

۱۔ مُجادلہ، غرور ۲۔ کُنْدُوسنی ۳۔ یکساں، ہم معنی، جُڑواں

اور اختیار سے ہے۔ اگر وہ چاہے، ہاتھ کو حرکت دے کر لکھنا شروع کر دے اور جب چاہے اُسے روک لے۔ ہاتھ کی یہ حرکت اُس طرح کی یقیناً نہیں جیسے حرکتِ رعشہ یا سردی سے کسی کی حرکت، کہ اُس کو اگر وہ بند کرنا چاہے تو بند نہیں کر سکتا۔ آخر ان دونوں حرکتوں میں جو فرق ہے، وہ کس بنا پر ہے؟ لامحالہ یہ ماننا پڑے گا کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی ایسی قوتِ انسان کے اندر رکھی ہے، جو ان دونوں حرکتوں میں فرق اور امتیاز کرتی ہے۔ اسی قوت کا نام ہے: قُدرت یا قُوْتِ ارادی، جس سے حجرو شجر وغیرہ محروم ہیں۔

اسی کے ساتھ یاد رہے کہ حق تعالیٰ کی ذاتِ منبج الکلمات ہی وجود کا خزانہ اور سرچشمہ ہے، جس کا وجود ذاتی ہے اور جہاں کہیں وجود کا کوئی ذرہ یا شاخہ آتا ہے، وہ اُسی خزانے سے آسکتا ہے۔ دُنیا میں اعیان و اوصاف، جواہر و اعراض، فاعلین اور افعال میں سے جو چیز بھی مُنصَب وجود پر جلوہ گر ہوگی، وہ اُسی موجدِ حقیقی کے اعطالے وجود اور افاضہ نور سے ہوگی اور جب تک عالم وجود میں باقی رہے گی، اُسی حق و قیوم کے ابقا سے رہے گی۔

بنابریں، بندوں کی تمامی حرکات و افعال بھی، خواہ وہ اضطراری ہوں یا اختیاری اپنے وجود میں آنے کے لیے اُسی موجدِ حقیقی کی قُدرتِ عامہ اور ارادہ و مُشیئتِ تامہ کے دستِ نگر ہوں گے، اس لیے وہ قُدرت و اختیار اور قُوْتِ ارادی، جو ان میں فاعلِ حقیقی نے پیدا ایشی طور پر ودیعت کی ہے، وہ بالکلِیہ مستقل و خود مختار نہیں ہو سکتی، بلکہ مُشیئتِ الہیہ کے تابع رہے گی اور قُدرتِ غیر مُستقلہ کہلائے گی۔

اب کبھی تو انسان کے بدن یا جوارح میں حرکت، اس قُدرتِ غیر مُستقلہ کے تَوَسُّط کے بِدُون ہوگی، جیسے حرکتِ مُرعشہ، کبھی اُس کے تَوَسُّط سے، جیسے حرکتِ یدِ کاتب۔ تو یوں کہیے کہ اللہ تعالیٰ کی قُوْتِ کاملہ و قُوْتِ مُستقلہ کا تَصَرُّف انسان کے اندر دو طریقے سے ہوتا ہے؛ بعض حالات میں تو اللہ تعالیٰ کی قُدرتِ مُستقلہ بِدُونِ تَوَسُّط ہماری قُدرتِ غیر مُستقلہ کے، مُوَثِّر و مُتَصَرِّف ہوتی ہے، جیسا کہ حرکتِ رعشہ میں؛ اور کبھی اللہ تعالیٰ کی

قدرتِ مستقلہ ہماری اس قدرتِ غیر مستقلہ کو بیچ میں ڈال کر اپنا تصرف دکھلاتی ہے، جیسے حرکتِ کتابت و نحو ہائیں۔ بہ ہر حال، ہر جگہ اصل موثر و متصرف و محرک اللہ تعالیٰ ہی کی قدرتِ کاملہ مستقلہ ہے، فرق اتنا ہے کہ ایک جگہ اُس کی تاثیر و تصرف بلا واسطہ ہے اور دوسری جگہ بالواسطہ۔

مسئلہ کسب کے | اسے ایک مثال سے سمجھیے: دیکھو، دن کے وقت شمس کی شعاعیں متعلق ایک عام فہم مثال | اور اس کا نور، برائے توبلا تو سبطِ قمر، ہم تک پہنچتا ہے اور وہی نور شمس رات کے وقت قمر کے توسط سے آتا ہے۔ کیوں کہ قمر باجماع حکما ایک کرۂ مظلمہ ہے، اُس میں کوئی نور ذاتی نہیں بلکہ شمس ہی سے نور اخذ کرتا ہے، تو رات کے وقت جو نور ہم پہنچتا ہے، وہ کوئی دوسرا نور نہیں، وہی نور ہے جو دن میں پہنچتا تھا، لیکن محض اس توسط و عدم توسط کی وجہ سے اُس کے خواص و احکام اور مزاج و تاثیرات حتیٰ کہ نام میں بھی تفاوتِ عظیم پیدا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ دن کے وقت شمس کا نور جو بلا واسطہ زمین پر پڑتا ہے، اُس کا نام دھوپ رکھا گیا ہے، اُس کا مزاج سخت گرم ہے، زمین، حجر و شجر اور انسان و حیوان پر اُس کی ایک خاص تاثیر ہوتی ہے اور اُس کے جداگانہ خواص ہیں۔ پھر وہی نور شمس جب شب کے وقت بلا واسطہ قمر زمین پر آتا ہے، اس کا نام دھوپ نہیں چاندنی ہے، اس کا مزاج ٹھنڈا ہے، دوسری مخلوقات پر اس کی تاثیر پہلی صورت سے بالکل مختلف ہے اور اس کے خواص جداگانہ ہیں۔

اس مثال سے واضح ہو گیا کہ ایک ہی چیز جب بلا واسطہ پہنچے اور بعینہ وہی چیز جب بالواسطہ پہنچے، تو دونوں حالتوں میں اُس کی تاثیرات و خواص اور احکام و مزاج حتیٰ کہ نام بھی مختلف ہو سکتے ہیں۔

دوسری مثال | اسی کو ایک دوسری مثال میں سمجھیے، دیکھیے کہ شمس کی شعاع کسی چیز کو جب بلا واسطہ پہنچے اور وہی شعاع جب آتشی شیشے کے واسطے سے پہنچے، ان دونوں

سہ براہِ راست سہ یعنی ایسا کرہ، جس میں تاریکی ہی تاریکی ہے۔

صورتوں کے اندر اس کی تاثیرات میں کتنا فرق ہو جاتا ہے۔ بلا واسطہ جو شعاع پہنچے گی، اس کے سامنے کوئی کپڑا یا کاغذ یا بارود رکھے، اُس میں فوراً آگ نہیں لگ جائے گی، مگر وہی شعاع جو آتش شیشے کے واسطے سے آتی ہے، تو مذکورہ بالا چیزوں میں آگ لگا دیتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح سمجھیے کہ خالق حقیقی نے انسان کے اندر سمیع و بصر وغیرہ حواس و قوا کی طرح ایک قوت ارادی اور قدرت بھی رکھ دی ہے، گو وہ قوت و قدرت غیر مستقلہ ہے، اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے عطا ہوئی ہے، اُسی کی مشیت کے تابع ہے، اُسی کی تحریک سے حرکت کرتی ہے، اُسی کے ارادے کے مطابق کام کرتی ہے، رتی برابر بھی اُس کے خلاف نہیں چل سکتی، مگر وہ قدرت انسان کے اندر ہے ضرور، جس کی بنا پر حرکت ارادیہ میں فرق ہوتا ہے اور انسان، شجر و حجر وغیرہ سے ممتاز ہے۔

اب اللہ تعالیٰ کی قدرت مستقلہ، انسان میں کبھی تو بلا واسطہ اس قدرت غیر مستقلہ کے تعارف کرتی ہے جیسا کہ حرکت (غیر) ارادیہ میں اور کبھی بہ واسطہ قدرت غیر مستقلہ کے، جیسا کہ حرکت ارادیہ میں۔ اور ہر انسان کی فطرت ہے کہ اُس قدرت غیر مستقلہ کے ماتحت جو حرکات و افعال اُس سے صادر ہوتے ہیں، اُن کو اپنا فعل سمجھتا ہے اور اپنی طرف منسوب کرتا ہے، بس اسی کا نام کسب ہے، جیسے پہلی صورت کو خبر کہتے ہیں۔

تو خالق دونوں قسم کی حرکات کا حق تعالیٰ ہوا۔ ہاں، بندے کے اعتبار سے اول جبر محض اور ثانی کسب کہلاتا ہے، اور یہ لفظ قرآن کریم سے لیا گیا ہے۔ فرماتے ہیں: لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ عَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ اب کسب کے معنی ہوئے کسی فعل کا بندے سے، بہ تو شط اُس کی قدرت غیر مستقلہ، بہ تخلیق الہی صادر ہونا۔ تو کسب ایک برزخی چیز ہوئی درمیان اختیار مستقل اور جبر محض کے نہ بندہ کو مستقل اختیار حاصل ہے، کیوں کہ اصل محرک و متصرف اللہ ہی کی قدرت مستقلہ ہے، نہ وہ بالکل مجبور محض ہے، کیوں کہ اُس کی قدرت غیر مستقلہ کا توسط پایا جاتا ہے، اور یہ تو شط کوئی معمولی چیز نہیں۔

کسب و جبر کے مسئلے میں امام رازی وغیرہ بڑے بڑے لوگ توجہات رکیکہ کر کے بیٹھ

۱۔ یہ لفظ سہواً چھوٹ گیا ہے ۲۔ کم زور توجہات

گئے، اور اس عقدے کو دل نشیں طریقے سے حل نہ کر سکے شیخ اکبر نے فتوحات میں اس کو خوب حل کیا ہے، اور یہ انہی کا کام تھا۔ عارفین ہی کا منصب ہے کہ ایسے دقائق کی حقیقت کو واضح اور منکشف کریں۔

الحاصل، جب کسب کا ایک برزخی درجہ نکل آیا، تو اب مجازات کے مسئلے میں بھی کوئی اشکال نہیں رہے گا، کیوں کہ مجازات کا مدار اسی کسب پر ہے۔ اور چوں کہ اس میں فی الجملہ عامل کی قدرت کا بھی تعلق ہے اور قدرت باری تعالیٰ کا بھی دخل ہے، تو اب نہ وہ بات کہنے کی گنجائش رہی، جو معتزلہ نے مجازات کے اشکال سے گھبرا کر کہی کہ افعال عباد کے خالق عباد ہی ہیں، جس سے کروڑوں خالق ماننے پڑے ہیں، اور نہ اس احمقانہ قول کے اختیار کرنے کی حاجت، جو جبریہ نے اختیار کیا کہ بندہ اپنے افعال میں اینٹ پتھر کی طرح مجبور محض ہے، جو مشاہدہ و بداہت اور جانوروں کی سمجھ کے بھی خلاف ہے، جیسا کہ ہم تفصیلاً عرض کر چکے ہیں۔

البتہ ایک شبہ یہ رہے گا کہ ہم نے مانا کہ افعال اختیار یہ، ان کی قدرت غیر مستقلہ کے توسط سے صادر ہوتے ہیں، مگر وہ قدرت غیر مستقلہ تو اللہ تعالیٰ ہی کی مشیت و قدرت کے تابع ہے، اُس کے بدون کچھ بھی نہیں کر سکتی۔ فی الحقیقت اللہ تعالیٰ کی قدرت مستقلہ ہی سب تصرفات کرتی ہے۔ اور خدا کی قدرت مستقلہ ہماری اس قدرت غیر مستقلہ پر حاکم ہے۔ لہذا اس قدرت غیر مستقلہ کا ہر فعل اُس قدرت مستقلہ ہی کا ہوگا۔ تو اب وہی اشکال غود کر آیا کہ ان افعال پر ان کو جزا و سزا کیوں دی جاتی ہے؟

لیکن اصل شبہ کا اصل منشا یہ ہے کہ ہم نے اپنے خیال میں، اللہ تعالیٰ کی مجازات کو اس دنیا کی مجازات پر قیاس کر رکھا ہے، حالانکہ یہ قیاس غلط ہے۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں مجازات محض بہ طریق انتقام دنیوی نہیں، بلکہ بہ طور تسبیب طبعی کے ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے اس عالم اسباب و مسببات کا ایک طویل و عریض سلسلہ پیدا کیا ہے، اسباب کے اندر ایک نوع تاثیر رکھ دی ہے کہ جب کوئی سبب وجود میں آتا ہے، تو باذن اللہ

مُسَبَّب اُس پر مُرْتَب ہو جاتا ہے، جیسا کہ اس دارِ دنیا کی چیزوں کو آپ دیکھتے ہیں۔ مثلاً آگ میں قُدرت نے اِحراق کی تاثیر رکھ دی ہے، یا زہر میں یہ تاثیر ہے کہ وہ انسان کو ہلاک کر دیتا ہے۔ اب جو شخص بھی زہر کھائے گا، بہ شرطِ عدم موانع، اُس کی تاثیر متحقق ہو کر رہے گی۔ خواہ اپنے قصد و ارادے سے کھائے، یا جبراً واکراہاً اُسے کھلا دے، بہر حال اُس کی تاثیر ظاہر ہو کر رہے گی۔

وَعَلَىٰ هَذَا الْقِيَاسِ، ساری دنیا اسی اسباب و مُسَبِّبات کے سلسلے میں جکڑے ہوئے ہے، اور کوئی نہیں بتلا سکتا کہ فلاں سبب میں ایسی تاثیر کیوں ہے کہ اُس پر وہی مُسَبَّب مُرْتَب ہو! اگر مَرَمار کر کوئی شخص دو چار جگہ اس کی کوئی وجہ بتلا بھی دے، تو پھر اس وجہ کی وجہ نہیں بتلا سکتا۔ مثلاً کوئی کہ دے کہ آگ اس لیے جلاتی ہے کہ اُس میں حرارتِ مُفْرِطہ موجود ہے، لیکن اُس میں اس درجے کی حرارتِ مُفْرِطہ کیوں موجود ہے! اس کا کوئی جواب نہیں ہو سکتا۔

اسی طرح دیکھیے کہ انگور کے درخت پر انگور لگتا اور نیم کے درخت پر نبولی لگتی ہے، اس دائرے میں ”کیوں“ کے سوال کا حق ہی نہیں۔ ساری دنیا مل کر اس کا جواب نہیں دے سکتی کہ انگور کے درخت پر انگور ہی کیوں لگتا ہے، نبولی کیوں نہیں لگتی؟ وبالعکس؟ زائد از زائد دماغ کھپا کر بھی کہہ سکتے ہیں کہ اُس کی صورتِ نوعیہ کا تقاضا یہی ہے۔ اگر پوچھا جائے کہ انگور کی بیل کی صورتِ نوعیہ کا یہ تقاضا کیوں ہے؟ نیم کی صورتِ نوعیہ کا کیوں نہیں؟ تو کسی کے پاس کوئی جواب نہیں۔

میچریوں کے لایعنی مفروضات | یہ دہری لوگ جو اللہ کو نہیں مانتے، وہ کہتے ہیں کہ مادہ یعنی اجزاء المرقطیسیہ جن کو یہ ایتھر کہتے ہیں، انہی اجزائے ذرات سے عالم کی پیدائش ہوئی، انہی ذرات کی دائمی حرکت اور جُولانی سے، بعض اجزاء سے زمین بن گئی اور بعض اجزاء سے چاند، سورج وغیرہ بنے، وغیرہ ذالک۔

۱۔ یعنی جلاتے کی تاثیر ۲۔ یعنی بہت زیادہ حرارت ۳۔ نبولی: نیم کا پھل

اب اگر ان سے کوئی سوال کرے کہ جن اجزاء سے چاند سورج وغیرہ بنے، اُن سے زمین کیوں نہ بنی؟ و بالعکس؟ اسی طرح اگر سوال کیا جائے کہ جن اجزاء سے سر کی کھوپڑی بنی، اُن سے پاؤں کے ٹکڑے کیوں نہ بن گئے؟ پھر جن اجزاء سے سر بنا ہے، اُن میں کتنے علوم و ادراکات اور معارف و کمالات رکھے ہیں، یہ علوم و کمالات اُن اجزاء میں کیوں نہ رکھ دیے گئے، جن سے پاؤں بنا ہے؟ ساری دنیا کے ملاحدہ و دہریے بھی اس کا جواب بجز اس کے نہیں دے سکتے کہ اُن اجزاء میں یہ استعداد تھی۔ اب اگر سوال کیا جائے کہ اُن اجزاء میں یہ استعداد کیوں ہوئی، عکس کیوں نہ ہوا؟ تو اس ”کیوں“ کا جواب دینے سے دنیا عاجز ہے اور رہے گی۔

بے شک ان سوالات کا جواب ہم موجدین بھی نہیں دے سکتے، مگر مُجدین اور موجدین میں یہ فرق ہے کہ ملاحدہ تو خود بھی اس راز کو نہیں جانتے، اور جس مادہ بے شعور کو انھوں نے اپنا خالق بنا رکھا ہے، وہ بھی کچھ نہیں جانتا، بلکہ وہ تو اُن سے بھی بدتر ہے۔ یہ ملحد کم از کم عقل و درایت، شعور و ادراک اور قدرت و ارادہ تو رکھتا ہے؛ دراصل ملحد کہ ایتھر بالکل بے شعور جمارِ لاعقل ہے

تو ملحد، نہ خود جانتے ہے اور نہ خدا کچھ جانتا ہے۔ ضَعْفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوب۔ بہ خلاف موجدین کے، بے شک وہ بھی اس سلسلہٴ اَسباب و مُسَبِّبات کے رازوں سے واقف نہیں، مگر اُن کا خدا خالق و مالک، وحدہ لا شریک کہ سب کچھ جانتا ہے، اُس کے علمِ محیط سے کوئی چیز خارج نہیں۔

الغرض، اس دنیاوی مُجازات کی طرح اللہ تعالیٰ کی مُجازات محض بہ طریق انتقام نہیں بلکہ بہ طریق تَسْبُبِ طبعی کے ہے۔ انسان جو کچھ اس دارِ دنیا میں کرتا ہے، آخرت میں اُسی عمل کے ثمرات و آثار طبعاً مُرتب ہوں گے۔ مثلاً ایمان و اعمالِ صالحہ کی وجہ سے جنت میں جانا ایسا ہی ہے جیسا کہ خمیرہ کا دُزبان عنبری جواہر والا کھانے سے دماغ کو قوت و تازگی پہنچتی ہے۔ دوسری طرف کُفر اور معاصی کی تاثیر طبعی یہ ہے کہ اپنے مُرتکب کو تباہی کے گڑھے میں دھکیل دے، جسے جہنم کہتے ہیں۔ پس کُفر اور معاصی کی

وجہ سے دوزخ میں جانا ایسا ہی سمجھیے، جیسے کوئی زہر کھا جائے تو اس کے لیے ہلاکت لازمی ہے۔

اعمال کے نتائج | اب اگر یہ سوال کیا جائے کہ ایمان اور اعمال صالحہ میں دو تاثیر اور کفر و معاصی میں یہ تاثیر کیوں رکھتی؟ معاملہ بالعکس کیوں نہ ہوا؟ تو میں پہلے ہی کہ چکا ہوں کہ اسباب و مسببات کے دائرے میں جو کچھ تاثیر و تاثر کا طبعی سلسلہ ہے، اُس میں ”کیوں“ کے سوال کی گنجائش نہیں، ورنہ عالم کی بے شمار چیزوں میں یہی ”کیوں“ کا سوال ہو سکتا ہے، جس کا مختتم جواب کسی کے پاس نہیں۔ لہذا یہاں یہ سوال لایا گیا ہے دیکھیے، اُطبا اپنے یا پہلے حکما کے تجربے سے بتاتے ہیں کہ فلاں دوا کی یہ تاثیر اور یہ مزاج ہے۔ وہاں یہ سوال کسی کے دل میں نہیں آتا کہ اس کی یہ تاثیر کیوں ہوئی؟ اسی طرح انبیاء جو روحانی و باطنی اُطبا ہیں، اُنھوں نے بعض افعالِ قلوب یا افعالِ جوارح کی تاثیرات بتلا دیں، تو اس قدر شور و شغب اور لالچنی سوالات کی بھرمار کیوں ہے؟ تُو ہے ایسی عقل پر کہ ان معمولی اُطبا کی بات پر تو سوال نہیں پیدا کرتی، مگر انبیاء علیہم السلام کی بتلائی ہوئی باتوں پر لغو سوال کرنے میں اتنی جری ہے!

تو اصل رگِ شبہ کی یہ ہے کہ وہاں مجازات کو ہم نے دنیا کی مجازات پر قیاس کر لیا، یہی غلط ہے۔ وہاں کی مجازات صرف اسباب و مسببات کا ایک طبعی سلسلہ ہے۔ اس دارِ دنیا میں جو کچھ ہم کسبِ خیر و شر کرتے ہیں، یہی اعمالِ مکسوثہ وہاں جا کر خاص خاص شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

چنانچہ ایک حدیث میں آتا ہے کہ جنتِ قیطان یعنی چٹیل میدان ہے، تمھارے اعمال وہاں جا کر خاص خاص اشکال اختیار کر لیتے ہیں۔ مثلاً تم نے یہاں سُبحانَ اللہ کہا، یہ کلمہ وہاں جا کر ایک درخت بن گیا۔ اسی طرح دوسرے اعمالِ صالحہ کو سمجھ لیجیے۔ اور اعمالِ سیئہ جس قدر ہیں، یہی وہاں سانپوں اور چھتوؤں کی شکل میں منتشکل ہوتے ہیں۔ اسے

۱۰ آخری فیصلہ کن ۱۱ یعنی یہی اچھے یا بُرے اعمال ۱۲ شکل و صورت اختیار کر لینا

یوں خیال کیجیے کہ جب ہم کوئی بیج زمین میں ڈالتے ہیں، تو اُس سے درخت اُگتا ہے۔ اُس درخت کی اصل مع اُس کی شاخوں بہتوں اور پھول پھل کے وہی بیج ہے۔ وہی بیج چند دنوں میں یہ شکل و صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اسی طرح ہمارے اعمال، انجام کار وہ شکل و صورت اختیار کر لیں گے جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔

اب یہ سوال کرنا کہ فلاں عمل سے جنت میں فلاں درخت کیوں اُگا؟ ایسا ہی ہے جیسا کوئی یہ پوچھے کہ آم کی گٹھلی سے آم کا درخت کیوں نکلا؟ جامن کا پودا کیوں نہ بن گیا؟ یا گیہوں کے تخم سے چاول کیوں نہ پیدا ہوئے؟ ظاہر ہے کہ ان سوالات کی عقل کے نزدیک کوئی گنجائش نہیں، اور سب کا جواب ایک ہی ہے کہ اُس میں استعداد ہی ایسی تھی، یا اُس کی صورت نوعیت کا اقتضایہ تھا۔

اب میری تقریر سے یہ بات بھی بہ خوبی واضح ہو گئی کہ اگر بالفرض بندہ مجبور محض بھی ہوتا، جیسا کہ جبریہ کا خیال ہے اور اللہ تعالیٰ بندوں کے ان افعال اضطراریہ ہی میں یہ تاثیر رکھ دیتا کہ انھی پر عذاب و ثواب مُرتب ہو، تب بھی مجازات کی حد تک کوئی اشکال نہ ہوتا۔ کیوں کہ مجازات بہ طور سببِ طبعی ہوئی، تو ضروری نہیں کہ سبب پر مُسبب کا ترتیب صرف اسی وقت ہو، جب سبب ارادے اور اختیار سے صادر ہو کرے۔ آخر آپ بہت سے اسبابِ طبعیہ میں برابر تجربہ کرتے ہیں کہ مُسبب کا تحقق بالا ارادہ ہو یا بلا ارادہ، سبب اُس پر مُرتب ہو جاتا ہے۔ لیکن جیسا کہ ہم پہلے تحقیق کر چکے، یہ واقعہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے افعالِ عباد میں عباد کو بالکلیہ مجبور و مضطر نہیں بنایا، بلکہ جبرِ محض اور اختیارِ مطلق کے درمیان کسب کی راہ اُن کے لیے کھلی رکھی اور کسبِ خیر و شر کو، جس میں فی الجملہ عباد کے اختیار و ارادہ کو دخل ہے، دخولِ جنت یا جہنم کا سبب ٹھہرایا، آگے یہ سوال بالکل لغو ہے کہ کسب میں ہی یہ سببیت اور تاثیرات کیوں رکھیں؟ کیوں کہ یہ سوال تو پھر دنیا کے ہر سبب و مُسبب پر وارد ہو سکتا ہے۔ اس کا جو جواب ساری دنیا وہاں دے گی، وہی ہم یہاں دے سکتے ہیں۔

نوشتہ تقدیر مطابق استعداد ہے | نیز ہماری تقریر بالا سے ایک اور بات بھی واضح ہو گئی کہ جن اشخاص کو ازل سے شقی یا سعید لکھ دیا گیا ہے، جس کے مطابق عملی دنیا میں اور پھر آخری انجام میں تقدیر اپنا کام کرتی رہتی ہے، اُس پر یہ سوال کرنا بے موقع ہے کہ شقی کو سعید یا سعید کو شقی کیوں نہ تجویز کر دیا گیا؟

ہم کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے علم ازلی میں جس شخص میں جس چیز کی استعداد پائی جاتی ہے، نوشتہ تقدیر اُسی کے مطابق ہے۔ آگے یہ کہنا کہ زید میں یہ استعداد کیوں رکھی، بکر میں کیوں نہ رکھ دی، ایسا ہی ہے جیسے کوئی کہے کہ آگ میں حرارت و احتراق اور پانی میں برودت و تبرید کی صفت کیوں موجود ہے؟ اگر کہا جائے کہ جس مادے سے آگ یا پانی بنا، اُس میں ایسی ہی استعداد تھی۔ پھر وہی سوال متوجہ ہو گا کہ دونوں کی استعدادوں میں یہ فرق کیوں ہوا اور کہاں سے آیا؟ جس طرح استعداد کے مرحلے پر پہنچ کر کوئی شخص کیوں ہوا، اور ”کہاں سے آیا“ کا جواب نہیں دے سکتا، ہم پر بھی اس ”کیوں رکھی گئی“ یا ”کیوں پائی گئی“ کی جواب دی ضروری نہیں۔ لیکن سب کے عجز عن الجواب سے حقائق اشیا بدل نہیں سکتیں، وہ جوں کی توں رہیں گی: لَا یَسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ وَ هُمْ یُسْئَلُونَ وَ اَنَّ اِلٰہَ رَبِّکَ الْمُتَنَبِّہُ۔

نکتہ ولی الہی | یہاں پہنچ کر مناسب ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ رحمہ کا ایک نکتہ نقل کر دیا جائے، جو انھوں نے کسب خیر و شر کے مدارِ ثواب و عذاب ہونے کے سلسلے میں بیان فرمایا ہے۔ میں اسے مولیٰ سی ایک مثال سے سمجھانا ہوں: مثلاً تین چار سال کا ایک بچہ ہے۔ بڑے لڑکوں کو پتنگ اڑاتے ہوئے دیکھ کر اُس کو بھی خواہش ہوتی ہے کہ پتنگ اڑائے، مگر اس کو اتنی قوت نہیں کہ پتنگ اڑ سکے اور اس کو پھر مگر سنبھال سکے۔ تو یہ صورت اختیار کی جاتی ہے کہ اُس کا باپ یا بھائی یا اور کوئی بڑا آدمی پتنگ اڑاتا ہے اور وہ بچہ اپنا ہاتھ پتنگ کی ڈور کو لگائے رکھتا ہے۔

ظاہر ہے کہ اس صورت میں حقیقتاً و املاً پتنگ اڑانے والا وہ بڑا شخص ہے، بچہ خود اس پتنگ کو اڑا نہیں رہا، نہ اڑا سکتا ہے۔ محض ایک معمولی اقتران و اتصال اُس کے ہاتھ کا دوسرے ہے۔ مگر اس معمولی اقتران و اتصال کی وجہ سے وہ اپنا اڑانا تصور کر لیتا ہے۔ اگر اُس کے ہاتھ سے ڈور چھڑائی جائے تو روتا ہے، اور ہاتھ لگا رہنے سے خوش ہوتا ہے۔ تو یہ جو کسب کا درجہ اور درمیان میں قدرتِ غیرِ مستقلہ کا اقتران و توسط رکھتا گیا، یہ اس لیے کہ انسان کی فطرت ہی یہ ہے کہ جس فعل کو وہ اپنا سمجھے، گو درحقیقت مُتَعَرِّف و مُؤَثِّر کوئی اور ہو، مگر اپنا فعل سمجھنے کی وجہ سے اُس کے اثرات کو قلب قبول کرتا ہے اور دل اُس سے مُنْصَبِحُ اور رنگین ہوتا ہے (جیسا کہ اوپر کی مثال میں بچہ محض اپنا ہاتھ لگائے رکھنے کی وجہ سے پتنگ اڑانے کو اپنا فعل سمجھتا ہے، اور اس سے اُس کا قلب مُتَأَثِّر اور خوش ہوتا ہے۔ حالانکہ اصل میں پتنگ اڑانا اُس بڑے کا فعل ہے)۔

اور جس فعل کو انسان اپنا فعل نہ سمجھے، دوسرے کا تصور کرے، اُس سے کوئی تاثر و انفعال حاصل نہیں ہوتا۔ مثلاً ایک شخص کبھی خود اپنے ارادے سے نماز نہیں پڑھتا، دوسرا آدمی اُس کی گردن پکڑ کر جبراً اُس کو اذنیہا کر دیتا ہے زمین پر گرادیتا ہے۔ کیا اس جبری رکوع و سجود سے اُس کا قلب کچھ مُتَأَثِّر و مُنْصَبِحُ ہوگا؟ ہرگز نہیں! اور اگر خود اپنے ارادہ و اختیار سے نماز پڑھتا، جیسی بھی پڑھتا کچھ نہ کچھ اثر دل پر ضرور ہوتا، اور کسی درجے میں اُس کا دل نماز کے رنگ کو قبول کرتا۔

الغرض، انسان کی فطرت ہے کہ جس فعل کو وہ اپنا عمل سمجھتا ہے، اُس سے اُس کا قلب مُتَأَثِّر و مُنْصَبِحُ ہوتا ہے اور یہ بھی انسان کی فطرت ہے کہ جو فعل و عمل اُس کی قدرتِ غیرِ مستقلہ کے اقتران و وساطت سے ہو، اُسی کو وہ اپنا عمل سمجھتا ہے اور اور اتنے پختہ عقیدے اور جزم و یقین کے ساتھ کہ وہ خود بھی اُس عقیدے اور یقین کے دفع کرنے پر قادر نہیں ہوتا اور جو فعل اس قدرتِ غیرِ مستقلہ کے اقتران و وساطت سے نہ ہو، اُس کو وہ اپنا عمل نہیں سمجھتا۔

ہر شخص اپنے وجدان کی طرف رجوع کر کے انصاف کے ساتھ غور کرے کہ جب کوئی فعل اختیاری وہ کرتا ہے، تو اُس کا دل اور اُس کا ضمیر کیا سمجھتا ہے؟ اس فعل کو اپنا عمل سمجھتا ہے یا دوسرے کا اوکھاٹ شہادۃ وجدانک۔ تو یہ قدرت غیر مستقلہ کا ایک اقتران و توسط ہے، جس کی وجہ سے انسان فطرتاً ایک فعل کو اپنا عمل سمجھتا ہے اور اپنی طرف منسوب کرتا ہے، اسی کا نام کسب ہے۔ چنانچہ شیخ اشعری کا لفظ بھی یہی ہے کہ کسب محض ایک اقتران ہے۔

خلاصہ بحث | خلاصہ کلام یہ کہ درحقیقت دنیا میں سب کچھ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ ہی کے تصرف و اقتدار سے ہوتا ہے، مگر درمیان میں قدرت غیر مستقلہ کے اقتران و وساطت کی وجہ سے انسان اس کو اپنا فعل قرار دیتا ہے، اور اسی بنا پر عمل کر کے اثرات سے اُس کا قلب ایک طرح رنگ پکڑتا ہے، لہذا اُس پر جزا و سزا بھی مرتب ہوتی ہے۔

اگر کوئی شبہ کرے کہ مثال مذکور میں چوں کہ وہ نادان بچہ تھا، اس لیے غلط فہمی سے اُس نے ایسا سمجھ لیا، ہم تو بچے نہیں بلکہ عاقل، بالغ، سمجھ دار ہیں، جواب اس کا یہ ہے کہ اس بچے کی جو نسبت بڑے آدمی کے ساتھ ہے، اُس سے کہیں کم نسبت ہم کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ حاصل ہے، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ کوئی نسبت بھی حاصل نہیں، ذرۃ ثراب کی رب الارباب کے سامنے کیا حقیقت ہے!

تین باتیں | اب حاصل اس مجموعہ تقریر کا تین باتیں ہوئیں: ایک تو یہ کہ جبر و اختیار میں فرق بہ اعتبار توسط قدرت غیر مستقلہ کے ہے۔ دوسری یہ کہ آخرت کی جزا و سزا محض غنی انتقام کی طرح نہیں، بلکہ بہ طریق تسبیب طبعی ہے۔ تیسری یہ کہ نفس انسان، انہی اعمال کے اثر سے متلون و متغیض ہوتا ہے، جن کو وہ اپنا عمل سمجھے گا، جب اس عمل کے صدور میں اپنی قدرت غیر مستقلہ کا اقتران و وساطت دیکھے۔ ان تین باتوں کو پیش نظر رکھنے سے سب اشکالات ان شاء اللہ مندرج ہو جائیں گے۔

۱۰ یعنی رنگین ۱۰ ختم

اب ایک چیز باقی رہ گئی، وہ یہ کہ اہل السنّت والجماعت شرور و قباّح کا خالق بھی اللہ تعالیٰ ہی کو کہتے ہیں جس میں بہ ظاہر اللہ تعالیٰ کی طرف قباّح کی نسبت لازم آتی ہے، جس سے بچنے کے لیے معتزلہ نے بندوں کا خالق افعال ہونا تجویز کیا تھا۔ اس کے متعلّق مختصر اتنی بات یاد رکھو کہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک چیز فی نفسہ اگر دوسری اشیاء سے الگ کر کے دیکھی جائے، تو بُری اور خراب ہے؛ مگر وہی چیز دوسری چیزوں کے ساتھ مل کر مجموعہ مرکّب کو حسین و جمیل بنادیتی ہے۔ یعنی وہ چیز میں کُلّ الوُجُوہ شر نہیں ہوتی، بلکہ اپنے محل کے اعتبار سے فی حدّ ذاتہ شر ہونے کے باوجود اپنے اندر کوئی پہلو دوسری جہت سے خیر کا بھی رکھتی ہے۔

مثالِ اوّل | مثال کے طور پر ایک حسین و جمیل عورت کو لیجیے، جسے دیکھ کر ہزار ہا آدمی عاشق ہو جاتے ہیں۔ اگر اُس کے سر کے بال کاٹ کر علاحدہ کریں اور اُس کے بدن سے خون اور پیٹ سے تمام آلائشیں نکال کر ایک طشت میں رکھ دیں، تو ان گندی چیزوں میں کوئی محسن نظر نہیں آئے گا؛ بلکہ ان چیزوں کو علاحدہ دیکھ کر اُس کے عاشق کا جی بھی متلّانے لگے گا۔ اس کے باوجود مجموعی حیثیت سے یہی نجاسات جب اُس کے پیٹ کے اندر آنتوں میں ہوں، اور یہی گند اخون جب اُس کی رگوں میں دوڑ رہا ہو، مادہ یہی بال جب اُس کے سر پر قرینے سے موجود ہوں، تو اُس کی خوب صورتی کی ضمانت اور حسن و رونق کو دوبالا کرنے والے ہیں۔

مثالِ دوم | دوسری مثال سمجھ لیجیے: ایک مکان ہے، نہایت خوب صورت عالی شان؛ اُس میں قسم قسم کے ساز و سامان ہیں، بہترین کمرے ہیں، لاکھوں روپے کا فرنیچر ہے اور ہر قسم کی آرائش و آسائش کے اسباب اُس میں مہیا ہیں۔ اگر اُس مکان میں بیت الخلا (قضاے حاجت کی جگہ) نہ ہو، تو ہر شخص اُس مکان کو خراب اور ناقص کہے گا۔ دیکھیے، بیت الخلا فی نفسہ گندی جگہ ہے، مگر مجموعی حیثیت سے مکان میں اُس کا وجود بھی ضروری ہے، جس کے بدون مکان کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔

مثالِ سوم | تیسری مثال اور لیجیے: کسی زہریلے دُنبُل وغیرہ کی وجہ سے ڈاکٹر نے ایک

عُضْو کو ایک عُضْو سے علاحدہ کر دیا۔ اب اگر خاص اُس عُضْو کی حیثیت سے دیکھا جائے، تو ڈاکٹر کا ایک عُضْو کو بدن سے علاحدہ کرنا شرع ہے۔ مگر مجموعہ بدن کی حیثیت سے دیکھو تو خیر ہے۔ کیوں کہ اس کی وجہ سے سارے اعضاء بے چین ہو رہے تھے اور اندیشہ تھا اس کی حیثیت سے سارے بدن میں سرایت نہ کر جائے۔

اس قسم کے ہزار ہا شواہد ہیں۔ مجھے صرف یہ دکھلانا ہے کہ مُرتب کے اندر بعض اجزا کوئی نفسہ و فی حد ذاتہ بے شک قبیح و شرکھا جاسکتا ہے۔ مگر وہی قبیح جز دوسرے اجزا کے لحاظ سے، یا مجموعے کے لحاظ سے خیر و حسن بھی ہو سکتا ہے۔ اس حیثیت سے کوئی بھی اُس کو قبیح و شر شمار نہیں کرتا۔ لہذا اُس جز پر شر و قبیح کے بنانے والے کو کوئی بُرا نہیں کہتا، بلکہ اُس جز کا نہ بنانا بُرا شمار کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ ایک بہترین عالی شان مکان بنایا اور اُس میں بیت الخلاء بنایا، تو ہر شخص بنانے والے کو بے وقوف کہے گا۔

پس اہل سنت والجماعت یہ کہتے ہیں کہ شر فی نفسہ شر ہے، مگر مجموعہ عالم کے حق میں وہ شر نہیں، کیوں کہ اُس کے بدون عالم کی تکمیل نہیں ہو سکتی تھی۔ آفرینش عالم کی غرض و غایت کے پیش نظر اُس کو پیدا کرنا بھی ضروری تھا، لہذا شر و روقبائح کی تخلیق میں کوئی بُرائی نہیں، بلکہ ان کی تخلیق عین حکمت ہے، ان کے بدون عالم بہیت مجموعی ناممکن رہتا اور ان ضرور و قباح کے ساتھ صفت خالقیت کے متعلق ہونے سے نفس تخلیق میں کوئی قباح و سزاقت نہیں آتی۔

الحاصل، کسب شر کا سب کے حق میں شر ہے، مگر خلق شر خالق کے حق میں شر نہیں۔ اسے ایک مثال سے سمجھیے: ایک جگہ ہے جسے چمنستان کہتے ہیں، جس میں رنگ بہ رنگ کے پھول کھل رہے ہیں۔ ان کی بہار دیکھ کر آنکھوں کو ٹراؤٹ اور ان کی پاکیزہ و لطیف خوشبوؤں سے دل و دماغ کو تازگی حاصل ہوتی ہے۔ اسی چمن کے پہلو میں دوسری جگہ ہے، جہاں کوڑی پڑتی ہے اور نجاست و قاذورات کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں، جن کی بدبو سے دماغ پھٹنے لگتا ہے اور جہاں چلنے سے بدن اور کپڑے ملوٹ ہوتے ہیں۔ رات کی سخت تاریکی میں انسانی بصارت دونوں میں کچھ امتیاز نہیں کر سکتی۔ ہاں، جب سورج

لے زہر پلین لے پیدائش لے اس، اس نسخہ میں سہواریہ ہو گیا لے قاذورات: جمع قاذورہ: گندگی

کی روشنی یا چاند کا نور اس کائناتِ ارضی پر اپنی شعاعیں ڈالتا ہے، تو وہ شعاعیں جس طرح اس سرسبز شاداب گلستاں پر پڑتی ہیں، اُسی طرح اُس گندی پلید جگہ پر بھی پڑتی ہے اور دونوں کو روشن اور ممتاز کرتی ہیں۔ اب کیا یہ گمان کیا جاسکتا ہے کہ اس پلید گندی جگہ پر واقع ہونے کی وجہ سے وہ روشنی اور نور بھی پلید ہو گیا! کوئی یہ گمان نہیں کر سکتا بلکہ وہ نور و روشنی برابر اپنی صفتِ صفا و لطافت پر باقی ہے اور پاکیزہ جگہ بحالہ پاکیزہ اور گندی جگہ بحالہ گندی رہتی ہے

اسی طرح اللہ تعالیٰ کی تخلیق کو مجموعہ تخلیق کے معنی ہیں کسی چیز کو عدم کی ظلمت سے نکال کر وجود سے روشن کرنا۔ تو جب نور وجود کی شعاعوں نے اپنے منبع سے نکل کر حقائقِ عالم یا اعیانِ ثابۃ کو چمکایا، تو خیر و شر، اچھی بُری سب چیزیں روشنی میں آگئیں اور وہ نور کسی گندگی سے قطعاً آلودہ نہیں ہوا۔ ہاں، شر اپنی جگہ شر اور خیر اپنی جگہ خیر رہی۔ فاطرِ حقیقی کا فیض ان میں سے ہر چیز کو کثمتِ عدم سے منصفۃ وجود پر لے آیا۔

خلاصہ کلام | خلاصہ کلام یہ ہے کہ شر و رقبائع اپنی جگہ فی نفسہا و فی حد ذاتہ قبیح اور شر ہیں؛ مگر ایجادِ عالم کی غرض و غایت کے پیش نظر، مجموعہ عالم کی تکمیل و اتمام اور گلشنِ عالم کی ترویج و تازگی، سرسبزی و شادابی، تابانی و درخشانی، رونق و بہار، اُس کی زیب و زینت کے لیے ان شر و رقبائع کی بھی ضرورت تھی۔ جیسا کہ تم کھیتوں میں کھاڈا ڈالا کرتے ہو، حالاں کہ وہ فی حد ذاتہ ایک نجس اور گندی چیز ہے، مگر باغ کی سرسبزی اور شادابی کے لیے اُس سے بھی چارہ نہیں۔

اسی طرح اگر اس عالم میں شر و رقبائع کا وجود نہ ہوتا، تو عالم ناقص و ناتمام رہ جاتا، لہذا ان اشیاء کی تخلیق بھی عین حکمت ہے، ان کا نہ پیدا کرنا ایسا ہوتا جیسے کوئی بہترین عالی شان مکان تعمیر کرے مگر اُس میں بیتِ النخلانہ رکھے، تو ایسے مکان کو کون پسند کرے گا؟ اور تخلیق کی حقیقت یہ ہے کہ کسی چیز کو ظلمتِ عدم سے نور وجود میں لانا۔ اس نورِ تخلیق

کو اُن قبائح کی قباحت سے کوئی ٹوٹ نہیں ہوتا۔ جیسا کہ سورج کی شعاع، یا چاند کی روشنی کسی گندی پلید جگہ پڑنے سے پلید نہیں ہو جاتی۔

ایک اور سوال کا جواب | اس کے بعد ایک آخری سوال یہ رہ جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شرک کو پیدا کیا ہی کیوں؟ پیدا ہی نہ کرتے تو کیا حرج و نقصان تھا؟ اس سوال کا بہترین جواب حافظ ابن القیم نے مدارج السالکین میں دیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ تم تو شرک کے متعلق دریافت کرتے ہو، میں پہلے پوچھتا ہوں کہ خیر کو کیوں پیدا کیا؟ تم سوال کرتے ہو کہ ابلیس و فرعون وغیرہ کے پیدا کرنے میں کیا حکمت ہے، میں دریافت کرتا ہوں کہ جبریل، میکائیل، ابراہیم، موسیٰ اور محمد صلوات اللہ وسلامہ علیہم کے پیدا کرنے کا راز کیا ہے؟

کیوں کہ یہ تو سب ملتے ہیں کہ اگر ساری دنیا خیر سے بھر جائے، اور سارے جہاں کے آدمی فرشتوں کی طرح بن جائیں، اور سب مل کر شب و روز اُس کی عبادت و اطاعت میں لگے رہیں، تب بھی اُس کی صفات عالیہ میں ذرہ برابر اضافہ نہ ہوگا۔ وہ تو اپنی صفات و کمالات میں، کماکان لم یزل و لا یزال، ہمہ وقت کامل و اکمل ہے، پھر خیرات و حسنات کے پیدا کرنے کی غرض و غایت کیا ہے؟ پہلے اسی کو سوچو، پھر شرک کے متعلق بھی غور کر لیں گے۔ بلکہ عنوان سوال میں تعمیم کر کے سارے عالم کے متعلق یہ سوال زیر بحث لاؤ کہ اس عالم کو اللہ تعالیٰ نے کیوں پیدا کیا؟ اسی کے ضمن میں خلق شرک کی حکمت بھی خود یہ خود واضح ہو جائے گی۔

تخلیق عالم کی حکمت | تو یاد رکھیے کہ دنیا کے سب مذاہب والوں نے اس سوال کے حل کرنے کی کوشش کی ہے اور اپنے اپنے انداز میں مختلف جوابات دیے ہیں۔ ہمارے نزدیک اس بارے میں کاملین و عارفین نے جو کچھ لکھا ہے، اُس سے آگے بڑھنا ممکن نہیں۔ اُن کی تخلیق کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات مجموعہ کمالات، مخزنِ حسنات اور منبع خیرات ہے۔

لہ آلودگی، اثر پذیری لہ جامع کمالات

اس کا ارادہ ہو کہ ان کمالات و صفات کا اظہار ہو اور مظاہر کے آئینے میں وہ اپنے کمالات و صفات کا عکس دیکھے، اور مخلوق اُس کے کمالات ذاتیہ و فعلیہ کی حسب مراتب صحیح معرفت حاصل کرے۔ قرآن کریم میں فرماتے ہیں:

اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ سَبْعَ سَمَوَاتٍ وَمِنَ الْأَرْضِ مِثْلَهُنَّ ۖ يَتَنَزَّلُ الْأَمْرُ بَيْنَهُنَّ لِتَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ وَأَنَّ اللَّهَ قَدْ أَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا۔ یعنی آسمان و زمین پیدا کیے۔ اور ان میں انتظامی احکام جاری کرنے سے مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفاتِ علم و قدرت کا اظہار ہو۔ (نَبْئُهُ عَلَيْهِ ابْنُ الْقَيِّمِ فِي بَدَائِعِ الْفَوَائِدِ) صفاتِ باری اُنھی دو صفتوں سے کسی نہ کسی طرح کا تعلق رکھتی ہیں۔

صوفیہ جو ایک حدیث نقل کرتے ہیں: كُنْتُ كَثْرًا مَخْفِيًا فَاحْبَبْتُ أَنْ أُعْرَفَ، مُخَدِّثِينَ کے نزدیک صحیح نہیں۔ مگر اس کا مضمون شاید اس آیت کے مضمون سے ماخوذ و مستفاد ہو، واللہ اعلم۔

ابن عباسؓ کی بعض روایات میں وما خلقت الجن والإنس إلا ليعبدون کی تفسیر ليعرفون سے آئی ہے۔ یہ وہی معرفت ہوگی جسے آیاتِ مذکورہ میں لتعلموا سے تعبیر فرمایا ہے۔ اگر کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارادہ ہی کیوں ہوا؟ تو سوال بالکل بھل ہے: لَا يُسْأَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْأَلُونَ

ایسے ”کیوں“ تو فعلوں ہی میں لاکھوں ہیں، جن کا کوئی جواب نہیں دے سکتا، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اگر آپ ہی سے کوئی سوال کرے کہ آپ عزت و راحت کی زندگی کیوں چاہتے ہیں اور کیوں اس کے لیے جدوجہد کرتے ہیں، تو اس کا جواب آپ کے پاس کیا ہے؟ پھر اللہ جل شانہ کے معاملات میں ہر ایک ”کیوں“ کے جواب کی توقع رکھنا حماقت نہیں تو اور کیا ہے؟

پس جب تخلیقِ عالم کی حکمت یہ ٹھہری کہ حق تعالیٰ اپنے کمالات و صفات کا، خارجی مظاہر میں مُعَانَنہ کرے اور کرائے، تو آگے معاملہ بالکل صاف ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ

اُس کی صفات مختلف، متقابل اور متضاد ہیں۔ وہ غفور و رحیم بھی ہے اور جبار و قہار بھی، وہ مُنعم بھی ہے اور مُنتقم ذوالبطش شدید بھی، و لَمْ جَزَا۔ تو جب صفات مختلف و متقابل ہوتیں، اُن کے مظاہر بھی متقابل و متضاد ہونے چاہئیں۔ اب بتلاؤ اگر ابلیس اور فرعون و نمرود وغیرہ بڑے بڑے باغی و کافر نہ ہوتے، تو جبار و قہار اور بطش شدید کا مظہر کون بنتا؟ اور ان صفات کا ظہور کس طرح ہوتا؟ اور اگر انبیاء و صالحین و مطیعین پیدا نہ ہوتے، تو مُنعم وغیرہ صفات جمالیہ کہاں ظاہر ہوتیں؟ اسی طرح ہم جیسے گنہ گار و عاصی نہ ہوتے، تو غفور و رحیم جیسی صفات کا اظہار کین پر ہوتا؟

الغرض، آفرینش عالم کی اصل غرض و غایت اور تخلیق اکوان کے اصل مقصد کی تکمیل اُسی وقت ہو سکتی ہے، جب مخلوقات میں اُس کی ہر قسم کی صفات کا مظاہر ہو۔ اگر ان میں سے بعض صفات کو معطل فرض کر لیا جائے، تو خدائی ناقص اور غیر مکمل ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ اس عالم میں خیر و شر دونوں کے سلسلے اُس حکیم مطلق نے پیدا کیے، اور شر کو بہ جائے خود شر ہے، لیکن پیدا کرنا اُس کا بھی خالق کے کمال اور مجموعہ عالم کے حُسن و خوبی کی دلیل ہے۔ اس لیے اس شر کی برائی اپنے محل تک محدود رہتی ہے، خالق حقیقی تک اُس کی رسائی نہیں، بلکہ خلق شر بھی اُس کے اعتبار سے خیر ہی ہے۔ والخیر کَلَّہ فی یدیک والشَّر لیس بِإِلیک۔

دیکھیے، نور شمس جب تاب دالوں اور دریچوں سے گزرتا ہے، تو مختلف اشکال و تقطیعات اختیار کر لیتا ہے۔ یہ سب اشکال مختلفہ اُسی نور سے ظاہر ہوتی ہیں۔ لیکن ذات آفتاب میں یہ اشکال موجود نہیں، وہ تو صرف نور کا خزانہ ہے، اشکال ادھر ادھر اگر نمودار ہوئیں۔ تو آفتاب نور کے لیے مصدر ہے اور ان اشکال کے حق میں اُسے خالق مجازی کہہ سکتے ہیں۔ صادر کا مصدر میں موجود ہونا ناگزیر ہے اور مخلوق کا خالق کے اندر موجود ہونا ضروری نہیں۔ بہ ہر حال، اللہ تعالیٰ خیرات و کمالات کا مصدر ہے اور خالق بھی، اور

شروع و قبايح کا خالق ہے مصدر نہیں۔ مخلوق کی ذاتی بُرائی ادھر ہی رہ جاتی ہے، خدا کی طرف محض اُس کے خلق کی نسبت ہوتی ہے، جو سراسر خیر ہے۔

یہاں ایک مثال، جو بہت ہی حقیر ہے اور حضرت حق سے اُسے کوئی نسبت نہیں، محض تقریب الی الفہم کے لیے پیش کرتا ہوں: آج کل سینما میں جو مناظر دکھلائے جاتے ہیں، وہ دونوں طرح کے ہوتے ہیں: اچھے بھی اور بُرے بھی، نہایت فرحت بخش، مُسرت انگیز بھی اور سخت ہول ناک و حشت انگیز بھی، بہت سے مناظر دیکھ کر ناظرین شاداں و ذراہاں اور ہشاش و بشاش ہوتے ہیں، اور بعض کو دیکھ کر عورتیں، بچے اور ضعیف القلب دہشت زدہ ہو جاتے ہیں اور بعض اوقات چیخیں مارنے لگتے ہیں۔

اب دیکھیے، ان میں ایک منظر کیسا حسین، دل کش اور خوب صورت اور دھرا اپنی جگہ کس قدر تحریش، بھیانک، قبیح اور بدہیت، مگر سینما کے مدیر کا کمال کہ دونوں صورتوں میں برابر ظاہر ہوتا ہے اور سینما دکھلانے کی غرض دونوں سے حاصل ہو رہی ہے، بلکہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر اُس کا مدیر صرف ایک ہی نوع کے مناظر دکھلاتا اور دوسری قسم کے مناظر کی عکاسی پر قدرت نہ رکھتا، تو یہ اُس کے کمال و جہارت فن میں ایک کمی اور نقص مُتصوّر ہوتا۔

ہم نے اپنے بچپن میں شعبدہ باز بازی گروں کو دیکھا کہ وہ اپنی خالی پٹاری میں سے کبھی سانپ نکال کر دکھاتے، کبھی کبوتر، باوجودے کہ کبوتر ایک اچھا پرندہ اور سانپ سخت مُؤذی جانور ہے۔ مگر بازی گر کا کمال دونوں میں یکساں سمجھا جاتا تھا اور تماشہ جو اُس کا مقصود تھا، وہ دونوں سے یکساں حاصل ہوتا تھا۔ تماشہ بینوں کی نگاہ اس پر ہوتی تھی کہ جو چیز ظاہر پٹاری میں موجود نہ تھی، وہ کیسے موجود نظر آنے لگی! حالاں کہ یہ صرف نظر بندی تھی، جس کے نیچے کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔

تو اس سے اندازہ کر لیجیے کہ خالق حقیقی کا کمال، یعنی ہر قسم اور ہر نوع کی چیزوں کو خواہ وہ خیر ہوں یا شر، پردہ عدم سے منقہ وجود پر لانا کیا دونوں میں ظاہر و باہر نہیں؟ یہی نکتہ ہے کہ سورہ شمس میں جہاں اللہ تعالیٰ نے مخلوقات کی قسم کھائی،

لے برا لے مطلب یہ ہے کہ خلق خیر و شر میں ذات باری کا کمال نمایاں طور پر واضح ہے۔

وہاں مُتقابل و مُتضاد اشیاء کا بھی ذکر کیا۔ فرماتے ہیں: وَالشَّمْسُ وَضُحَاهَا
وَالْقَمَرُ إِذَا تَلَّهَا وَالنَّهَارُ إِذَا جَلَّهَا وَ اللَّيْلُ إِذَا يَغْشَاهَا وَالسَّمَاءُ
وَمَا بَنَاهَا وَ الْأَرْضُ وَ مَا طَحَّهَا وَ نَفْسٌ وَ مَا سَوَّاهَا فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا
وَ تَقْوَاهَا۔

ان متضاد اشیاء کی قسم کھا کر ارشاد فرما دیا کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے ان متضاد
اشیاء کو اس کائنات میں پیدا کیا، اُسی طرح نفس انسانی میں تقویٰ و فجور دو متضاد کیفیات
کا ایہام و القا بھی کر دیا۔ پھر ان دونوں حالتوں پر فلاح یا خبیثت کے مختلف ثمرات
بھی مُرتب کیے ایسا ہی ارشاد ہے: وَاللَّيْلُ إِذَا يَغْشَىٰ وَالنَّهَارُ إِذَا تَجَلَّىٰ
وَ مَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَ الْأُنثَىٰ إِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتَّىٰ ۝

غرض، مُتقابل اُضداد کا پیدا کرنا خالق کا انتہائی کمال ہے۔ خیر و شر کی تخلیق
سے فاطر حقیقی کی طرف کوئی عیب یا نقص عامد نہیں ہوتا۔

آخر میں ایک بات اور یاد رکھنے کی ہے کہ کبھی کسی موصوف کے لیے ایک صفت
ثابت کرتے ہیں اور اُس کا نفس اثبات واقع کے اعتبار سے غلط نہیں ہوتا، لیکن
صرف اسی قدر صفت کا ثابت کرنا چوں کہ دوسرے لحاظ سے ایک گونہ ایہام پیدا
کرتا ہے؛ اس لیے عرفاً اس صفت کے ذکر پر اکتفا محمود نہیں سمجھا جاتا، بلکہ تاؤب
وَ احترام کے خلاف شمار ہوتا ہے۔ مثلاً کوئی شخص بادشاہ یا وائسرائے کے اختیارِ
بیان کرتے وقت یہ کہے کہ وہ ہمارے گاؤں کے مکھیا یا قصبے کے تحصیل دار سے بھی
زیادہ اقتدار و اختیار رکھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بات فی نفسہ غلط تو نہیں، مگر عرفاً
محض اتنی بات کے بیان سے اُن کے اعلیٰ اقتدار و اختیار کی تنقیص متوہم ہوتی ہے؛
اس لیے محققانے متاؤبین اس قسم کی عبارات کو ایک طرح کی توہین قرار دیتے ہیں۔
اسی طرح سمجھ لیجیے کہ اللہ جلّ شانہ کوئی الواقع ہر ایک خیر و شر کا خالق ہے

۱۔ توہین کا وہم و غمبہ، جیسا کہ آگے ملاحظہ ہے۔

اور اس کی خالقیت عامہ کے متعلق اعتقاد رکھنا مجرب ایمان ہے، تاہم بعض شرور و قباہ کی تخصیص کر کے اُس کی طرف نسبت کرنا، مثلاً یوں کہنا: الحمد للہ خالق الکلاب والنخازیر؛ یہ سوہِ ادب میں داخل ہے اور بارگاہِ قدس کے ادب شناس تو اس بارے میں بہت ہی احتیاط برتتے ہیں، اور کسی شریافِ قبیح و مکروہ چیز کی علانیہ نسبت حضرت حق کی طرف کرنے سے، گو وہ خلقتاً صحیح ہو، تا بہ حد امکان گریز کرتے ہیں۔

دیکھیے، حضرت ابراہیم خلیل اللہ نے یَطْعَمُنِی وَيَسْقِیْنِ وَاِذَا مَرَضْتُ فَهُوَ يَشْفِیْنِ میں اطعام و سقی اور شفا کو اپنے رب کی طرف منسوب کیا اور مرض کو اپنی طرف، ترمیض کی نسبت اُدھر نہیں کی۔ مومنین جن نے کہا تھا: وَاَنَّا لَا تَدْرِي اَشَرُّ اُرِيْدُ بِمَنْ فِي الْاَرْضِ اَمْ اُرَادَ بِهُمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا۔ شر کی جانب میں اُرید بہ صیغہ مجہول لائے، رُشد کی طرح ارادۂ شر کے فاعل کو تصریحاً ذکر نہیں کیا۔ موسیٰؑ اور خضرؑ کے چھتے میں تین واقعات کا ذکر تھا: سفینہ کو توڑ کر عیب دار بنانا، غلام کا قتل کرنا، دیوار کو سیدھا کر دینا۔ پہلے واقعے میں خضرؑ نے فَأَرَدْتُ اَنْ اُعِیْبَهَا فرمایا۔ کیوں کہ عیب دار بنانے کے الفاظ کی نسبت باری تعالیٰ کی طرف صراحتاً کرنا خلاف ادب سمجھا، گو نتیجے کے اعتبار سے وہ بھی خیر تھا۔

قتل غلام میں دُو پہلو تھے۔ بہ ظاہر غلام کے ”نفسِ زکیہ“ ہونے کے اعتبار سے ابتداءً یہ فعل قبیح تھا، لیکن بہ اعتبار انجام و نتیجہ کے اس میں بہت بڑی چیز مضمر تھی، وہاں خضرؑ نے بہ صیغہ جمع، فَأَرَدْنَا اَنْ یُبَدِّلَهُمَا رَیْبَهُمَا الخ اختیار کیا۔ گویا ظاہری صورتِ حال کے اعتبار سے اسے اپنے ارادے کے ماتحت رکھا اور باطنی حکمت کے لحاظ سے اس کا انتساب اللہ تعالیٰ کے ارادے کی طرف رہا۔

تیسرا واقعہ ”اقامتِ جدار“ کا تھا، جو ابتداءً ادا انتہاء ہر پہلو سے خیر محض تھا۔ جو دیوار گرا چاہتی تھی اُسے گرنے سے بچایا اور یتیموں کا مال محفوظ کر دیا؛ اس لیے وہاں

لہ تعریف ہے اُس اللہ کی، جو خالق ہے کثوں اور سوروں کا

اپنا تو سٹ بالکل اُڑا دیا اور صاف طور پر فرما دیا: فَأَرَادَ رَبُّكَ أَنْ يَبْلُغَا أَشُدَّهُمَا وَيَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا پھر اخیر میں تمام واقعات کو مجموعی طور پر ایک جملہ: وَمَا فَعَلْتُهُ عَنْ أَمْرِي میں پیٹ کر ظاہر کر دیا کہ یہ سب کچھ اُدھر ہی سے ہے۔ اس طرح کی حسنِ تعبیر کی مثالیں قرآن و حدیث میں بے شمار ہیں۔

اس لیے عارفین و کاملین اور علمائے متادین ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے حقِ ربوبیت اور اور اپنی شانِ عبودیت کے پیش نظر تفصیلات اور غرضوں کو اپنی طرف اور طاعات و خیرات کو اللہ سبحانہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔

جبر و اختیار کے درمیان | اور میرے نزدیک اختیار مطلق اور جبر محض کے درمیان کسب پر حکمت راستہ | کا درجہ قائم کرنے کی بڑی حکمت یہی ہے کہ بندہ اعتدال پر قائم رہ کر، اپنی ہر ایک نقل و حرکت پر ربوبیت و عبودیت کے صحیح آداب بجالائے اور بندگی کے کڑے امتحان و آزمائش میں اپنے کو ثابت قدم رکھے۔ حافظ ابن قیم نے مدارج السالکین میں ایک عجیب اثر نقل کیا ہے جس سے اس مسئلے کی پوری عقدہ کشائی ہوتی ہے، وہ اثر یہ ہے:

إِنَّ الْعَبْدَ إِذَا أَذْنَبَ فَقَالَ: يَا رَبِّ! هَذَا قَضَاؤُكَ، وَأَنْتَ قَدَّرْتَ عَلَيَّ وَأَنْتَ حَكَمْتَ عَلَيَّ وَأَنْتَ كَتَبْتَ عَلَيَّ۔ يَقُولُ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ: وَأَنْتَ عَمَلْتَ وَأَنْتَ كَسَبْتَ وَأَنْتَ أَرَدْتَ وَاجْتَهَدْتَ وَأَنَا أَعَاقَبُكَ عَلَيْهِ۔ وَإِذَا قَالَ: يَا رَبِّ! أَنَا ظَلَمْتُ وَأَنَا أَخْطَأْتُ وَأَنَا اعْتَدَيْتُ وَأَنَا فَعَلْتُ، يَقُولُ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ: وَأَنَا قَدَّرْتُ عَلَيْكَ وَقَضَيْتُ وَكَتَبْتُ وَأَنَا أَعْفِرُكَ۔

وإذا عمل حسنة فقال: يا رب! أنا عملتها وأنا تصدقت وأنا صليت وأنا أطعمت، يقول الله عز وجل: وأنا أعنتك وأنا وفقتك. وإذا قال: يا رب! أنت أعنتني وفقتني وأنت مننت علي، يقول الله: وأنت عملتها وأنت أردتها وأنت كسبتها (مدارج السالكين ج: ۱، ص ۹۹-۱۰۰، مطبوعہ: مطبعہ منار، مصر) اس کا خلاصہ مطلب یہ ہے کہ بندہ جب گناہ کر کے کہتا ہے کہ اے پروردگار! جو کچھ میں نے

کیا، تو نے میری تقدیر میں پہلے لکھ دیا تھا اور تو میرے حق میں تو کیا اُس کا فیصلہ کر چکا تھا، تو اللہ تعالیٰ اس کا جواب دیتا ہے کہ یہ سب کچھ سہی، مگر عمل تو تو نے کیا، کسب تیرا ہے، تیرے ارادے اور کوشش سے یہ کام ہوا، اب میں اس پر تجھے سزا دوں گا۔

اس کے برعکس جب گناہ کا ارتکاب کر کے عرض کرتا ہے کہ اے پروردگار! میں نے ظلم کیا، مجھ سے خطا اور زیادتی ہوئی اور یہ سب میری کر توت ہے، تو ادھر سے جواب ملتا ہے کہ ٹھیک ہے، مگر یہ سب تقدیری بات تھی جو میں تیرے حق میں پہلے ہی لکھ چکا تھا، اب تیری اس تقصیر پر میں تجھے معاف کرتا ہوں۔ یہ تو گناہ کی صورت تھی، اب اطاعت کی صورت سنئے: ادھر کوئی بندہ اچھا کام کر کے دعا کرتا ہے کہ پروردگار! میں نے یہ کام کیا، میں نے صدقہ کیا، میں نے نماز پڑھی، میں نے کھانا کھلایا، تو حق تعالیٰ کی طرف سے ارشاد ہوتا ہے کہ بے شک ایسا ہوا، مگر میں نے تیری مدد کی اور میری توفیق سے تو یہ کام کر سکا۔ کیا میری امداد و توفیق کے بدون تو کچھ کر سکتا تھا؟ اس کے برخلاف، جب بندہ اپنی طرف سے عرض کرتا ہے کہ آپ نے میری مدد فرمائی، اور آپ نے احسان فرمایا کہ مجھ سے یہ کام بن پڑا، تو جواب ملتا ہے کہ عمل تیرا ہے، تیرے ارادے سے ہوا ہے اور تو نے یہ نیکی کائی ہے۔

اب غور کیجیے کہ کسب کا یہ ذوالوجہیں اور برزخی درجہ اگر نہ رکھتے، تو عبودیت اور نادب و اخلاص کے پر کھنے کی اس سے بہتر کسوٹی اور کیا ہو سکتی تھی؟ سبحان اللہ! کیا لطف و کرم ہے اور کیا امتحانِ محبت و اطاعت ہے! یہی وہ پاک حقائق ہیں، جن کے چہرے سے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام نے پردے اٹھائے ہیں۔ یہ حکمائے متفلسفین کے بس کا روگ نہ تھا۔ حق تعالیٰ کا شکر کہ اُس نے نور نبوت کے فیض سے یہ باریک عقدے اپنے مُخلص بندوں پر کھول دیے۔

فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي هَدَانَا لِهَذَا، وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَا اَنْ هَدَانَا اللّٰهُ،
لَقَدْ جَاءَتْ رُسُلٌ رَبِّنَا بِالْحَقِّ وَلَوْلَا اللّٰهُ مَا اهْتَدَيْنَا وَلَا تَصَدَّقْنَا وَلَا
صَلَّيْنَا، وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنْ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ -

الدُّارُ الْآخِرَةُ

(اسلام کا عقیدہ آخرت)

افادات

حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ
ترتیب و تحقیق: خالد القاسمی

آخرت کیا ہے؟ عقیدہ آخرت فطرتِ انسانی کا خاصہ ہے اسلام اور دیگر مذاہب میں آخرت کا تصور کیا ہے اس کی پر مغز اور مفصل بحث۔

منظم اشاعت
ناشر
دارالعلوم حیدرآباد، آندھرا پردیش © دارالمؤلفین دیوبند، دیوبند

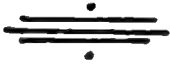
بله تمام؛ وحید الزماں قاسمی کیرانوی
معتد دارالمؤلفین دیوبند

طبع اول سنہ ۱۴۱۳ھ و ۱۹۹۲ء

قیمت رسالہ ۸/-

فہرست مضامین، الدار الآخرہ،

نمبر شمار	مضامین	صفحہ	نمبر شمار	مضامین	صفحہ
۱	مذہبی، سستی کا عملی ثبوت	۲۳۶	۱۲	تناسخ کی قسمیں	۲۵۱
۲	معروضات	۲۳۸	۱۳	تناسخ کے سلسلے میں تضاد بیانیات	۲۵۲
۳	موضوع بحث	۲۳۹	۱۴	حامیاں تناسخ کا استدلال	۲۵۳
۴	عقیدہ آخرت کی اہمیت و افادیت	۲۴۰	۱۵	دلیل کے کمزور پہلو	۲۵۴
۵	عقیدہ آخرت پر ایمان سے قبل عربوں کی حالت	۲۴۰	۱۶	کیا راحت و تکلیف جزا و سزا میں منحصر ہے	۲۵۵
۶	عقیدہ آخرت پر ایمان کے درخشاں نتائج	۲۴۲	۱۷	عہد الست پر قیاس صحیح نہیں	۲۵۶
۷	مسیحی محققین کے اعتراضات	۲۴۴	۱۸	تناسخ کی ایک فلسفہ آمیز دلیل اور اس کا جواب	۲۵۷
۸	مذہب میں تصور آخرت	۲۴۹	۱۹	عقیدہ برزخ پر اعتراض کا جواب	۲۵۸
۹	اسلام کا تصور آخرت	۲۴۹	۲۰	قدم عالم کی بحث اور قائلین کے دلائل	۲۵۹
۱۰	باطل کا تصور آخرت	۲۵۰	۲۱	مذکورہ دلائل کا تجزیہ	۲۶۲
۱۱	بیروان وید کے نزدیک آخرت کا تصور	۲۵۰			



الدار الآخر

مذہبی ہستی کا عملی ثبوت | صاحبو! آج یہ مؤثر الانصار کا دوسرا سالانہ جلسہ ہے، جس میں ہندوستان کے مختلف طبقات کے مسلمانوں نے ایک کثیر تعداد میں محض اسلامی درد مندی اور دینی اخوت و دل سوزی کی راہ سے، زحمت سفر اور صرف اوقات وغیرہ کی پرداہ نہ کر کے، شرکت حاصل فرمائی ہے۔ ہم یقیناً جانتے ہیں کہ آپ حضرات کا یہ قومی اجتماع، کسی معتد بہ شخصی منفعت پر مبنی نہیں ہے، بلکہ آپ تو اپنے کاروبار کا حرج کر کے اور بہت سے ذاتی فوائد کو نظر انداز کر کے یہاں تشریف لارہے ہیں۔ نہ آپ کی غرض یہاں جمع ہونے سے کوئی سیر و تماشا ہے، ورنہ تو چند ہی کے ایام، جو ابھی عنقریب ختم ہوئے ہیں، اس کے لیے زیادہ موزوں اور مناسب تھے اور نہ ہی کوئی شاہی عمارت کے دیکھنے کا اشتیاق یا اپنے اسلاف کے قدیم و ممتاز یادگاروں کی کشش آپ کو یہاں کھینچ کر لائی ہے، کیوں کہ اس قسم کی قوتِ جاذبہ میرٹھ کی سرزمین میں آگرہ، دہلی، لکھنؤ سے زیادہ موجود نہیں، جن کو چھوڑ چھوڑ کر آپ نے اس اجلاس کو رونق اور ہم ناچیزوں کو عزت بخشی ہے، پھر آخر وہ کیا مقصد ہے جس کے لیے آپ نے سفر کی گونا گوں مشقتوں کا تحمل فرمایا، زیرِ باری گیارا کی، روپیہ اور پیسے سے قیمتی وقت صرف کیا، نیند کھوئی، آرام کھو یا اور ایک پُر زہ کاغذ پھینچنے پر وطن عزیز کو چھوڑ کر ایک اجنبی شہر میں آپڑے؟

میرے نزدیک اس سوال کا معقول جواب اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا کہ

آپ صرف ایک مقصد یعنی اپنی مذہبی ہستی کا عملی ثبوت پیش کرنے کے واسطے تشریف لائے ہیں۔ بے شک آپ کے اس طرزِ عمل نے بہ خوبی ثابت کر دیا کہ مسلمانوں کے تین بیمار میں ابھی تک جان باقی ہے، اُن کے دلوں میں مذہب کا جذبہ موجود ہے، اُن کی رگوں میں عربی خون حرکت کر رہا ہے، وہ گو خود مٹ گئے ہوں، مگر اسلام کی عظمت و احترام کو اُنھوں نے اپنے دلوں سے نہیں مٹایا ہے اور اُن کو اگرچہ بالکل مُردہ فرض کر لیا جائے، لیکن اس پر بھی جب وہ کبھی مُنادی اسلام کی آواز سُن لیتے ہیں، تو اُس کو روح القدس کی آواز سمجھ کر فوراً اُٹھ بیٹھتے یا کم از کم گھبلانے ضرور لگتے ہیں۔

یہ سچ ہے کہ یہاں آنے سے آپ کو فی الحال کوئی زرعی یا تجارتی فائدہ نہیں پہنچا، لیکن یہ میں کہہ سکتا ہوں کہ آپ نے فی الحقیقت ایک ایسی سودمند تجارت میں حصہ لگایا ہے جس کو قرآن پاک تَجَارَةً تُنْجِيكُمْ مِنْ عَذَابِ الْيَمِّ کے الفاظ سے ادا کرتا ہے۔ آپ نے بے شک یہاں کسی پرانی یادگار یا دِل چسپ عمارت کی سیر نہ کی ہوگی، مگر بالیقین ایسے پاک باز بزرگوں کی زیارت کر لی ہوگی، جن کو دیکھ کر اسلام کے فراموش کیے ہوئے کمالات اور قرونِ اولیٰ کے مُقدس مسلمانوں کی یاد تازہ ہو جائے۔ بلاشبہ آپ اور ہم یہاں کسی شادی یا غمی کی تقریب میں شرکت کرنے کے لیے مجتمع نہیں، لیکن ہاں، اپنی قوم کے تَنْزِل و تیرہ سختی پر مژبہ پڑھنے اور پچھلے بزرگوں کے تذکرے یا اُن جدید کوششوں کو سُن کر مسرور ہونے کے لیے حاضر ہوئے ہیں، جن کے ساتھ فی زمانہ ہماری حقیقی زندگی اور فلاح مُتعلق ہے۔

ہمارا اور آپ کا نصب العین اس وقت صرف یہ ہے کہ ہم مسلمانانِ ہندوستان کے مختلف گروہوں کے جو مختلف فرائض اس پُر آشوب زمانے میں ہونے چاہیں، اُن میں سے بعض کو بیان کر دیں اور یہ بھی جتلا دیں کہ اُن فرائض میں کام یاب ہونے کے لیے دارالعلوم دیوبند اور جمعیتہ الانصار کا وجود کس حد تک ضروری ہے، اور یہ کہ اُن قومی انجمنوں کے برخلاف (جن میں بہت سے بلند پایہ خیالات اور آمیدیں

پیدا ہو کر وہیں دفن کر دی جاتی ہیں اور جن کو انجن کے بجائے، قومی اُنگوں کا گورستان کہنا زیادہ مناسب ہے، دارالعلوم دیوبند اور جمعیتہ الانصار نے اپنی طویل یا قصیر زندگی میں، اپنے فرائض کے اندر کس قدر سرمایے سے کس قدر کام یابی حاصل کر لی تھی جلسے کے انہی مقاصد کے انجام دینے کے لیے مہلک و عطا فرمائیں گے، تقریریں ہوں گی تحریریں سنائی جائیں گی اور جو تجاویز، مذہبی ترقیات کے بارے میں اہل الرائے کے مشورے سے طے ہو چکی ہیں، اُن کا اعلان کیا جائے گا۔

معروضات | مجھ کو اپنے حال پر افسوس ہوتا ہے، جب یہ دیکھتا ہوں کہ در صورتی کہ اس مجمع کے اندر کوئی وعظ کہنے میں، کوئی رائے و مشورے میں، کوئی انتظام میں اور کوئی اور کسی مفید کام میں مصروف ہے، میں چند اوراق سیاہ لے کر اہل مجلس کے دلوں کو کچھ دیر کے لیے مُنغص بناؤں اور ایک ایسے خشک اور پیچیدہ اور بے آب و نمک مضمون کے سُنتے پر سامعین کو مجبور کروں، جس میں نہ کچھ لذت اور مزہ حاصل ہو اور نہ عام طور پر آسانی کے ساتھ سمجھ میں آنے کے قابل ہو۔

لیکن اے حضرات! معاف کیجیے کہ میں اپنی خود مختاری سے ہرگز اس جرم کا (اگر یہ واقعی جرم ہے) مُرتکب نہیں ہوا ہوں۔ ہمارے محترم بزرگ مولانا عبید اللہ، ناظم جمعیتہ الانصار، جنہوں نے کسی نامعلوم مصلحت اور حسن ظن کی بنا پر یہ عنوان میرے سپرد کیا ہے، اس کے گواہ ہیں کہ میں نے اس مضمون کے لکھنے سے کسی وقت اور کس حد تک پہلو تہی کی ہے اور کس کس حیلے سے جان بچانا چاہی، لیکن آخر کار مولانا موصوف کے محکم تقاضے میرے کُٹاٹل اور تقاضے پر غالب آئے اور جلسے سے تین روز پہلے بنام خدا یہ تحریر لکھنا شروع کر دی۔

میری ان معروضات کا یقین کرنے کے بعد، آپ خود انصاف کر سکتے ہیں کہ مجھ جیسا کاہل اور بے بصاعت آدمی اتنے تھوڑے عرصے میں کسی طرح سب اگلے پچھلوں

کے اقوال کا استقصا کر کے ایسے دقیق مضمون کو کابل و مکمل نہیں بنا سکتا تھا، اس لیے جن مواقع میں مجھ سے کوئی فروگزاشت ہوئی ہو، یا کسی سمجھ دار آدمی کے واسطے نکتہ چینی کا موقع رہ گیا ہو، یا غجالت اور پریشانی تقریر کی وجہ سے دلائل کی تقریب نامتام ہو، تو آپ مسامحت اور اصلاح سے کام لے کر مجھ کو معذور سمجھیں، اور اگر کوئی جملہ آپ کے نزدیک صحیح لکھا گیا ہو، تو اُس پر خدا سے بے نیاز کا شکر ادا کریں کہ اُس نے ایک نیک کام میں اپنے بندہ ضعیف کی مدد فرمائی۔ اس سے زیادہ نہ ہم کو آپ سے صلے کی خواہش ہے اور نہ اجر کی امید، اِنْ أَجْرِي إِلَّا عَلَى اللَّهِ، عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ (شعر)

شاہا! مَنْ از بعرش رسام سریر فضل

ملوکِ ایں جنابم و مسکین ایں دَرَم

موضوع بحث | اس تمام سامعہ خراشی کے بعد، جو ہم نے اب تک کی ہے، مناسب ہے کہ ہم اپنے مقصد اصلی کا آغاز کر دیں؛ لیکن چوں کہ ہر بحث کے شروع کرنے سے پہلے جب تک موضوع بحث کی تعیین اور دائرۂ بحث کی تحدید نہ ہو جائے، تو اُس بحث کا سمجھنا علی وجہ البصیرت ناممکن ہے، اس لیے میں بتلا دینا چاہتا ہوں کہ میرا موضوع بحث اس وقت کیا ہوگا اور میں اُس سے کس درجے تک سروکار رکھوں گا!

آپ سُن چکے ہیں کہ میرے مضمون کا عنوان دَارُ الْآخِرَةِ قرار دیا گیا ہے۔ دَارُ الْآخِرَةِ اگرچہ اپنے ترکیبی لحاظ سے عربی زبان کا لفظ ہے، مگر اردو میں بھی اس کثرت سے اس کا استعمال کیا جاتا ہے کہ مجھ کو اس کے معنی کے سمجھانے میں توضیح کی ضرورت نہیں رہی؛ مجھ کو اس کا صحیح مفہوم دل نشین کرانے کے واسطے اتنا کہ دینا کافی ہے کہ عالم، تغیر و در تغیر اور فنا در فنا کے بعد جو مَرْتَعِہ اُس کی موجودہ حالت کو ختم کر کے دوبارہ قائم کیا جائے گا اور جس کے وجود کے لیے کوئی انتہا نہ ہوگی اور جس میں کھرا اور کھوٹا بالکل الگ الگ کر کے مطیع و عاصی کی پوری تفریق قائم کر دی جائے گی اور جس کے ایک پہلو میں جنت، مع اپنی بے شمار نعمات و آلات کے، اور دوسرے پہلو میں جہنم، مع اپنے ہر قسم کے آلائم و تکالیف کے، موجود ہوگی، اُسی کا نام ہمارے نزدیک دارِ آخرت ہے۔

عقیدہ آخرت کی اہمیت و افادیت | دارِ آخرت کا اعتقاد، مذہبِ اسلام کے اُن قطعی اور ناقابلِ انکار مسلمات میں سے ہے، جن کے قبول کیے بغیر کوئی شخص دائرہ اسلام میں داخل نہیں رہ سکتا اور یہی وہ چیز ہے، جس کو تمام اُدامرو نو اہی شرعیہ پر عمل پیرا ہونے کا سب سے آخری نتیجہ قرار دیا جاسکتا ہے، اسی کی تلاش میں بڑے بڑے سلاطین نے اپنے جاہ و جلال کو خاک میں ملا دیا ہے اور اسی کی طلب میں بادشاہوں نے گداؤں کے سامنے گردنیں خم کی ہیں، اسی کے اشتیاق میں ایک مذہبی سپاہی اپنے کو موت کے مُنہ میں ڈال دیتا ہے اور اسی کے خوف سے ظالمانہ خوں ریزیاں دُنیا سے معدوم ہوتی ہیں، یہی وہ چیز ہے، جس کے نشے میں چور ہو کر ایک دُنیا پرست قوم سارے جھگڑوں اور خرخشوں سے آزاد ہو جاتی ہے اور اسی کی اُمید و بیم کی کش مکش، انسان کو ہر قسم کی بد اخلاقیوں اور ناپاک جرائم کے ارتکاب سے باز رکھتی ہے، شاید یہی دارِ آخرت کا خیالِ راسخ تھا، جس نے ایک زلمنے میں عربوں کی کایا پلٹ کر سارے عالم میں اُن کی فتح و ظفر کا جھنڈا گاڑ دیا اور یہی وہ جذبہ تھا، جس کی بہ دولت اُن کے دلوں میں کینہ خصال کی جگہ ہمتِ بلند، نیتِ صحیح اور اور جوشِ صادق وغیرہ اوصاف نے لے لی۔ وہ کہا تھے اور اس خیال میں پختہ ہونے کے بعد کیا ہو گئے؟ اس کی مختصر کیفیت، ذیل کے نہایت صحیح واقعات سے آپ کو معلوم ہو سکتی ہے:

عقیدہ آخرت پر ایمان | آفتابِ رسالت کے طلوع ہونے سے پہلے عرب سے قبل عربوں کی حالت | میں چند مذہبی گروہ موجود تھے، جن میں یہود، نصاریٰ، مشرکین مکہ اور مجوس خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ یہ لوگ سب کے سب اَوہام کی تاریکیوں اور طرح طرح کی غلط فہمیوں میں پھنسے ہوئے تھے، ان کے عقائد میں توحیدِ کابل کا نام و نشان نہ تھا، ان کے عادات و اطوار بالکل بگڑے ہوئے تھے، انہوں نے اپنے معاملات کو کبھی جادہ اعتدال پر لانے کی کوشش نہ کی تھی اور ہر گز ان کے گلوب میں خداوند کریم کی عظمت و کبریائی کا نقشہ اس طرح نہ جاتا تھا کہ وہ ان کو ایسے افعالِ شنیعہ سے باز رکھتے۔

اور حرکاتِ ناشایستہ سے روک دیتا، جن کو وہ خود بھی فواحش اور ممنوعات میں شمار کرتے تھے۔

یہ سب کچھ اس وجہ سے تھا کہ اُن کے دلوں میں خدا کا خوف اور آخرت کی جواب دہی کا اندیشہ پوری قوت اور استحکام کے ساتھ موجود نہ تھا، وہ یہ نہ جانتے تھے کہ خدا کے یہاں ہرگز مُشرک کی نجات نہیں ہو سکتی اور توحید کا دل سے ملنے والا ضرور فلاحِ ابدی کا مستحق ہوتا ہے، اُن کو یہ بھی یقین نہ تھا کہ سارے عالم کے انسانوں کو فنا ہو جانے کے بعد ایک روز اپنے خالق کے رو بہ رو کھڑا ہونا ہے، جہاں اُن سے ذرے ذرے کا حساب و کتاب ہوگا اور اگر اُن میں سے کوئی ان باتوں کو سمجھتا بھی تھا، تو اُس کے دل میں یہ خیالات ایسی مضبوطی کے ساتھ جاگزیں نہ تھے کہ اُن کا اثر اُس کے جوارح اور اعمال میں جھلکنے لگتا۔

غرض، وہ، بلکہ وہی خاص نہیں، ساری دُنیا ایک عام غفلت اور ظلمت میں پڑی ہوئی تھی، جو ناگہاں خدا کی رحمت سے مکہ کی پہاڑیوں میں ایک خورشید جہاں تاب اپنی نورانی اور تیز تیز شعاعیں ڈالتا ہوا ساری دنیا کی اندھیروں کو دور کرنے کے واسطے نمودار ہو، جس کے نکلنے پر گواؤں اور بہت سے خفاش سیرتوں اور شپیرِ چشموں نے اپنی کور باطنی کی وجہ سے اُس کے دیکھنے سے انکھیں چڑائیں اور اُلٹے آفتاب ہی کی ذاتِ مُنور میں عیب نکالنے لگے، لیکن ۛ

گر نہ بیند بروز شپیرِ چشم
چشمِ آفتاب را چہ گناہ!

انجام کار اُن کو بھی ثابت ہو گیا کہ یہ صرف ہماری نظر کا قصور تھا۔ اس آفتاب سے، ہر ایک شخص نے سمجھ لیا ہوگا کہ میرا اشارہ اپنے آقائے نامدار، حضورِ اقدس جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ بابرکات کی طرف ہے، جنہوں نے دنیا میں تشریف لا کر سرزمینِ عرب سے ہر ایک قسم کی مخلوق پرستی اور ذمائم و منکرات

ۛ خفاش عربی اور شپیرِ فارسی کا لفظ ہے۔ دونوں کے معنی چمکا دہیں۔ ۛ برائیاں

کا استیصال فرمادیا اور وہی گنوار، ٹنڈخو، جاہل، وحشی اور خوں ریز عرب، جن کا تذکرہ میں پہلے کرچکا ہوں، آپ کی رہ نمائی سے راستی اور صدق کو قبول کر کے تمام عالم کی ہدایت و اصلاح کا پیش خیمہ بنے۔

عقیدہٴ آخرت پر ایمان | آپ نے دُنیا کے فانی اور آخرت کے لازوال ہونے کے درخشاں نتائج کا نقشہ، کچھ اس طرح اُن کے دماغوں میں جھادیا کہ اُن کے نزدیک ساری دنیا پر پستہ سے زیادہ حقیر اور ذلیل نظر آنے لگی اور وہ ہر وقت آخرت ہی کے دھیان میں با مستغرق رہنے لگے۔ اُنھی شراب کے متوالوں نے، جن سے عبادت کے وقت بھی شراب کی بدستی زائل نہ ہوتی تھی، جب شراب کی حرمت کا حکم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے سنا اور یہ معلوم کیا کہ اُس کے پینے میں آخرت کا گناہ اُس کے ظاہری منافع سے بڑھا ہوا ہے، تو فوراً منکے توڑ ڈالے اور مے کدوں کو برباد اور اس کثرت سے شراب گرائی گئی کہ مدینے کی تمام گلی کوچوں میں پانی کی طرح بہتی پھری۔

اسی طرح جب اُن لیٹروں کو، جن کے واسطے اپنا اور پیرایا مال شیر مادر کی طرح حلال تھا، یہ بتلادیا گیا کہ دوسروں کا مال لینے سے خدا ناراض ہوتا ہے اور آخرت میں صاحب مال اپنے مال کا مطالبہ کرے گا، تو وہ اس قدر اس نصیحت سے متاثر ہوئے کہ حضرت علیؓ کرم اللہ وجہہ لہ پختہ مانہ خلافت میں اپنی زرہ وصول کرنے کے واسطے ایک ذلیل یہودی کے مقابلے پر قاضی شریح کی عدالت میں دعوادائر کرنا پڑا اور جب کوئی شہادت ثبوت میں نہ گزار سکے اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی شہادت کو قاضی صاحب نے بیٹا ہونے کی وجہ سے مسترد کر دیا، تو زرہ یہودی کے حوالے کر کے ناکامی کے ساتھ واپس چلے آئے۔

علیٰ ہذا القیاس، عربوں میں اقوامِ یونان کی طرح دختر کشی کی بے ہودہ رسم،

۱۔ پستہ: مخمر، پر پستہ: مخمر کا پر

۲۔ یہ لفظ سہوا چھوٹ گیا ہے۔

قدیم زمانے سے جاری تھی اور وہ اس بے رحمی اور سفاکی کے اس درجہ خوگر ہو گئے تھے کہ اُن کے خیال میں یہ کوئی عیب بھی نہ رہا تھا۔ جس وقت قرآن نے دارِ آخرت کا ہول ناک منظر اُن کے سامنے ان الفاظ میں پیش کیا: وَإِذَا الْمَوْءُودَةُ سُئِلَتْ، بِأَيِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ تو اُن کو اپنی اولاد سے گزر کر غیروں کی اولاد کے ساتھ ایسا رشتہ محبت و اُلفت پیدا ہو گیا کہ عُمَرُ القُصَا سے فارغ ہو کر، بہ وقتِ واپسی مدینہ طیبہ، حضرت حمزہ کی لڑکی پر تین صحابیوں کی نزاع قائم ہو گئی۔ حضرت علی، حضرت جعفر اور حضرت زید رضی اللہ عنہم میں سے ہر ایک اُس کا حَقِّ حَصَانَت (پرورش) اپنے لیے ثابت کرتا تھا اور ایک جو دلیل پیش کرتا تھا، دوسرا اُس کو رد کر دیتا تھا، یہاں تک کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے، بہ قاعدہ شرعی، لڑکی کو حضرت علی کے حوالے کر کے، حضرت جعفر کو اشبہت خلقی و خلقی اور حضرت زید کو اَنْتَ اَخونا و مولانا فرما کر تسلی دی۔

یہی حال اُن کا بُت پرستی کے بارے میں ہوا۔ ایامِ جاہلیت میں اُن کے معبود لاکھوں کروڑوں تھے، بلکہ یہ کہنا شاید غلط نہ ہو کہ پہاڑ کا ہر ایک پتھر اُن کا معبود تھا اور انہی معبودوں کی حمایت میں وہ خدا سے اور خدا کے سچے رسول سے لڑتے رہتے تھے، لیکن جب سے وہ دنیوی اعزاز کو چھوڑ کر دارِ آخرت کی طرف متوجہ ہوئے اور

إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ کی تہدید اور

الَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يَلْبِسُوا إِيمَانَهُمْ بِظُلْمٍ أُولَٰئِكَ لَهُمُ الْأَمْنُ وَهُمْ مُهْتَدُونَ کی بشارت اپنے نبی کی زبانِ مبارک سے سنی، تو اُن کے پُنجتہ اور پُرانے اعتقادات میں اس قدر عظیم اور سریع انقلاب واقع ہوا کہ وہ بولے شرک سے بھی بھاگنے لگے اور چار دانگِ عالم میں اُنھوں نے خالص توحید کا ڈنکا بجا دیا، یہاں تک کہ خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس احتمال پر کہ شاید آئندہ چل کر اس کی پرستش یا تعظیمِ مفرط کی نوبت نہ آجائے، ایک نہایت متبرک درخت: شَجَرَةُ الرِّضْوَانِ

۱۵ غلو کی حد تک تعظیم

کو جرے گنواؤالا اور جب سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ادا کرنے کے لیے آپ نے حجرِ اسود کو بوسہ دیا، تو یہ کہہ کر دیا کہ: اِنِّی وَاللّٰہُ اَعْلَمُ اَنَّکَ حَجَرٌ لَا تَنْفَعُ وَلَا تَضُرُّ۔ یعنی میں خوب جانتا ہوں کہ تو میں جملہ پتھروں کے ایک پتھر ہے، جس کے قبضے میں سود و زریاں اور نفع و نقصان کچھ نہیں ہے۔

اسی قسم کا عظیم الشان تغیر اُن کی ایک اور عادت میں ہوا۔ عربوں پر کمالِ بددیت کی وجہ سے درندگی اس درجے غالب تھی کہ ذرا ذرا سی بات پر ان کے یہاں جنگ و جدال کا بازار گرم ہو جاتا تھا، اور کسی ادنیٰ حرکت پر جب تلوارِ میان سے باہر نکل آتی تھی، تو صدیوں تک قتل و خون ریزی کا سلسلہ بند نہ ہوتا تھا۔ اسلام کے پُر زور اثر نے جب اُن میں آخرت کا خوف پیدا کر اکر، اس طرح کی نفرت انگیز حرکات سے روکا، تو وہ ایسے حلیم اور نرم دل ہو گئے کہ خلیفہ ثالث حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے دشمنوں کے بُرے میں پھنس کر بھی اپنے بے شمار حامیوں کو لڑنے کی اجازت نہ دی، یہاں تک کہ اُن کا سرکٹ گیا، مگر کسی اور کی انگلی تک نہ گئی۔

یہ ہیں درخشاں نتائج اُس دارِ آخرت پر ایمان رکھنے کے، جس کے شوق اور خوف نے قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کو تمام دُنیوی لذتوں اور تکلیفوں سے آزاد کر دیا تھا اور جس کے حاصل کرنے کی فکر میں اُنھوں نے گھر باہر، زن و فرزند اور مال و دولت وغیرہ سب کو خاک میں ملا کر، حضورِ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حلقہ بہ گوشی اختیار کی تھی۔

مسیحی محققین کے اعترافات | بلاشبہ دارِ آخرت کے متعلق ایسا مضبوط اعتقاد جس کے ایسے ایسے آثارِ قاہرہ دنیا میں پائے گئے اور جس کی طاقت نے اس کا رواں سراے میں عام ہل چل ڈال دی، ایک قوم کی قوم کے دلوں میں ہرگز نہ نشیں نہیں ہو سکتا، تاوقتے کہ کوئی اعلیٰ درجے کی زبردست صداقت اور حقانیت اُس کے منوانے میں مدد نہ کرے، اس لیے ہم کو اہل عرب کی ان عام حالتوں کا موازنہ کرنے سے، جو اسلام سے پہلے اور اس کے بعد اُن کے متعلق تاریخوں میں بہ تو اثر

بیان کی گئی ہیں، نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی اور راست بازی کا گہری حد تک سراغ بل سکتا ہے۔ گاڈ فری ہیگنس صاحب اپنی کتاب میں گبن صاحب سے نقل کرتے ہیں کہ :

”چاروں خلفاء کے اطوار یکساں صاف اور ضرب الثقل تھے، کہ ان کی سرگرمی دل دہی اخلاص کے ساتھ تھی اور ثروت و اختیار پاکر بھی انھوں نے اپنی زندگیوں فراغ اخلاقی کے ادا کرنے میں صرف کیں، یہی آدمی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اول جلسے میں شامل تھے، جو پیش تر اس سے کہ آپ نے اقتدار حاصل کیا، آپ کے جانب دار ہو گئے، یعنی ایسے وقت میں کہ آپ ہدفِ آزار ہوئے اور جان بچا کے اپنے ملک سے چلے گئے، اُن کے اول ہی اول تبدیلِ مذہب کرنے سے ان کی راستی ثابت ہوتی ہے اور دنیا کی سلطنتوں کو فتح کرنے سے ان کی لیاقت کی فوقیت معلوم ہوتی ہے“

”اس صورت میں کوئی یقین کر سکتا ہے کہ ایسے شخصوں نے ایذا نہیں سہیں اور اپنے ملک سے جلا وطنی گوارا کی اور اس سرگرمی سے اُس کے پابند ہوئے؟ یہ سب امور ایک ایسے شخص کی خاطر ہوں، جس میں ہر طرح کی بُرائیاں پائی جائیں اور اسی سلسلہ فریب اور سخت عیاری کے لیے ہوں، جو اُن کی تربیت کے بھی خلاف ہو اور ان کی ابتدائی زندگی کے تحصبات کے بھی مخالف ہو؟ اس پر یقین نہیں ہو سکتا، کیوں کہ یہ خارج از حیطہ امکان ہے“

”عیسائی اس کو یاد رکھیں تو اچھا ہو کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مسائل نے، اس درجے کا نشہ دینی آپ کے مریدوں میں پیدا کیا، جس کو عیسیٰ کے ابتدائی پیروؤں میں تلاش کرنا بے فائدہ ہے اور آپ کا مذہب اُس تیزی کے ساتھ پھیلا، جس کی تفسیر دین عیسوی میں نہیں، چنانچہ نصف صدی سے کم میں اسلام بہت سی عالی شان اور سرسبز سلطنتوں پر غالب آگیا۔ جب عیسیٰ (علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام)

کو سولی پر لے گئے، تو اُن کے پیرو بھاگ گئے، اُن کا نشہ دینی جاتا رہا اور اپنے مُقتدا کو موت کے پنجے میں گرفتار چھوڑ کر چل دیے۔ اگر بالفرض آپ کی حفاظت کرنے کی اُن کو ممانعت تھی، تو آپ کی تشفی کے لیے تو موجود رہتے اور صبر سے آپ کے اور اپنے ایذا رسانیوں کو دھمکاتے؟ برعکس اس کے، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھی اپنے مظلوم پیغمبر کے گرد آئے اور آپ کے بچاؤ میں اپنی جانیں خطرے میں ڈال کر کُل دشمنوں پر آپ کو غالب کیا۔“ انتہی

لارڈ ولیم میور صاحب، بے انتہا متعصب ہونے کے باوجود، اپنی کتاب سیرت محمدیہ میں لکھتے ہیں کہ:

مد ایک زمانہ نامعلوم سے مکہ اور جزیرہ عرب کی روحانی کیفیت بالکل بے حس ہو گئی تھی، گویا ایک ضعیف اور ناپایدار اثر یہودیت و نصرانیت یا فلسفے کا عرب پر ہوا تھا جیسے کہ ایک دریائے غیر رواں کی سطح کا ادھر ادھر لہر کھانا، مگر تہ میں بے حس و حرکت رہنا تمام عرب توہمات، مظالم اور بد کاریوں میں غرق ہو رہے تھے۔ یہ عام رسم تھی کہ بڑا بیٹا اپنے باپ کی بیویوں کو بیاہ لیتا۔ اُن کے غرور اور افلاس سے رسم دختر کشی بھی جاری ہو گئی تھی۔ اُن کا مذہب، حد درجے کی بُت پرستی تھا اور اُن کا ایمان ایک مُستَبَبُ الْأَسْبَاب، مالک علی الاطلاق پر نہ تھا، بلکہ غیر مُرئی ارواح کے توہم باطل کی سی ہیئت کا اُن کا ایمان تھا۔ قیامت اور جزا و سزا، جو فعل یا ترک کا باعث ہو اُس کی انہیں خبر تک نہ تھی۔

ہجرت سے تیرہ برس پیش تر تو مکہ اسی طرح سے ایسی ذلیل حالت میں بے جان پڑا ہوا تھا، مگر ان تیرہ برسوں نے کیا ہی اثر عظیم پیدا کیا! سیکڑوں آدمیوں کی جماعت نے بُت پرستی چھوڑ کر خداے واحد کی پرستش اختیار کی اور اپنے اعتقاد کے موافق، وحی الہی کی ہدایت کے مطیع و متقاد ہو گئے، اُسی قادرِ مطلق سے بہ شدت و کثرت دُعا مانگتے، اُسی کی رحمت پر مغفرت کی اُمید رکھتے اور حَسَنات اور خیرات و پزہیزگاری اور انصاف کرنے میں بڑی کوشش کرتے تھے۔ اب انہیں

شب و روز اُسی قادرِ مطلق کا خیال ہے اور یہ کہ وہی رازِ حق ہماری ادنیٰ ادنیٰ حوائج کا خیر گیراں ہے۔ ہر ایک قدرتی یا طبعی کیفیت میں، ہر ایک امورِ متعلقاتِ زندگی میں اور خلوت و جلوت کے ہر ایک حادثے اور تغیرات میں وہ اسی کی یدِ قدرت کو دیکھتے تھے، اور اُس کے وہ لوگ اُس روحانی حالت کو، جس میں وہ خوش حال اور حمد گناں رہتے تھے، خدا کے فضلِ خاص اور رحمتِ باختصاص کی علامت سمجھتے تھے۔ وہ اپنے اہل شرکافروں کے کفر کو خدا کے تقدیر کیے ہوئے خذلان کا نشان جانتے تھے۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو وہ اپنی حیاتِ تازہ بخشنے والا جانتے تھے (الح)

اس قہرے عرصے میں مکہ اس عجیب تاثیر سے دو حصوں میں منقسم ہو گیا مسلمانوں نے مصیبتوں کو تحمل اور شکیبائی سے برداشت کیا۔ ایک سومرد و عورت نے اپنے ایمان عزیز سے انکار نہ کر کے، گھر بار اپنا چھوڑ، حبش کو ہجرت کر لی تھی۔ پھر اس سے زیادہ آدمی اور اُن میں نبی بھی، اپنے عزیز شہر کو اور مقدس کعبہ کو چھوڑ کر مدینہ کو ہجرت کر آئے۔ اور یہاں بھی اس عجیب تاثیر نے دو باتیں برس کے عرصے میں اُن لوگوں کے واسطے ایک برادری، جو نبی اور مسلمانوں کی حمایت میں جان دینے کو مستعد ہو گئی، تیار کر دی۔ اہل مدینہ کے کانوں میں یہودی، حقانی باتیں عرصے سے گوش گزار کر چکے تھے، مگر وہ بھی اُس وقت تک خوابِ فرغوش سے نہ چونکے، جب تک کہ روح کو کپکپا دینے والی باتیں نبیِ عربی کی نہیں سنیں، تب البتہ ایک نئی اور سرگرم ہنگامی میں دم بھرنے لگے۔ (انتہی)

اسی کتاب میں ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ:

”ہم بلا تامل اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ اسلام نے ہمیشہ کے واسطے اکثر توحشاتِ باطلہ کو کالعدم کر دیا، اسلام کی مدائے جنگ کے روبرو بت پرستی موقوف ہو گئی

اور خدا کی وحدانیت اور غیر محدود کمالات اور قدرت کاملہ کا مسئلہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مُتَقَدِّمِ دِلوں اور جانوں میں ایسا ہی زندہ اُصول ہو گیا ہے، جیسا کہ خاص حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دل میں تھا۔ مذہب اسلام کی پہلی بات، جو خاص اسلام کے معنی میں ہے، یہ ہے کہ خدا کی مرضی پر تو کُلِ مطلق کرنا چاہیے۔ مذہب اسلام اس بات پر فخر کر سکتا ہے کہ اُس میں پرہیزگاری کا ایک ایسا درجہ موجود ہے، جو کسی اور مذہب میں نہیں پایا جاتا۔“ (انتہی)

راوی رمل صاحب دیباچہ قرآن مجید میں لکھتے ہیں کہ:

”محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سب کام اس نیک نیتی کی تحریک سے ہوتے تھے کہ اپنے ملک کے لوگوں کو جہالت اور ذلت اور بُت پرستی سے چھڑائیں، اور یہ کہ نہایت مرتبہ کی خواہش اُن کی یہ تھی کہ سب سے بڑے امرِ حق یعنی توحیدِ الہی کا، جو اُن کی روح پر بہ درجہ غایت سُٹو لگی رہتی تھی، اشتہار کریں، اور مُقتضائے حوادث اور تدبیرِ کجی فُوزِ مرام اس کا باعث ہو کہ انھوں نے اپنے آپ کو خدا کا رسولِ امین یقین کر لیا، تاہم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سیرت ایک عجیب نمونہ ہے اُس ثُوت اور حیات کا، جو ایسے شخص میں ہوتی ہے کہ جس کو خدا اور قیامت پر اعتقادِ کامل ہوتا ہے۔“

الغرض سبھی مُحققین کے ان تمام اقوال سے، جو اوپر نقل کیے گئے اور تاریخ کی متواتر شہادتوں سے، یہ بخوبی ہُویدا ہوتا ہے کہ عربوں کی حیرت انگیز ترقی اور کامیابی کا راز صرف اُن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مفید تعلیمات اور ثُوتِ روحانیت کے پردے میں چھپا ہوا تھا اور اُن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ساری ہدایات کا خلاصہ یہ تھا کہ انسان، دنیا میں محض ایک مُسافر یا راہ گیر کی طرح زندگی بسر کرے یعنی وہ دارِ اپنا اُصلی دارِ اُقر اور دارِ الاقامہ سمجھے اور حُطامِ دنیا سے بہ قدرِ ضرورت متمتع ہو اور لذائذ اور تعیشات میں پڑ کر خدا کو اور دارِ آخرت کو نہ بھول بیٹھے۔

لے غالب، قابض لے مقصد میں کامیابی۔ لے حُطامِ دنیا: فانی و زوال پذیر دنیوی اسباب

مذہب میں تصور آخرت | یہ دارِ آخرت، جس کو اسلام نے ہمارا وطن اصلی اور دائمی جلّے اقامت قرار دیا ہے اور جس کے معتقدوں کی شناختِ خوانی ہم بہت کچھ کر چکے ہیں، اس کے وجود کا اعتراف اگرچہ اسلام کے سوا اور بھی بعض مذاہب میں فی الجملہ پایا جاتا ہے، لیکن مذاہب کا عام اتفاق اس پر نہیں، اس لیے میں چاہتا ہوں کہ آپ کو ان مذاہب کی ضروری تفصیل سے ایک حد تک مطلع کر دوں، جو دارِ آخرت یا دوسرے لفظوں میں مسئلہ معاد سے تعلق رکھتے ہیں۔

اس سلسلے کے ضمن میں، میں اُن بے شمار خیالات کو، جو زمانہ قدیم میں اس مسئلے کی نسبت وقتاً فوقتاً قائم کیے گئے ہیں، مُفَصَّل بیان کرنا نہیں چاہتا، کیوں کہ میرے نزدیک اُن کے اس وقت ذکر کرنے میں تطویلِ لا طائل اور خوابیدہ فتنوں کو بیدار کرنے کے سوا کوئی فائدہ معتد بہ متصور نہیں۔ اس واسطے میں اس بارے میں فقط اُنہی خیالات کو ذکر کروں گا، جو ہمارے ملکی بھائیوں کے لیے خاص طور پر کارآمد ہو سکیں۔ ہندوستان میں جو مذاہب جوش و خروش کے ساتھ اپنی حقانیت کے دعوے دار ہیں، اُن میں چوں کہ اسلام، عیسائیت اور ویدک دھرم کا نام خصوصیت کے ساتھ لیا جاسکتا ہے، اس لیے ہمارے مضمون کے اکثر خطابات کا تعلق بھی زیادہ تر انہی تینوں مذہبوں سے ہوگا اور اب ہم یہ بتلائیں گے کہ ان میں سے ہر ایک جزا، سزا، حشر اور معاد کے متعلق کیا رائے رکھتا ہے؟

اسلام کا تصور آخرت | اسلام کا دعوا ہے کہ یہ ساری دنیا جیسا کہ ایک دفعہ پہلے معدوم محض رہ چکی ہے، اسی طرح ایک مرتبہ پھر نیست و نابود کر دی جائے گی اور اس نیستی کے بعد پھر اُس کو ایک ایسا وجود عطا ہوگا، جو غیر فانی اور لازوال ہوگا۔ اسی وجود کے بل جانے پر تمام لوگ خدا کے روبرو حساب و کتاب کے واسطے کھڑے کیے جائیں گے اور اس سے فارغ ہونے کے بعد جو کافر جہنم میں اور جو مسلمان جنت میں داخل ہوں گے، وہ وہاں اَبَدُ الْآبَاد تک زندہ رہ کر جنت کی نعمتوں اور جہنم کی تکلیفوں کا ہمیشہ ہمیشہ نوبہ نوبہ چکھتے رہیں گے۔ انبیاء، اولیاء اور عامۃ مومنین کی

شفاعت پر خدا تعالیٰ بہت سے مجرموں کی تقصیرات معاف فرمائے گا اور بہت سے سپاہ کاروں کو بلا توسط غیرے محض خدا کے فضل و رحمت سے رہائی مل جائے گی۔ اس کے سوا اور بھی عجیب و غریب واقعات ہیں، جن کا ظہور محشر میں ہوگا اور جن کی تفصیل مسلمانوں کی مذہبی کتابوں میں دست یاب ہوگی۔

بائبل کا تصور آخرت | بائبل کی روایات بھی اس بارے میں اسلامی اعتقادات کے قریب قریب ہیں اور نصارا کی ہول ناک قیامت اور جنت کا خوش نمائین اور دوزخ کے کریہہ منظر جو کتاب مقدس میں موجود ہیں، وہ ہرگز اس سے کم نہیں جس کا قرآن مجید نے یقین دلایا ہے، البتہ عہد عتیق کے صحیفوں کا تتبع کرنے سے یہ ضرور ظاہر ہوتا ہے کہ موجودہ تورات کی رو سے اہل جہنم کے واسطے خلود نہیں ہے، یعنی نیکوں کو خدا تعالیٰ خوش ہو کر جنت میں اور بد کرداروں کو ناراض ہو کر کئی ہزار برس جہنم میں رکھے گا اور اُس کے بعد دونوں فنا کر دیے جائیں گے اور ہمیشہ کے لیے بس ایک خدا اپنی کافی صفات کے [ساتھ] موصوف ہوتا ہوا باقی رہ جائے گا۔

بہر حال، قرآن اور بائبل کے معتقدات میں اتنا زیادہ بُعداالمشرقین نہیں ہے کہ جس کی وجہ سے اصل مقصود کے اعتبار سے ایک صلیح کلمہ مشرب کے واسطے ان کے اندر تطبیق دینے میں کچھ موانع اور دقتوں کا سامنا کرنا پڑے۔ البتہ ویدک دھرم کے پیروں نے جس عقیدے کا اظہار، معاد کے متعلق، ویدک تعلیم کی رو سے کیا ہے، (اگرچہ خود وید اُس کا اظہار نہ کرتے ہوں) اُس میں اور جزا و سزا کے ان دونوں طریقوں میں جو قرآن و بائبل کے حوالے سے نقل کیے گئے ہیں، بے انتہا فرق اور بون بعید ہے۔

پیروان وید کے نزدیک | وید کے پیروں کے نزدیک، عالم کی ہستی کے واسطے نہ آخرت کا تصور | ابتدا ہے نہ انتہا، اُن کے نزدیک جس طرح خدا تعالیٰ مجموعہ صفات ہمیشہ سے موجود ہے، ایسے ہی عالم کا مادہ اور رو میں اور جسم و روح کی

باہمی ترکیب کا سلسلہ بھی ہمیشہ سے قائم ہے۔ خدا کا کام صرف اتنا ہے کہ وہ ارواح کو ایک قالب سے دوسرے قالب میں مناسب طور پر منتقل کرتا رہے اور کسی ایک شخص کے حق میں بھی وہ اعمال و افعال کے موافق جزایا سزا دینے سے نہ چوکے، اُن کے نزدیک کسی آدمی کی جنت یہی ہے کہ اُس کی روح کسی اسفل اور ناقص قالب کو چھوڑ کر اعلیٰ اور کامل قالب اختیار کرے اور اگر حد سے زیادہ نیکی میں ترقی کر جائے، تو پھر اپنے قطرہ ہستی کو سرچشمہ وجود میں ڈال کر فنا کر دے۔ اس کے مُقابلے میں دوزخ اس کا نام ہے کہ روح، اپنے درجات میں اوج سے حنیض کی طرف اور بلندی سے پستی کی طرف اُترتی ہوئی چلی آئے۔ اور جب کوئی انسان مثلاً بُرے کرم کرے، تو اس کی روح، انسانی قالب سے نکل کر گدھے، گتے اور خنزیر وغیرہ کی صورتوں میں جنم لے اور اسی طرح ہمیشہ ہمیشہ تک جنم لیتی رہے۔ روحوں کے اس دوامی چکر کا نام تناسخ باآواگون ہے اور قدیم مُعتقد ابان ہند اور اہل چین اور حکماء یونان کا یہی عقیدہ مشہور کیا جاتا ہے، اور ساسان اول کے نامہ کے اس جملے: رواں از تنے روزہ است مجوسیوں کا مذہب بھی یہی معلوم ہوتا ہے، چنانچہ جملہ: ۴۰، ۴۱، ۴۲ میں اس کی تصریح ہے کہ انسان، عالم میں اپنے پہلے بدن کے اعمال کا نتیجہ شادی، غمی، رنج اور خوشی دیکھتا ہے۔

تناسخ کی قسمیں | مجھ کو فی الحال اس سے بحث نہیں کہ جن لوگوں کو تناسخ کا مُعتقد بننا یا گیا ہے، وہ فی الحقیقت اس کے مُعتقد ہیں یا نہیں؟ بلکہ اس کی تحقیق منظور ہے کہ ہمارے برادرانِ وطن (آریہ سماج) جنہوں نے عقیدہ تناسخ کے منوانے میں بے بصیرت کوششیں کیں، تناسخ کے اقسام میں سے کس کس قسم کو جائز قرار دیتے ہیں؟ علامہ قطب الدین شیرازی نے شرح حکمت الاشراق میں تناسخ کی چار قسمیں

۱۔ اوج و حنیض بمعنی: بلندی و پستی ۲۔ کرم: کام، چال چلن

اس طرح بتلائی ہیں کہ اگر روح، ایک انسانی قالب کو چھوڑ کر دوسرا انسانی قالب اختیار کرے، تو اُس کو اصطلاحاً نسخ کہا جاتا ہے اور اگر انسان کے علاوہ اور کسی حیوانی قالب میں اُتر آئے، تو نسخ ہے اور نباتی قالب میں فتیح اور جمادی میں رشیخ کے ناموں سے اُس کو موسوم کیا جاتا ہے اور یونان کے بعض فلسفیوں کے نزدیک ان چاروں کے تجاوز کر کے ایک یہ بھی صورت ممکن ہے کہ روح، اجسامِ عنصریہ کو چھوڑ کر اجسامِ فلکیہ میں جا سکا ہے۔

تناسخ کے سلسلے میں تضادِ بیانیوں | بہ ہر کیف، تناسخ میں پانچ احتمال ہوں یا چار ہم کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ ہمارے ملکی دوستوں نے اُن میں سے کس احتمال کو قبول کیا ہے اور کس کو چھوڑا ہے؟ لیکن افسوس ہے کہ جب ہم اپنے دوستوں کے مسائل میں سے کسی مسئلے کے متعلق یہ منقح کرنا چاہتے ہیں کہ اُن کا واقعی مذہب اس میں کیا ہے، تو ہم کو ایک سخت لاینحل دشواری پیش آ جاتی ہے، وہ یہ کہ وید مقدس تو ہم کو کچھ بتلاتی ہے اور پنڈت سرسوتی سوامی جی ہمارا ج کچھ ارشاد فرماتے ہیں اور سوامی جی کی کتابوں پر حاشیہ لکھنے والے جو مطلب سمجھتے ہیں، وہ اُن دونوں سے الگ ہوتا ہے۔ چُنّاں چھ اسی قسم کے بعض نظائر پر عنقریب آپ اسی مضمون میں مطلع ہوں گے۔ پس ایسی حالت میں، کہ نہ سوامی جی کے مُقلدین کو سوامی جی پر اعتماد ہو اور نہ سوامی جی کو وید کی ہدایات پر، اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ ہم اپنے روئے سخن سب طرف سے پھیر کر، خاص سوامی جی کی جانب بہ حیثیت اُن کے مقتدا اُسے جماعت ہونے کے مُتوجہ ہوں اور جو کچھ نقل کریں، اُنھی کی تصنیفات سے نقل کریں!

تناسخ کی جو بحث رگ وید آدمی بھاشیہ بھومکا میں ہم نے پڑھی ہے، اُس سے گویہ فیصلہ صاف طور پر نہیں ہوتا کہ انسان کی روح، نباتات و جمادات میں کیوں کر آسکتی ہے؛ لیکن طرزِ بیان یہ بتلاتا ہے کہ سوامی کے نزدیک، روحوں کا دورِ دورہ، بہ طرہٴ استقرار، صرف حیوانی قالبوں ہی میں محدود ہے اور یہ کہ تناسخ کے اقسام میں سے نسخ و رشیخ کے سوا، نسخ و رشیخ کا وجود ممکن نہیں سوامی جی کی؟ اس تحقیق کو اگرچہ ویدک دھرم

کی وہ نصوص باطل ٹھہراتی ہیں جن سے نباتات کا ذی روح ہونا ثابت ہے، مگر بالفعل تجارتِ خصم کے طور پر ہم اپنے اقوال کی بنا صرف سوامی جی کی محسوسات ہی پر قائم کرتے ہیں اور ان سے دریافت کرتے ہیں کہ وہ تناسخ کی حقیقت کے معتقد کہاں ہوئے؟

میرے اس سوال سے جس طویل بحث کی سلسلہ جُنبانی ہوتی ہے، اگرچہ اُس پر رائے زنی کرنے کا پورا استحقاق مجھ کو نہیں، کیوں کہ میرے محترم بزرگ مولانا سید رفیع حسن صاحب جن کی تحریر کا عنوان خاص تناسخ ہی قرار دیا گیا ہے، یہ حق رکھتے ہیں کہ مجھ کو اپنی سرحد میں قدم رکھنے سے روک دیں؛ لیکن یہ خیال کر کے کہ اگر میں اس موقع پر سکوت سے کام لیتا ہوں تو میرے موضوع بحث کی تصویر کا صرف ایک ہی رخ آپ دیکھ سکیں گے، مولانا کی خدمت میں بہ ادب عرض کرتا ہوں کہ وہ مجھ کو بہت تھوڑی دیر کے لیے ادھر آنے کی اجازت دے دیں، تناسخ کے متعلق مختصر کلام شروع کرتا ہوں۔

حامیانِ تناسخ کا استدلال | حامیانِ تناسخ نے سب سے بڑا زبردست استدلال

جو تناسخ کے ثابت کرنے کے واسطے پیش کیا ہے، وہ یہ ہے کہ دُنیا میں ہم بنی آدم کے حالات کو بہت ہی مختلف پاتے ہیں، کوئی شخص امیر ہے کوئی غریب، کوئی توانا کوئی کم زور، کسی کی دو آنکھیں ہیں کسی کی ایک بھی نہیں، ایک اگر اقلیموں پر حکومت کرتا ہے تو دوسرے کا کاسہ گدائی بھی خالی ہے، وہ اگر انتظام سلطنت میں مصروف ہے تو یہ فکرِ شگم میں، غرض، جہاں تک نظر دوڑاؤ، زمانے کی نیڑگیوں کی کوئی انتہا معلوم نہیں ہوتی۔ اب اگر ان تمام اختلافات کی، جن کو ہم آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں، یہ توجیہ کی جائے کہ خدا تعالیٰ کو اپنی مخلوقات پر کامل تصرف اور قبضہ حاصل ہے اور وہ اپنی مقبوضات میں جو کچھ بھی سیاہ و سپید کرے، اُس سے کوئی باز پرس نہیں ہو سکتی؛ تو یہ ایک ایسا جواب ہوگا، جس سے خدا تعالیٰ کی صفتِ انصاف و معدلت گُتری بالکل فراموش کر دینا پڑے گی۔ کیوں کہ جب خداوند ذوالجلال، قادرِ مطلق ہونے کے

۱۰ تجارتِ خصم: فریقِ مخالف کی موافقت

ساتھ اعلیٰ درجے کا عادل اور منصف بھی تسلیم کر لیا گیا ہے، تو اس کی کیا وجہ کہ اس نے اپنے ایک بندے کو عین راحت اور ایک کو سراسر تکلیف میں پیدا کیا ہے؟

اب اس کے بعد دو ہی احتمال ہیں: یا وہ شخص، جس کو ہدف آزار بنایا گیا ہے، کچھ تقصیر وار تھا جس کی پاداش میں اس کے ساتھ ایسا برتاؤ ہوا یا خود حق تعالیٰ شانہ معاذ اللہ لطف و کرم اور عدل اور انصاف کرنا نہیں جانتا؟ دوسری صورت تو ہر وہ شخص جو خدا کی خدائی کا صحیح مفہوم سمجھے ہوئے ہو، ذرا سی دیر کے لیے بھی قبول نہیں کر سکتا اور پہلی صورت اگر درست ہے، تو اس کے ماننے کے دو طریقے ہیں: یا جن تقصیرات کی اس کو سزا دی جاتی ہے، وہ اس جوں میں اس سے صادر ہوئے ہوں اور یا اس پہلے کسی جون میں؛ پہلا احتمال اس شیرخوار بچے میں ہم کو کچھ نفع نہیں دے سکتا، جو ماں کے پیٹ سے اندھا اور بہرا پیدا ہوا ہو۔ کیا اس نے رحم مادر کے اندر ہی خدا کی کسی نافرمانی کا ارتکاب کیا تھا، جو فوراً ہی موردِ عتاب بنا؟ جب یہ نہیں، تو لامحالہ ماننا پڑے گا کہ آواگون کے طور پر جن معاصی کے اندر وہ پہلے کسی جون میں ملوث ہو چکا ہے، یہ سب اس کی سزا ہے۔ اور یہی وہ مدعا تھا، جس کو ہم ثابت کرنا چاہتے تھے۔

دلیل کے کم زور پہلو | اصحابِ تناسخ کی یہ دلیل جس کو ہم نے بہت آب و تاب کے ساتھ منطقی ترتیب میں بیان کیا ہے، اگرچہ بادی النظر

میں نہایت دقیق اور صادق التقدّمات معلوم ہوتی ہے، لیکن فی الواقع اس کے بعض پہلو نہایت ہی کم زور ہیں۔ اس دلیل کا مدار اس امر کے ثابت ہونے پر ہے کہ جُملہ تکالیف اور راجحیں، جو کسی شخص کو میسر ہو سکتی ہیں، اُن کے پہنچنے کا طریقہ بجز سزا اور جزا کے اور کچھ نہیں۔ اگر فرض کر دو کہ مکافات اور سزا ہی کے سوا کسی اور عمدہ غرض کے لیے بھی کوئی تکلیف دی جاسکتی ہو، تو ہم کو کیا ضرورت پڑی ہے کہ ہم انسان کے واسطے اس کی موجودہ زندگی سے پہلے کوئی اور موبہوم زندگی فرض کریں! کیوں کہ اس حالت

میں یہ کہ دیا جاسکے گا کہ خدا تعالیٰ عادل اور منصف اور رحمان و رحیم سب کچھ ہے اور اُسی نے کسی کو عیب دار اور کسی کو بے عیب بنایا ہے، لیکن نہ بطور کسی پچھلے کرم کی جزا اور سزا کے، بلکہ بہ سبب کسی اور ایسی عمدہ مصلحت کے، جس کا ملحوظ رکھنا نظامِ عالم کی حفاظت یا تکمیل کے واسطے ضروری تھا؛ لہذا ہم کو اور ہمارے دوستوں کو سب سے مُقَدَّم یہ طے کر لینا چاہیے کہ آیا تکلیف و راحت رسانی کے اسباب، سزا و جزا ہی میں مُنہج رہیں یا اور کوئی سبب بھی ان کے ماسوا پایا جاتا ہے؟

کیا راحت و تکلیف | اس مطلب پر بہ سہولت پہنچنے کے واسطے، میرے
جزا و سزا میں خسرت ہے؟ | نزدیک بہتر ہوگا کہ آپ اس بات پر غور کریں کہ ہم نے

راحتوں اور تکلیفوں کا مثلاً سزا و جزا کے لیے ہونا کہاں سے سمجھا؟ اگر دُنیا کے حالات کو دیکھ کر، تو میں کہہ سکتا ہوں کہ آپ نے حالات کا تتبع کرنے میں بہت کوتاہی کی کیوں کہ دُنیا میں اگر ہم نے چور کو جیل خانے میں اور قاتل کو سولی پر لٹکا ہوا دیکھا ہے، تو شفا خانے میں جا کر یہ بھی معائنہ کیا ہے کہ کہیں ڈاکٹر کسی مریض کے دُنبل میں تیز نشتر چبھور رہا ہے اور کہیں کسی کے بدن کا کوئی عضو نہایت بے رحمی کے ساتھ کاٹا جا رہا ہے، حالاں کہ اُس مریض نے ڈاکٹر صاحب کی جناب میں کوئی گستاخی نہیں کی تھی، لیکن شاید آپ نے کلور افارم کا استعمال کرتے ہوئے دیکھ کر یہ تاویل کر لی ہو کہ ڈاکٹر گوا یا ساعمل کر رہا ہے، جس سے تکلیف پہنچے، مگر کیوں کہ مریض کو اس کا احساس نہیں ہوتا، اس لیے وہ تکلیف کا لعدم ہے اور اس لیے ہم ڈاکٹر کو ظالم نہیں ٹھہرا سکتے۔ بے شک آپ کی یہ تاویل یا تلمیح ایسی لا جواب ہے کہ اگر مولوی ثناء اللہ صاحب ہوتے، تو ضرور یہ پڑھتے کہ:

سُخَن شَناسی نئی دِبرِ اخطا اینجا است

اور میں اس مصرعے کو چھوڑ کر یہ عرض کرتا ہوں کہ اگر یہ ڈاکٹر صاحب ظالم ہونے سے بچ گئے، تو کیا وہ سارے طبیب، جو اَمْتِ اس کا قَدَح، مریض کے منہ سے لگا دیتے ہیں یا وہ ڈاکٹر، جو تلخ سے تلخ دوا پلانے میں خدا کا خوف نہیں کرتے یا وہ والدین، جو ایک ننھے معصوم بچے کو بغیر کسی خطا کے کسی قصاص میاں جی کے حوالے کر دیتے ہیں، یہ سب

لوگ بھی اس کے مستحق نہیں کہ ان کو بے رحم اور ظالم ٹھہرایا جائے اور ان کی ان کارروائیوں کو نگاہِ نفرت سے دیکھا جائے؟

اور اگر اس وجہ سے ان کے ظالم کہنے میں تساہل کیا جاتا ہے کہ ان لوگوں کی یہ تکلیفِ رسانی، بغرضِ سزا و پاداش نہیں، بلکہ بہ نیتِ اصلاح و تربیت ہے؛ تو یہ کیوں ممکن نہیں کہ خدا تعالیٰ نے بھی جس کسی کو اندھایا بہر ایا گونگا وغیرہ پیدا کیا ہے، اُس میں بھی اسی طرح کی تربیت اور چارہ سازی کی رعایت ہو! خداوندِ کریم بے شک قادرِ مطلق اور عادل و منصف ہے، لیکن شانِ تربیت بھی اُس کی اتنی اعلیٰ ہے کہ اُس کا نام ہی ربُّ العالمین ہو گیا۔ اب اگر دنیا میں بعض تکالیف بہ طریقِ جزا و سزا کے اور بعض بہ طریقِ تربیت اور حفظِ ماتقدم کے خدا کی جانب سے پہنچتی ہوں، تو یہ کیوں محال ہے؟ اور پہلے ہی سے خود بہ خود یہ کیوں قرار دے دیا گیا کہ خداوندِ کریم کے سارے معاملات جو بندوں کے ساتھ ہوتے ہیں، وہ سب جزا و سزا ہی میں منحصر ہیں؟

ہمارے اس بیان پر شاید اعتراض کیا جائے کہ اگر خدا تعالیٰ نے کسی شخص کی تربیت اور اصلاح کی غرض سے اُس میں کوئی عیب اور نقصان رکھا ہے، تو کیا وہ ربُّ العالمین اس پر قادر نہ تھا کہ اُس کی اصلاح، نقصان پہنچائے بغیر ہی کر دیتا؟ تو ہم کہتے ہیں کہ بے شک قادر تھا، لیکن ممکن ہے کہ اس طریقِ تربیت میں مجموعہٗ عالم کی خوبی قائم رکھنے کے اعتبار سے کچھ اور ایسی مصالح اور حکمتیں موعی ہوں، جو دوسرے طریقوں کے اندر نہ پائے جاسکیں؛ چنانچہ ان میں سے بعض حکمتوں کی مزید تشریح ہم آگے چل کر کسی مناسب موقع پر کریں گے (فاتنظروا مُفْتَشِّہِین)۔

عہدِ اُلست پر قیاس صحیح نہیں | یہ ایک عجیب بات ہے کہ ہمارے دوستوں کے نزدیک باوجودِ یہ کہ جس قدر معائب و آلامِ انسان کو اس دنیا میں پہنچتے رہتے ہیں، وہ سب کھلی جُونوں کے اعمال کی سزا قرار دیے گئے ہیں، لیکن سزا پانے والے مجرم کو اتنی بھی اطلاع نہیں ہے کہ میں کس عمل کے بدلے میں یہ سزا پارہا ہوں! یہاں تک کہ نہ اُس کو پہلے جہنم کی کچھ خبر ہے اور نہ اُس جہنم کے اعمال ہی اُس کو یاد ہیں۔

ہمارے مہربان اس نسیان کو عہدِ اُست کے نسیان پر قیاس کر کے جواب دیتے ہیں، لیکن اُن کا یہ قیاس کسی طرح صحیح نہیں۔ کیوں کہ پچھلے جنم کے اعمال کا اس لیے یاد دلانا ضروری تھا کہ اس وقت اُس کو جن جرموں کی سزا دی جا رہی ہے، وہ اُس کو معلوم کر کے شرمائیں اور دوسرے لوگ عبرت حاصل کریں۔ یہ خلاف عہدِ اُست کے، کہ وہ ایک قسم کی تعلیم تھی، جس کا اثر ہر ایک انسان کی جذرِ فطرت میں آج تک باقی ہے۔ ایک کی تعلیم تمام خصوصیات اگر کسی شخص کو یاد نہ رہیں، لیکن جو تعلیم سے مقصود ہو، وہ حاصل ہو جائے، تو اس میں کچھ بھی مُضائقہ نہیں۔ مثلاً یہ یقینی امر ہے کہ اپنے بچپن میں جب ہم نے بولنا سیکھا تھا، تو ضرور کسی خاص شخص نے ہم کو اول اول خاص الفاظ سکھائے ہوں گے، لیکن نہ ہم کو اب سکھلانے والا یاد ہے، نہ وہ الفاظ یاد ہیں، نہ یہ یاد ہے کہ وہ کیا وقت تھا اور ہم اُس وقت کس جگہ اور کس کے پاس بیٹھے تھے الی غیر ذلک من الخصوصیات۔ البتہ اُس تعلیم کا یہ اثر ہم اپنے اندر پاتے ہیں کہ ہر طرح کی تقریر اور گفتگو کرنے پر اس وقت ہم کو قدرت حاصل ہے اور ان وقتی خصوصیات کے فراموش ہو جانے سے کچھ بھی ضرر ہم کو نہیں پہنچتا۔

یہی حال بعینہ عہدِ اُست کا ہے کہ گو ہم اس عہدِ اُست لینے کے واقعے کو بھول گئے ہوں اور اس وقت کی جملہ خصوصیات سے ہم کو ذُہول ہو گیا، لیکن خدا تعالیٰ کی رُبُوبیت کا اقرار، جو اُس تعلیم کا اثر تھا، برابر ہر ایک فطرت میں نقش فی الحجر ہو کر موجود ہے۔ پس ایسی حالت میں ہم کو واقعے کی تمام کیفیات کے محفوظ رہنے کی کیا احتیاج ہے! اس کے علاوہ عہدِ اُست کا قصہ ایک دو ساعت سے زیادہ نہیں رہا، جس کا فراموش کر دینا عقلاً مُستبعد بھی نہیں۔ یہ خلاف ہماری سابق زندگی کے، جس میں ہم سال ہا سال تک جنم لیتے رہے اور بعض بعض اعمال ہزاروں لاکھوں مرتبہ کیا کیے۔

تسلی کی ایک ”فلسفہ آمیز“ طرفہ تماشا یہ ہے کہ اس جگہ تو ہمارے دوست انسان دلیل اور اس کا جواب | کو ایسا زود فراموش اور نسیٰ الحفظ تصور کر لیتے ہیں

کہ اُس کو پہلے جہنم کی ایک بات بھی یاد نہیں رہتی، بلکہ خود وہ جہنم ہی یاد نہیں رہتا، اور دوسری طرف سوامی جی ہمارا جتنا نسخ کے ثبوت میں یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ دیکھو! ہر آدمی کو بالطبع موت سے ڈر لگتا ہے، حالانکہ خوف اُسی چیز کا ہونا چاہیے جو کبھی تجربے میں آچکی ہو، اس سے ثابت ہوا کہ ہم پہلے بھی کبھی موت کا ذائقہ چکھ چکے ہیں اور اس کی ناگوار تلخی جب ہم کو یاد آجاتی ہے، تو ہم اُس سے گھبرا اُٹھتے ہیں۔

سوامی جی ہمارا ج نے اس دلیل میں جس فلسفیت کو کام فرمایا ہے، وہ ہر آئینہ قابلِ داد تھی، اگر وہ یہ بھی خیال فرمالیتے کہ آدمی موت سے اس لیے ڈرتا ہے کہ موت اُس کی ہستی کو زائل کر دینے والی چیز ہے اور اپنی ہستی کی محبت ہر ایک شخص کے دل میں ایسی طبعی ہے جس کے واسطے سبب کے تلاش کرنے کی ضرورت نہیں، جیسا کہ اگriوں کہا جائے کہ آگ بالطبع گرم اور پانی ٹھنڈا ہے، تو یہ سوال نہیں کیا جاسکتا کہ اس سبب سے ایسا ہوا اور کیوں آگ ٹھنڈی اور پانی گرم نہ ہو گیا؟ سامعین خیال فرما سکتے ہیں کہ یہ کس قدر افسوس ناک امر ہے کہ ایک عظیم الشان مذہبی عقیدے کے ثابت کرنے کے واسطے اس طرح کی ضعیف اور پتھر دلیلوں سے امداد لی جائے، اور بالخصوص امداد لینے والا بھی اُس مذہب کا ایسا بڑا مُسلم الثبوت امام ہو!

قیاس کُن ز کلستان من بہارِ مرا

اچھے ہوا کہ ہم نے ابطالِ تناسخ میں اپنے ان مخاطبوں کے سامنے اُس بُرا ہنِ عرشی وغیرہ کی تقریر نہیں کی جس کو علامہ صدر الدین شیرازی نے اسفارِ اربعہ میں نہایت افتخار کے ساتھ بیان کیا ہے اور جس کے دقیق فلسفیانہ مُقدمات کا تحمل ہمارے ان دوستوں کے ماؤف دماغ کبھی نہیں کر سکتے تھے۔

عقیدہ برزخ پر اعتراض کا جواب | اب ہم اپنے ان دوستوں سے نہایت ادب کے ساتھ ایک اور سوال کرنا چاہتے ہیں۔ وہ یہ کہ جب آپ عذابِ قبر کے مسئلے میں اس وجہ سے ہم پر برہم ہو ا کرتے ہیں کہ خدا تعالیٰ (کوہ) ایک مذہبِ دراز تک سشن سپر کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ کیوں قیامت کا انتظار کیا جاتا ہے اور فوراً ہی سزا (کیوں)

نہیں دی جاتی؟ کیا خدا تعالیٰ کو اُس کے مجرم کی تحقیقات صحیح طور پر نہیں ہوئی؟ تو ہم تھوڑی دیر کے واسطے اسلام پر آپ کا یہ اعتراض تسلیم کیے لیتے ہیں، لیکن اب عرض یہ ہے کہ جس وقت کسی زانی نے زنا کیا، یا کسی شرابی نے شراب پی، یا اور کوئی گناہ کیا، تو تناسخ ملتے والوں کا خدا اُسی وقت اُن کو سزا کیوں نہیں دیتا اور موت کا انتظار کیوں کرتا ہے؟ اگر خدا کو ابھی تک اُس کے مجرم ہونے کا ثبوت بہم نہیں پہنچا، تو اُس کو عالم الکُل کہنا روا نہیں، اور اگر باوجود مجرم ثابت ہو جانے کے پھر سزا دینے میں سہل انگاری کی، تو آپ کے اصول کے موافق اُس کی کھلی ہوئی سُستی یا نا انصافی پر دلالت کرتا ہے، تعالیٰ اللہ عن ذلک علواً کبیراً۔

تناسخ کی غرض پوری نہیں ہوتی | الغرض، تناسخ کو مان کر یہ ساری خرابیاں سر پر رکھنی پڑتی ہیں اور پھر بھی سوامی جی مہاراج کی ایک تحریر کے موافق تناسخ کی جو غرض ہے، وہ پوری نہیں، کیوں کہ بھاشیہ بھومکا کے ص ۱۳ پر جو منتر، وید کا نقل کیا گیا ہے، اُس کا یہ ایک جملہ یہ بھی ہے کہ: ”جو جیو، پچھلے جنم میں جس قسم کے دھرم کے کام کیے ہوتا ہے، اُنھی کے مطابق اگلے جنموں میں بہت سے اعلیٰ اعلیٰ جسم حاصل کرتا ہے۔ اور اسی طرح جو پاپ کے کام کیے ہوتا ہے، وہ اگلے جنم میں انسان کا جسم نہیں پاتا، بلکہ حیوان وغیرہ کا جسم پا کر دُکھ بھوگتا ہے۔“ پس جب کہ پچھلے جنم میں بُرے کام کرنے والا حیوانسانی قالب نہیں پاسکتا، تو پھر سوامی جی مہاراج کے نزدیک اندھے بہرے انسانوں کے پیدا کرنے کی کیا توجیہ ہوگی؟ اور وہ بنی آدم کے مختلف الحالات ہونے کی اُس مشکل کو کس طرح حل کریں گے، جس کی عقدہ کشائی کے واسطے عقیدہ تناسخ اختیار کیا گیا تھا، فاعبوا بیاؤلی الأبصار۔

قَدَمِ عالم کی بحث | حضرات! یہاں تک آپ اُن دلائل میں سے اکثر کو سن چکے، اور قائلین کے دلائل جن کے سہارے ہندوستان میں تناسخ کی بنیاد قائم کی گئی ہے، اور بہ قدر حاجت یہ بھی دریافت کر چکے کہ وہ تاریک ثبوت سے زیادہ کم زور ہیں؛ اس لیے اب ہم کو مناسب تھا کہ ہم قلم کی باگ اپنے اُس مقصدِ اصلی کی طرف پھیر دیتے، جس

کے لیے ردِ تناسخ کی یہ تمہید اٹھائی گئی تھی۔ لیکن اس موقع پر شاید یہ نامناسب ہو گا کہ ہم قدیم عالم کی اُس اہم بحث کو بالکل نظر انداز کر جائیں، جو تناسخ پر گفتگو کرتے وقت لازمی طور پر پیدا ہو جاتی ہے اور جس کا سننا ہمارے سامعین کے حق میں نفع اور دل چسپی سے خالی نہیں ہے۔

اصل یہ ہے کہ مُبکرینِ تناسخ کی جانب سے تناسخ کے رد میں یہ سوال کیا گیا کہ انسان کے موجودہ جنم کے مختلف احوال اگرچہ سابق جنم کے افعال و اعمال کے نتائج ہیں، لیکن اس کی کیا ضمانت ہے کہ بنی نوع انسان کی ارواح تمام جنموں سے پہلے جنم میں، جبکہ کہ دُنیا کی پیدائش کی ابتدا ہوتی ہے، مختلف حالات نہیں رکھتی تھیں؟ اگر رکھتی تھیں، تو اس اختلاف کو کس جنم کے اعمال کا نتیجہ قرار دیا جائے گا؟ اور اگر اول جنم میں یہ اختلاف نہ تھا کہ سب روحوں ایک کیفیت اور وضع پر تھیں، تو لازم آتا ہے کہ دنیا میں کوئی جان پر بھی انسان کے سوا موجود نہ ہو اور کارخانہ عالم درہم و برہم ہو جائے!

اس کا جواب قائلینِ تناسخ نے یہ دیا کہ ہمارے نزدیک عالم کا سلسلہ قدیم ہے۔ ہم جیسا کہ خدا تعالیٰ کو قدیم مانتے ہیں، ایسے ہی عالم کے مادہ اور ارواح اور اُن کے سلسلہ ترکیبی کو بھی قدیم کہتے ہیں۔ بے شک عالم کی یہ موجودہ صورت پہلے موجود نہ تھی، لیکن اس سے پہلے عالم کسی دوسری شکل و صورت میں موجود تھا اور اُس سے پہلے کسی اور میں، وہلَمَّ جَزْأً، غرض، صورِ عالم کا یہ تسلسل ہمیشہ سے یوں ہی بدلتا ہوا چلا آتا ہے اور یوں ہی ہمیشہ تک چلتا رہے گا، نہ اس کی کہیں ابتدا ہے نہ انتہا۔ ایسی حالت میں ہم سے یہ سوال کرنا ہی بے کار ہے کہ تم سب سے پہلے جنم میں روحوں کی کیا کیفیت تسلیم کرتے ہو؟ کیوں کہ ہم کوئی ایسا جنم مانتے ہی نہیں، جس کو سب سے پہلا جنم کہا جائے، پھر اُس کی کوئی کیفیت ہم کیا بتلا سکتے ہیں؟

باقی رہا یہ کہ عالم کو قدیم کہنے کا ہمارے پاس کیا ثبوت ہے، تو اس کے جواب میں ہم کو اتنا کہ دنیا کفایت کرے گا کہ ہم نے دنیا میں کسی چیز کو محض نیست سے ہست ہوتے نہیں دیکھا، یعنی جو چیز بھی ہم بنتے ہوئے دیکھتے ہیں، تو اُس کے لیے پہلے سے علت مادی

کو موجود پاتے ہیں؛ تو یہ کیسے ممکن ہے کہ اتنا بڑا کارخانہ عالم بغیر کسی مادہ سابقہ کے محض عدم سے وجود میں آجائے؟

ادھر یہ کہ خدا تعالیٰ مع جملہ اپنی صفات کے قدیم بالذات ہے اور اُس کی صفات قدیمہ میں سے بعض وہ بھی ہیں کہ جن کا وجود، مخلوقات کے پائے جانے پر موقوف ہے، اب اگر مخلوقات کو حادث کہیں، تو خدا کی صفات کمالیہ کا حدوث ثابت ہوتا ہے۔ اور اگر صفات کو قدیم مانیں، تو اُن کی قدامت سے مخلوقات کی قدامت لازم آتی ہے، مثلاً خالقیت اور رزاقیت (یعنی پیدا کرنے اور رزق پہنچانے) کی صفت خدا کے اندر جب ہی مانی جاسکتی ہے، جب کہ کوئی مخلوق اور مرزوق بھی موجود ہو، یعنی خدا کو ہم پیدا کرنے والا اور رزق پہنچانے والا جب کہہ سکیں گے، جب کہ ایسی چیزیں بھی موجود ہوں، جن کو پیدا کیا گیا اور رزق، یا گیا ہے۔ اور اگر ایسی اشیا ہمیشہ سے موجود نہ تھیں اور خدا کی خالقیت اور رزاقیت کی صفت موجود تھی، تو کہنا چاہیے کہ ایک اضافت بغیر اپنے حاشیتین کے پائی گئی، جو بالبداهت محال ہے۔ ان وجوہات سے اعتراف کرنا پڑا کہ جب سے خدا اور اُس کی صفات ہیں، اُسی وقت سے سلسلہ کائنات بھی برابر چلا آتا ہے اور چوں کہ ہر ازلی چیز ابدی بھی ضرور ہوتی ہے، اس لیے جیسا کہ خدا کے وجود کی کوئی انتہا نہیں، ایسے ہی کائنات کی بھی کوئی انتہا نہیں۔

اور قطع نظر ان تمام باتوں سے، ہم فلسفیانہ طور پر دریافت کرتے ہیں کہ اگر عالم حادث ہے، تو اُس کی علت تامہ (جو ہر حادث کے واسطے ہونی ضرور ہے) قدیم ہے یا حادث؟ اگر حادث ہے، تو پھر اُس کی علت حادث ہے یا کیا؟ اگر وہ بھی حادث ہے، تو اسی طرح سلسلہ حوادث کا سلسلہ لامتناہی تعداد میں چلا جائے گا اور عالم کا قدم مع تبدیل صور ثابت ہو جائے گا، جو ہمارا عین مدعا تھا۔ اور اگر آپ عالم کی علت تامہ کو یا اُس علت تامہ کی علت تامہ کو یا اور اوپر جا کر کسی علت تامہ کو قدیم ملتے ہیں، تو چوں کہ معلول کی جدائی اپنی علت تامہ سے ممکن نہیں، اس لیے اُس کی قدامت سے تمام معلولات کی درجہ بہ درجہ قدامت لازم آئے گی اور لوٹ پھیر کر وہی ہمارا ادعواے قدامت پھر آ موجود ہوگا:

برہر کے دائرے ہی میں رکھتا ہوں میں قدم

آئی کہاں سے گردش پر کار پاؤں سے

مذکورہ دلائل کا تجزیہ | یہ ہیں وہ پرزور دلائل، جو ہمارے دوستوں کو عالم کے قدیم ماننے پر مجبور کر سکتے ہیں اور ان میں سے آخری دلیل، گو اپنے دوستوں کی کتابوں میں ہم نے نہیں دیکھی، لیکن محض بہ راہ تائید وہم دردی ہم نے اُس کو مجتہد الاسلام امام غزالی کی کتاب: تہافت الفلاسفہ سے نقل کر کے اپنے احباب کو مدد پہنچائی ہے۔ خدا کرے کہ وہ ہماری اس اعانت سے خوش ہوں اور جب خوش ہوں، تو اس محنت کے صلے میں ہمارے جوابات کو بھی بہ نظر تعمق و انصاف ملاحظہ فرمائیں۔

ہم کو ان دلائل کی مختصر جانچ کرنے سے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ آیا واقعی مذہب ہمارے ملکی بھائیوں کا اس مسئلے میں کیا ہے؟ اور جو روش انھوں نے اپنے مذہب کے متعلق فی الحال اختیار کی ہے، وہ کہاں تک وید کے مطابق ہے؟ مگر جب ہم اس بحث کو چھیڑتے ہیں، تو وہی افسوس ناک تعارض وید اور اہل وید کے کلاموں میں ہم کو پھر نظر آتا ہے، جس کے دکھلانے کا ہم پہلے ایک موقع پر وعدہ کر چکے ہیں، جو کہ اب ایفاء کیا جائے گا۔

تحفہ آریہ سماج کا مُصنّف، جو اعلیٰ درجے کا سنسکرت داں ہے اور جس کی کتاب عرصہ ہوا بڑے زور شور اور متحدی کے ساتھ شائع ہو چکی ہے، پیدایش عالم کے مضمون میں صفحہ ۲ پر اوّل رِگ وید کا ساتواں منتر نقل کرتا ہے جس کا ترجمہ لفظی یہ ہے:

”تب نہ است (نیستی) تھی، نہ ست (ہستی) تھی، نہ پرمانو یعنی ذرہ تھا، نہ وہ تھا جو بڑا آکاش ہے“ اس کے بعد لکھتا ہے کہ اب سوانی جی تفسیر پر (جو بھاشیہ بھومکا میں اس منتر کی گئی ہے) متوجہ ہو جیے، دھو ہذا: ”اُس وقت ست (پر کرتی) یعنی کائنات کی غیر محسوس علت، جس کو ست کہتے ہیں، وہ بھی نہ تھی اور نہ پرمانو تھے۔“

ناظرین غور فرمائیں کہ جب وید منتر میں لفظ ”ست نہ تھا“ موجود ہے اور ”ست (ہستی)“ سے ”پر کرتی“ کا مطلب لے کر خود سوامی جی ہی، باوجود لفظوں کا میر پھر کرنے لے سہوا یہ لفظ چھوٹ گیا ہے

کے بھی، آخر چارونا چار مان رہے ہیں کہ اُس وقت ”پر کرتی“، بھی نہ تھی اور نہ ہی مانو یعنی ذرے بھی نہ تھے، یعنی اُن کی نیستی تھی؛ تو سمجھ میں نہیں آتا کہ پھر سوامی جی مہاراج نے ”پر کرتی“ (مادہ) کو ہمیشہ قائم رہنے والا کس طرح مان لیا؟ یہاں تو وہ صاف مان رہے ہیں کہ اُس وقت ”پر کرتی“، بھی نہ تھی اور ذرے بھی نہ تھے۔

اور اگر سوال کیا جائے کہ جب کہ ذرہ وغیرہ کچھ بھی تھا ہی نہیں، تو یہ سب بعد میں کس سے پیدا ہوا؟ تو کیا اس کا یہی جواب کہ نیستی سے ہستی میں آیا؟ چنانچہ یہ بات اسلامی اصولوں کے موافق ہے۔ پس گویا ویدوں سے اور خاص کر انھی منتروں سے، جو سوامی پیدائش عالم کے بیان میں پیش کر رہے ہیں، اسلام کی یہ بات ثابت ہو رہی ہے کہ خدا نے اس تمام خلقت کو اپنی قدرت ہستی میں ظاہر کیا۔ یہاں پر بابو نہال سنگھ، مترجم رگ وید آدمی بھاشیہ بھومکا کو بھی کھٹکا ہوا اور انھوں نے ایک نوٹ دیا ہے، جو حسب ذیل ہے:

”پہلے میں جو مادے کی حالت ہوتی ہے، وہ بیان میں نہیں آسکتی؛ اس لیے کوئی اصطلاح بھی قائم نہیں ہو سکتی۔ پر کرتی، آکاش، شونیہ (خلا)؛ تمام الفاظ موجودہ حالتِ عالم میں مستعمل ہو سکتے ہیں۔ منوسرتی ادھیائے درک اول، اشوک: ۵ میں اس حالت کو ناقابلِ احساس و تمیز بے (الکشن) بتلایا ہے۔ اس ابتدائی حالتِ مادہ کو اس منتر میں لفظِ سامرتھ (قدرت) سے بیان کیا ہے، یہ لفظ اس حالت کے ناقابلِ بیان ہونے کی وجہ سے صرف اشارے کے طور پر ہے۔“

ناظرین اس آخری فقرے کو غور سے پڑھیں، سوامی دیانند سرسوتی جی مہاراج سے جو کچھ کہی رہ گئی تھی، وہ اب اُن کے اتباع پوری کر رہے ہیں، جب کہ سوامی جی کو یہ ماننا ہی پڑا کہ ”پر کرتی“، بھی نہ تھی اور ذرہ بھی نہ تھا۔ اور اب جب کہ مترجم صاحب نے دیکھا کہ پر کرتی کی قدامت اڑی جاتی ہے، تو اوپر کا نوٹ لکھ کر چاہتے ہیں کہ یہ یوں کھلنے نہ پائے۔

ہم پوچھتے ہیں کہ لفظِ سامرتھ (قدرت) سے ابتدائی حالتِ مادہ کی کیوں کر

مانی جاسکتی ہے، سمرقہ کے معنی ہیں طاقت (یا کدورت) کے، اور طاقت ہمیشہ طاقت ور میں رہا کرتی ہے؛ پس پریشور کی طاقت (سمرقہ) ہر حالت میں اس سے علاحدہ بہ ذاتِ خود کوئی شے نہیں ہے، چنانچہ اس قدر جاں فشانی کرنے پر بھی ”پر کرتی“ کی قدامت نہ ثابت ہوئی۔ (انتہی باختصار)

اعجاز القرآن

افادات

حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ
ترتیب و تحقیق: خالد القاسمی

معجزہ کیا ہے؟ معجزہ کا ظہور کیسے اور کن حالات
و شرائط کیساتھ کیسی، مستیوں کے ذریعہ ظہور
پذیر ہوتا ہے، قرآن خدا کا کلام ہے اور وہ
زبان و بیان اور مضامین کے اعتبار سے ایک
معجزہ ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ
ظاہر ہوا، اس کی مفصل و مدلل بحث،

منتظم اشاعت

ناشر

دارالعلوم حیدرآباد۔ اے۔ پی۔ © دارالمؤلفین دیوبند۔ یو پی
۲۳۴۵۵۴

باهتمام، وحید الزماں قاسمی کیرانوی
مقدمہ دار المولفین دیوبند

طبع اول ۱۴۱۳ھ ۱۹۹۲ء قیمت اعجاز القرآن ۱۵/-

فہرست مضامین، اعجاز القرآن

نمبر شمار	مضامین	صفحہ	نمبر شمار	مضامین	صفحہ
۱	مقدمہ	۲۶۸	۱۵	عربی نہ جانتے والے کس طرح قرآن	۳۱۹
۲	اصل اول	۲۷۱	-	کی فصاحت پہچان سکتے ہیں	-
۳	اصل دوم	۲۷۳	۱۶	خدائی کام سے توحید اور خدائی	-
۴	عادت عامہ و خاصہ	۲۷۸	۳۲۳	کلام سے رسالت کا ثبوت	-
۵	معجزہ خدا کا فعل ہے	۲۸۵	۳۲۵	نزول قرآن کے وقت نبی کی	-
۶	خدا کی پہچان	۲۸۱	-	کیفیت	-
۷	معجزہ کوئی فن نہیں	۲۸۳	۱۸	قرآن کا اثر سامعین پر	۳۲۷
۸	معجزہ میں دعوتِ نبوت	۲۸۹	۱۹	جناب رسول اللہ کی قوت	۳۳۱
۹	کی شرط کیوں؟	-	-	اخلاقی و عقلی	-
۱۰	وحی کی تعریف اور ضرورت	۲۹۲	۲۰	قرآن کریم کی حفاظت	۳۳۳
۱۱	وحی کی طرف احتیاج فطری ہے	۲۹۳	۲۱	قرآن کریم کی تعلیم	۳۳۴
۱۲	قرآن اور اس کی جامعیت	۳۰۰	۲۲	قرآن کریم کی بے نظیر سلاست	۳۳۶
۱۳	نبی امی اور اس کا اعجاز	۳۰۱	-	وروانی	۳۳۹
۱۴	قرآن کس طرح لوگوں کو عاجز کیا۔	۳۰۶	۲۳	قرآن میں غیبی خبریں۔	۳۴۱
۱۵	خدائی کلام سے خدائی شان	۳۱۸	-	-	-
۱۶	ٹپکتی ہے	-	-	-	-

(مقدمہ)

الحمدُ للّٰہِ وکفی و سلامٌ علیٰ عبادہ الذی اصطفیٰ

اما بعد،

زمانے کے حالات اس وقت مُقتضی ہوئے کہ دارالعلوم دیوبند کے طلبہ کے سامنے ایسی تفاریر کا سلسلہ شروع کیا جائے جن میں اسلام کے عام اصول و قواعد کی تحقیق اور قرآن کریم کی حکیمانہ تعلیم اور اُس کی عظمتِ شان ظاہر کرنے والی حقائق زیادہ سے زیادہ واضح، معقول اور دل نشیں پیرایے میں بیان کی جائیں اور طلبہ کی ایک جماعت کو اس قابل بنایا جائے کہ وہ یہاں سے جا کر اپنے نادانانہ یا کم علم بھائیوں کے ایمان کی حفاظت اور مُنکَرین یا مُشکَلِکین پر خدا کی مُجْت تمام کر سکیں۔

اسی نیت سے، اس ناچیز نے چند روز ہوئے کہ ایک سلسلہ بیانات کا شروع کیا اور جوں کہ کچھ عرصے سے آریوٹس کے شور و غوغا نے ملکی سطح میں تلاطم اور اسلامی حلقوں میں حمایتِ حق کا ہیجان پیدا کر رکھا ہے، اس لیے ان بیانات میں خصوصیت سے آریہ سماج کے اُصول و خیالات مرعیٰ کر رہے ہیں۔

تمام مباحث سے پہلے میں نے مناسب خیال کیا کہ قرآن کریم کے اعجاز اور کلامِ الہی ہونے کے متعلق ایک مبسوط اور مُفصّل تقریر کر دی جائے جس کے بعد ایک انصاف پرست اور طالبِ حق کے لیے یہ گنجائش باقی نہ رہے کہ وہ قرآن کریم کی عظمت و جلالت سے انکار کر سکے، یا اُس کی روشنی کے قبول کرنے سے رُود گردانی کرے۔

۱۔ ہندو مذہب کا ایک فرقہ جو تنازع کا قائل ہے ۲۵ مرعی: ملحوظ، پیش نظر

اس بحث کے ضمن میں اور بھی کئی مفید اور اہم بحثیں آگئی ہیں اور ایسا ہونا ناگزیر تھا۔ اعجاز قرآن کی تحقیق اُسی وقت حتمی ہو سکتی تھی کہ اول اعجاز کی بحث ہو، یعنی یہ کہ معجزہ کیا چیز ہے؟ اُس کی ضرورت کیا ہے؟ اُس کا وجود، فطرت (یا نیچر) کے خلاف تو نہیں؟ وہ دلیل نبوت کس طرح بن جاتا ہے؟ اور معجزہ جیسے فعلی ہوتا ہے، قولی بھی ہوتا ہے؟ پھر یہ بتلانا ہوگا کہ وحی کیا چیز ہے؟ اُس کی ضرورت بندوں کو کیا ہے؟ اُس میں تدریج ہو سکتی ہے یا نہیں؟ قرآن، جسے ہم آخری وحی الہی اور کلام ربانی مانتے ہیں، اُس کو ہم معجزہ کیوں کہتے ہیں اور کس طرح کلام الہی اور وحی ربانی ماننے پر مجبور ہوئے ہیں؟

غرض، یہ مضمون جب اپنے نزدیک مکمل ہو گیا اور بہ قدر کفایت اُس کے سب اُطراف و جَوَانِب روشنی میں آ گئے، تو بعض اُجاب کی قلم بندگی ہوئی یادداشتوں کو خاک سارنے ایک رسالے کی صورت میں مرتب کر دیا، تاکہ غائبین کے حق میں بھی اس کا نفع عام ہو اور مضمون چھپ کر ضیاع سے محفوظ ہو جائے۔ آئندہ بھی اگر خدا نے توفیق دی، تو یہی صورت اختیار کی جائے گی۔

جن لوگوں کو ان رُسائل کے مطالعے کا اتفاق ہو، اُن سے میری یہ درخواست ہے کہ وہ رسالے کو ایک تقریر کی صورت میں دیکھیں اور مہربانی فرما کر اول سے آخر تک پڑھ جائیں؛ کیوں کہ مضمون کا پورا لطف اور فائدہ اس کے بغیر حاصل نہ ہوگا۔ بعض مضامین، جو بہت ہی خشک فلسفیانہ ہوتے ہیں، خواہ اُن کو کتنا ہی سہل عبارت میں ادا کیا جائے، لیکن عام لوگوں کو اُن کے پڑھنے میں پوری دل چسپی نہیں ہو سکتی۔ ایسے معرکہ الآراء مسائل کی تحقیق میں، ناظرین کو اس طرح کے بعض مضامین سے اکتانا نہیں چاہیے، بلکہ مؤلف کو اُن کے ترک نہ کر سکنے میں معذور خیال کیجیے اور ہمت کر کے پوری کتاب کو پڑھ جائیے، آخر لکھنے والے کی محنت سے تو پڑھنے والے کی محنت زیادہ نہ ہوگی! یہی مضمون (اعجاز القرآن) جو آپ کے سامنے ہے، اہل علم اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس

کا ابتدائی حصہ کس قدر ضروری ہے، جو کسی طرح حذف نہیں کیا جاسکتا تھا، اور یہ کہ اس میں کتنے اہم اور مشکل مسائل کو حل کیا گیا۔

چوں کہ اس رسالے کا موضوع بحث اعجاز القرآن ہے، اس لیے اولاً مجھے چند ایسے اصول مبادی کے طور پر بیان کرنا ضروری ہیں، جو قرآن کی عظمت اور اس کے اعجاز کے سمجھنے میں مدد دینے والے ہوں، لہذا وہ اگرچہ آپ کے نزدیک فی المحال اصل بحث سے بے تعلق ہوں، مگر میں مٹھی سے اپنی تقریر کا آغاز کرتا ہوں، وبالله ولی التوفیق۔

اصلِ اوّل

”کیوں“ کا سوال کہیں نہ کہیں ختم کرنا ضروری ہے

مُکَوَّنَات (سب جگت) میں جو واقعات و حوادث پیش آتے ہیں، ہر چیز پر یہ سوال کر سکتے ہیں کہ یہ کیوں ہوا؟ مگر ہر شخص کو ناچار ایک جگہ پہنچ کر یہ سوال ختم کرنا پڑے گا۔ تشریح: مثلاً لکڑی آگ میں ڈال دی اور آگ نے اُس کو جلادیا، تو سوال ہو سکتا ہے کہ آگ نے اُس کو کیوں جلادیا؟ پانی آگ پر بہایا اور وہ بجھ گئی، تو سوال ہو سکتا ہے کہ پانی نے آگ کو کیوں بجھادیا؟ کسی نے زہر کھایا اور مر گیا، تو سوال ہو سکتا ہے کہ زہر نے اُس کو کیوں مارا؟ آم کے درخت پر صرف آم ہی کیوں لگتا ہے؟ یہ سوالات وہاں بھی پیدا ہو سکتے ہیں، جہاں آثار کا صدور ارادہ اور اختیار کے توسط سے نہ ہو، جیسے: آگ کا جلانا، زہر کا مار ڈالنا، آم کے درخت پر صرف آم ہی کا لگنا، آگ اور آم کے درخت اور زہر کے اختیار سے باہر ہے۔ لیکن اگر کہیں توسط ارادہ و اختیار بھی ہو، تو وہاں یہ سوال اور بھی زیادہ واضح ہو جاتا ہے، جیسے: کوئی کافر اسلام لے آئے یا مسلمان مُرتد ہو جائے (العباد باللہ منہ)؛ تو سوال کر سکتے ہیں کہ اس نے ایسا کیوں کیا؟

غرض کہ ہر چیز ”کیوں“ (سوال) کے تحت میں آ سکتی ہے، مگر دیکھنا یہ ہے کہ کیا کہیں ”کیوں“ کا سلسلہ بند بھی ہوتا ہے یا نہیں! آؤ، ہم اس کی تفتیش کسی مُلحد اور مادّہ پرست کو سامنے رکھ کر کریں۔ مثلاً ایک شخص طاعون کی بیماری سے فوت ہوا، تو ہم دریافت کرتے

ہیں کہ طاعون کیوں ہوا؟ جواب یہی ملے گا کہ زیرِ پے جراثیم کے پھیلنے سے، ہم پھر دریافت کریں گے کہ جراثیم کیوں پھیلے؟ کہا جائے گا کہ آب و ہوا کی خرابی سے، آب و ہوا کیوں خراب ہوئی؟ بس، ابھی ایک یاد دہانہ ”کیوں“ کا جواب دے کر ”کیوں“ کا سلسلہ بند ہو جائے گا۔

اور سنیے! آگ کیوں جلاتی ہے؟ اس لیے کہ اُس میں حرارتِ مفرطہ ہے، حرارتِ مفرطہ آگ میں کیوں ہے؟ آگے ”کیوں“ کا سلسلہ بند ہو گیا اور انگریز ساری دنیا کے فلاسفہ جمع ہو جائیں، تو اس سے آگے ”کیوں“ کا جواب نہیں دے سکتے۔ جو لوگ فاعلِ مختار کو چھوڑ کر صرف مادہ کے قائل ہو گئے ہیں، اُن سے اور بھی دو ایک باتیں دریافت کرو: جن اجزائے مادہ سے آفتاب بن گیا، اُن سے چاند کیوں نہیں بنا؟ جن ذرات سے چاند مُتکون ہوا، اُن سے بجائے چاند کے، سورج کا ٹکڑن کیوں نہیں ہوا؟ جن مواد سے تاروں کی کڑوی اشکال ہستیاں موجود ہوئیں، اُن مواد سے سنگ ریزے کیوں نہیں بن گئے؟ جن اجزائے پاؤں کے تلوے بنائے گئے، اُن سے سر کی کھوپڑی کیوں نہ بنی؟ باقی کی روح میں جو طاقت ہے کہ وہ بڑی بڑی قوی چیزوں کو متسل ڈالتا ہے، وہ چیونٹی کی روح میں کیوں نہ آئی؟ اور چیونٹی کی روح جو ذرا سے اشارے سے صفحہ ہستی سے رخصت ہو جاتی ہے، اس قدر کم زور کیوں واقع ہوئی؟ شیر کی روح نے اس قدر ٹوٹ کیوں پانی کہ وہ بڑے بڑے عظیم الجثہ حیوانات کو چیر بھاڑ کر اُن کے پرچھے اڑا دیتا ہے؟ مقناطیس صرف لوہے کو کیوں کھینچتا ہے، گھاس کے تنکوں کو کیوں نہیں کھینچتا؟ لوہا اس قدر بھاری اور رُودنی اس قدر ہلکی کیوں ہے؟ وقس علیٰ هذا۔ غرض کہ ارواح کی قوتوں اور مادہ کی استعدادوں اور خواص میں اس قدر تفاوت کیوں ہے؟ انھی چند مثالوں سے واضح ہو گیا کہ ہر چیز کی علت اور سبب کی تلاش اور ”کیوں“ کے جواب کا سلسلہ کوئی ہستی، خواہ وہ خدا پرست ہو یا مادہ پرست ملحد ہو یا مؤجد زیادہ دوزخ جاری نہیں رکھ سکتی، بلکہ کسی نہ کسی درجے پر یہ سلسلہ طوعاً و کرہاً خواہ مخواہ بند

۱۰ بہت زیادہ حرارت سے ٹکڑن: بنا سے کڑوی اشکال: گیند میسا گول

کرنا پڑے گا۔ اور بند کرنے میں ملحد اور موجد دونوں برابر ہیں، البتہ فرق اگر ہے، تو بند کرنے کے طریقے میں ہے۔ مادہ پرست سوالاتِ مذکورہ کے جواب میں کہے گا کہ مادہ میں جیسی استعداد تھی، ویسی صورت قبول کر لی۔ جب یہ سوال کر دے کہ مادہ میں استعداد کیوں مختلف تھی؟ جواب یہ دیں گے کہ آگے سوال نہیں ہو سکتا۔ آم وغیرہ کے سوال میں یہ سنو گے کہ اُس کی صورت نوعیہ کا اقتضایہ ہے۔ اسی طرح سنکھیا کا ٹھلک ہونا بھی اُس کی صورتِ نوعیہ پر منحصر ہے۔ دیکھو، بڑے بڑے دہریہ، جب وہ ہیولیٹی کی استعداد اور مادہ کی قابلیت اور صورتِ نوعیہ کے اقتضار پر پہنچے، تو آگے بڑھنے سے اُن کی بلند پروازی رُک گئی، اسی طرح موجد کا حال ہے کہ وہ بھی ایک خاص حد پر پہنچ کر اپنی پرواز کو ختم کر دیتا ہے۔ ”کیوں“ کے بند کرنے میں ملحد اور موجد میں فرق | البتہ اتنا فرق ہے کہ ملحد سے جب سوالات کر دے، تو وہ مادہ، صورتِ نوعیہ، رُوح کے خواص پر سوالات ختم کرے گا اور موجد کہے گا کہ جو چیزیں جن خواص و آثار کے ساتھ موجود ہیں، اللہ جلّ جلالہ کے علمِ ازلی محیط میں اُن کا اُسی طرح ہونا مناسب تھا۔

اگر مادہ پرست کہے کہ اللہ کے علمِ محیط میں یہی کیوں مناسب تھا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جب تم نے مادہ کی استعداد کے سامنے سر جھکا دیا، تو اس میں کیا عیب ہے کہ ہم خدا تعالیٰ کے علم کے سامنے سر جھکائیں! اگر تم صورتِ نوعیہ اور رُوح و مادہ کے سامنے سجدہ کر کے اور عاجز ہو کر، سوالات کے سلسلے کو بند کرنے کا حق رکھتے ہو، تو ایک موجد کو کون روک سکتا ہے کہ وہ اپنے پیما نہ فہم کو تنگ اور قوتِ ادراک کو علمِ الہی کے رُوبہ رُوح و ناچیز سمجھ کر، اُس خداے قدّوس و برتر کے سامنے سجدہ کرے جس کو زمین و آسمان کی ہر چیز سجدہ کرتی ہے! جہاں تم نے سوال کا سلسلہ ختم کر دیا رُوح کی قوت اور مادے کی استعداد پر وہاں

۱۷ حوالہ کرنا ۱۸ اصل ہیئت اصل مادہ
۱۹ مادہ: ہر چیز کی اصل جس نے اس کی تخلیق کی ہو

میں کہوں گا کہ اس کو منتہی کر دے اللہ جلّ جلالہ کے علم محیط ازلی پر۔ جس طرح مادہ اور روح کے خواص کو تم ازلی کہتے ہو، جس میں ارادہ اور اختیار کو کوئی دخل نہیں؛ اسی طرح خیال کر لو کہ اللہ تعالیٰ کا محیط علم بھی ہمارے نزدیک بلکہ تمام اہلِ بطل کے نزدیک ازلی ہے، خدا کو یہ اختیار نہیں کہ وہ علم کو ایک منٹ کے لیے اپنے سے جدا کر کے جاہل رہ جائے (معاذ اللہ)۔ خلاصہ یہ کہ خدا یہ اختیار نہیں رکھتا کہ وہ اپنے کو خدا نہ رہنے دے۔

وَاِنَّ اِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰی ۝
لَا يُسْأَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ
يُسْأَلُونَ ۝ النجم آیت ۴۲
وَمَا اَوْتِیْتُمْ مِنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا ۝ انبیاء
سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَا اِلَّا مَا
عَلَّمْتَنَا، اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ
الْحَكِیْمُ ۝ بقرہ آیت ۲۲۔

اور ہر چیز کی انتہا تیرے رب کی طرف ہے۔
اُس کے کاموں کی نسبت سوال نہیں کیا جاسکتا۔
ہاں، بندوں سے باز پرس ہو سکتی ہے۔
اور تم کو صرف ایک ذرا سا علم دیا گیا ہے۔
پاک ہے تو (اے پروردگار) جس قدر تو نے بتلادیا
اس کے سوا ہم کچھ نہیں جانتے۔ بے شک تو ہی
ہے جانتے والا اور حکمت والا۔

وفی الحدیث الصحیح :

فَلِیْنْتَه وَلِیْسْتَغْذُ بِاللّٰهِ۔
(جب خدا تک سوال کا سلسلہ پہنچ جائے) تو چاہیے
کہ آدمی رُک جائے اور اللہ کی پناہ ڈھونڈے۔

اصل دوم

قُدْرَت اور عادت میں فرق، عادت کے مراتب، خرق عادت کی حقیقت

جو لوگ خدا کی ہستی اور اُس کے وجود کے قائل ہیں، ناچار اُن کو تسلیم کرنا پڑا ہے کہ اللہ کی ایک قُدْرَت ہے اور ایک ارادہ اور ایک اُس کی عادت ہے، اور یہ تینوں ایک دوسرے سے الگ الگ ہیں۔ قُدْرَت اور عادت میں بسا اوقات التباس ہو جاتا ہے مثلاً عام طور پر ایسے امور کے متعلق، جو سلسلہٴ اسباب و مُسَبَّبَات کے خلاف واقع ہوں، کہ دیا

جاتا ہے کہ یہ امر قانونِ قدرت کے خلاف ہے اور اہل الحاد اسی بہانے سے بہت سے صحیح مسائل کو ماننے سے انکار کر دیتے ہیں۔ حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ یہ کہنا ہی غلط ہے کہ یہ امر قانونِ قدرت کے خلاف ہے۔ یہ لوگ اس لفظ کا غلط استعمال کرتے ہیں۔

اس وقت میرا رُوئے سخن دہریوں کی طرف نہیں، بلکہ آریوں کی طرف ہے اور آریہ بھی قانونِ قدرت کا لفظ بہت استعمال کیا کرتے ہیں۔ لیکن خود بھی پر میثور کو ”سروشکتیمان“ (قادرِ مطلق) مانتے ہیں، جیسا کہ ہم خدا کو قادرِ مطلق مانتے ہیں۔ پس اگر وہ واقعی ”سروشکتیمان“ اور قادرِ مطلق ہے، تو اُس کی قدرت میں یقیناً یہ داخل ہے کہ سبب کو بدونِ مسبب کے اور مسبب کو بدونِ سبب کے پیدا کر دے۔ مثلاً آگ موجود ہو مگر نہ جلاوے، یا کوئی چیز جل جاوے مگر آگ موجود نہ ہو۔

یا مثلاً ہم قادرِ مطلق کی عادت یہ دیکھتے ہیں کہ بچہ عورت کے رحم سے نکلتا ہے اور پھر بہ تدریج نشو و نما پاتا ہے چنانچہ کسی نے نہیں دیکھا ہو گا کہ کوئی جوان انسان آسمان سے اُترا ہو یا زمین اُگ آیا ہو، مگر اس عادتِ مستمرہ کے خلاف، ماں کے رحم اور لطفے کے توسط کے بدون، انسان کو پیدا کرنا بھی اس ”سروشکتیمان“ کی قدرت میں داخل ہے۔

کیوں کہ اُن کا مذہب یہ ہے کہ لیل و نہار کی طرح یہ عالم بھی فنا ہو کر پیدا ہوتا رہتا ہے اور جیسے رات کے بعد دن اور دن کے بعد رات آتی ہے، اسی طرح عالم کا سلسلہ فنا و بقا یکے بعد دیگرے جاری ہے۔ اور عالم کے فنا کے زمانے کو وہ ”پرے“ کا زمانہ کہتے ہیں اور اُس وقت میں اُن کے خیال کے موافق سارا عالم فنا ہو جاتا ہے اور سب کچھ مٹ مٹا کر خدا کی ذات میں سما جاتا ہے اور جیسا کہ رگ وید میں تصریح ہے، صرف ”پر برہم کی سامرٹھ“ (یعنی خدا کی قدرت) باقی رہ جاتی ہے، باقی سب کچھ نیست و نابود ہو جاتا ہے۔ ایک مدتِ دراز تک اسی طرح عالمِ فنا میں پڑا رہتا ہے، اُس کے بعد نئے سرے سے پھر پیدا ہوتا ہے۔

اب دُنیا کا جو دور چل رہا ہے، اُس کا حساب سوامی دیانندنے نہ معلوم کس ہی کھاتے سے لگا کر یہ کہا ہے کہ ”ایک ارب چھیانوے کروڑ کچھ لاکھ کچھ ہزار برس سے یہ دُنیا موجود“

اس سے پہلے غیر متناہی مرتبہ دُنیا مٹی اور پیدا ہوتی چلی آئی ہے اور موجودہ دُور بھی اپنے وقت پر، جب خدا چاہے گا، فنا ہو جائے گا۔“
 اس عقیدے کا رد اس وقت مقصود نہیں، بلکہ میں یہ کہتا ہوں کہ جب دُنیا ”پرے“ کے بعد نئے سرے سے پیدا ہوتی ہے، تو مختلف مخلوقات خصوصاً انسان کہاں سے آتے ہیں؟ سوامی دیانند لکھتے ہیں کہ: ”پرے کے بعد جو انسان پیدا ہوتے ہیں، اُن کی پیدائش کی کیفیت متعارف طریقے سے بالکل علاحدہ ہے۔ یعنی ہزاروں انسان بغیر ماں باپ کے جو اُن، محض خدا کی قدرت اور اس کے ارادے سے بدُون متعارف سلسلہ اسباب طبعیہ کے، بن جاتے ہیں۔“

اب جو مذہب یہ کہتا ہے، وہ مذہب قطعاً حق نہیں رکھتا کہ وہ اس کے بعد ”سروِ شکیمان“ کو اس ظاہری سلسلہ اسباب میں ایسا جکڑ بند کر دے کہ خواہ کیسی ہی حکمت و مصلحت کا اقدنا ہو، مگر وہ ایک منٹ کے لیے ان اسباب کے سلسلے سے الگ ہو کر کوئی چھوٹے سے چھوٹا کام کرنے سے بھی مجبور اور عاجز ٹھہرے۔

جب اُن کے اعتراف کے موافق ”پرے“ کے بعد اس عادتِ مستمرہ کے برخلاف غیر متناہی دفعہ ایسا ہو چکا ہے اور ہوتا رہے گا، تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جو خدا اب سے ایک ارب سال پہلے ”پرے“ کے بعد قادر تھا کہ بدُون ماں باپ کے انسان کو پیدا اور بدُون اسباب کے مسببات کو موجود کر دے، اب اُس کی قدرت کو کس چیز نے سلب کر لیا کہ ایک یا دو ارب سال کے بعد ایسا نہ کر سکے!

معلوم ہوا کہ خرقِ عادت یعنی کبھی کبھی سلسلہ اسباب سے علاحدہ ہو کر محض وسیع قدرت کے اظہار کے طور پر کام کرنا اُس کی قدرت کے خلاف نہیں۔ ہاں، عام عادت اور معمولات کے خلاف ہوگا۔ لہذا اس کو قانونِ عادت کے خلاف کہنا صحیح ہو تو ہو، مگر قانونِ قدرت کے خلاف قرار دینا، اس لفظ کا غلط استعمال اور مخالطہ دینے والی تعبیر ہے۔

مثلاً اہل اسلام کے عقیدے کے موافق ابراہیم خلیل اللہ کو آگ میں ڈالا گیا اور وہ نہ جلے، تو خدا کی اُس عام عادت کے تو خلاف ہوا جو آگ کے متعلق ہے کہ وہ جلانے کا سبب

ہے، لیکن قدرت کے خلاف نہ ہوگا، جس نے ہی اُس میں خاصہ احراق و دلیعت کیا ہے۔
 آریوں کے چار رشیوں کے علاوہ کسی اور سے خدا کا ہم کلام | آریہ کہتے ہیں کہ ہر د پرلے کے
 ہونا قدرت کے خلاف نہیں، البتہ عادت کے خلاف ہے۔ بعد چار ویدوں کا الہام چار
 معین اشخاص پر ہوتا ہے، جن کے نام بھی لکھے ہیں: وایو، اگنی، انگرا، ارتیہ، کہا جاتا ہے
 کہ یہ چار رشی ہیں۔ گو تاریخ ایسے ممتاز انسانوں کا پتا نہیں دیتی اور نہ ان کی کوئی سوانح
 بتلا سکتی ہے۔ بلکہ ان کو چار انسان بتانا بھی سو امی دیا تہ کی کوشش کا نتیجہ ہے جو اُنھی
 کے دائرہ اثر تک محدود ہے۔ دوسرے بڑے بڑے فرقے ہنود کے، اس کی تشریح دوسری
 طرح پر کرتے ہیں۔ تاہم مجھے اس وقت اس سے بحث نہیں۔ مجھے تو یہ کہنا ہے کہ آریہ مہلج کے
 نزدیک ہر ”پرلے“ کے بعد اپنی چار رشیوں پر چار ویدوں کا الہام جگت کی ابتدا میں ہوتا
 ہے۔ بعد میں کوئی کتاب کسی پر نہیں اُترتی اور ہر ”پرلے“ کے بعد وہی چار وید اُترتے
 ہیں جو پہلے اُتر چکے ہیں، ان میں بھی تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔

میں کہتا ہوں کہ حق تعالیٰ اپنی چار رشیوں سے ابتداء آفرینش میں کلام کرتا ہے اور
 کسی سے نہیں کرتا۔ گویا خدا کا بندوں سے ہم کلام ہونا اُس کی عام عادت نہیں بلکہ خاص عادت
 ہے، جو خاص زمانے میں مخصوص بندوں کی نسبت ظاہر ہوتی ہے، حالاں کہ خدا اس سے
 مجبور اور عاجز نہیں کہ اگر وہ چاہے تو کسی اور سے بھی کسی وقت کلام کرے۔

تو مجھے اس وقت یہ کہنا ہے کہ خود آریوں کے اصول کے موافق بھی دو چیزیں الگ
 الگ ہیں: ایک قدرت اور ایک عادت، اور یہ کہ عادت کے خلاف کوئی کام کرنا بھی
 قدرت سے خارج نہیں ہے۔ پس اسباب سے مسبب کا پیدا کرنا خدا کی عادت ہے اور
 بلا سبب کے مسبب بنادینا قدرت کا کام ہے۔ اسباب کا سارا سلسلہ قدرت کا بنایا ہوا
 ہے، نہ یہ کہ قدرت اسباب کی بنائی ہوئی ہے۔ اور اس لیے قدرت تو اسباب پر حاکم
 ہوگی، لیکن اسباب معاذ اللہ قدرت کے پاؤں میں کوئی زنجیر نہیں ڈال سکتے۔ قرآن کریم

نے بھی قدرت اور عادت میں فرق کیا ہے:

ولو شاء الله ما اقتتلوا، ولكن الله يفعل ما يريدہ۔ بقرہ آیت ۲۵۲
یہ تو اللہ کی قدرت اور ارادے کا تفاوت ہوا، اب عادت کا بیان سنئے، فرماتے

ہیں:

فطرة الله التي فطر الناس عليها

لا تبديل لخلق الله۔ روم۔ ۳۰۔

ولن تجد لسنة الله تبديلاً۔

ولن تجد لسنة الله تحويلاً۔

سنة الله التي قد خلت

في عباده۔ سورہ فاطر آیت ۲۳۔

یہی فطرت (نہج) ہے، جس پر خدا نے لوگوں کو پیدا کیا، خدا کے (قانون) پیدائش کو کوئی بدل نہیں سکتا خدا کی عادت میں تم ہرگز کوئی تبدیلی و تغیر نہ پاؤ گے۔

یہ خدا کی عادت ہے، جو اپنے بندوں کے متعلق پہلے سے چلی آتی ہے۔

یہ غیر متبدل سنت اللہ عادت اللہ ہے۔ پس معلوم ہوا کہ عادت اور قدرت میں فرق ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ کوئی شخص ہمیشہ عمامہ باندھنے کا عادی ہے، یا کوئی ہمیشہ چاول کھاتا ہے، یہ تو اس کی عادت ہوگی، مگر باوجود اس کے بھی وہ ٹوپی اوڑھنے یا روٹی کھانے پر قادر ہے، اسی کا نام قدرت ہے۔ ہر انسان اپنے اندر اس بات کو پاتا ہے، مثلاً لڑکا اپنے ناتواں باپ کو مار سکتا ہے، (یہ اس کی قدرت ہے)، مگر نہیں مارتا، یہ اس کی عادت ہے۔

عادت عامہ و خاصہ | ہاں، عادت میں بھی تفصیل ہے۔ ایک عادت عام، غیر موقت اور مستمر ہوتی ہے۔ اسی عادت سے ہر خاص و عام واقف ہو جاتا ہے۔ اسی کو نقل کیا جاتا ہے۔ مثلاً ایک طالب علم مدرسے میں داخل ہوا اور اساتذہ کی عام عادت دیکھی، تو وہ یہاں سے جا کر اسی عادت کو نقل کرے گا جو مدت قیام میں روزمرہ مشاہدہ کرتا رہا ہے۔ دوسری عادت موقت یعنی خاص وقت کے ساتھ مخصوص ہوتی ہے، اس کو عادت خاصہ کہنا چاہیے۔ مثلاً کوئی ہمیشہ روٹی کھاتا ہے، مگر عید کے روز ہمیشہ چاول کھایا کرتا ہے۔ پس جس شخص نے اس کو عید کے روز چاول کھاتے نہ دیکھا ہو، وہ کہے گا

کہ چاول کھانا اُس کی عادت نہیں، مگر جس نے دس بیس مرتبہ عید کی عادت بھی دیکھی ہے، وہ کہے گا کہ روٹی کی طرح چاول کھانا بھی اُس کی عادت میں داخل ہے۔ ایک عام مُستبر عادت تھی، دوسری خاص مُوَقَّت؛ دونوں اپنے اپنے خیال اور تجربے کے مُوافِق درست کہتے ہیں، مگر دوسرے کا کہنا مطابق واقعہ ہے۔ اس لیے کہ اُس کو اُس شخص کے تمام رُملے پر نظر ہے۔ وہ جیسا عادتِ عامہ سے واقف ہے، ویسا ہی عادتِ خاصہ سے بھی آگاہ ہے۔

یاد رکھو! جس کا نام ہم مُعْجَزہ رکھتے ہیں، وہ بھی ایک فعل اللہ تعالیٰ کا ہے جو اُس کی عام عادت کے گو خلاف ہو، مگر عادتِ خاصہ کے خلاف نہیں ہوتا۔ بلکہ اُس کے مُطابق اور مُوافِق ہوتا ہے۔ کیوں کہ خاص خاص اوقات اور خاص خاص مصلحتوں کے وقت، عام عادت کے تَوَسُّط کو چھوڑ کر محض قُدْرَت سے خوارق اور مُعْجَزات کا ظاہر کرنا، یہ بھی اللہ تعالیٰ کی خاص عادت ہے۔ مثلاً ایک آدمی کو ہم نہایت مُتَحَلِّل مزاج، حَلِیْمُ الطَّبِیع سمجھتے ہیں کہ ہزار گالیاں سُننے پر بھی غُصّہ نہیں آتا، مگر اُس کی طبیعت میں یہ بھی ہے کہ مذہب پر اگر کوئی حملہ کر دے، تو باوجود اس قدر بُر بُر باری کے غُصّے سے بے تاب ہو کر آپے سے باہر ہو جاتا ہے۔ کیا یہ اُس کی عادت نہیں سمجھی جائے گی؟

اللہ تعالیٰ کی عام عادت ہے کہ اَسْبَاب سے مُسَبَّبات کو پیدا کرتا ہے، لیکن یہ بھی اُس کی عادت ہے کہ جب اپنے مُقَرَّرین (انبیاء کرام) کی تصدیق کرانا ہوتی ہے، تو اُن کے ہاتھوں پر وہ علامات ظاہر کرتا ہے، جس سے لوگ سمجھیں کہ بے شک یہ اُس کے مُقَرَّرین اور مُعْتَمِد خاص ہیں، جن کے دعو کی تصدیق کے لیے وہ خلافِ معمول چیزیں پیش کر کے ساری مخلوقات کو اُس کے مثل لانے سے عاجز کر دیتا ہے۔ اور یہی ہونا بھی چاہیے۔ عقل اور فطرت کا اقتضا بھی یہی ہے کہ خدا اپنے خاص بندوں کے ساتھ وہ معاملہ کرے، جو دوسروں سے نہ کرے۔ کیا ایک گاؤں کے نگھیا یا نمبردار کے کہنے سے دائرے وہ کام کر سکتا ہے، جو کہ ایک صوبے کے گورنر کے کہنے سے کرتا ہے؟ ماں، باپ، بیوی، احباب، اقارب، حُکام، رعایا، غرض ہر ایک کے ساتھ انسان کا معاملہ اور اُس کی عادت جُدا گانہ ہوتی ہے، جو ثابت کرتی ہے کہ یہ حاکم ہے، یہ محکوم ہے اور یہ باپ ہے، یہ لاڈلا بیٹا ہے۔ بسا اوقات

جو بے تکلفی یا خلاف طبع امور کا تحمل آدمی اپنے مخلصوں اور دوستوں کی رعایت سے کر لیتا ہے، وہ ہرگز ساری دنیا کے دباؤ سے نہیں کر سکتا۔ ایک اُستاد کا خاص خاص شاگردوں کے ساتھ جو معاملہ ہوتا ہے، وہ تمام طلبہ سے مستثنیٰ ہوتا ہے؛ ان سب چیزوں میں عام عادت سے علاحدہ معاملہ کرنا ہی قزین قیاس اور عقل و فطرت کے موافق ہے، تاکہ قریب کا قریب اور بعید کا بعید ہونا لوگوں پر واضح ہو جائے۔ اس امر کو ملحوظ رکھ کر میں یہ کہتا ہوں کہ مُعجزہ فطرت کا مقتضا ہے۔ اُس کے مُخالف کیوں کر ہو سکتا ہے؟ بلکہ اگر مُعجزات ظاہر نہ ہوں تو یہ حکمت کے خلاف ہوگا، سفاہت ہوگی:

گر فرق مراتب نہ کنی ز ندیقی !

جو لوگ خدا کے یہاں وجیہ ہیں، اپنی جان، اپنی آبرو، مستقبل پر رکھ کر خدا کے لیے کھڑے ہوتے ہیں اور خدا ہی اُن سے یہ دعا کرتا ہے کہ آج تمہاری سب کی نجات میرے اتباع میں منحصر ہے، ضروری ہے کہ اُن کی وجہ سے عام عادت سے ہالا ترکارنے خدا کی قدرت کے ظاہر ہوں، جو کہ تمام دنیا کو اپنی نظیر پیش کرنے سے تھکا دیں اور تمام مخلوق کو عاجز کر دیں۔ یہی معنی ہیں مُعجزہ کے۔ یاد رکھیے کہ مُعجزہ خدا کا فعل ہوتا ہے، اُس کو نبی کا فعل سمجھنا سخت غلطی ہے۔

مُعجزہ خدا کا فعل ہے | مُعجزہ، قانونِ عادتِ عامہ کے خلاف اور عادتِ خاصہ کے موافق اللہ کا ایک فعل ہے، جو کہ تمام مخلوق کو تھکا دینے اور عاجز کر دینے والا ہوتا ہے، ناکہ اللہ تعالیٰ سچے مدعی نبوت کا وہ رتبہ تمام جہاں پر واضح کر دے، جو کہ اُس کے یہاں اُس کو حاصل ہے، اور یہی حکمت کا اقتضا بھی ہے۔ کیا میں اپنے بیٹے کے ساتھ جو عادت برتوں گا، وہی ایک عام آدمی کے ساتھ کروں گا؟ نہیں! بلکہ جیسے تعلقات ہوتے ہیں، ویسا ہی معاملہ ہوتا ہے۔ پس ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ بھی جن کا جیسا تعلق ہو، ویسا ہی اُدھر سے معاملہ اور برتاؤ بھی ہو۔ یہی مُعجزہ کی حقیقت ہے، جس سے آج کل کے مادہ پرستوں کو

۱۷ وجیہ: صاحب جاہ یعنی خدا کے ہاں بلند رتبہ و عالی مقام

اس قدر گھبرانے اور وحشت کھانے کی ضرورت نہیں۔

ہم نے خدا کو اُس کے کاموں سے پہچانا ہے۔ اس کے بعد ہمیں سوچنا چاہیے کہ وہ کیا چیز ہے جس نے ہم کو خدا کے ماننے پر مجبور کیا؟

(جواب) سو یہ بات ظاہر ہے کہ جب ہم ٹکونات میں مختلف افعال و آثار دیکھتے ہیں، تو بعض اُن میں سے ایسے ہیں جن کو ہم کسی سبب کی طرف منسوب کر سکتے ہیں۔ مثلاً بیمار نے دوا پی، اچھا ہو گیا، یہ صحت یابی دوا کی طرف منسوب ہو گئی۔ چھت گری اور اس کے نیچے کوئی دَب کر مر گیا، بجلی گری اور کوئی شخص جل گیا۔ اور بعض ایسے ہیں جن کو کسی سبب کی طرف منسوب نہیں کر سکتے۔ جیسے کسی پر بجلی گری، مگر نہیں مَرا یا چھت گری، مگر وہ زندہ نکلا، اس قسم کے واقعات کو کسی سبب کی طرف مَحْوَل نہیں کرتے بلکہ کہتے ہیں کہ محض خدا کی قدرت سے ایسا ہوا۔ کیوں کہ یہاں بہ ظاہر اسباب کا سلسلہ اس واقعے کے مخالف تھا۔

چاند سورج کو گھن لگتا ہے، اُس کا سبب بیان کیا جاتا ہے۔ بارش برسی ہے، اُس کا سبب بیان کرتے ہیں۔ لیکن اسباب کا سلسلہ ضرور کہیں نہ کہیں مجبوراً بند کیا جاتا ہے اور وہاں پہنچ کر اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ یہ چیزیں قدرتی ہیں غرض، قدرتی چیزیں وہ کہلاتی ہیں، جن کا بنانا تمام مخلوق کی قدرت سے باہر ہو اور جس کو دیکھ کر لامحالہ ایک قادرِ مطلق کا اقرار کرنا پڑتا ہے۔ اسی یہ حق تعالیٰ نے ایسی اشیا کے وجود سے اپنے وجود پر استدلال فرمایا ہے۔ قرآن عزیز میں فرماتے ہیں:

بَلَا شَبْهَ آسَمَانُوكَ اَدْرِزْمِنْ كَپِيَا اَكْرَنَ مِي
اَوْرَاَتِ دِنِ كَ اَدْلُ بَدَلِ مِي، اَوْرَ جَاوَزِ
مِي، جَوَلُوكُوكَ كَ فَاَدَهْ كِي چِيْزِي (مَالِ تِجَارَتِ وَغِيْرَهْ)
سَمْدَرُو مِي لَ كَر چَلْتِي يَسْ اَوْرِ مِيْنَهْ مِي جَوَالَلَهْ
آسَمَانِ سَ بَر سَا نَا پَهْرُ اُسْ كَ ذَرِيْعَ سَ زَمِيْنِ
لَو اُسْ كَ مَرَّ يَحْيَ دَوْبَارَهْ زَنْدَهْ كَر تَا هَ، اَوْرِ

اِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ
الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَ النَّهَارِ
وَ الْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي
الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَ مَا
اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ مَّاءٍ
فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا

وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ
وَتَصْرِيفِ الرِّيحِ وَالسَّحَابِ
الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ
لَا يَتَّبِعُ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ .
سورہ بقرہ ۱۶۲

ہر قسم کے جانوروں میں، جو خدا نے روئے زمین پر پھیلارکھے ہیں، اور ہواؤں کے (ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر) پھرنے میں اور بادلوں میں، جو خدا کے حکم سے آسمان و زمین کے درمیان گھرے رہتے ہیں۔ (غرض ان سب چیزوں میں) اُن لوگوں کے لیے جو عقل رکھتے ہیں، بہت سی نشانیاں موجود ہیں

آسمان اور جو سیارات اُس میں ہیں جیسے چاند اور سورج وغیرہ، اُن سب کا وجود قدرتی ہے۔ اُن کی پیدائش کو کسی مخلوق کا فعل نہیں کہہ سکتے، کیوں کہ دنیا کی کوئی طاقت اُس کے مثل بنانے کا حوصلہ نہیں کر سکتی۔ زمین ہے کہ جس سے ہر قسم کی غذائیں اور رنگ بہ رنگ کے پھول پھل نکلتے ہیں، کسی کی طاقت نہیں کہ ایک ٹکڑا اُس جیسی زمین کا بنادے۔ سورج ایک معین اور مضبوط نظام کے ماتحت ہمیشہ دن کو نکلتا ہے، شام کو غروب ہو جاتا ہے۔ کس کی کیا طاقت ہے کہ اُس کو ایک منٹ یا ایک سکند کے لیے روک لے! ہوا ہے کہ اُس پر کسی کا قابو نہیں، انسان چاہتا ہے کہ کچھ چلے مگر پُر واپلتی ہے، سارا جہان بل کر پانچ منٹ کے لیے بھی کچھ چلا سکتا۔ پانی سے بھرے ہوئے بادل کڑکتے اور گر جتے ہوئے نکل جاتے ہیں، مگر کسی کو اختیار نہیں کہ بارش حاصل کر سکے۔ زمین و آسمان کے درمیان بادل ٹسکا ہوا ہے، کسی کی طاقت نہیں کہ دو قطرے لے سکے اور جب برستا ہے، تو کسی کی قدرت نہیں کہ روک سکے۔

جب ان امور کو انسان دیکھتا ہے اور عاجز ہو جاتا ہے، تو قدرت کو ماننا پڑتا ہے۔ طوفان خیز سمندر میں جہازوں کا چلنا، ہواؤں کا اُدل بدل، یہ سب کسی کے قبضے میں نہیں

اور سورج ہے کہ چلا جا رہا ہے اپنے ٹھکانے کی طرف، یہ اندازہ ہے زبردست حکیم کا باندھنا۔ اور چاند ہے کہ مقرر کردی ہم نے اُس کی منزلیں یہاں تک کہ پھر لوٹ کر رہ جاتا ہے کھجور کی پڑانی

وَالشَّمْسُ تَجْرِي لِمُسْتَقَرٍّ لَهَا
ذَلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ
وَالْقَمَرَ قَدَرْنَا مَنَازِلَ حَتَّىٰ
عَادَ كَالْعُرْجُونِ الْقَدِيمِ

لَا الشَّمْسُ يَنْبَغِي لَهَا أَنْ
تُذِرَكَ الْقَمَرَ وَلَا اللَّيْلُ سَابِقَ
النَّهَارِ وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ
يَسْبَحُونَ . (سورہ بقرہ آیت ۲۸-۲۹)

پُرانی ہنسی کی طرح، نہ تو سورج کو یہ لائق ہے
کہ وہ جا بکڑے چاند کو اور نہ رات (کی مجال ہے)
کہ وہ آجائے دن (ختم ہونے) سے پہلے۔ اور ہر
ستارہ پڑا اپنے مدار میں گردش کر رہا ہے

یہ سب اس لیے ذکر کیا گیا کہ آپ سمجھ لیں کہ خدائی کام اور انسانی کاموں میں
کس طرح تمیز ہوتی ہے۔ خدائی کام وہ کہلاتا ہے کہ اُس جیسا کرنے سے سب مخلوق
عاجز ہو۔ ازل وابد کے انسانوں کو بلاؤ، لیکن کوئی نہ کر سکے یہی استدلال ابراہیم
علیہ السلام نے بھی کیا تھا۔ پہلے حیات اور فطرت کے متعلق سوال کیا، جب اُس میں
مُخَاطَب (نمرود) کی غباوت دیکھی، تو فرمایا: إِنَّ اللَّهَ يَأْتِي بِالشَّمْسِ مِنَ
الْمَشْرِقِ فَأَتَتْ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ، فَبُهِتَ الَّذِي كَفَرَ۔ میرا رب ایک قاعدے سے، ایک
ضابطے سے شمس کو چلاتا ہے۔ خدائی کام وہ کہلاتا ہے کہ دنیا میں اس کا مقابلہ کوئی طاقت
نہ کر سکے۔

خدائی کام کی طرح خدائی کلام کو بھی سمجھنا چاہیے | ٹھیک اسی طرح خدائی کلام وہ
ہے کہ ساری دُنیا اُس جیسا کلام بنانے سے عاجز اور در ماندہ ہو۔ ساری دنیا کو لکھا
جائے، غیرتیں دلائی جائیں، مقابلے کے لیے کھڑا کیا جائے اور لوگ چاہیں کہ کسی طرح
یہ روشنی سمجھ جائے، مگر پھر بھی ویسا کلام بنا کر نہ لاسکیں، تو ہم سمجھیں گے کہ یہ خدا کا کلام ہے۔
خلاصہ یہ ہے کہ جس طرح خدائی کاموں کو بندوں کے کاموں سے الگ کر کے
پہچان سکتے ہیں، کیوں کہ ان دونوں میں بہت فرق ہوتا ہے۔ گلاب خدا کا بنایا
ہوا ہے، اب تم بھی کاغذ کے پھول بناتے ہو، مگر جب تمہارے پھول پر پانی کا ایک چھینٹا
پڑ جاتا ہے، تو آپ کی صنعت کا سارا پول کھل جاتا ہے۔ لیکن قدرتی پھول پر پانی
گرتا ہے، تو اُس میں اور زیادہ صفائی اور تازگی محسوس ہوتی ہے۔

معجزہ کوئی فن نہیں | بلاشبہ خدائی کام اور بندوں کے کام میں نمایاں امتیاز ہوتا
ہے۔ خدائی کام کی نقل بندہ اتارتا ہے، لیکن عاقل کو کبھی التباس بھی نہیں ہو سکتا۔

انسان جان داروں، درختوں، پھولوں کی تصویر کھینچ لیتا ہے؛ مگر ایک مچھلی کی آنکھ، ایک مکھی کا پر، ایک مچھر کی ٹانگ بلکہ ایک جو کا دانہ تمام عالم ل کر بھی نہیں بنا سکتا۔ لاکھوں مجتہدے، کروڑوں بیل بوٹے دنیا کے صنّاع بناتے ہیں، مگر مچھر کا پر بنانے سے بالکل عاجز ہیں:

لَنْ يَخْلُقُوا ذُبَابًا وَلَوْ اجْتَمَعُوا لَهُ (حج ۷۲) کبھی نہیں ہو سکتا کہ وہ پیدا کر لیں ایک مکھی کو
إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَحْي أَنْ يَضْرِبَ اگرچہ وہ سب اس کام کے لیے اکٹھے ہو جائیں۔
مَثَلًا مَا بَعُوضَةً فَمَا فوقَهَا (بقرہ آیت ۲۶) اللہ مجبوت نہیں ہوتا اس سے کہ بیان کرے
مثال مچھر کی اور اس سے بھی زیادہ کم تر اور حقیر چیز کی

اسی کا نام خدائی فعل ہے۔ اور جب ایسا فعل بدون اُن اسباب کے، جو اُس کے نگوئن کے لیے متعارف ہیں، کسی مدّعی نبوت کے ہاتھوں پر ظاہر ہو، تو اسی کا نام معجزہ ہو جاتا ہے، خواہ وہ جس افعال سے ہو یا جس اقوال سے۔

اور جب کہ یہ ثابت ہو کہ معجزہ اللہ تعالیٰ کا فعل ہے، جو بدون تعاطی اسباب کے ظہور پذیر ہوتا ہے، دوسرے خدائی کاموں کی طرح اُس میں کسی صانع کی صفت کو دخل نہیں ہو سکے گا پس تنجیم، کہانت، مسمریزم، سحر، شعبدہ کی طرح معجزہ کوئی فن نہیں ہے جو کہ تعلیم و تعلم سے حاصل ہوتا ہو۔ یہ فنون سیکھنے سکھانے سے حاصل ہو سکتے ہیں لیکن معجزہ میں نہ تعلیم و تعلم ہے، نہ انبیا کا کچھ اختیار اُس میں چلتا ہے۔ نہ معجزہ صادر کرنے کا کوئی خاص ضابطہ اور قاعدہ اُن کو معلوم ہے کہ جب چاہیں ویسا ہی عمل کر کے ویسا ہی معجزہ دکھلا دیا کریں بلکہ جس طرح ہم قلم لے کر لکھتے ہیں اور یہ ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ قلم لکھتا ہے اور فی الحقیقت اُس کو لکھنے میں کوئی اختیار نہیں ہوتا یہی صورت معجزہ کی بھی ہے۔ ایسا نہیں

۱۔ کاری کر ۲۔ معجزہ ۳۔ یعنی اسباب اختیار کیے بغیر ۴۔ تنجیم: ستارہ شناسی، علم نجوم، کہانت: فال گوئی ۵۔ معجزہ: نام ۶۔ مسمریزم: وہ علم جس میں تصور یا خیال کا اثر دوسرے پر ڈال کر اس سے پوشیدہ اور آئندہ حالات معلوم کیے جاتے ہیں۔

کہ انبیاء جس وقت چاہیں، مثلاً انگلیوں سے پانی کے چشمے جاری کر سکیں۔ بلکہ جس وقت اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ مقتضی ہوتی ہے، تو جاری ہو سکتے ہیں۔ برخلاف اُن فنون کے، جو تعلیم و تعلم سے حاصل کیے جاتے ہیں۔ اُن میں جس وقت چاہیں، قواعد مقررہ اور خاص خاص اعمال کی پابندی سے یکساں نتائج اور ایک ہی طرح کے آثار و کیفیات دکھائے جاسکتے ہیں۔ مگر آج تک مدعیان نبوت و اعجاز کی طرف سے کوئی درس گاہ معجزہ سیکھنے سکھانے کی نہ بنی، نہ کوئی قاعدہ اور ضابطہ مُہمّد ہوا، نہ کوئی کتاب تبجیم، رسم ریزم، سحر کی طرح معجزات سکھانے والی تصنیف کی گئی۔

بلکہ وہ خدا کا فعل ہے، جو سب کو تھکا دیتا ہے۔ اگر وہ فعل ہے، تو اُس جیسے فعل سے دُنیا عاجز ہے اور اگر اقوال میں سے ہے، تو اُس جیسے کلام کو تمام دنیا کے بولنے والے مجبور اور در ماندہ ہیں، رسول کے اختیار یا قدرت کو بھی اُس میں کوئی دخل نہیں۔ اسی واسطے انبیاء سے جب معجزات طلب کیے گئے، تو اُنہوں نے اللہ پر مُحوّل کیا۔ فرماتے ہیں:

اور وہ تم سے کہتے ہیں کہ ہم اُس وقت تک تم پر ایمان لانے والے ہیں نہیں، کہ یا تو ہمارے لیے زمین سے کوئی چشمہ بہا نکالو، یا مجھوروں اور انگوروں کا تمہارا کوئی باغ ہو اور اس کے بیج میں تم بہت سی نہریں جاری کر دکھاؤ، یا جیسا تمہارا خیال ہے، آسمان کے ٹکڑے ہم پر لا کر آؤ اور خدا اور فرشتوں کو ہمارے سامنے لا کھڑا کر دو، یا رہنے کے لیے تمہارا طلائی گھر ہو، یا آسمان پر چڑھ جاؤ اور جب تک تم وہاں سے ایک کتاب اُتار کر نہ لاؤ کہ ہم اس کو پڑھ بھی لیں، ہم تمہارے چڑھنے کو بھی باور کرنے والے

وَقَالُوا لَنْ نُؤْمِنَ لَكَ حَتَّى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْأَرْضِ يَنْبُوعًا أَوْ تَكُونَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيلٍ وَعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْأَنْهَارَ خِلَالَهَا تَفْجِيرًا أَوْ تُسْقِطَ لِسَاءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسْفًا أَوْ تَأْتِيَ بَالِدًا مِنَ الْمُنْذَكَةِ قَبِيلًا أَوْ يَكُونَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرَفٍ أَوْ تَرْقَى فِي السَّمَاءِ وَلَنْ نُؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتَّى تُنْزِلَ

۱۰ یعنی بنایا گیا

عَلَيْنَا كِتَابًا نَقْرُوهُ ۖ ط
قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ
كُنْتُ بِآلَاءِ رَبِّىْ رَسُوْلًا ۝

(بنی اسرائیل آیت ۹۰-۹۳)

نہیں کہ دوداے محمد صلعم! میں رسول تو ہوں، مگر
بشر رسول ہوں، خدا نہیں ہوں (یعنی معجزہ تو بشر کا فعل
نہیں ہے، خدا کا فعل ہے، میرے قبضے میں یہ نہیں کہ
جو تم چاہو تمہیں دے دوں؛ بلکہ جس قدر خدا میری
تصدیق کی علامات کے طور پر کافی اور مناسب جانتا
ہے، ظاہر کرتا ہے۔

معجزہ کچھ ایسے حالات کے ساتھ آتا ہے کہ اُس میں شبہ کی گنجائش نہ رہے

اور وہ اثر دھابن گیا۔ اُس کا جواب دینے کے لیے فرعون نے بڑے بڑے ساحروں کو
جمع کیا اور وہ بھی موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے میں اپنی لاثیمیاں اور رستیاں لے کر پہنچ
گئے۔ وہ سمجھے ہوئے تھے کہ موسیٰ بھی ہمارے ہم پیشہ ہیں، اسی لیے کہا: اِمَّا اَنْ تُلْقٰى
وَمَا اَنْ تَكُوْنَ نَحْنُ الْمُلْقٰى۔ تم پہلے ڈالو گے یا ہم؟ مگر موسیٰ علیہ السلام نے
فرمایا کہ تم بھٹکو۔ جب انھوں نے اپنی لاثیمیاں اور رستیاں بھینکیں اور وہ جلتے ہوئے
سانپ نظر آنے لگے، تو: (فَاَوْجَسَ فِيْ نَفْسِهٖ خِيفَةً مُّوسٰى) موسیٰ نے اپنے دل
میں ڈرے، حالانکہ اگر وہ بھی پیشہ ور ساحر ہوتے، تو ڈر کی کوئی وجہ نہ تھی۔

شیخ اکبرؒ فرماتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر یہ خوف کیوں طاری ہوا اور
کیوں طاری کیا گیا؟ یعنی خوف کا منشا کیا تھا اور اُس کے طاری کیے جانے میں حکمت
کیا تھی؟ اگر یہ کہا جائے کہ سانپوں کی صورت دیکھ کر ڈر گئے، تو موسیٰ جیسے پیغمبر کو
ان لاثیموں سے کوئی خوف نہیں ہو سکتا تھا۔ خصوصاً جب کہ اُسی نوعیت کے اعلیٰ خوارق
کا تجربہ بھی دومرتبہ کر چکے تھے۔ پہاڑ پر جو واقعہ اتفاقاً عصا کا ہوا تھا، اُس پر لاثیم
سُن چکے تھے، کیوں کہ وہاں بھی خائف ہوئے تھے۔ وَلٰى مُدْبِرًا وَلَمْ يُعَقِّبْ
اور اللہ نے دیں خوف اور ڈر نکال دیا تھا۔ لَا تَخَفْ ۚ اِنِّىْ لَا يَخَفُ لَدٰى
الْمُرْسَلُوْنَ۔ اے موسیٰ! ڈر و مت! یہاں انبیاءؑ ڈرا نہیں کرتے پھر دوسری مرتبہ
لے اعرف آیت ۱۱۵ لے ظہ آیت ۶۷ لے النمل آیت ۱۰

فرعون کے سامنے بھی لاٹھی ڈال کر دیکھ چکے تھے۔

شیخؒ فرماتے ہیں کہ پہلی دفعہ پہاڑ پر بشری خوف تھا، جو کہ وہیں نکل چکا تھا۔ اب جو دوسری دفعہ طاری ہوا، یہ اس وجہ سے ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام جانتے تھے کہ میرے ہاتھ میں کوئی طاقت نہیں، کوئی قدرت نہیں، کہیں ساحرین کی اس شعبہ بازی کے سامنے حق کا کلمہ پست نہ ہو جائے اور بے وقوف لوگ فتنے میں نہ پڑ جائیں۔ چنانچہ جواب میں ارشاد ہوا:

لَا تَخَفْ إِنَّكَ أَنْتَ الْأَعْلَىٰ ۖ ۶۸

یہ تو خوف کا غشا تھا۔ اب اُس کی حکمت فرماتے ہیں کہ جب ڈر گئے اور ڈرے ہوئے آدمی پر خوف اور گھبراہٹ کے جو آثار ہوٹا ہوتے ہیں، اُن کو محسوس کر کے ساحرین سمجھ کہ یہ ہمارے پیشے کا آدمی ہرگز نہیں، یا کم از کم اس کو کوئی ایسا ساحر نہ عمل معلوم نہیں، جس سے ہمارے مقابلے میں قلب کو مطمئن رکھ سکے، اب جو موسیٰ نے اپنا عصا ڈالا جو باذن اللہ اُن تمام جادو کے سانپوں کو ننگل گئے، تو ساحرین نے یقین کر لیا کہ یہ سحر سے بالاتر کوئی اور حقیقت ہے۔ وہ سب بے اختیار سجدے میں گر پڑے اور جلا اٹھے کہ ہم بھی موسیٰ اور ہارون کے پروردگار پر ایمان لاتے ہیں۔ فرعون نے بہت کچھ دھکیاں دیں اور خوف زدہ کرنا چاہا، مگر اُن کا جواب صرف یہ تھا کہ:

جو کچھ تجھے فیصلہ کرنا ہے کر گزر، تو اس سے زیادہ نہیں کہ صرف اسی دنیا کی (چند روزہ) زندگی کا فیصلہ کر سکتا ہے۔ ہم تو اپنے (حقیقی) لایوت پروردگار پر ایمان لا چکے ہیں۔ تاکہ ہماری خطائیں اور ان ساحرانہ حرکتوں کو معاف فرمائے، جو کہ تو نے ہم سے زبردستی کرائیں۔ اور اللہ سب بہتر ہے اور ہمیشہ باقی رہنے والا ہے۔

فَاقْضِ مَا أَنْتَ قَاضٍ، إِنَّمَا تَقْضِي هَذِهِ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا، إِنَّا آمَنَّا بِرَبِّنَا لِيَغْفِرَ لَنَا خَطَايَانَا وَمَا أَكْرَهْتَنَا عَلَيْهِ مِنَ السِّحْرِ، وَاللَّهُ خَبِيرٌ وَاعْبَقٍ.

(سورہ طہ، ۷۷ تا ۷۹)

اور جو لوگ ایسی آیات بینات کو دیکھ کر بھی راہِ حق پر نہ آئے، اُن کا بھی یہ حال تھا:

لے یعنی سبب لے ظاہر

اس صورت میں ظاہر ہے کہ بادشاہ اس کے قول کی عملی تصدیق کر دی، جو کہ قولی تصدیق سے بہت بڑھ چڑھ کر ہے۔ اگر بادشاہ قول سے تصدیق کرتا، تو شاید اتنا مؤثر نہ ہوتا۔ اتنی بات اس مثال میں ضرور ہے کہ بادشاہ ایک انسان ہے، وہ جھوٹی تصدیق بھی کر سکتا ہے۔ مگر اللہ جلّ شانہ کے یہاں جھوٹ اور کذب کی قطعاً گنجائش نہیں ہے۔

پس جو نبی دعوا کرتا ہے کہ میں نبی ہوں، اگر میری بات سُنو گے، مانو گے، تو نجات ہے ورنہ عذاب مُخلّد میں گرفتار ہو جاؤ گے، نجات کا راستہ مُنہصر ہے میری متابعت میں۔ اور یہ دعوا اللہ کے سامنے کرتا ہے۔ اللہ کی زمین پر اور اُس کے آسمان کے نیچے بہ آواز بلند کہتا ہے کہ میری متابعت کے بغیر کوئی راستہ نجات کا نہیں ہے اور اس کی یہ دلیل پیش کرتا ہے کہ اللہ جلّ شانہ، میرے ہاتھوں اور زبان سے وہ چیزیں ظاہر فرمائے گا، جو اُس کی عام عادت کے خلاف ہوں گی اور دنیا اُس کی مثال لانے سے عاجز ہوگی۔ پھر اُس کے موافق مُشاہدہ بھی کیا جا رہا ہو۔ تو یہ خدا کی جانب سے عملاً اس کے دعوے کی تصدیق ہے درحقیقت مُعجزہ نبی کے دعوے کی عملی تصدیق ہوتی ہے اور اللہ چوں کہ جھوٹی تصدیق نہیں کر سکتا، لہذا نبی کا دعوا مُعجزہ کے ظہور کے بعد سچا ثابت ہو جاتا ہے۔ اسی لئے ہم بلا خوفِ تردید یہ یقین رکھتے ہیں کہ خداوندِ قدّوس، جو کہ تمام سچائیوں کا سرچشمہ ہے، کسی انسان کو یہ درست رس نہ دے گا کہ وہ نبوت کا دعوا کر کے ایسے خوارقِ عادت دکھلائے کہ دنیا اُس کے مُقابلے سے عاجز ٹھہرے۔ جس کا جی چاہے اب بھی اس ضابطے کا امتحان کر دیکھے ضرور کہ خدا ایسے حالات بہ روئے کار لائے گا کہ اُس کی طرف سے جھوٹے کی عملی تصدیق نہ ہونے پائے۔

عملی تصدیق کی مثال | آپ جلسوں میں دیکھتے ہیں اور کونسلوں اور پارلیمنٹوں کا حال سُنتے ہیں کہ جب کسی مسئلے پر کسی تجویز، کسی انتخاب پر بحث ہو جاتی ہے، تو ایک طرف سے محرّک اپنی تحریک پاس کرانے کے لیے حُضار کے سامنے بسط سے دلائل بیان کرتا ہے

اور دوسری طرف تردید کرنے والا اُس کے تردیدی دلائل مُفَصَّلًا سامنے رکھتا ہے۔ اس رد و کد کے بعد فیصلے کی صورت یہ ہوتی ہے کہ رائے لی جائے۔ جس کی صورت یہ ہے کہ ہاتھ اٹھوائے جاتے ہیں، اور یہی ہاتھ اٹھادینا یا نہ اٹھانا اُس ریزولیوشن کی تصدیق و تائید یا تکذیب و تردید کے لیے کافی سمجھا جاتا ہے، زبان ہلانے کی قطعاً ضرورت نہیں ہوتی۔ ایک شخص کی نسبت پبلک جلسے میں رائے لی جاتی ہے کہ آیا اُس پر جمہور کو اعتماد ہے؟ اس پر ہاتھ اٹھا دیے جاتے ہیں یہی علامت ہوتی ہے اس بات کی کہ اُن سب کی رائے اُس شخص کے حق میں ہیں۔ ہم دن رات میں سیکڑوں دفعہ اپنے ہاتھ اوپر کو اٹھاتیں، اس کو کسی چیز کے ثابت کرنے یا نہ کرنے میں کوئی دخل نہیں لیکن یہی ہمارا ہاتھوں کی وضعِ طبعی اور ہیئتِ اصلی کے خلاف اوپر کو اٹھادینا جب کسی ریزولیوشن کی تسلیم و انکار یا کسی دعوے کی صحت و بطلان کی آزمائش کے موقع پر ہو، تو کسی غبی سے غبی انسان کو بھی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہتی۔ اُس وقت ان کھڑے ہوئے ہاتھوں ہی کے شمار سے رایوں کا شمار کر لیا جاتا ہے اور پھر بڑے نازک اور عظیم الشان مسائل کے فیصلے ہاتھ کی اس غیر طبعی حرکت پر بے چون و چرا ہو جاتے ہیں۔

پس جس طرح ہاتھوں کا نیچے لٹکائے رکھنا آدمی کی عام عادت اور وضعِ طبعی کے موافق ہے اور اوپر کو اٹھانا کبھی کبھی خاص ضرورت اور مصلحت سے ہوتا ہے، اور یہی غیر طبعی وضع جب کسی ریزولیوشن پر ووٹ لینے کے وقت اختیار کی جائے، تو اس پر ریزولیوشن یا دعوے کی بے شک و شبہ تصدیق و تائید سمجھی جاتی ہے، ٹھیک اسی طرح حق تعالیٰ شانہ کا جو فعل سُننِ طبعیہ کے سلسلے میں ظہور پذیر ہو، وہ اس کی عام سُنّت اور عادت کہلاتی ہے، اور جو اسباب سے علاحدہ ہو کر کسی خاص مصلحت اور حکمت کے اقتضا سے ظاہر ہو، وہ خرقِ عادت ہے۔ اور یہی خرقِ عادت جب کسی شخص کے دعوے نبوت اور تحدی کے بعد، اُس سے اُس کے کہنے کے موافق صادر ہو، یہ

معجزہ ہے جو کہ **مِنْ اللہ اُس** کے دعوے کی فعلی تصدیق ہے۔ اور میں کہہ چکا ہوں کہ حق تعالیٰ کسی جھوٹے کی قولاً یا فعلاً تصدیق نہیں کر سکتا، لہذا ہم کو ایسے مدّعی کے دعوے میں شک کرنے کا کوئی حق نہیں۔

وحی کی تعریف اور ضرورت | اللہ تعالیٰ کا خطاب کسی ایسے شخص سے، جس کے دعوائے نبوت کی تکذیب کے لیے کوئی صحیح علامت نہ پائی جاتی ہو، اس کا نام وحی ہے۔ وحی، اصولی طور پر قریب قریب یکساں ہے، یعنی نفس فعل میں کوئی اختلاف نہیں، البتہ کلی مشکک کے طور پر وحی کے مراتب اور درجات ہیں۔

جب سے دنیا پیدا کی گئی، اُسی وقت سے بندوں کو ہدایت کی ضرورت ہے، یعنی انسان میں یہ معلوم کرنے کی ایک طبعی اور فطری خواہش ہے کہ کن خیالات اور اعمال سے اُس کو اللہ کا قُرب حاصل ہو سکتا ہے جیسے کہ انسان کو بھوک لگتی ہے، غذا کی خواہش میں مضطرب اور بے تاب ہو کر اتریاں سُکڑنے لگتی ہیں، پیاس لگتی ہے، پانی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، زبان سُوکھ جاتی ہے، جس طرح حق تعالیٰ نے فطری طور پر بندے کو بھوک یا پیاس لگائی، اُسی طرح ایک اور بھوک اور پیاس روحانی بھی لگا دی ہے، جو موصول الی اللہ اور معرفت کی ہے۔ اور یہ پیاس اور بھوک بھی فطری ہے، مذاہب اور اُکبنہ و اُزمینہ کا اختلاف اس فطرت پر کوئی اثر نہیں ڈال سکا۔ مسلمان، آریہ، ہندو، عیسائی، یہود، مجوس ایک چیز کی تلاش میں ہیں، البتہ بعضوں کا راستہ غلط ہے، مگر مقصد ایک ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہدایت کی خواہش، سچائی کی تلاش، وصول الی اللہ، معرفت ربّانی اور اللہ سے نزدیک ہونے کی تمنا ایک چیز ہے، جو کہ انسان کے لیے فطری اور طبعی امور میں سے ہے۔

وحی کی ضرورت سے انکار کرنے والوں کی مثال | ہاں، جب کبھی جیسا کہ آدمی بیمار ہو جاتا ہے، تو بھوک پیاس جیسے فطری اور طبعی امور بھی اُس سے کنارہ کر لیتے ہیں،

ٹھیک اسی طرح وہ ملاحدہ، جو کہ دنیا کی زندگی اور لذات میں محو ہو چکے ہیں، شاید اُن کو معرفتِ الہی کی بھوک اور روحانی پیاس نہیں رہی ہے اور اسی لیے ایسے روحانی بیماروں کا وجود یا کسی خاص زمانے اور مکان میں ایسی دُباکی کثرت ہمارے فطری ہونے کے دعوے کو مخدوش نہیں کر سکتی۔

وحی کی طرف انسان کی احتیاج فطری ہے | پس جس طرح حق تعالیٰ نے ہمارے جسمانی اُمور فطریہ کا انتظام کیا ہے، ہماری بھوک کے لیے غلہ زمین سے اُگاتا ہے، پانی آسمان سے اُتارتا ہے، ناممکن ہے کہ روحانی بھوک کے لیے کوئی انتظام نہ کرے۔ بلکہ اُس کی رحمت کا بلہ سے یقین ہے کہ جس طرح مادی حوائج و ضروریات کے لیے مادی سامان مہیا فرماتا ہے، اُس سے زائد روحانی ضروریات کے لیے روحانی سامان ضرور مہیا کرے گا۔ ظاہری پیاس کے بجھانے کے لیے جس طرح اُس نے پانی کے چشمے پیدا کیے ہیں، اسی طرح روحانی پیاس کے لیے روحانی چشمے ہونے چاہئیں، اور وہ چشمے وحیِ الہی کے صاف اور شیریں چشمے ہیں۔

نزولِ وحی میں تدریج | اور اس بات کو آریہ سماج بھی مانتے ہیں۔ ہاں، اتنا فرق ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ جو کچھ سامان کرنا تھا، وہ ابتداءے آفرینش ہی میں کیا جا چکا ہے، پھر بار بار اُس میں تغیر و تبدل یا تجدید اور تدریج کی ضرورت نہیں، ہم کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی عادت تکوینات میں یہ ہے کہ وہ اگرچہ تمام اشیاء کو دفعتاً پیدا کرنے پر قادر ہے، مگر بہ تدریج ہی پیدا کرتا ہے۔

وَبِانْ مِنْ شَيْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا
خَزَائِنُهُ وَمَا نُنْزِلْهُ اِلَّا بِقَدَرٍ
معلوم۔ (سورہ حجر آیت ۲۱)
اور کوئی چیز کیوں نہ ہو، اُس کے خزانے ہمارے پاس ہیں اور ہم اُس کو اُتارتے ہیں ایک مُعین اور چمکی تلی مقدار میں۔

ہر چیز کو دفعتاً پیدا کرنا خدا کے لیے کچھ مشکل نہ تھا، مگر ایسا نہیں کرتے۔ بلکہ درخت کا بیج ڈالو، تو بہ تدریج ایک عرصے کے بعد درخت بن جائے گا۔ زوہجین کا قبر بان ہوتا ہے،

لے تکوینات تکوین کی جمع ہے جس کے معنی تخلیق یعنی عدم سے وجود میں لانے کے ہیں۔ ۲ وصالِ جنسی اختلاط

مہینے گزرتے ہیں، مختلف اطوار و ادوار ہیں، بہت سے چکر ہیں، تب بچہ بنتا ہے؛ گو بہ یک دم بنانے پر قادر تھا، جس طرح تمام حیوانات کو مد پر لے کے بعد بہ یک دم بناتا ہے اور اُس کو اس میں تکان بھی نہ ہوتا، لیکن عادت اس کے برخلاف ہے۔

اب اگر کہو گے کہ یہ عادت کیوں ہے؟ تو ہم کہیں گے کہ مادہ میں استعداد ہی ایسی ہے پھر اگر کہو کہ ایسی استعداد کیوں ہے؟ اس کا جواب گزر چکا ہے کہ ہر جگہ ”کیوں“ نہیں پوچھا جاسکتا، بلکہ آخر میں ایک موجد ہی کہے گا کہ اللہ کے علم محیط میں یہی قرین مصلحت تھا۔ خلاصہ یہ ہے کہ اللہ کی عادت یہ معلوم ہوتی ہے کہ بہت سی اشیاء کو بہ تدریج بناتا ہے۔ اور جن اشیاء کی نسبت ہم یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ شاید دفعتاً پیدا ہو گئی ہوں جیسے چاند، سورج، ستارے وغیرہ، اُن میں بھی بہ اعتبار فیض رسانی اور دوسری اشیاء سے تعلق رکھنے، تدریج اور تغیر و تجدید مُشاہد ہے۔

پس ہمارا خیال یہ ہے کہ جس طرح وقتاً فوقتاً ضرورت پیش آنے پر اللہ تعالیٰ بارش نازل کرتا رہتا ہے، یہ نہیں کہ ایک ہی بارش ہمیشہ کی ضروریات کے لیے کافی ہو جائے، پھر ضروری نہیں کہ ہر ایک بارش ایک سال زمانے تک کفایت کر سکے، کبھی دو چار دس دن کے لیے روک تھام ہو جاتی ہے، کبھی اتنی بارش ہوتی ہے کہ کئی ماہ تک ضرورت نہیں رہتی، ٹھیک اسی طرح اقوام عالم کی ارواح و قلوب کی کھیتوں کو ابھارنے اور سرسبز کرنے کے لیے بھی اللہ تعالیٰ وحی و الہام کی بارش حسب ضروریات زمانہ اور حسب استعداد قلوب، مختلف زمانوں میں کرتا رہا ہے۔ کبھی تو وحی و الہام کی بارش ایسے زور و شور کی ہوتی کہ قرون تک اُس کی تری زمین سے نہ گئی، اور کبھی تھوڑا سا ترشح کافی سمجھا گیا: **فَإِنْ لَمْ يُمْسِكْهَا وَأَبْلَقْ فَطَلَ**۔ (بقہ آیت ۲۶۵)

اسی طرح لگاتار چھوٹی بڑی بارشیں مختلف اقوام و ممالک پر ہوتی رہیں اور ہر ایک نے چھوٹی یا بڑی مبعادت تک زمین والوں کی روحانی کھیتوں کو سیراب کیا۔ آخر ایک وقت آیا کہ خدا کی ساری زمین خشک اور پیاسی ہو گئی، ہدایت کے چشمے سوکھ گئے، چاروں طرف آگ برسنے لگی، بد اعتقادیوں اور بد اعمالیوں کی آندھیوں اور ٹونے تمام

روحانی کھیتوں کو جھلس ڈالا، اُس وقت بٹھا کے پہاڑوں سے ایک گھٹا اٹھی، جو آخر کار ساری دنیا پر چھا گئی اور وحی الہی کی وہ موسلا دھار اور عالم گیر بارش ہوئی، جس نے ایک مدتِ مدید تک دوسری بارش کی کوئی ضرورت باقی نہ چھوڑی۔ جب تک اس بارش کا کافی اثر باقی رہے گا، دوسری بارش نہ آئے گی۔ اسی بارش کے پانی سے، جو بڑے بڑے تالابوں اور نہروں میں جمع ہو گیا ہے، وقتاً فوقتاً زمینوں کی آب پاشی ہوتی رہے گی اور جب یہ پانی تمام ہو جائے گا، تو منجبر صادق کی خبر کے موافق یہ دنیا بھی ایک آخری سنبھالائے کر داعی اجل کو لبیک کہے گی۔

یا اُن مُنافِقوں کا ایسا حال ہے، جیسے آسمانی بارش کہ اُس میں کئی طرح کے، اندھیرے ہیں اور گرج اور بجلی موت کے ڈر سے، مارے ٹوک کے اپنی اُنکلیاں اپنے کانوں میں ٹھونسے لیتے ہیں اور اللہ مُنکر دلوں کو گھیرے ہوئے ہے، (کہ اُس کی پکڑ سے کہیں نہیں نکل سکتے)

أَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَاءِ فِيهِ ظُلُمَاتٌ وَرَعْدٌ وَبَرْقٌ، يَجْعَلُونَ أَصَابِعَهُمْ فِي آذَانِهِمْ مِنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ، وَاللَّهُ مُحِيطٌ بِالْكَافِرِينَ۔
(سورہ بقرہ آیت ۱۹)

وفی الحدیث:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: جو ہدایت اور علم دے کر مجھ کو خدا نے بھیجا ہے، وہ ایک موسلا دھار بارش کی طرح ہے، جو (خدا کی) زمین پر برسی، پھر زمین کا ایک عمدہ (سیر حاصل) قطعہ تھا جس نے بارش کے پانی کو قبول کر کے گھانس اور سبزہ اُگایا۔ اور دوسرا قطعہ تھا (جہاں پیداوار تو کچھ نہیں ہوئی، لیکن) اُس نے پانی کو اپنے اندر روک رکھا، جس سے لوگ مُنفع ہوئے اور انھوں نے خود پیا اور جانوروں کو پلایا اور کھیتوں کو سیراب کیا۔ (ان دونوں کے سوا،

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: مثل ما بعثنی اللہ تعالیٰ بہ من الہدیٰ و العلم، کمثل الغیث الکثیر أصاب أرضاً فكانت منها طائفة طيبة قبلت الماء، فأنبتت الكلأ والعشب الكثير، وكانت منها أجادب أمسکت الماء، فنفع الله بها الناس، فشربوا وسقوا

وزرعوا وأصاب منها طائفة
أخرى إنما هي قيعان لا تنفع
الماء ، ولا تُنبتُ كلاً ، فذلك
مثل من فقه في دين الله
ونفعه ما بعثني الله به ،
فعلم وعلم ، ومثل من
لم يرفع بذلك رأسه
ولم يقبل هدى الله أرسلت
به .

(متفق علیہ)

زمین کے ایک ایسے حصے پر بھی بارش کا کافی پانی
پہنچا، جو پھیل اور شورشی کہ نہ تو وہاں پانی
رکتا ہے، اور نہ گھاس اور سبزہ اُگتا ہے تو سمجھ
لو کہ پہلی مثال ہے اُس شخص کی جس نے دین کی
سمجھ حاصل کی اور جو چیز خدا نے مجھ کو دی تھی،
اُس نے اُس کو نفع پہنچایا۔ اُس نے خود بھی وہ
علم حاصل کیا اور دوسروں کو بھی سکھایا۔
اور آخری مثال ہے اُس نے جس نے اُس
ہادی کی طرف گردن اٹھا کر دیکھا بھی نہیں اور نہ
اُس ہدایت کو قبول کیا جسے دے کر میں بھیجا گیا تھا

وحی کا تدریجی اور غیر تدریجی ہونا دونوں امکان میں داخل ہیں، پہلے گزر چکا ہے کہ وحی
لیکن تدریجی ہونا عادتِ الہی کے موافق ہے اور الہام کی دو صورتیں
ممکن ہیں: یا بہ تدریج ہو یا دفعتاً۔ پس ہمارے اصول کے موافق جب عدم محض سے
دُنیا کو پیدا کیا گیا، اور آریوں کے نزدیک جب مد پرے کے بعد دُنیا موجود ہوئی، اسی
وقت سے آدمیوں کو الہام اور وحی کی ضرورت ہونی چاہیے۔ اس لیے کہ اُن کو اب
زندگی بسر کرنی ہے اور معاش اور معاد کی درستی کے اسباب بہم پہنچانے ہیں، جو بجز ایک
لُہما نہ تعلیم کے منصوبہ نہیں۔

معرفتِ الہی کی روحانی پیاس جو ایک فطری امر ہے اور اپنے رب کو خوش
رکھنے کی تمنا، جس کا بیج بنی آدم کے قلوب میں ازل سے بکھیر دیا گیا ہے، شروع ہی سے
ایک ایسے صاف، شیریں اور روح پرور چشمے کی تلاش میں ہے، جو تشنگانِ رصلے ہوئی
کو سیراب اور اُن کی روحانی کھیتوں کو سرسبز و شاداب کر سکے۔ چنانچہ حق جلّ و
علا کی حکیمانہ رافت و رحمت ملاحظہ ہو کہ زمین کے آباد کرنے والے نے ابھی تک زمین
پر قدم بھی نہیں رکھا تھا، کہ پروردگار حقیقی نے اُسے تمام ضروری چیزوں سے نام بہ نام واقف

کر دیا :

وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا (بقہ آیت ۳۱) اور آدم کو سب چیزوں کے نام بتا دیے۔ بلاشبہ اگر ایسا نہ ہوتا، تو بڑے تعجب کی بات تھی۔ جس خدا نے رحمن نے ہماری پیدائش سے پیش تر ہمارے مادی حوائج کا کافی انتظام کر دیا، زمین پیدا کی، جس پر ہم کو بسنا اور کاروبار کرنا تھا اور اُس کو ہر طرح کی غذاؤں اور اسباب زندگی کا ایک گودام بنا دیا، چشمے اور دریا جاری کر دیے، گنودں میں پانی کا ذخیرہ محفوظ کر دیا، زندہ رہنے اور سانس لینے کے لیے تمام فضا میں ہوا پھیلا دی، آسمان کی مضبوط چھت میں کیسے درختاں اور آنکھوں کو خیرہ کرنے والی قندیلیں روشن کر دیں، غرض علویات اور سفلیات کا ایسا نظام قائم کیا کہ اس خاک کے پتے کو اپنی ضروریات میں اُس سے نفع اٹھانا آسان ہو۔ پھر کوئی وجہ نہ تھی کہ ایسا مہربان خدا ہماری رُوحی اور باطنی ضروریات کی طرف توجہ نہ فرمانا۔ اُس نے ابتداءے آفرینش سے ہی ہدایت کے چشمے جاری کیے، وحی والہام کی بارشیں وقتاً فوقتاً برسائیں اور جس جس وقت جس طرح اُس کے علم ازیلی میں مناسب تھا، روحانی زندگی کے سامان مہیا فرمائے۔

پس اگر مختلف زمانوں میں مادی غذا کی تیاری کے لیے مختلف طرح کی بارشوں اور بادلوں کے اُدل بدل پر ہم کوئی اعتراض نہیں کر سکتے، تو ہم کو اس کا بھی کچھ حق نہیں پہنچتا کہ ہم بہت سے انبیاء و مرسلین اور اُن کی شرائع کے ارسال و انزال پر کسی طرح کی حرف گیری کر سکیں۔

متعدّد شرائع کے نزول میں جو تدریج و تغیر موعی ہوتی ہے، وہ شخص اکبر (عالم) کے حق میں اس سے زائد نہیں کہ ایک طبیب کسی بیمار کو کوئی دن تک مُنہ بچ پلانے کے بعد مُسہل دینے لگے، یا تنقیہ خاص کے بعد تنقیہ عام کا مشورہ دے۔ کوئی عقل مند بھی اُس وقت یہ نہ کہے گا کہ طبیب کے مُنہ بچ پلانے میں کچھ غلطی یا بھول چوک ہو گئی تھی، جس کی تلافی اُس نے مُسہل کے نسخے سے کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ طبیب دانا، مریض کی ہر ایک حالت کے مُناسب دوا تجویز کرتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح سمجھ لو کہ وہ حکیم و علیم خدا بھی عالم کے

لے رعایت ملحوظ

مزاج اور تغیر کے احوال و عوارض کی رعایت سے کبھی جلد جلد اور کبھی بہ دیر اُس کے حالات کے مناسب نسخہ بدلتا رہتا ہے اور بعض اوقات کسی نسخہ کا استعمال بہت دیر تک قائم رکھتا ہے۔ کیوں کہ مریض کے حالات کا تغیر اُس نسخے کا اجزا پر کوئی اثر نہیں ڈالتا۔

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہاں سوال امکان اور قدرت کا نہیں، بلکہ عادت الہی کہ ہے۔ اور یہ پہلے گزارش کی جا چکی ہے کہ عادت سے اُس کے خلاف قدرت رکھنے کی نفی نہیں ہوتی۔ وحی کے مراتب کی تدریج اور تفاوت کو آپ ایک اور مثال سے بھی سمجھ سکتے ہیں۔ پہلے یہ سمجھ لیجیے کہ جس طرح انسان کی ظاہری آنکھ مبصرات کے دائرے میں اُس وقت اپنا فعل کر سکتی ہے، جب کہ اُس کے اندر نور بصارت موجود ہو اور مبصر (یعنی جس چیز کو دیکھنا ہے) وہ بھی کسی قسم کی خارجی روشنی کے احاطے میں ہو، اگر اندرونی اور بیرونی روشنیوں میں سے کوئی ایک بھی مفقود ہو جائے، تو آنکھ کے لیے دیکھنا ناممکن ہے، ٹھیک اسی طرح غیبات اور امورِ معاد کا سمجھنا بھی دُورِ دُشینیوں پر موقوف ہے: ایک اندرونی جو عقل کی روشنی ہے، دوسری بیرونی، جس کو وحی کی روشنی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ گویا عقلِ انسانی نہ تو بے کاری ہے اور نہ نورِ وحی سے مستغنی ہو سکتی ہے۔

اس کے بعد نیل و نہار کے نظام پر غور کیجیے کہ شب میں جوں جوں تاریکی بڑھتی چلی جاتی ہے، تو ستاروں کی چمک میں بھی تیزی آتی جاتی ہے، تاریک کمروں میں لائٹن، چراغ وغیرہ سے روشنی کا سامان کیا جاتا ہے، جن کو قدرت کے فیض نے تاریک اوقات میں دُنیا کے کاروبار جاری رہنے کے لیے میسر کر دیا ہے۔ ستاروں سے جہازوں کے چلنے چلانے میں مدد ملتی ہے اور خشکی اور تری میں لوگ اُن کے ذریعے سے وقت اور سمت کی تعیین کرتے ہیں۔

وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُونَ . اور لوگ ستاروں سے بھی راہ معلوم کرتے ہیں گیس کے ہنڈوں اور بجلی کے قلموں سے لوگوں کا کاروبار چلتا ہے۔ جب صبح ہوتی ہے اور سورج نکلتا ہے، تو تمام مختلف روشنی کے سامان نابود ہو کر، ہزاروں آلاتِ روشنی کے بجائے تنہا ایک روشنی سورج کی کام دیتی ہے۔ قدرت یہ بھی کر سکتی تھی کہ سورج کو

ہمارے سر پر ہمیشہ کھڑا رکھتی۔ مگر ایسا نہ کیا، جس کی مصالح اور حکمتوں کا احصاء خدا ہی کر سکتا ہے۔ بہر حال، اس سے اس قدر ضرور معلوم ہوا کہ ظاہری نور (روشنی) مندرج اور متفاوت ہو سکتی ہے۔ اور اس تدریج اور تفاوت کے باوجود ایک ایسا مرتبہ بھی آسکتا ہے، جو تمام مدارج کو ختم کر کے صرف ایک ہی درجہ کو باقی رکھے، جو کہ اپنے مستفیدین کو سب ستاروں اور چراغوں کی روشنی سے مستغنی کر دے اور سب چھوٹی بڑی روشنیاں اُسی ایک روشنی میں محو اور مدغم ہو جائیں۔

پس اگر روحانی نور یعنی وحی اور الہام خداوندی میں بھی تدریج ہو اور آخر میں اُس کا ایک درجہ ایسا بھی آجائے، جس کے بعد کوئی باقی نہ رہے، تو اس میں کیا تعجب ہے؟ حضور نے فرمایا کہ مجھے پانچ چیزیں دی گئی ہیں، جن میں سے ایک یہ ہے کہ ہر ایک نبی صرف اپنی قوم کی طرف بھیجا جاتا تھا، لیکن میں تمام آدمیوں کی طرف مبعوث ہوا ہوں۔ وحی میں باوجود اصولی تفاوت کے فروغی تفاوت | یہ بات فراموش نہ کی جائے کہ تمام انبیاء کے پاس اُصول کے اعتبار سے ایک ہی چیز ہوتی ہے:

شرع لکم من الدین ما وصیٰ بہ نوحًا والذی اوحینا الیک، وما وصینا بہ ابراہیم وموسیٰ وعیسیٰ ان اقموا الدین ولا تتفرقوا فیہ (سورہ شوریٰ آیت ۱۳)	(لوگو! اُس نے تمہارے دین کا وہی راستہ ٹھہرایا ہے، جس (پر چلنے) کا اس نے نوح کو حکم دیا تھا اور (اسے بغیر!) تمہاری طرف (بھی) ہم نے اُسی راستے کی وحی کی ہے، اور اس کا ہم نے ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو (بھی) حکم دیا تھا کہ (اسی) دین کو قائم رکھنا اور اس میں تفرقہ نہ ڈالنا۔
--	---

البتہ مختلف انبیاء اور ان کی شرائع میں اُصول کو بجا لہا قائم رکھتے ہوئے اُزْمَہ اور اُتْمَہ کے اختلاف سے زوائد کا خیف سا تغیر و تبدل ہو جاتا ہے۔ اس کو یوں سمجھو کہ انسانوں کی عام غذا ہمیشہ ایک قسم کی ہے۔ مثلاً روٹی یا چاول اور پانی؛

۱۔ احصاء: شمار ۲۔ تدریجی، بہ تدریج پھیلنے والا ۳۔ اُزْمَہ: مزاج کی صحت

لیکن زوائد اور فروع میں بہ اعتبارِ اوقات و مواسم تغیر و تبدل کرتے رہتے ہیں۔ مثلاً جاڑے میں سوہنِ حلوہ، گاجر اور انڈوں کا حلوہ، اور گرمی میں فیرنی، فالودہ وغیرہ کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اسی اصول کے اتفاق اور زوائد کے اختلاف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا: **أَبُوهُمْ وَاجِدٌ وَأُمَّتُهُمْ شَتَّى**۔ یعنی انبیائے کرام کی مثال اُن بھائیوں کی طرح ہے، جن کا باپ ایک اور والدہ مختلف ہوں۔

خاص خطاب کے بعد وحی کا عالم گیر خطاب | قرآن کریم کا دعوا ہے کہ مختلف
یعنی نبوتِ خاصہ کے بعد نبوتِ عامہ | اقوام کی طرف مختلف نبی آئے:

وَأَن مِّنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ (فاطر آیت ۲۴) اور کوئی امت ایسی نہیں (ہوئی) کہ اس میں کوئی ڈرانے والا نہ گزرا ہو۔

جو مختلف زمانوں میں اپنے منصب کے موافق رہ نہائی کا فرض ادا کر کے چلے گئے۔ ان سب کے بعد ایک ہادیِ اعظم اور مُنذِرِ عام آیا، جو کہ تمام مخلوق کے لیے ہادی ہے:

لِيَكُونَنَّ لِلْعَالَمِينَ نَذِيرًا (فرقان آیت ۱۱) تاکہ تمام جہان کے (لوگوں کے) لیے (عذابِ خدا) سے ڈرانے والا ہو۔

پس ضروری تھا کہ ایسے مُنذِرِ عام کے پاس ایسی کتاب ہو، جو کہ تمام لوگوں کی ہدایت اور عام عالمِ اقوام کی رہبری کے لیے ابدی طور پر ضامن اور مُستَکفِل ہو جائے۔ اس سے پہلے مُفَصَّلًا گزر چکا ہے کہ خدائی کلام کو ہم خدائی کام کی طرح پہچان سکتے ہیں۔

قرآن اور اس کی جامعیت | آؤ! اس مُنذِرِ عام کی اُس کتاب کو دیکھیں، جو قرآن کے نام سے معروف ہے کہ آیادہ خدا کا کلام ہو سکتا ہے یا نہیں؟ جب تم اس کی تفتیش کر دو گے، تو تم کو اُس کتاب میں تہذیب و اخلاق، طریقِ تمدن و معاشرت، اُصولِ حکومت و سیاست، ترقی و روحانیت، تحصیلِ معرفت و ربانی، تزکیہٴ نفوس، تنویرِ قلوب، غرض کہ دُصولِ الی اللہ اور تنظیم و رفاہیتِ خلّاق کے وہ تمام قواعد و سامان موجود نظر آئیں گے، جن سے آفرینشِ عالم کی غرض پوری ہوتی ہے اور جن کی ترتیب و تدوین کی ایک اُمّی قوم کے اُمّی فرد سے کبھی امید نہیں ہو سکتی تھی۔

پھر اُن تمام علوم و حکم کا تکفل کرنے کے ساتھ جن کے بغیر مخلوق اور خالق کا تعلق صحیح طور پر قائم نہیں ہو سکتا اور نہ کوئی مخلوق دوسری مخلوق کے حقوق کو پہچان سکتی ہے! اس کتاب کی غلغلہ انداز فصاحت و بلاغت، جامع و مؤثر اور دل رُبا طرزِ بیان، دریا کا سامنُوُج اور روانی، سہل ممتنع سلاست، اُسالیب کلام کا تفضیل و اُس کی لذت و خلاوت اور شہنشاہانہ شان و شکوہ، یہ سب چیزیں ایسی ہیں جنہوں نے بڑی بے بسند آہنگی سے سارے جہان کو مقابلے کا چیلنج دے دیا ہے۔

جس وقت سے قرآن کے جمالِ جہاں آرا نے غیب کی نقاب اُلٹی اور آدم کی اولاد کو اپنے سے روشناس کیا، اُس کا برابر یہی دعوٰی رہا کہ میں خداے قدوس کا کلام ہوں۔ اور جس طرح خدا کی زمین جیسی زمین اور خدا کے سورج جیسا سورج اور خدا کے آسمان جیسا آسمان پیدا کرنے سے دُنیا عاجز ہے، اِسی طرح خدا کے قرآن جیسا قرآن ہنسنے سے بھی دُنیا عاجز رہے گی۔

قرآن کے مٹانے کی لوگ سارے کوشش کریں گے، مگر کاتھیں گے، مقابلے کے جوش میں گٹ مریں گے، اپنی مدد کے لیے دنیا کی بڑی بڑی طاقتوں کو دعوت دیں گے، کوئی جیلہ کوئی تدبیر کوئی داؤ بیچ اٹھانہ رکھیں گے، اپنے آپ کو اور دوسروں کو مصیبت میں ڈالیں گے، سارے نقصانات اور مصائب و دواہی کا تحمل اُن کے لیے ممکن ہو گا، مگر قرآن کی ایک چھوٹی سی سورت کا مثل بنانا ناممکن نہ ہو گا۔

نبی اُمّی اور اُس کا اعجاز | پھر طرفہ یہ ہے کہ جو ہادی اس کتاب کو لایا، اُس نے نہ کسی درس گاہ میں تعلیم پائی، نہ کسی لائبریری کا مطالعہ کیا، نہ کسی اُستاد اور مُعَلِّم کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا اور نہ اُس کے گرد و پیش ایسی بے بہا تعلیمات کا کوئی مولود موجود تھا، بلکہ اُس کی اور اُس کی قوم کی وہ حالت تھی، جس کو قرآن نے یوں ادا کیا:

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ (وہ خدا، ہی تو ہے جس نے عرب کے جاہلوں میں مہفی

لے ضمانت لے تنوع لے دواہی : داہیہ کی جمع ہے، مصائب، حوادث

رَسُولًا مِنْهُمْ، يَتْلُو عَلَيْهِمْ
آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ
الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا
مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُبِينٍ

میں سے (محمد کو) پیغمبر (بنا کر) بھیجا، کہ وہ اُن کو
خدا کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سنانے اور ان کو کفر
و شرک کی گندگی سے پاک صاف کرنے اور اُن
کو کتاب (الہی) اور عقل (کی باتیں) سکھاتے ہیں؛
ورنہ (اس سے) پہلے تو یہ لوگ صریح گمراہی میں (بتلا)
تھے۔

نہ صرف یہ کہ قرآن نے اُس کے اُمی ہونے کا اشارہ کیا، بلکہ اُمی ہونے کا وصف اُس
کے لیے بہ منزلہ ایک ممتاز لقب کے استعمال فرمایا، جس جگہ یہ فرمایا:

الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ
النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ الَّذِي يَجِدُونَهُ
مَكْتُوبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرَةِ
وَالْإِنْجِيلِ. (سورہ اعراف آیت ۱۵۷)

اُن سے ہماری مراد اس زمانے کے وہ اہل کتاب
تھے جو (ہمارے ان) رسول نبی اُمی (محمد) کی پیروی
کرتے ہیں جن (کی بشارت) کو اپنے ہاں تورات اور
انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔

اور ایک موقع پر تو آپ کی نوشت و خواند کے متعلق اُن لوگوں کے مجمع میں جن سے آپ
کی چہل سالہ طویل زندگی کا کوئی مُنہ واقعہ خصوصاً وہ جس میں احتیاج غیروں کی ہو،
مستور نہ رہ سکتا تھا؛ صاف صاف اعلان کر دیا گیا:

وَمَا كُنْتَ تَتْلُو مِنْ قَبْلِهِ
مِنْ كِتَابٍ وَلَا تَخُطُّ
بِإِمْبِيكَ إِذَا أَلَّارْتَابَ الْمُبْطِلُونَ
(سورہ عبکوت آیت ۴۸)

نہ تو تم قرآن سے پہلے کوئی کتاب پڑھ سکتے تھے اور
نہ اپنے دائیں ہاتھ سے لکھ سکتے تھے۔ اگر ایسا ہوتا تو
بے شک باطل پرستوں کو کچھ شک و شبہ کی گنجائش
ہوتی۔

یہی نہیں کہ آپ رسمی نوشت و خواند سے بالکل الگ تھلگ رہے، بلکہ جو چیز بڑے
سے بڑے متعصب و معاند کو بھی محو حیرت بنا دینے والی ہے، وہ یہ ہے کہ آپ باوجود عرب

کے نہایت ہی واجب الشغلیہ معزز و ممتاز خاندان میں سے ہونے کے، اُس فن شاعری سے بھی نا آشنا رہے، جس میں اُس سرزمین کے بچے اور چھو کر یاں بھی طبعی سلیقے کے موافق یدِ طولیٰ رکھتی تھیں۔ کیا یہ عجیب بات نہیں کہ ایسے ملک کا، جہاں کی زمین نباتات کی طرح شاعروں کو اُگاتی تھی، ایسا مایہ ناز فرزندِ شعر گوئی سے کوئی علاقہ نہ رکھے! ایک شعر بھی اس کا عرب کے دواوین میں موجود نہ ہو! کسی مُشاعرے میں ایک قصیدہ بھی اُس نے نہ پڑھا ہو، جو یہی گمان کر لیا جائے کہ شاعری سے ترقی کرتے کرتے شاید وحیِ والہام کا دعوا کر دیا ہو گا!

وَمَا عَلَّمْنَاهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْبَغِي لَهُ. (سورہ یسین آیت ۶۹) اور ہم نے اُن (پیغمبر محمد) کو شاعری نہیں سکھائی اور شاعری اُن کی شان کے لائق بھی نہیں۔

پھر لائے، تو پورے چالیس سال بعد ایک ایسا کلام لائے، جو نہ قصیدہ ہے، نہ غزل ہے، نہ مرثیہ ہے، نہ اس رنگ دھنگ کا کوئی کلام اُن کے یہاں موجود ہے، نہ اس طرح کی کوئی تصنیف وہاں پائی جاتی ہے، بلکہ وہ آفتاب کی طرح مکانوں کو نہیں، دلوں کو روشن کرنے والا کلام ہے، وہ حکمت ہے، علم ہے، شفا ہے، بُرہان ہے، نور ہے، قانونِ ہدایت ہے، خلاصہ یہ کہ خدا کے علم سے روشن کی ہوئی مشعل ہے، جسے نہ کوئی ہو، کا جھونکا گل کر سکتا ہے، نہ کوئی آندھی بجھا سکتی ہے۔

دنیا کے ضحّا و بُلغانے اس اُمّی کی لائی ہوئی کتاب کے سامنے پیرِ ڈال دی۔ بڑے بڑے شاعر ایسے بہک گئے کہ جس آدمی نے نُدّة العُمر ایک شعر نہیں کہا تھا، محض یہ کلام سن کر اُسے شاعر بنانے لگے۔ اُس کا خارقِ عادت اثر دیکھ کر سحر سے تعبیر کیا کہ یہی چیز اُن کے زعم میں تمام فوق العادۃ کارناموں کی حد تھی۔ اور بعض اُن میں سے قرآن کی فصاحت کو سجدہ کرنے لگے۔ قرآن کے علوم و قوانین نے ساری دنیا کے قانون ردی کر دیے۔ اعلیٰ سے اعلیٰ حکمتوں اور رُتبتوں کو پُپا کر کے اُن کی جگہ لے لی اور آخر کار اُمتوں کی جماعت کو دُنیا کے مدعیانِ حکمت و تہذیب کا مُعَلِّم بنا دیا۔

۱۔ دواوین: دیوان کی جمع، مجموعہ کلام

آپ کا اُمّی ہونا تاریخ کے اُچلی بد ہیبت میں سے ہے | کیا آج ساڑھے تیرہ سو برس کے بعد کوئی شخص یہ جرات بلکہ حماقت کرے گا کہ آں حضرت صلعم کے اُمّی ہونے کو یہ کہہ کر ٹھٹھکانے لگے کہ شاید آپ نے بھی دنیا کے دوسرے محققین کی طرح مختلف علوم و فنون کی کتابیں پڑھی ہوں گی، کسی میاں جی کے پاس بیٹھے ہوں گے، کوئی کُتب خانہ آپ کے مکان میں چھپا ہوگا۔

میں کہتا ہوں کہ وہ آیات جن میں آپ کا اُمّی ہونا بیان کیا گیا ہے، ایسی قوم کو سالہا سال تک شب و روز سنائی جاتی رہیں، جن کی گودوں میں آپ بچپن سے پلے تھے اور آپ کی عمر کا مُعتمدہ حصّہ اُن کی نگاہوں سے اوجھل نہ تھا، لیکن ایسی شدید عداوت اور غیظ و غضب اور آپ کی تکذیب و تردید پر اس قدر حرّیں ہونے کے باوجود، کسی ایک آدمی نے بھی یہ شہادت نہ دی کہ آپ نے فلاں مدرسے میں تعلیم پائی، یا فلاں اُستاد کی خدمت اور ملازمت میں اتنی مدت تک رہے ہیں۔

اگر کوئی آواز بھی ایسی اٹھی ہوتی، تو ضرور آج تاریخ میں اُس کا کچھ نشان ملتا۔ تاریخ کے صفحات جس طرح اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کھلے ہوئے تھے، اُس سے زائد آپ کے دشمنوں اور بدنام کرنے والوں کے لیے کُشادہ تھے۔ بلکہ آغازِ اسلام میں، جب کہ چند مظلوم اشخاص کے سوا کوئی بھی حضرت (محمد) صلعم کا کلمہ پڑھنے والا نہ تھا اور کُفرو باطل کی ساری شیطانی طاقتیں آپ کے نام و نشان کو صفحہ ہستی سے محاذ اللہ مٹا دینے میں مشغول تھیں، اُن کے لیے ایسا پروپیگنڈہ پھیلانے کا بڑا وسیع میدان موجود تھا اور وہ بخوبی اس کی اشاعت اطراف و اکناف میں کر سکتے تھے کہ محمد (صلعم) محاذ اللہ اپنے اُمّی ثابت کرنے کے دعوے میں جھوٹے ہیں، انھوں نے فلاں کالج میں فلاں پروفیسر سے اتنے زمانے تک رسمی تعلیم پائی ہے۔

پس جب کہ چودہ سو برس کی تاریخ کوئی ایسا بیان پیش کرنے سے خاموش ہے، تو تاریخ کی عزّت پر یہ ایک بڑا ہی ناپاک اور کمینہ حملہ ہوگا کہ تعصّب کے جوش میں محض اپنے توہمات کی بنا پر تاریخ کو جھوٹا ثابت کیا جائے۔ اگر سکندرِ رومی کی فاتحانہ مُلک گیری، اَلوشیرِ واں عادل کی عدل گستری، ہرستم کی شہرہ آفاق طاقت و شجاعت، حاتم طائی کی فیاضی اور

سخاوت کی تردید کر دی جائے، تو غالباً تاریخ و روایت کا فن اس قدر بے اعتبار نہ ہوگا جتنا کہ نبی عربی صلعم کے اُمّی ہونے کی نفی ہونے سے ناقابل اعتبار ٹھہرتا ہے کیوں کہ یہ ایسا واقعہ ہے کہ جس کا تواثر قرآن کے تواثر کے برابر ہے۔

اس کا انکار صرف اس صورت میں ممکن ہوگا کہ ایک آدمی یہی دعوٰی کر دے کہ محمد صلعم نامی انسان عرب میں پیدا ہی نہیں ہوئے، نہ اُنھوں نے یہ قرآن پڑھ کر سُنا یا، نہ دعوائے پیغمبری کیا، تو کیا آپ یہ پسند کریں گے کہ محض قرآن یا حامل قرآن کی عداوت کے جوش میں گذشتہ تمام مشہور و مستواتر واقعات کو بھی جھٹلانے لگیں! جس کا خمیازہ نہ صرف مذہب اسلام کو بلکہ دنیا کے تمام مذہبوں اور قوموں خصوصاً اُس مذہب کو اٹھانا پڑے گا، جس کا وجود تاریخی زمانے سے بہت پہلے کا بتایا جاتا ہے۔

میں نہیں سمجھتا کہ کوئی شخص قرآن کی ضد میں اس درجہ جہالت پر اُتر آئے گا کہ وہ نزول قرآن سے پہلے نبی اُمّی کا تعلیم یافتہ ہونا ثابت کرے، حالانکہ وہ مشہور ہندی اور مُمَرَّد افراد بھی، جنھوں نے کوئی امکانی صورت تکذیب قرآن کی اٹھانہ رکھی تھی، تنگ اور کھسیانے ہو کر اس سے زائد نہ کہ سکے کہ اِنْعَامُ یُعَلِّمُهُ بَشَرًا (کوئی آدمی ان کو قرآن سکھاتا ہے)۔ ایسا کوئی حوالہ بھی نہ دے سکے جس سے چالیس سال کی عمر تک ایک دن کے بیسبب آپ کا کسی سے تعلیم پانا ثابت ہوتا۔

بلکہ خود اُن کا یہی قول اس کی دلیل ہے کہ رسول خدا صلعم کے اُمّی ہونے کو وہ ایسی ناقابل انکار بدابہت سمجھتے تھے کہ قرآن کے علوم و معارف کو آپ کے گذشتہ مشہور و معروف اُمّیت سے تطبیق دینا اُن کے لیے ممکن نہ تھا۔ اس لیے وہ آپ کی جگہ کسی غیر معلوم بشر کو، جو تعلیم یافتہ ہو، اس قرآن کا اصل مُصنّف قرار دیتے تھے۔ اُس وقت شاید اُن کو یہ خیال نہ رہا کہ اگر آن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن سکھانے والا بھی کوئی بشر ہی ہے، تو کسی بشر کا مقابلہ کرنے اور اُس کے کلام کا مثل لانے سے سارے جہاں کی بشری

لے سرکش ۵ اُمّیت: اُمّی ہونا، اُن پڑھ ہونا۔

اور غیر بشری طاقت عاجز نہیں رہ سکتی۔

بے شک قرآن حضرت محمد صلعم کا کلام نہیں ہے اور نہ آپ کے پاس ایسی کتاب تیار کر لینے کا کوئی طبعی سامان موجود تھا، اور یہ بھی درست ہے کہ یہ قرآن ضرور آپ کو کسی اور نے پڑھایا ہے، لیکن وہ پڑھانے والا بشر نہیں تھا، بلکہ وہ ربِّ کریم تھا جو لَا یُخَلِّیْ لُطْفَہٗ اَوْ رُحْمَہٗ خَوْنَ کو صاحبِ عقل و شعور انسان بنا دیتا ہے:

اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ، پڑھو (اے محمد صلعم) اپنے رب کے نام سے،
خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ۔ (سورہ علق) جس نے پیدا کیا انسان کو جھے ہوئے خون سے
وہ جس طرح اپنی ذات و صفات میں اور اپنے کلام میں بے مثل اور مکتا ہے، اسی طرح اپنے کلام میں بھی بے نظیر و بے ہمتا ہے۔ مخلوق جس طرح اُس کے کام کا مقابلہ کرنے سے عاجز ہے، اسی طرح اُس کے کلام کا معارضہ کرنے سے مجبور ہے۔

قرآن کے لانے والے نے بڑے زور سے شجاعت کی، ہر طرح لوگوں کو اس کلام کا مثل لانے کے لیے اُبھارا، غیرتیں دلائیں، مقابلے کے لیے بیدار کیا، جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر اٹھایا اور ایک ذرا سی بات پر جو اُن کے زعم میں بہت ہی آسان اور سہل الحصول ہونا چاہیے تھا، اپنے کل دعاوی کے جھوٹ اور سچ ہونے کا فیصلہ چھوڑ دیا، لیکن مقابلہ کرنے والوں نے لڑائیاں لڑیں، حاملین قرآن کے مٹانے اور تباہ کرنے کی سازشیں کیں، اُن کے ذلیل اور رسوا کرنے میں کوئی دقیقہ باقی نہ چھوڑا، تاہم یہ حوصلہ کسی کو نہ ہوسکا کہ قرآن کی کسی چھوٹی سی سورت کے جواب میں چند جملے بنا کر قرآن کے اُس عظیم الشان دعوے کو غلط یا پست کر دیتا۔ (العباد باللہ)

قرآن نے کس طرح لوگوں کو عاجز کیا؟ جیسے ہم خدائی کاموں کو مَصْنُوعَاتِ عَالَم میں غور کر کے بہ آسانی پہچان لیتے ہیں، اسی طرح خدا کے کلام کے مقابلے میں بہت سے شعرا کے کلاموں اور دنیا کے بڑے بڑے بولنے والوں کے نتائج افکار کو، اُن کے شُستہ اور مُہذب بیانوں کو، غُلغلہ اندازِ خطبوں کو، معرکہ الارالکچروں کو، عرق ریزی سے لکھی ہوئی تالیفات کو، ادبی اور علمی مصنفات کو سامنے رکھ کر ہم آسانی سے اس

نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں کہ یہ خدائی کلام ہے، آدمیوں کا کلام نہیں۔ پس جس کلام کے متعلق یہ دعویٰ ہمارے سامنے آتا ہے کہ یہ خدائی کلام ہے، اُس میں ہم کو اُمورِ ذیل پر غور کرنا پڑے گا: خدائی کلام کے پرکھنے کی کسوٹی کیا ہے؟ (۱) مدعی نبوت، جس کی زبان سے یہ ہم تک پہنچا، اُس کی کیسی حالت ہے؟

(۲) اُس کی تعلیم کیسی ہے؟

(۳) کیا اُس جیسا آدمی ایسا کلام بول سکتا ہے؟

(۴) کیا اُس کے پاس ایسا سامان موجود ہے، جس سے وہ ایسے بیش بہا علوم و مضامین ادا کر سکے؟

(۵) کیا حجاز میں کوئی علمی سامان موجود ہے؟

کیا قرآن اس کسوٹی پر پورا اترتا ہے؟ پہلے سوال کے متعلق قرآن کے لانے والے کی حالت جب ہم دیکھتے ہیں، تو وہ ایک دیانت دار، شریف النسب مگر ایک یتیم بچہ ہے، جس کے سر پر نہ باپ نے سایہ کیا، نہ زیادہ دنوں تک آغوشِ مادری کی راحت اٹھائی، نہ اس کے پاس کوئی ثروت ہے نہ دولت، نہ اُس کا گھرانہ کوئی علمی یا صنعتی گھرانہ ہے، نہ اُس کے پاس لڑکپن کے زمانے یا جوانی بلکہ نبوت کے بعد بھی کوئی ظاہری علمی سامان ہے، نہ کتب خانہ ہے، نہ اُس کے وطن میں کوئی مدرسہ ہے، نہ کوئی مکتب، نہ اُس کے وطن میں علوم و فنون کا کسی قسم کا چرچا ہے، بلکہ وہاں کسی کے کان علوم و فنون کے چرچے سے آشنا بھی نہیں۔

ہاں اُس کے پاس اگر ہے تو صرف زبان ہے اور اس قدر طلاقتِ لسانی اور قادرِ اِلهامی ہے کہ وہ تمام جہان کو اپنے سامنے گونگا سمجھتے ہیں، چُنال چہ عرب کے ماسوا کا جو نام عجم رکھا تھا، اُس کی بھی یہی وجہ تھی کہ عجم کو قادرِ الکلام نہیں سمجھتے تھے اور اپنے مقابلے میں سب کو ایچ جانتے تھے۔ بڑے بڑے بادشاہوں کے درباروں میں نہایت شان و شوکت کے ساتھ بے دھڑک بولتے تھے۔ معمولی اونٹ اور بکریاں چرانے والے ایسا برجستہ کلام کہتے تھے کہ دوسروں کو بہت فکر و تامل کے بعد بھی ویسا کہنا مشکل تھا۔ چند جُلوں میں جذبات کو

برائیکھ کر دیتے۔ جب بولتے تو رُعد کی طرح گرجتے، بجلی کی طرح گڑکتے، بارش کی طرح برستے تھے اور تھوڑی سی دیر میں گہے بہ آب و گہے بہ آتش کا سماں کھینچ دیتے تھے۔ غرض کہ لے دے کر اُن کے پاس اگر کوئی چیز تھی، تو صرف زبان تھی۔ ویسے کوئی طریقہ باقاعدہ تصنیف کا نہ تھا، درس گاہیں نہ تھیں، کُتب خانے اور لائبریریاں نہ تھیں۔

اب سوچو کہ اگر ایسے مُلک میں کوئی ذہین اور صاحب ثروت بھی ہو، تو کیا مختلف علوم و فنون کا سیکھنا اُس کے لیے عادتاً مُحال نہ ہوگا! پھر جب اُس کے ساتھ دوسرے قُدرتی اَسباب بھی ایسے جمع ہوں، جن کے ہوتے ہوئے سیدھی سادی زندگی بسر کرنا اور معمولی کفایت بھی تہیّا کرنا مُشکل ہو جائے، جیسا کہ ولادت سے پہلے والد کا انتقال اور بہ حالت رضاعت والدہ کی وفات، پھر چچا کی پرورش میں چلے جانا اور اسی طرح چالیس برس کی عمر کو بے سروسامانی میں بسر کرنا، کبھی قلم کو ہاتھ بھی نہ لگانا، نہ کسی اُستاد کے سامنے کتاب کھولنا!

ان سب علامتوں کو دیکھ کر عادت اللہ (جس کو آج کل کے لوگ قانونِ قُدرت بھی کہتے ہیں)، یہ بتلاتی ہے کہ ایسا شخص اَبُو اب نہذیب و تہذُن اور معارفِ الہیہ اور حقائقِ توحید ذاتی و صفاتی و افعالی اور علومِ ہدایت اُتم و اقوام میں کوئی سیدھی بات بھی نہ کر سکے، چہ جائے کہ وہ ایسی کتاب لاجواب اور ایسی آیاتِ بینات لوگوں کے سامنے پیش کرے، جس کو دیکھ کر اربابِ فنون اور حکمائے مُتبحرین حیران رہ جائیں۔ بلکہ دنیا کے بڑے بڑے عقلا اور حکما اُس کی چو کھٹ پر سر دھننے لگیں اور جن و انس اُس کا مُثل پیش کرنے سے صریحاً عاجز و درماندہ ہو جائیں۔ ایسے حالات میں ایسا کلام ہم دیکھیں گے، تو ضرور اُس کو خدائی کلام کہنے پر از روئے عقل و انصاف و تجربہ مجبور ہوں گے۔

دوسرا سوال بھی مذکورہ بالا بیان سے حل ہو گیا کہ جب مُلکی اور قُدرتی حالات ایسے ہوں، جن کے ہوتے ہوئے ایک فارغ اَبال اور خوش حال آدمی بھی اُنتساپِ علوم اور تحصیلِ فنون سے عاجز ہو، تو ایک بے سروسامان کے بے ایسی اعلیٰ تعلیم کہاں سے تیر ہو سکتی

تھی! آپ کی سواغ سب کو معلوم ہے کہ طفولیت ہی میں یتیم ہوئے اور ہوش سنبھالنے کے بعد بعض ابوابِ معیشت اور دیگر افکار میں مبتلا ہو گئے۔

ہاں، پیدائشی طور پر جو بہت ہی شدید اور قوی داعیہ طلبِ حق اور معرفتِ الہیہ کا آپ کے قلبِ مبارک میں موج زن تھا اور جو بہت سخت نفرت اور بغضِ آپ کو فطری طور پر رسومِ بشریہ اور فحشا و منکرات سے تھا، وہ آپ کو بمثل (انقطاعِ خلاق)، ادریکِ سوائی اور عزالتِ گزینی کی طرف مائل کرتی تھی، چنانچہ کبھی کبھی آپ کئی کئی دن تک تمام انسانوں کے جوار سے علاحدہ ہو کر، غاروں اور پہاڑوں میں خدا سے وحدہ لا شریک لہ کو یاد کرتے اور اپنے کائناتِ کس کے موافق اُس کی عبادت کیا کرتے تھے، جہاں انسان کا گزر تو کیا، کوئی پرندہ بھی پر نہ مارتا تھا۔

تاریخ کی نہایت ہی معتبر اور محفوظ روایتیں، جن سے بڑھ کر کوئی وثوق کی چیز تاریخ کے خزانے میں نہیں مل سکتی، بتلاتی ہیں کہ آپ حرا کی چوٹی پر (جسے آج کل جبلِ النور کہتے ہیں) کئی کئی دن تنہا رہ کر اُس وحدہ لا شریک کی معرفت کی طرف قدم اٹھاتے تھے۔ کوئی شخص ان چند ایامِ خلوت میں بھی یہ ثابت نہ کر سکا کہ آپ کے پاس خفیہ طور پر کوئی معلم جاتا تھا اور وہ آپ کو کتاب پڑھاتا تھا۔ ایسے حالات میں نزولِ قرآن سے پہلے آپ کے تعلیم یافتہ ہونے کا اِدِّعَا کس قدر بے دلیل بات ہے! قرآن نے صاف صاف اعلان کر دیا:

وَمَا كُنْتَ تَتْلُو مِنْ قَبْلِهِ مِنْ	قرآن سے پہلے نہ تو کوئی کتاب پڑھتا تھا، نہ اپنے
كِتَابٍ وَلَا تَخُطُّهُ بِيَمِينِكَ إِذْ الْأَرْيَابُ	دائیں ہاتھ سے لکھتا تھا۔ اگر ایسا ہوتا، تو البتہ اہل
الْمُبِطِلُونَ • (سورہ عبکوت آیت ۴۸)	باطل شے میں پڑتے۔

نبوت سے پہلے، ایک دفعہ یمن میں اپنے چچا ابوطالب کے ہم راہ اور ایک مرتبہ جوانی میں دوسرے رفقا کے ساتھ آپ کو شام کی طرف بہ غرض تجارت چند روز کے لیے

سفر کا اتفاق ہوا۔ بحیرا راہب نے اسی سفر میں آپ کو دیکھا اور آثارِ رشد و صلاح اور علاماتِ نبوت دیکھ کر حضور کے تاب ناک مستقبل کے متعلق کچھ پیش گوئی بھی کی۔ لیکن جیسا کہ حافظ ابن تیمیہ نے لکھا ہے، پڑھنا پڑھنا تو درکنار، کوئی شخص تاریخ سے ایک شہادت بھی اس بات کی پیش نہیں کر سکتا کہ اس چند ساعت کی صحبت میں آپ نے کلمہ اور ایک حرف بھی بحیرا یا کسی اور راہب اور قسّیس سے سیکھا ہو۔ اور اگر بالفرض ایسا ہوتا، تو سب سے پہلے قافلے والوں کو اور بحیرا کے متبعین کو اس کی خبر ہوتی اور وہ بڑے زور و شور سے اپنی تاریخوں میں درج کرے کہ محمد معاذ اللہ فلاں راہب کے شاگرد ہیں، حالانکہ تاریخ کے صفحات میں (نہ) اس کا کوئی نشان موجود نہیں۔

تیسرے سوال کے متعلق یہ کہنا ہے کہ اگر مدعی الہام ایسا ہو کہ اُس نے باقاعدہ علوم و فنون کو حاصل کیا ہو اور اپنی سادہ زندگی میں اُس کی فصاحت اور علمی قابلیت بھی مشہور ہو چکی ہو اور اُس کے پاس ایسا سامان بھی موجود ہو، جس کی وجہ سے وہ تصنیف و تالیف پر قادر ہو جائے، بعد وہ ایک نفیس کتاب لکھ کر اُس کے الہامی ہونے کا دعو کرے، تو شبہ کی گنجائش ہو سکتی ہے۔

کیا فیضی کی تفسیر اور سعدی کی گلستاں معجزہ ہے؟ | آپ نے سنا ہو گا کہ قرآن کے مقابلے میں بعض خوش فہم فیضی کی بے نقطہ تفسیر اور سعدی کی گلستاں کو پیش کر کے یہ کہا کرتے ہیں کہ جس طرح ان دونوں کا جواب آج تک کوئی نہ دے سکا، اسی طرح اگر قرآن کا جواب بھی کسی نے نہ دیا، تو وہ معجزہ کیوں کر ہو سکے گا؟ اور اگر وہ معجزہ ہے، تو فیضی کی بے نقطہ تفسیر اور سعدی کی گلستاں بھی معجزہ ہوگی۔

اس کا جواب | حالانکہ دنیا جانتی ہے کہ سعدی اور فیضی، دونوں کے پاس سامانِ تعلیم و تالیف کس قدر موجود تھا۔ کتنے عرصے تک انھوں نے تعلیم حاصل کی۔ برسوں مدرسوں میں پڑے رہے، راتوں جاگے، ہفتوں محنتیں کیں، سال ہا سال کی محنتوں اور دماغ سوزیوں

۱۔ پادری ۲۔ (تاریخ) ۳۔ اصل نسخے میں یہ لفظ ہوا چھوٹ گیا ہے ۴۔ کنا اصل نسخے میں اسی طرح ہے

کے بعد بالفرض فیضی یا حریری یا مہتمنی، یا کوئی اور عربی میں، سعدی فارسی میں، ملٹن انگریزی میں، یا ہومر یونانی میں، یا کالی داس سنسکرت میں؛ ایسے ہوئے کہ ان کا کلام دوسروں کے کلام سے فائق ہو گیا، تو کوئی تعجب کی جگہ نہیں۔

خدا کے کلامِ معجز کی تعریف میں میں پہلے کہ چکا ہوں کہ وہ اسبابِ مُتعارفہ کے توسط کے بِدُون صادر ہونا چاہیے۔ کیا ان لوگوں کی باقاعدہ تحصیلِ علوم، اُستادوں کے ساتھ طویل مُلازمت و ہم نشینی، وسیع مطالعہ، مدّتوں کی مشائی اور جد و گد، اُن کے جاننے والوں سے مخفی ہے؟ اور کیا فائق کلام بولنے اور لکھنے کے لیے یہ ظاہری اسباب نہیں ہیں؟

اگر ہیں اور ضرور ہیں، تو اُن کے کلام کا فائق ہونا بلا سببِ مُتعارف کے ظاہر نہ ہوا۔ بلکہ اتنی خاک چھاننے اور مُصیبت بھگتنے کے بعد اگر ان کا کلام ایسا نہ ہوتا، تو خلافِ عادت ہونے کی وجہ سے موجبِ تعجب ہو سکتا تھا۔ لہذا فیضی کی تفسیر کا ایک خاص صنعت یعنی بے نقط ہونے میں تفوقِ محلّ تعجب نہیں۔ تعجب یہ ہے کہ جس نے کتاب اور کاغذ، قلم، دوات کو چالیس برس تک ہاتھ نہ لگایا، نہ کسی درس گاہ میں قدم رکھا، اُس نے وہ کتاب دنیا کے سامنے پیش کی کہ ہزاروں سعدی اور لاکھوں فیضی اُس کے اوپر قربان ہو جانا اپنا فخر سمجھے اور سمجھتے ہیں اور سمجھتے رہیں گے۔ بلکہ وہ اُن سے زیادہ باکمال ہستیاں اپنی ہستی اور کمالات کا سرچشمہ بھی اُسی نورِ محترم اور اسی کتابِ مقدس کو سمجھتے ہیں۔ دیکھو، خود حضرت سعدی بوستان کے دیباچے میں قرآن لانے والے پیغمبر صلعم کی نسبت کیا فرماتے ہیں (اشعار):

خلافِ پیمبر کسے رہ گزید	کہ ہرگز بمنزلِ خواہر رسید
مہندار سعدی کہ راہ صفا	تو ال رفت جز بر پئے مُصطفیٰ
کلیمے کہ چرخِ فلک طورِ اوست	ہمہ نور ہا پر تو نورِ اوست
یتیمے کہ ناگردہ قرآن درست	کتب خانہ چند ملتِ بشت
بلند آسمان پیشِ قدرتِ محفل	تو مخلوق و آدم ہنوز آب و گل

تو اصل وجود آدمی از نخست
نمانم کد ایں سخن گویمت
ترا عز لولاک نمکیں بس ست
چہ وصفت کند سعدی نام تمام

اور فیضی، جس کو قرآن کے مخالف بہ طور ایک غیر مجروح گواہ کے پیش کرتے ہیں، اپنی تفسیر کی ابتدا میں اُس نبی اُمّی کی کتاب کو خدائی کلام مانتے ہوئے اور اُس کے سامنے تمام علوم و کتب کو (خواہ فیضی کی ہوں یا سعدی کی) ہیج بلکہ محض در بدر قرار دیتے ہوئے کہتا ہے:

العلوم کلّھا صدّاعٌ اِلّا علّم
کلام اللّٰہ، وکلام اللّٰہ لا عدّ
لمحامدہ، ولا حدّ لمکارمہ ولا حصر
لرسومہ، ولا احصاء لعلومہ، وما علّم
علوم کلام اللّٰہ کلّھا اَحَدٌ
اِلّا اللّٰہ ورسولہ واولوالعلم ما
علموا اِلّا عدادہ

پس جب فیضی اور سعدی بھی خود اپنے اقرار کے موافق اس نبی اُمّی صلعم کے دبستانِ علم و حکمت میں ایسے ہیں، جیسا کہ ایک شیر خوار بچہ سمندر کے کنارے پر لیٹا ہوا ہاتھ پاؤں مار رہا ہو، جس کے ہاتھوں کو کبھی کبھی ایک آدھ بوند پانی کی لگ جاتی ہو، تو اب سعدی کی گلسنہ یا فیضی کے کلام کو کلام اللہ کے مقابل لانا، نہ صرف فیضی اور سعدی کا استہزاء اور شاہد کی ضمیر کے خلاف شہادت دلانا ہے، بلکہ حد درجہ کی بے حیائی سے مدعی سست اور گواہ چست کے طور پر اپنے آپ کو ذلیل اور رسوا کرنا ہے۔

علاوہ اس کے ایک بات اور بھی ہے وہ یہ کہ کیا فیضی اور سعدی نے یہ آواز بھی لگائی تھی کہ تمام دنیا بل کر میری کتاب کی گلا یا جُزّائشال پیش کرے اور کیا پھر یہ دعو بھی کیا کہ وہ ہرگز پیش نہ کر سکے گی؟ کیا انھوں نے کسی ایک آدمی کو بھی اپنے مُقابلے کے لیے اُبھارا،

عارِ دِلّائی، مجبور کیا کہ وہ ناچار سامنے آئیں اور ایسے سامان ٹھہرایے کہ اُن کو خواہی خواہی کشاں کشاں سامنے آنا پڑتا اور وہ مجبور ہوتے کہ فیضی اور سعدی کے کلاموں کا مُعارضہ کریں ؟

اور فرض کر دو کہ سعدی وغیرہ تختِ دی اور مبارزہ بھی کرتے، اس پر بھی کوئی میدان میں نہ آتا تو یہ بھی عجز کی دلیل نہیں ہو سکتی تھی، کیوں کہ ممکن تھا کہ دُنیا اُن کا مُقابلہ کرنے میں کوئی عظیم نفع یا نہ کرنے میں کوئی عظیم نقصان نہ سمجھتی اور اس لیے اس دعوے سے بے التفاتی اور استغناء برتنی۔ مگر برخلاف اس کے، قرآن نے شروع ہی سے دعوایا کہ میرا مُقابلہ کوئی نہیں کر سکتا۔ غیرتِ دِلّائی، جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر اٹھایا، چابک مار مار کر مُعارضے کے لیے کھڑا کیا۔

مقابلے کا پرزور چیلنج | اور کہا کہ میرے جیسی ایک چھوٹی سی سُورت سب ہل کر بنا لاؤ اور اسی پر فیصلہ ہے۔ اگر نہ لاسکو اور ہمارا دعوہ ہے یہ بھی کہ کبھی نہ لاسکو گے، تو پھر مجھے خدا کا کلام تسلیم کر دو، ورنہ اُس ابدی عذاب سے ڈرو، جو مُنکرین کے لیے تیار ہے۔

اب دیکھیے کہ چیلنج کس زور کا تھا اور کتنے بھاری نفع اور نقصان کا سودا تھا۔ کیا ایسی حالت میں کوئی کہہ سکتا ہے کہ لوگوں نے توجہ نہ کی ہوگی، یا پوری ہمت اور قوت سے مُقابلے کے لیے نہ نکلے ہوں گے ؟ حالاں کہ تاریخ شاہد ہے کہ پوری توجہ اور پورا اعتنا کیا گیا۔ کیسے کہا جائے کہ توجہ نہ کی گئی ہوگی، جب کہ آپ کے پیچھے پیچھے آدمی دوڑتا تھا کہ ”اے لوگو! یہ مجنوں ہے، اس کی بات نہ سُنو“ تاکہ آپ کا اثر کہیں ٹھننے نہ پاوے۔ آپ کی ہلاکت کی کوشش کی گئی، آپ پر ہر قسم کے حملے کیے گئے، آپ کے قاتل کے لیے بڑے بڑے انعاموں کا اعلان ہوا، اور جب آپ کا اثر برق رفتاری سے بڑھتا گیا اور آپ کی صداقت و حقانیت اور صبر و استقامت کو دیکھ کر ہزار ہا نفوس آپ کے گرویدہ ہو گئے اور آپ کے حریفوں کے خاص خاص لوگ بھی اُن سے ٹوٹ ٹوٹ کر آپ کے حلقہ بہ کوشش غلام بن گئے، خاندان کے خاندان داخل اسلام ہونے لگے، بعض بڑے بڑے مُتمہول اور مُعزز لوگ عیش و عشرت چھوڑ کر آپ کے پاس پہنچے، پیارے پیارے بچوں اور عورتوں

کو خیر باد کہہ کر فقیرانہ حالت میں نہایت بے سروسامانی کے ساتھ آپ کے قدموں پر اڑے اور ایسی سخت کٹھن اور خطرناک زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوئے کہ بشرے اُس کا تختہ تختہ سخت دُشوار تھا، تو آپ کے مخالفوں نے غیظ و غضب سے بے تاب ہو کر جنگ و جدال اور معرکہ آرائی شروع کر دی۔ تلواریں اٹھائی گئیں، صف آرائیاں ہوئیں، خون کی ندیاں بہائیں، جانیں گنوا دیں، خویشتوں اور عزیزوں کے سرگٹوائے، مال و متاع کو برباد کیا، تاکہ کسی نہ کسی طرح محمد صلعم کو مغلوب کر لیں۔

ادھر سے بہت سہل و آسان طریقہ مغلوب بلکہ اثر کے کلینٹا معدوم کرنے کا یہ بتایا گیا کہ صرف تین آیت کے برابر ایک چھوٹی سی سورت اسی شان کے لے آؤ، جس شان میں قرآن تمہارے سامنے ہے، تو ہم خود بہ خود تمام تحریک کو ختم کر کے اپنی جماعت بلکہ اپنے آپ کو بھی تمہارے حوالے کر دیں گے۔

پھر مقابلے کی اس آسان اور سہل ترین تدبیر کے ساتھ اور بھی رنگارنگ سہولتیں، بلکہ ہر ممکن آسانی بھی اُن کے لیے ہم پہنچا دی چُناں چہ جب چیلنج دیا، تو یہ نہ کہا کہ حضرت محمد صلعم کے مقابلے میں اُن جیسے ایک اُمی کو منتخب کرو۔ بلکہ سب کے سب مل کر جتنے فصیح و بلیغ تعلیم یافتہ قبائل ہیں، سب جمع ہو جاؤ۔ اتنے پر بھی بس نہیں، تمام دُنیا کے انسانوں کو بھی جمع کر لو، بلکہ انسانوں کے ساتھ دوسری مخلوق کو بھی شامل کر کے ایک سورہ بنالاد، تو نہ تلوار اٹھانے کی ضرورت ہوگی، نہ خون بہانے کی حاجت رہے گی، نہ سلطنتیں اور سرداریاں تباہ ہوں گی، نہ سارِ شیں کرنا پڑیں گی، اور ساری تدابیر اسی ایک سہل بات پر ختم ہو جائیں گی۔

پہلے گزر چکا ہے کہ وہ اس قدر بولنے والے تھے کہ بولنے میں اور زبان کی فصاحت میں اپنے سوا تمام دنیا کو گونگا کہتے تھے، جو صاف دلیل ہے کہ اُن کے پاس مقابلے کے لیے اس سے بڑھ کر اور کوئی چیز آسان اور سہل نہ تھی۔ مگر اُن کی زبانیں گنگ ہو گئیں، دماغ مفلوج ہو گئے، جو ارجح مُعطل ہو گئے، لیکن اس سہل ترین اور فیصلہ کن مقابلے کی تاب نہ لا سکے۔

اَقْلُنَا مِثْلَ هَذَا كَا جَوَابٍ | کبھی کبھی زبان سے یہ بھی کہتے تھے: لَوْ نَشَاءُ لَقُلْنَا

مثلاً ہذا۔ اگر ہم چاہتے تو اس جیسا کلام کہہ دیتے۔ یعنی نہ ہم نے چاہا نہ کہا، مگر کیوں نہ چلا؟ اس لیے کہ اپنی عزت اور آبرو اور قرآن کے سامنے اپنے عجز اور کم زوری کی پردہ پوشی صرف اسی صورت میں دیکھی۔ اگر وہ جھوٹ موٹ کہہ دیتے کہ یہ ہمارا کلام، قرآن جیسا ہے، تو کہنے والے کی زبان دانی اور فصاحت اور تصدیق کرنے والوں کی سخن شناسی اور سخن فہمی پر ایسا سخت اور بدنامہ داغ لگتا کہ وہ کسی بزم سخن اور محفل ادب میں سُخّہ دکھانے کے قابل نہ رہتے اور دنیا اُن کا تسخّر اڑاتی۔ اس وجہ سے یہ ہمت کسی نے نہیں کی۔ بلکہ جب مضطر ہوئے تو یوں ٹال دیا کہ اگر ہم چاہتے تو کہہ دیتے، مگر ہم نے چاہا ہی نہیں۔ لیکن اس کا فیصلہ ہر عاقل خود بہ خود سابقہ واقعات کو ملحوظ رکھ کر کر سکتا ہے کہ کیا انھوں نے چاہا، یا نہیں!!

بھائیو! کیا یہ ممکن ہے کہ خود تمام مصیبتیں برداشت کریں اور دوسروں کو بھی ہر ایک مصیبت میں ڈالیں، قرآن پڑھنے والوں کے خلاف بادشاہوں کے پاس جا کر مدد مانگیں، ہر قسم کی سازشیں کریں لوگوں کو قرآن سننے سے روکیں اور خود اقرار کریں کہ اس آواز سے ہماری عورتیں اور بچے مستون ہوئے جاتے ہیں، قرآن اُن کے مذہبوں پر ایسی کاری ضرب لگائے، اُن کی سرداریوں کو خاک میں ملا دیے، اُن کے کبر و نخوت کے طلسم کو توڑ دے، اُن کے معبودوں کی حکومت میں زلزلہ ڈال دے، اُن کے جتنے توڑ ڈالے، اُن کی قوتیں پر اگندہ کر ڈالے، بھائی کو بھائی سے، باپ کو بیٹے سے، میاں کو بیوی سے، دوست کو دوست سے بغرض آدمی کو کل محبوب چیزوں سے چھڑا کر صرف اپنا ہی والدِ دشیدہ بنالے، مگر وہ برقِ زبانی اور شیوا بیانیوں کے مدّعی زبانیں سی کر اور بوں کو بند کر کے چُب میٹھے رہیں اور باوجود ایسے عُدب البیان اور قادرُ الکلام ہونے کے، دو چار جُلے بنانے کی خواہش بھی نہ کریں! بے شک ہر میت خوردہ اور در ماندہ آدمی بدحواس ہو کر ایسا ہی کہا کرتا ہے۔ قرآن کسی ایک آدمی یا کمیٹی کا بنا ہوا کلام نہیں | جب کوئی بات نہ بن پڑتی تھی اور قرآن کے علوم کو محمد اُمّی صلعم کے حالات سے تطبیق نہ دے سکتے، تو کہتے: اِنَّمَا يَعْلَمُهُ بَشَرٌ مِّثْلُ مُحَمَّدٍ کو قرآن کوئی دوسرا آدمی تعلیم دیتا ہے۔ اور یہ اشارہ ایک شام کے نصرانی کی طرف تھا۔ اس کا جواب بھی قرآن نے ایسا دیا کہ دنیا پر واضح ہو گیا کہ یہ مقولہ بھی نہایت

بے بسی کی حالت میں اُن سے صادر ہوا تھا:

لِسَانُ الَّذِي يُلْحِدُونَ إِلَيْهِ
أُعْجِبُ وَ هَذَا لِسَانُ
عَرَبِيٍّ مُبِينٍ ۝ (نحل آیت ۱۰۳)

یعنی یہ لوگ کج روی سے جس شخص کی طرف قرآن کی نسبت کرتے ہیں، اُس کی زبان عجمی ہے اور یہاں ایک روشن اور فصیح زبان عربی کے مقابلے کا چیلنج دیا جا رہا ہے۔

جس سے بڑے بڑے قریش عرب جان چراتے ہیں، وہ عجمی غلام اُسے کیا جانے؟ کبھی کبھی بالکل ہی بدحواس ہو کر کہہ اُٹھتے تھے:

إِنَّ هَذَا إِلَّا فُلْكَ ۝ افْتَرَاهُ
أَعَانَهُ عَلَيْهِ قَوْمٌ آخِرُونَ ۝
(فرقان آیت ۴)

یہ قرآن اس کے سوا کچھ نہیں کہ (معاذ اللہ) محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اختراع (گھڑٹ) ہے، جس کی تصنیف میں دوسری جماعت نے اس کی مدد کی ہے۔
دیکھو، کس قدر مذہب و جی حرکات ہیں۔ بے ساختہ زبانوں سے نکل جاتا ہے کہ ایک انسان سے ایسا کلام ممکن نہیں کہ بن پڑے، ہونہ ہو یہ کمیٹی کا کام ہوگا، اس کا جواب بھی مُسکرت اور دندان شکن دیتے ہوئے فرمایا:

فَقَدْ جَاءُوا ظُلْمًا وَ زُورًا (فرقان ۴) ارے ایسا ظلم اور دُور و ہارے ایسا سفید جھوٹ! اگر بالفرض ہمارے پاس کمیٹی ہے، تو تم اس سے زیادہ آدمیوں کی کمیٹی بنا سکتے ہو۔ تم کو تو تمام جن و انس کی کمیٹی بنانے کی اجازت دی جا رہی ہے۔ پھر جب تمام انسانوں کو جمع کرنے کی تم کو اجازت دی گئی، تو تم ہم سے دعوے کے ساتھ اس کمیٹی کے تمام افراد بھی اگر تمہیں معلوم ہوں، مانگ لو، جو تمہارے کہنے کے موافق ہمارے پاس ہے، اس لیے کہ وہ بھی انسانوں میں داخل ہیں جن کے جمع کرنے کی تم کو مہلت دی گئی ہے۔ باوجود اس قدر وسعت اور انسانی بہم پہنچانے کے بھی اگر مقابلہ کلام ایزدی کا نہ کر سکے اور نہ کر سکو گے اور یہ بھی مطالبہ کیا کہ تم فلاں فلاں آدمی کو ہمارے ساتھ دے دو، جن پر تم کو خیال ہے کہ وہ کمیٹی کے ارکان ہیں، تو سمجھ لو کہ یہ محض شرارت اور ظلم اور دروغ بے فروغ ہوگا کہ قرآن کی تصنیف کسی مجہول الحال کمیٹی سے منسوب کرتے رہو۔

اس مقولہ کے جھوٹ ہونے کی اور ایک دلیل | پھر کیا کسی کمیٹی کا پنچایتی کلام ایسا ہو سکتا ہے؟ آپ نے بڑے بڑے فصیح البیان اور عمدہ بولنے والے بھی دیکھے ہوں گے، کیا کوئی ایسا لکچرار آپ کی نظر میں ہے، جو ہر ایک مضمون پر یک سا بولنے کی قدرت رکھ سکتا ہو؟ کوئی آدمی ہر مضمون کے بیان پر یک سا قدرت نہیں رکھ سکتا بلکہ بڑے بڑے قصیدوں میں دوہری چار اشعار منتخب ہو جاتے ہیں۔ اس لیے کہ کسی متکلم کو ہر مضمون پر پوری قدرت نہیں ہوتی۔ چنانچہ علمائے ادب کا اعتراف ہے کہ امرؤ القیس گھوڑوں کی تعریف اچھی کرتا ہے۔ نابغہ خون و خشیت میں، عشتیٰ شراب کی طلب اور تعریف میں، زہیرِ رغبت و رجا میں اچھا لکھتا ہے۔ جیسے نظامی و فردوسی رزم و بزم میں، سعدی و عظمیٰ دیند میں تفوق رکھتا ہے، لیکن دوسرے فن میں جا کر ان کی جولانیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ بوستاں میں ایک جگہ جنگ کی کہانی آگئی، وہیں سعدی کی زبان سست پڑ گئی۔ بوستاں کے پانچویں باب میں اس حکایت کو دیکھ لو کہ نظامی اور فردوسی کے مقابلے میں سعدی کا کلام کس قدر پھسپھسا ہے، کیوں کہ رزمیہ کلام لکھنا سعدی کا فن نہیں تھا۔

کسی مشہور سے مشہور شاعر کا دیوان یا کسی مُسلم سے مُسلم عالم اور حکیم کی کتاب کُفِّ ما اتفق اٹھا کر پڑھ جاؤ، ازل سے آخر تک یک سا زور قائم نہیں رہ سکتا۔ قرآن کو ازل سے آخر تک دیکھ لو، کس قدر مضامین مختلفہ کی زد ہے، جو کہ نہایت روانی، سلاست، آب و تاب اور شان و شوکت سے بہا رہی ہے اور ہر مضمون کو کس قدر قوت اور جزالت و فصاحت کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے! کہیں معاش کا بیان ہے، نکاح و طلاق کے قواعد کی تعلیم ہے، کہیں فرائض میت تقسیم کی جاتی ہے، کبھی نماز روزہ کا رغل ہے، کبھی جہاد کا بیان ہے، لڑائی کے نقشے کھینچے جاتے ہیں، کہیں سینین ماضیہ کے تاریخی واقعات ہیں، کبھی دلوں کو رولانے والی پند و نصائح بیان کی جاتی ہیں، کبھی بہشت کا شہنشاہ سامنے ہے کبھی دوزخ کا عذاب، یہ سب کچھ ہے مگر طرز بیان میں کوئی سستی نہیں،

۱۷ جنی فصاحت و بلاغت سے گذشتہ سالوں کے مکہ نعمت، ناز و نعمت کی زندگی

کم زوری نہیں، انخطاط نہیں۔ ہر موقع پر اقرار کرنا پڑتا ہے کہ اس کے مقابلے سے تمام جن و بشر عاجز ہیں اور ہر جگہ زبان پر آتا ہے!

کرشمہ دامن دل می کشد کہ جاییں جاست

اول سے آخر تک ایک ہی اسلوب اور ایک ہی طرح کا زور ایک ہی رنگ ڈھنگ اور سارے کلام کی یہ یکسانیت پتا دے رہی ہے کہ یہ کسی مخلوق کا بیان یا کسی کمیٹی کا کلام نہیں؛ بلکہ یہ اُس کا کلام ہے، جس کی صفات سب کی سب کامل اور غیر متبدل، لازوال اور نقص و فتور سے منزہ ہیں:

و لَوْكَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا

اور اگر (قرآن) خدا کے سوا کسی اور کے پاس سے

فیہ اختلافًا کثیرًا۔ (سورہ نسا آیت ۸۲) آیا ہوتا، تو ضرور اُس میں بہت سا اختلاف پاتے

خدائی کلام سے خدائی نشان ملتی ہے | پھر دیکھو، اول سے آخر تک تمام مضامین

نہایت شوکت اور کبریاء و عظمت بھرے الفاظ اور زوردار لہجے میں ادا کیے گئے ہیں۔ اگر

یہ کلام اس بشر کا ہوتا، جس کی زبان سے ہم تک پہنچا، تو اس کی مظلومیت اور دشمنوں

کی اُس پر چڑھائیاں تو سب کو معلوم ہیں، ناممکن تھا کہ اس کلام کے اندر کہیں نہ کہیں

ظالموں کے سامنے تسلی، خوشامد، مدائنت، بے چارگی اور مرعوب ہونے کے آثار موجود

نہ ہوتے، جن کا نام و نشان بھی قرآن میں اوّل سے آخر تک موجود نہیں۔ بلکہ جس زور و

شور اور خدائی شوکت سے شروع ہوا، اُسی تزک و احتشام اور زور کے ساتھ ختم

بھی ہوا۔

اگر کسی نے مقابلہ کیا ہوتا، | ممکن ہے کوئی یہ کہہ بیٹھے کہ شاید قرآن کی نظیر پیش کی گئی

تو اس کا ضائع ہونا محال تھا | ہو، مگر وہ باقی نہ رہی ہو، تو میں کہتا ہوں کہ ایک مظلوم

اور بے یار و مددگار کلام تو اب تک برابر موجود ہے، مگر عرب کے بڑے بڑے رئیسوں

بلکہ دنیا کے تمام باطل مذاہب و ملل کی دلی تمنا جس کلام سے پوری ہو جاتی ہو، وہ باقی نہ

رہے، کیا اسے عقل سلیم باور کر سکتی ہے؟

پھر جب کہ موافقوں کی تعداد سے مخالفوں کی تعداد کہیں زیادہ ہو، روئے زمین پر

دشمن پھیلے پڑے ہوں، جو ہر آن ایسی چیز کے تجسس میں آغاز اسلام سے آج تک رہے، جو قرآن کے اس دعوے کو ٹھنڈا کر دے۔ مسیلمہ کذاب نے قرآن کے سامنے کچھ منہ چڑایا تھا، وہ تاریخ میں موجود ہے۔ باوجودے کہ وہ بہت زیادہ گندا اور بدبودار اور رکیک اور خلاف تہذیب کلام ہے مگر وہ بھی اب تک موجود ہے، یعنی: اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ خَلَقَ الْبَشَاءَ اَفَرَا جَا، فَتَوَلَّوْا جِهَتًا اٰیَلًا جَا۔ سورہوں نے لفظ لفظ کو محفوظ رکھا۔ جب ایسے رکیک اور ناشایستہ کلام کو بھی ضائع نہ ہونے دیا، تو کسی اچھے کلام کو، اور وہ بھی ایسا اچھا جو بہ فرض محال قرآن سے بھی اعلیٰ اور اتر ہو، کس طرح ضائع کیا جاسکتا تھا! اگر قرآن سے بہتر فصیح و بلیغ کلام ادبی ٹریچر سے کُٹ ہو گیا، تو قرآن کا یہ دوسرا اعجاز ہو گا کہ وہ اپنے سے غائب اور قوی کو بھی اس طرح فنا کر ڈالتا ہے کہ آج صفحہ ہستی پر کوئی اُس کو زبان پر لانے والا بھی نہیں۔

عربی نہ جاننے والے کس طرح قرآن کی فصاحت کو پہچان سکتے ہیں؟ شاید کہو گے کہ ہم تو عربی نہیں جانتے، ہماری سمجھ میں کس طرح قرآن کا اعجاز آئے؟ تو یاد رکھو کہ ہر فن میں اُس کے اساتذہ اور ماہرین کے فیصلے کے آگے سر جھکانا پڑتا ہے پھر عربی زبان آج بھی زندہ زبان ہے، سنسکرت کی طرح مُردہ نہیں۔ بیروت، مصر، قاہرہ وغیرہ میں اس وقت بھی بہت سے ایسے نصارا اور یہود موجود ہیں، جن کے مقابلے میں بڑے بڑے ادیب قلم نہیں اٹھا سکتے۔ انھوں نے عربی زبان میں عجیب و غریب کتابیں لکھی ہیں، عربی لغت تیار کی ہے، ہزار ہا چھوٹے چھوٹے رسائل اور موٹی موٹی کتابیں تصنیف کر ڈالی ہیں۔ اگر تم نہیں جانتے، تو جاؤ اُنھی سے کہو کہ ایک سورت قرآن کے جواب میں بنا کر دے دیں۔ وہ بھی اسلام کے دوست نہیں بلکہ تم سے بڑھ چڑھ کر اس کے دشمن ہیں، ہر ممکن سعی سے وہ اسلام کو مٹانا چاہتے ہیں۔ مگر یہ حوصلہ آج تک نہ کسی فرد کو ہوا، نہ کسی انجمن کو قرآن کے چہارہ صد سالہ چیلنج کو منظور کرتا۔ وہ اسی میں اپنی لیاقت اور عزت سمجھتے ہیں کہ اس طرف کا قصد نہ کریں۔

تم بھی لاکھوں روپیہ شدھی سبھاؤں پر صرف کر رہے ہو، جس طرح عیسائی اپنے

مثنوں پر کروڑوں روپیہ لگاتے ہیں۔ بغداد کی آریہ سماج کو لکھو کہ وہ وہاں کے مثنوں کو یہ مشورہ دے کہ سب مل کر قرآن کے جواب میں چند سطر لکھ کر شائع کر دیں۔ مگر ہاں بعد میں ان کی فصاحت اور رسوائی کا ذمے دار تم کو ہونا پڑے گا!

اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ کوئی مضمون قرآن ہی سے لے لو اور اُسی قدر مزایا اور لطائف کے ساتھ اپنی عبارت میں اُس کو ادا کر دو جس قدر مزایا اور لطائف قرآن کی عبارت میں مرعی ہیں۔ قرآن کے پیرو تم کو بتلا دیں گے کہ چراغِ مُردہ کو نورِ افتاب سے کیا نسبت ہے۔

قرآن کا اصلی اعجاز اُس کے انتہائی | نردول قرآن کے وقت بعض لوگوں نے یہ درجے کے بلیغانہ نظم و اسلوب میں ہے بھی کہا تھا کہ یہ سب مختصرات ہیں۔ و

يقولون افترى على الله كذباً جواب یہ ہے کہ: رَقْلٌ فَأَتُوا بَعْشَرَ سِوَرٍ مِثْلَهُ مُفْتَرِيَاتٍ اچھا، اگر ہدایت کی باتیں نہ سہی، تو تم بھی ایسی ہی مُفْتَرِيَات یعنی گھڑی ہوئی باتیں ایسے طرزِ بیان میں لے آؤ!

محض ایک شاعرانہ مضمون کے ادا میں بھی بہت بڑا فرق ہوتا ہے۔ ایک ہی خیال ہے جس کو شاعر ایک رنگ سے ادا کرتا ہے۔ دوسرا اُسی میں ایسی لطافت پیدا کرتا ہے کہ پہلے شاعر کا کلام اُس کے سامنے بیچ معلوم ہونے لگتا ہے۔ ذوقِ ملک الشعراء ایک غزل میں لکھتا ہے کہ:

آنکھ سے آنکھ ہے لڑتی، مجھے ڈر ہے دل کا

کہیں یہ جائے نہ اس جنگ و جدل میں مارا

اسی خیال کو دوسرا ایک شاعر مکندرام (جس کا نام بھی شاید کسی کو معلوم ہو) ایسی لطافت کے ساتھ ادا کرتا ہے کہ سُخن شناسوں کو ناچار اُسی کے حق میں فیصلہ دینا پڑا، کہتا ہے:

دل کی نہیں تفصیر مکنہ آنکھیں ہیں ظالم
یہ جا کے نہ لڑتیں، وہ گرفتار نہ ہوتا
دیکھ لو ذوق کا کلام مکنہ آرام کے مقابلے میں کیسا پھیکا پڑ گیا ہے! اسی طرح فردوسی
نے کہا تھا:

جہاں را بُندی و پستی توئی
ندانم چہ آنچہ ہستی توئی

نظامی نے اس کے مقابلے میں فرمایا:

پناہ بلندی و پستی توئی
ہمہ نیستند آنچہ ہستی توئی

پہلے مصرعے میں ”پناہ“ اور دوسرے میں ”نیستند“ نے نظامی کے شعر کو فردوسی کے
شعر سے بلیغ اور بہت صاف کر دیا ہے۔ فردوسی نے لکھا تھا:

زہے بارگاہے زافرا سیاب
زمشرق بمغرب کشیدہ طناب

نظامی کہتے ہیں:

زہے بارگاہے کہ چوں آفتاب
زمشرق بمغرب کشیدہ طناب

دیکھو، ”چوں آفتاب“ نے شعر کو کیسا مُبرِّق اور لاجواب بنا دیا ہے، اور ”زافرا سیاب“
کی ”ز“ کی ضرورت بھی نہیں رہی۔ اردو میں قمر کا شعر ہے:
مرضِ جگر مرا خاک ہوا چھتا تم سے
خود سیجا ہوا جی، اور ہیں بیمار آنکھیں
جو ہرنے اس مضمون کو کس قدر خوبی سے ادا کیا ہے:

آپ سے اپنا مددوا بھی نہیں ہو سکتا
کیسے عیسیٰ ہو کہ جب دکھو، میں بیمار آنکھیں
مد آنکھوں، کے ساتھ لفظ ”دیکھو“ دیکھنے کے قابل ہے۔ نسخ کہتا ہے
شکل نظر نہیں پڑی، آیا نہیں پیام ابھی
عمر ہوئی کہ ایک سی، حالت چشم و گوش ہے
غالب نے اس کو کس قدر حسرت اور لطیف بنا دیا، کہتے ہیں:
نئے مُردہ وصال نہ نظارہ جمال
مدّت ہوئی کہ آشتی چشم و گوش ہے
ذوق نے کہا تھا:

ہزار لطف جو ہیں ہر ستم میں جاں کیے
ستم شریک ہوا کون آسمان کیے
کسی اُستاد نے اسی مضمون کو اس طرح لکھا ہے:
چرخ کو کب یہ سلیقہ ہے ستم گاری میں
کوئی معشوق ہے اس پردہ زنگاری میں
سُخن شناس سمجھتا ہے کہ دوسرا شعر اَدل سے بہ اعتبارِ پاکی الفاظ و حُسن ادا و خوبی
ترکیب بالاتر ہے اور الفاظ ”معشوق“ و ”پردہ زنگاری“ نے اُس کے لطف کو
دو بالا کر دیا ہے۔ مومن خاں کہتے ہیں:

خوں بہا قاتل بے رحم سے، مانگا کس نے
کہ فرشتے مجھے یاں داغِ درم دیتے ہیں
اس کے مقابلے میں ذوق کا کلام ملاحظہ ہو:

کہنتی تھی ماہی بریاں کہ دبیرانِ قضا
داغ دیتے ہیں اُسے جس کو درم دیتے ہیں
ظاہر ہے کہ شعر اَدل میں ”داغِ درم دینا“ اور ”خوں بہا مانگنا“ محض اِدعا ہے اور

دوسرے شعر میں ”داغ دینا“ اور ”صاحبِ درم“ ہونا ثابت ہے۔ دیکھو یہاں داغ اور درم کا مضمون لے کر ایسی طرح ادا کیا کہ پہلے کی نسبت شعر نہایت بلیغ ہو گیا۔

یہ چند نمونے ہم نے اس لیے پیش کیے ہیں کہ یہ ثابت ہو سکے کہ بعض شاعرانہ تخیلات اور مفروض و مختَرع مضامین کے ادائیں بھی ترکیب کی بندش اور الفاظ کی چستی اور روانی اور دیگر لطائف و مزایا کی رعایت سے تسر، قدر فرق اور تفاوت ہو جاتا ہے۔ پس ہم اجازت دیتے ہیں کہ آج بھی سارے فصیح و بلیغ مل کر ایک دو قصے کہانیاں ہی ایسی عبارت میں پیش کر دیں، جو قرآن کی کسی چھوٹی سے چھوٹی سورت کے مقابلے میں لطیف تر اور فصیح تر ہو۔ کیا اس قدر سہولتیں عطا کرنے کے بعد بھی اگر مقابلے سے عاجز رہے، تو یہ اس کی دلیل نہ ہوگی کہ یہ کلام دنیا کے خالق اور مالک کا ہے !

خدائی کام سے توحید اور خدائی کلام سے رسالت کا ثبوت | میں نے کہا تھا کہ خدائی کام بندوں کے کام سے اس طرح ممتاز ہوتا ہے کہ بندوں کو اس جیسے کام پر کوئی دسترس نہیں ہوتی۔ اسی طرح اللہ کا کلام بھی بندوں کے کلام سے الگ پہچانا جاتا ہے کہ ویسا کلام بنانا بندوں کے اختیار اور قبضے میں نہیں ہوتا۔ قرآن کریم نے ان دونوں مضامین پر ایک ہی آیت میں متنبہ فرمایا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے :

یَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي	تم کو اور تمہارے اُسلان اور تمہارے
خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ	لیے زمین کا فرش، آسمان کی چھت اور
تَتَّقُونَ، الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ فِرَاشًا	بادلوں کی بارش درختوں کے پھل
وَالسَّمَاءَ بَنَاءً وَأَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً	جس پر در در گار نے بنائے، اس
فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَكُمْ فَلَا تَجْعَلُوا	کی عبادت کرو اور اُس کا مثل

بِئْسَ الْأَعْدَاءُ أَنْتُمْ تَعْلَمُونَ۔ (بقرہ آیت ۲۸) مت قرار دو۔

یعنی جب خدا کے کاموں کا کوئی مثل نہیں لاسکتا، تو خدا کو بھی بے مثل ماننا ضروری

ہے، اسی طرح خدائی کلام کا مثل لانے سے جب سب عاجز ہوں، تو اُس کو خدا ہی کا کلام یقین کرنا ضروری ہوا اور اسی لیے جو بندہ اس کلام کو لایا ہے، اُس کی تصدیق بھی لازم ہوتی۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

وَإِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا
نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا فَأْتُوا
بِسُورَةٍ مِّمَّنْثِهِ وَاذْعُوا
شُهَدَاءَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ إِنْ
كُنْتُمْ صَادِقِينَ . (بقرہ آیت ۲۳)

اور وہ جو ہم نے اپنے بندے (محمد) پر (قرآن) اتارا
ہے، اگر تم کو اس میں شک ہو اور یہ سمجھتے ہو کہ یہ
کتاب خدا کی نہیں (بلکہ آدمی کی بنائی ہوئی ہے) اور
(اپنے اس دعوے میں) سچے ہو، تو اس جیسی ایک سورت
(تم بھی بنا) لاؤ اور اللہ کے سوا اپنے حمایتوں کو (بھی) بلاؤ۔

ممکن ہے کہ کسی کو یہ خلیجان رہے کہ خدائی کاموں کو ہم بہ ظاہر کسی فاعل مختار
سے صادر ہوتے نہیں دیکھتے، بہ خلاف اس کے، خدائی کلام کو ہم ایک ذی شعور اور
بااختیار مُتکلم انسان کی زبان سے سنتے ہیں۔ اسی لیے ہمارے لیے یہ ممکن ہوتا ہے کہ وہ
کلام خواہ کتنا ہی اُغلی و اُرفح ہو، ہم اُسے مُتکلم کی طرف منسوب کر دیں جس کی زبان
سے ہمارے کانوں تک پہنچ رہا ہے۔

لیکن اُس کا یہ شبہ محض سطحی ہے۔ غور کیجیے کہ اگر ایک چھ سات سال کا دیہاتی
بچہ آپ کے سامنے آئے، جس کو کسی نے گلستاں یا بوستاں کا ایک باب، یا عُرُنی یا
قَاتَنی کا ایک قصیدہ، یا حافظ شیرازی کی ایک غزل، یا کسی اور بڑے عالم یا حکیم یا شاعر
یا خطیب کا کوئی منتخب کلام یاد کرادیا ہو، وہ آپ کے رُوبہ و نہایت صاف و صحیح لب و
لہجے میں اُسے زبانی ادا کر دے، اور فرض کر دو کہ آپ کو یہ تعین نہ ہو کہ اصل کلام کس کا ہے؛
تو کیا واقعی اس صورت میں آپ محض اتنا دیکھ کر کہ یہ کلام اسی بچے کے کام و دہن سے
نکل رہا ہے، یہ یقین کر لیں گے کہ بے شک یہ کلام اسی بچے کا تصنیف کیا ہوا ہے اسی کے
دل و دماغ کا نتیجہ ہے؛ خصوصاً جب کہ وہ بچہ خود بھی کہہ رہا ہو کہ جناب یہ میرا کلام نہیں اور
میں ایسی قابلیت رکھتا ہوں کہ ایسا کلام بنا سکوں اور اُس کے سارے بستی والے بھی
مُوافِق اور مُخالف گواہ ہوں کہ اس بچے نے کبھی قبل ازیں ایسی اعلیٰ تعلیم اور صحبت نہیں

پائی جو ایسا کلام تصنیف کرنے پر قادر کر دے۔

کہا آپ ان سب حالات کی موجودگی میں بھی برابر یہی کہتے چلے جاتیں گے کہ نہیں، یہ سب اسی کی تصنیف ہے کیوں کہ بچہ ذی شعور، با اختیار، بولنے والا انسان ہے اور اسی کے مخلوق سے ہم یہ آواز سن رہے ہیں! میں سمجھتا ہوں کہ پرلے درجے کا بلیڈ، احمق، جاہل اور مستعصب بھی اس کی جرات نہ کرے گا۔

تو ثابت ہوا کہ محض اس قدر دیکھ لینے سے کہ ایک کلام ایک شخص کے کام و دہن سے نکل رہا ہے، یہ یقین نہیں کیا جاسکتا کہ وہ کلام اُسی کا ہے۔ خصوصاً جب کہ وہ اپنے سے نفی بھی کر رہا ہو اور اُس کا ایک جھوٹ بھی عمر بھر ثابت نہ ہوا ہو اور اُس کے حالات زندگی بھی نفی کی تائید کرتے ہوں اور خود اُس شخص کے کلام کا بڑا بھاری ذبیحہ (احادیث) بھی محفوظ اور مُدَوَّن ہو اور اُس میں کا کوئی حصہ باوجود غایت درجہ کی فصاحت و بلاغت کے، اُس کلام کے کسی حصے کی ہم سری نہ کر سکتا ہو اور ساری دنیا ویسا کلام پیش کرنے سے تھک چکی ہو۔ اندریں حالات، آپ ہی فیصلہ کریں کہ ایک ایمان دارانہ طالب حق کو کیا یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ:

گفتہ او گفتہ اللہ بود
گرچہ از مخلوق عبد اللہ بود

لاریب، اُس کی یہی شان ہے!

وما ینطق عن الہوی، ان ہو
الآ وحی یوحی، (انجم آیت ۴)

(بلکہ ایہ قرآن) جو بڑھ کر سناتے ہیں، وحی
(آسمانی) ہے جو ان پر نازل ہوتی ہے۔

اور بلاشبہ قرآن کا لانے والا وہی نبی ہے، جس کی نسبت تو رات میں سیکڑوں برس پہلے خبر دی گئی تھی کہ خدا اُس کے منہ میں اپنا کلام ڈالے گا۔

نزول قرآن کے وقت نبی کی کیفیت | قرآن جس وقت اُترتا تھا، یا بہ الفاظ دیگر

جب خدا حضرت محمد صلعم کی زبان سے بولتا تھا، اُس وقت آپ کے حالات عام تکلم اور خطاب کے حالات سے بالکل ممتاز اور جُدا گانہ ہوتے تھے، کیوں کہ

بشری کا بُدگو خدائی صفت کا مظہر بنا پڑتا تھا اور تمام روحانی قوتیں اور ملکوتی طاقتیں جو موحیؑ الیہ میں فطراناً ودیعت کی جاتی ہیں، اس مادی عالم سے یک سو ہو کر ملا بر اعلیٰ اور عالم غیب کی طرف سمت جاتی تھیں، تو بشری خصائص اور ملکوتی قوا کے تجاذب اور تصادم سے قدرتی طور پر ایسے وقت میں وہ آسمانی موحیؑ الیہ کے جسم پر طاری ہونے چاہئیں، جو عام حالات و اوقات سے مبرا بنے ہوں۔ چنانچہ سیرت نبوی اور احادیث کا مطالعہ کرنے والوں سے یہ چیزیں پوشیدہ نہیں ہیں۔

باقی، تمام اوقات میں جو مکالمات و مخاطبات نبی کریم صلعم کے ہوتے تھے، اُن میں ایسے علائم کا نام و نشان نہ تھا۔ کیوں کہ اُس وقت ایک بشر کا کلام تھا جو اُسی کی زبان سے ادا ہو رہا تھا۔ گو جن علوم و مطالب پر وہ کلام مشتمل ہوتا تھا، وہ کیسے ہی صادق اور عمیق بلکہ الہامی ہوں۔

قرآن کی تلاوت کا اثر خود | جس وقت نبی کریم صلعم قرآن کی تلاوت فرماتے
آل حضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر | تھے، یا کسی دوسرے سے سنتے تھے، تو آپ خود بھی اس قدر متاثر ہوتے تھے کہ خود اپنے کلام کو پڑھ کر اتنا متاثر نہ ہوا داتا مستور نہیں۔ آپ کا چہرہ خوف سے متغیر ہو جاتا، آنکھیں بہنے لگتیں، گریہ طاری ہو جاتا، راتوں کو جب کہ مخلوق بسترِ استراحت پر آرام کرتی تھی، آپ خدا کے سامنے کھڑے ہو کر قرآن پڑھتے حتیٰ کہ پاؤں سوج جاتے اور قدموں کا دَرَم دیکھ کر لوگ رحم کھاتے اور آپ فرماتے: اَفْلا اَکون عبدًا شکورًا! ایک ہی آیت کو کبھی بار بار پڑھتے اور روتے تھے۔

غرض، قرآن کا جو اثر آپ کی زبان سے سننے والے صحابہ قبول کرتے تھے، اُن سے زائد آپ پر ہوتا تھا۔ ایک صاحب بصیرت، جو خوفِ خدا کی ذرا سی بھی ٹیسِ دل میں رکھتا ہو، اتنی ہی بات سے قرآن کی نسبت ایمان لا سکتا ہے کہ وہ محمد صلعم کی

۱۔ قالب، انسانی جسم ۲۔ صاحبِ دُحیٰ ۳۔ تجاذب: کشش، کششِ ثقل ۴۔ مختلف

۵۔ آثار و علامات

تصنیف نہیں ہے اور نہ وہ کسی ایسے بشر یا کمیٹی کی تصنیف ہے، جن کا نام اور حال اس حضرت صلعم نے ساری عمر مخفی رکھا ہو۔

قرآن کا اثر سامعین پر کیا ہوا؟ | قرآن نے اُس قوم پر کیا اثر ڈالا، جس نے اُسے نوبہ کو اور تازہ بہ تازہ پیغمبر صلعم کی زبان مبارک سے سنا تھا؟ اس سوال کا جواب تاریخ کے اُن درخشاں واقعات میں سے ہے، جن کا اعتراف دوست اور دشمن ہر ایک کو کرنا پڑا ہے۔ دنیا نے جب سے جنم لیا ہے آسمان سے جب سے سایہ ڈالا، زمین نے جب سے اپنی پشت پر اولادِ آدم کو اٹھایا، کبھی ایسا عظیم، ایسا سریع، ایسا محیر العقول انقلاب چشمِ فلک نے نہیں دیکھا ہوگا، جیسا بے مثال انقلابِ عرب کی حالت میں بلا واسطہ اور سارے رُبعِ مُسکُوں کی روحانی حالت میں بالواسطہ اُس بے مثال ذرا کے اُتارے ہوئے بے مثال قرآن کی بے مثال تعلیم سے نمودار ہوا۔ صاحبِ آیاتِ بینات لکھتا ہے کہ قرآن حکیم ایک ایسے زمانے میں اُترا، جب کہ دنیا ایک عجیب روحانی سکے کی حالت میں تھی اور آپ ایسے ملک میں مبعوث ہوئے، جہاں اخلاقی تعلیم کا کچھ سامان نہ تھا اور ایسی قوم کی اصلاح آپ کے ذمے کی گئی، جو سوائے اوہام اور فاسد عقیدوں اور باطل خیالات اور غلط رایوں اور وحشیانہ اعمال اور بد اخلاقی اور نفاق اور جنگ جوئی کے، کسی قسم کی اخلاقی خوبی نہ رکھتے تھے، مگر آپ کے الہامی بیان اور خدائی قوت نے اُن پر ایسی عجیب و غریب تاثیر کی کہ اُس سے اُن کی تمام ظاہری و باطنی حالتیں بدل گئیں، برسوں کے بہکے ہوئے خدا کی راہ پر چل سکے اور مدتوں کے سوئے ہوئے غفلت کی نیند سے چونک پڑے۔ جو مُشرک تھے وہ مُوجد ہو گئے، جو کافر تھے وہ ایمان لائے، جو بُت پرست تھے وہ بُت شکن بن گئے، جو گمراہ تھے وہ خدا کی راہ دیکھانے لگے۔ جاہلانہ حمیت اور وحشیانہ عصبیت کا نام اُن میں نہ رہا، خاندانی جھگڑے اور پشتینی عداوتیں جاتی رہیں، دماغِ نخوت و غرور سے خالی ہو گئے اور اُن کے دل صبر و توکل، حلم و بردباری، زہد و پرہیزگاری اور جمیع اخلاقی صفات سے بھر گئے۔

آپ کی تعلیم و ہدایت نے ایک ایسا گروہ خدا پرست، پاک طبیعت، راست باز، نیک دل لوگوں کا قائم کر دیا، جس کی کوششوں سے شرک و بت پرستی کی آواز، جو تمام جزیرہ نماے عرب میں گونج رہی تھی، بند ہو گئی اور اس کے بدلے ایک بے چون و بے چگون، بے شبہ و بے نموں خدا کی منادی پھر گئی۔ بتوں نے عدم کا راستہ لیا، بت خانوں کا نشان مٹ گیا، آتش کدے ٹھنڈے پڑ گئے، تثلیث کا طلسم ٹوٹ گیا، اودھام پرستی کا باطل خیال باطل ہو گیا۔

جاء الحق و زهق الباطل حق ظاہر ہو گیا اور باطل مغلوب، اور ظاہر ہوا الباطل کان زهوقاً۔ (بنی اسرائیل آیت) باطل مغلوب ہی ہو کر رہتا ہے۔ کیا اس سے اس امر کا مشاہدہ اور درخشاں ثبوت نہیں ملتا کہ آپ حقیقت میں سچے رسول اور خدا ہی کی طرف سے مویّد تھے! ورنہ انسان کا کام نہ تھا کہ وہ ایسا انقلاب عظیم عرب کی روحانی اور اخلاقی حالت میں پیدا کر دیتا اور ایسے جگمگو، ستم پیشہ لوگوں کو، جو بات بات پر لڑتے اور جھگڑتے تھے، اخوت کے ایک رشتے میں باندھ دیتا اور ان کی پشتینی عداوتوں اور کینوں سے اُن کے دلوں کو ایسا صاف کر دیتا کہ اس کا کچھ اثر باقی نہ رہنا، بلکہ دنیا میں اُن کو اخلاق اور انسانیت کا نمونہ بنا دیتا۔

سرور کائنات صلعم کی ہدایت کی ایسی عجیب و غریب تاثیر اور ایسے حیرت انگیز نتائج کو دیکھ کر منکرین بھی اس بات کے معترف ہیں کہ درحقیقت یہ بات بشری قدرت سے خارج تھی۔ چناں چہ کوئی اُن میں سے کہتا ہے کہ: ”وہ پیام جو آپ لائے، وہ ایک سچا اور حقیقی پیام تھا جس کا مخرج وہی ہستی تھی جس کی نگاہ کبھی کسی نے نہیں پائی“ کوئی لکھتا ہے کہ قرآن ہی کی تعلیم کا یہ اثر ہے کہ عرب کے رہنے والے ایسے بدل گئے، جیسے کسی نے سحر کر دیا ہو، ”مُتَعَصِّب سے مُتَعَصِّبِ عِیسَیوں کا یہ اقرار ہے کہ دینِ سحی کی ابتدا سے آلِ حضرت صلعم کے وقت تک کبھی حیاتِ روحانی ایسی برا نگینہ نہیں ہوئی تھی، جیسی کہ اسلام کی تعلیم سے ہوئی۔

خدا نے جس سے کلام کیا یعنی قرآن اُس پر اتارا، اب قرآن کے کلام الہی ہونے اس کی فہم و اخلاق کا کیا حال تھا؟ پر ایک اور جہت سے بھی غور کرو۔ وہ یہ کہ خداوند کریم نے جس کی زبان سے کلام کیا، اُس کی فطرت کیسی تھی؟ پیدائشی طور پر اُس نے دل و دماغ کیسا پایا تھا؟ فہم کے ساتھ اخلاق کیسے تھے؟ کس قسم کے ہوش و حواس، تدبیر و تیقظ، انسانی ملکات، باطنی خصائل اظاہری شمائل پر وہ مفطور و مخلوق ہوا تھا؟

دنیا کے چھوٹے چھوٹے راجا اور سلاطین بھی، باوجود دے کہ وہ ہم ہی جیسے انسان ہیں تھوڑی سی فانی عزت اور ناپائیدار خودداری کے تحیل میں ہر کس و نا کس کو منہ نہیں لگاتے نہ ہر ایک کو اپنے مسند قرب و ہم نشینی پر جگہ دیتے ہیں، نہ ہر ایک کو ہم کلامی کا شرف بخشتے ہیں، نہ ہر ایک کی زبان سے بولتے اور تقریر کرتے ہیں؛ مخصوص اشخاص ہوتے ہیں جن کو مَجْلِسَت و مِکْلَمَت اور ترجمانی کا حق دیا جاتا ہے، یا بطور مُعْتَمِد خاص یا قائم مقام خاص کے نام زد کرتے ہیں۔ ہر ایک انگریز و اُسراے نہیں بنا دیا جاتا، ہر ترک پاشا نہیں ہوتا، ہر سوبیلین کا یہ درجہ نہیں کہ داسراے سے بلا واسطہ گفتگو کر سکے۔ ٹھیک اسی طرح سمجھ لو کہ ہر ایک انسان خدا کا مکلم یا رسول یا نبی یا اس احکم الحاکمین کا نائب السلطنت بنائے جانے کے قابل نہیں:

اللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ
يَجْعَلُ رِسَالَتَهُ ۚ ۱۰ سورہ انعام آیت ۱۲۳ (اُس جگہ کے مھوفا اور قابل اطمینان ہونے کو بھی) خوب جانتا ہے۔

اس بات کا تفصیلاً ذکر کرنا، کہ کس قسم کے نفوس حق تعالیٰ شانہ کی ہم کلامی سے مشرف ہو سکتے ہیں، میرے لیے مشکل ہے اور وقت بھی اجازت نہیں دیتا کہ میں ایسی لمبی

۱۔ مفطور: پیدا
۲۔ پاشا: ترک سرداروں کا خطاب ۳۔ سوبیلین (CIVILIAN) شہری ۴۔ خدا کا مخاطب، جیسے حضرت موسیٰ تھے: وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوسٰى تَكْلِيْمًا

بحث کو چھیڑوں۔ اور اپنی بضاعت اور کفایت کے قدر اُس کے مُتعلق کتاب العقل والنقل میں بھی عرض کر چکا ہوں۔ لیکن اجمالاً اس قدر گزارش کر دینا مناسب ہے کہ جو شخص منصبِ نبوت پر فائز کیا جائے، ضروری ہے کہ فطری طور پر اُس کے دماغی قوا اور قلبی ملکات اور عام اخلاقی حالات تمام اُقرآن سے اعلیٰ و ارفع ہوں۔ فہم و دانش، غم و استقلال و صبر و ثبات، خلوصِ نیت و ہم دردیِ خلّاق، محنت، جفاکش اور خدا کی اطاعت و وفاداری کے جذبے سے اُس کا ظاہر و باطن رنگا ہوا ہو۔ کوئی شخص یہ خیال نہیں کر سکتا کہ ان ملکات اور قوا کے فقدان کی صورت میں خداے قادر و توانا، جس کا علم ازلی تمام مآگان و مایکون کو محیط ہے، اپنی بھاری ذقے داری اور نیابتِ الہیہ اور امانتِ عظیمہ کو کیف و اتفق کسی معمولی انسان کے سپرد کر دے گا۔

قرآن کے لانے والے کی سیرت (دلائل)، کو جب ہم اس معیار پر کتے ہیں، تو ہم کو ناگزیر اقرار کرنا پڑتا ہے کہ آج تک جتنے آدمیوں کی نسبت مُکَلَّم ہونے کا دعوا کیا گیا ہے، اُن سب میں زیادہ اقدم و اُحق اس منصبِ جلیل کا، بہ اعتبار اپنے فوقِ عادیہ قواے عقلیہ و علمیہ کے، دنیا کا سب سے بڑا انسان ہی ہو سکتا ہے، جس کو ہم نبی اُمّی اور پیغمبرِ عربی کے مشہور اور معروف لقب سے یاد کرتے ہیں، فداہ ابی و اُمّی۔ اللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا وَ مَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَ اٰلِهِ وَ اَصْحَابِهِ وَ بَارِكْ وَ سَلِّمْ۔

اس حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور حالاتِ زندگی اور حضور کی بعثت کا ایک ایک لمحہ اُن ضخیم اور مستند کتابوں میں محفوظ ہے جن سے بڑھ کر روایت کے ہاتھ میں کوئی قابلِ اعتبار اور باوثوق ذخیرہ نہیں ہے۔ آپ کے پیروں نے آپ کی سوانحِ زندگی اور تمامی اقوال و افعال اور حرکات و سکنات کو اس قدر اہتمام و استیعاب و دیانت، تیقظ اور شغف سے محفوظ رکھا کہ وہ ایک مستقل فن بن گیا، بلکہ اُس فن سے پھر کئی فن نکل آئے۔

۱۔ اُقرآن، قرین کی جمع: معاصرین ۲۔ صاحبِ الہام ۳۔ بیدار مغزی، احتیاط

غالباً کسی اُمت نے اپنی آسمانی کتاب کی بھی حفاظت اُتنی نہ کی ہوگی جس قدر اُمتِ محمدیہ نے اپنے پیغمبر کے حالات کی کی۔ اور بے شک ایسے نبی کے حالات کی، جو اُبدی مذہب اور نہ فسوخ ہونے والا کلام لے کر آیا، ایسی ہی حفاظت ہونا چاہیے تھی، تا مگر درمطہور کے بعد بھی کوئی شخص اُس ہدایت کے قبول کرنے سے مُنہ نہ پھیر سکے، جسے لے کر آپ تشریف لائے تھے اور یہ حیلہ نہ بنا سکے کہ ہم کو ملہم کے حالات ہی جب معلوم نہیں، تو ہم کس طرح پورا اطمینان کر سکتے ہیں کہ خدا کا کلام لانے والا ویسی ہی عظمت و شان کا انسان تھا، جو اس عہدہ جلیلہ کے بے ضروری ہے۔

حدیث اور سیر کی بے شمار کتابوں کی تلخیص میں اس جگہ نہیں کر سکتا۔ البتہ آن حضرت صلعم کی اعلیٰ فہم اور اعلیٰ اخلاق کے متعلق ایک دو چیزیں اپنے رسالہ الاسلام سے نقل کرتا ہوں، جو کہ اس موقع پر ان بشار اللہ کفایت کریں گی۔

جناب رسول اللہ کی قوت اخلاقی و عقلی | ” عرب کی جہالت، اور شہزادگی

گردن کشی کو کون نہیں جانتا! جس قوم میں ایسی جہالت ہو کہ کوئی کتاب ان کے پاس آسمانی ہو نہ زمینی، اور ان کے اخلاق کا یہ حال کہ قتل و غارت وغیرہ ایک معمولی حرکت ہو، عقل و فہم کی یہ کیفیت کہ پتھروں کو اٹھالائے اور پوجنے لگے، اور گردن کشی کی یہ حالت کہ کبھی کسی بادشاہ کی اطاعت قبول نہ کریں، بھانسی کی یہ نوبت کہ ایسے ملک میں شاد و خرم زندگی گزاریں، ایسے جاہلوں اور خود سُرُو کو راہ پر لانا ہی دُشوار تھا، چہ جائے کہ علمِ الہیات، علمِ معاملات، علمِ عبادات، علمِ اخلاق، علمِ سیاست، مُدن میں حکمائے نام دار بنادیا، یہاں تک کہ دُنیا نے اُن کی اور اُن کے شاگردوں کے شاگردی کی۔ ڈاکٹر گسٹاوی بان لکھتا ہے:

”اس پیغمبر اسلام، اس نبی اُمتی کی بھی ایک حیرت انگیز گزشت ہے، جس کی آواز نے ایک قوم ناہنجار کو، جو اُس وقت تک کسی

ملک گیر کے زیر حکومت نہیں آئی تھی، رام کیا اور اس درجے پر پہنچایا کہ اس نے عالم کی بڑی بڑی سلطنتوں کو زیر و زبر کر ڈالا۔ اور اس وقت بھی وہی نبی اُمّی اپنی قبر کے اندر سے لاکھوں بندگانِ خدا کو کلمہ اسلام پر قائم رکھے ہوئے ہے۔

اگر انصاف کرو، تو آپ کے حسن اخلاق کا اندازہ کرنے کے لیے یہی کافی ہے کہ آپ نہ کہیں کے بادشاہ تھے نہ بادشاہ کے گھرانے میں پیدا ہوئے تھے؛ نہ کچھ مال و دولت آپ نے جمع کر رکھا تھا، نہ باپ دادا نے کوئی اندختہ میراث میں چھوڑا تھا، نہ آپ کے پاس تن خواہ دار فوج تھی، نہ اہل وطن آپ کے ہم راہ تھے، نہ قبیلہ والوں کو آپ کے مذہب سے ہم دردی تھی۔

ایسی بے کسی اور بے بسی کی حالت میں آپ نے اُن مُنذخ گنواروں کو ایک ایسی صدا سے ناما نوس سے مخاطب کیا کہ جس سے بڑھ کر اُس وقت ساری دُنیا میں کوئی مکر وہ آواز نہ سمجھی جاتی تھی اور نہ ایسی صدا دینے والے سے زیادہ اُن کے نزدیک کوئی اُن کا دشمن اور بد خواہ سمجھا جاسکتا تھا۔ یہ وہی لا اِلهَ اِلَّا اللہ کی آواز تھی کہ جس نے دفعتاً تمام عرب میں تہلکہ ڈال دیا، جس سے باطل موجودات کی حکومت میں بھونچال آنا شروع ہو گیا اور جس کی چمک سے اُس کفر و جہالت کی تاریکیوں میں بجلی سی کو نہ گئی۔ گویا وہ ایک زور و شور کی ہوا تھی، جس کے چلتے ہی شرک و بُت پرستی کے بادل چھٹ گئے اور آفتاب توحید اُبر کے پردے سے باہر نکل آیا، یا ابابیل رحمت تھی، جس کو بوجھار نے مخلوق پرستی کے سیاہ ہاتھیوں کے پر خچے اُڑا دیے اور خدا کے گھر کو اُن کی زد سے بچا لیا۔

غرض کہ ایک ایسے بے یار و مددگار نے ایسی سخت قوم کو، ایسی ظلمت کے زمانے میں، ایسے اجنبی مضمون کی طرف اُبھارا اور تھوڑے عرصے میں اُن سب کو ایسا مُسخر اور گردیدہ بنالیا کہ جہاں آپ کا پسینا گرے، وہاں اپنا خون گرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ گھر باہر کو ترک کر دیا، زن و فرزند سے بگاڑ لی، مال و دولت

کو سنگ ریزوں سے حقیر سمجھا، اپنے بیگانوں سے آمادہ جنگ و پیکار ہوتے، کسی کو آپ نے مار کسی کے ہاتھ سے آپ مارے گئے۔

پھر دو چار روز کا دلولہ نہ تھا، بلکہ آپ کے بعد اسی حالت پر استقلال کے ساتھ جمے رہے، یہاں تک کہ قیصر و کسریٰ کے تخت اُلٹ دیے، فارس و روم کو تہ و بالا کر دیا۔ اور اس پر معاملات میں وہ شایستگی رہی کہ کسی لشکری نے سولے مقابلہ جہاد کسی ایذا رسانی یا بستک ناموس کو گوارا نہ کیا۔ یہ تسخیر اخلاق، بتلایئے اس سے پہلے یا اس کے بعد کسی سے ظاہر ہوئی ہے؟

یہ تو آپ کے اخلاق کی حالت تھی، باقی آپ کی عقل و فہم کا نشان سب سے بڑا یہی ہے کہ آپ بہ ذاتِ خود اُمتی محض، جس ملک میں پیدا ہوئے، جہاں ہوش سنبھالا بلکہ ساری عمر گزار دی، علوم سے یک نخت خالی، نہ وہاں علوم دینی کا پتا نہ دنیاوی کا نشان، پھر اس پر ایسا دین، ایسا آئین، ایسی کتاب لا جواب اور ایسی ہدایات پینات لائے کہ آج تک بڑے بڑے مُلکا اُس کا جواب نہیں لاسکے، بلکہ بڑے بڑے مدعیانِ عقل و تہذیب نے اس کی داد دی۔ قرآن جیسا زندہ اور علمی معجزہ کسی پیغمبر کو دیا گیا؟ جس کا مقابلہ کیا بہ اعتبار فصاحت و بلاغت کے اور کیا بہ اعتبار تحریف و تبدیل سے محفوظ رہنے کے، دنیا کی کوئی کتاب نہیں کر سکتی اور نہ ان شاء اللہ کر سکے گی۔

قرآن کے حق میں ہم اُس سے زیادہ اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ خود قرآن تیرہ سو برس سے پکار پکار کہہ رہا ہے، یعنی یہ کہ جس میں ہمت ہو، وہ میرا جواب لکھ دے؛ مگر آج تک کسی کا حوصلہ نہ ہوا اور نہ ہوگا، کہ اُس کی ایک چھوٹی سی سورت کی مثال بھی پیش کر سکے! اب میں اس کے سوا کیا کہوں کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم جیسا کہ اپنی عادات و اخلاق میں تمام انبیاء علیہم السلام سے نائق تھے، ایسے ہی علوم کے بھی سارے مراتب آپ پر تمام کر دیے گئے تھے۔ کیوں کہ انبیاء سابقین میں نہ ایسا اعجاز علمی کسی کو دیا گیا، نہ اُن کے اتباع میں کسی نے اُن علوم کے

دریا بہاے میں، جو اہل اسلام نے بہائے ہیں۔

اور جب کہ صفتِ علم تمام اُن صفات کی خاتم ہے جو مُرتبی عالم میں ہیں، تو جس کا اعجازِ علمی ہوگا، گویا اُس پر تمام کمالاتِ علمی کا خاتمہ کر دیا جائے گا اور اُسی کو ہمارے نزدیک خاتمُ الانبیا کہنا مناسب ہوگا۔ اور چوں کہ اُس کا دین قیامت تک رہے گا، اِس لیے اُس کی کتاب کا بھی قیامت تک رہنا ضروری ٹھہرے گا۔

قرآن کریم کی حفاظت | پس جس طرح قرآن کی ہر ایک ادا انوکھی اور ہر ایک شانِ نرالی ہے، ضروری ہوا کہ اُس کی حفاظت بھی نرالے طریقے اور نئے ڈھنگ سے ہو۔ اور چوں کہ وہ محض خدا کی کتاب ہی نہیں بلکہ اُس کا کلامِ معجز ہے، اِس لیے نہ صرف اُس کے مطاب اور علوم، بلکہ اُس کی عبارت اور الفاظ بھی تغیر و تبدل سے مصون و مامون رہے۔ بہ ظاہر یہ ایک ایسا مُشکل اور اہم اور پُر صعوبت مقصد تھا کہ اگر اِس کا انصرام صرف ناتواں بندوں کی مرضی، ہمت، تدبیر اور انتظام کے حوالے کر دیا جاتا اور ایک خاص قسم کی توفیقِ ربانی اُن کی مدد نہ کرتی، تو کسی طرح اِس کا سرانجام آسان نہ تھا۔

لیکن اِس سے پہلے کہ بندے اُس کی حفاظت کے سامان مکمل کرتے، خود قرآن اُتارنے والے نے بڑے مُوکلہ اور قطعی عنوان سے اُس کا تکفل فرمایا۔ چنانچہ اُسی ذقت، جب کہ کسی انسان کو یہ یقین کر لینے کے لیے بہ ظاہر کچھ اَسباب موجود نہ تھے کہ قرآن بھی معاذ اللہ کچھ زمانے کے بعد ویسے ہی غلط اور مُحرّف ترجموں کی صورت میں نہ رہ جائے گا جس میں کہ تورات و انجیل موجود ہیں، صاف اعلان فرما دیا گیا کہ:

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ۔ (بحر آیت ۹)

بے شک ہم ہی نے قرآن اُتارا ہے اور بے شک ہم ہی اُس کے نگہبان بھی ہیں۔

یہ وعدہ الہی ایسی صفائی اور حیرت انگیز ذرائع سے پورا ہو کر رہا، جسے دیکھ کر بڑے بڑے مُتَعَصِّب اور مغرور مُخالفوں کے سر بھی نیچے ہو گئے۔ جس طرح قرآن کی بے نظیر فصاحت و بلاغت کے آفتاب نے لمبے چوڑے دعوے کرنے والوں کی آنکھیں خیرہ کر دیں اُسی طرح اُس کی بے عدیل حفاظت و خدمت نے بھی ایک مرتبہ اور تاریخ کو اپنی مثال

پیش کرنے سے عاجز کر دیا۔

ہر زمانے میں ایک خیم غفر علما کا جن کی تعداد اللہ ہی کو معلوم ہے، ایسا رہا ہے کہ جس نے قرآن کے علوم و مطالب اور غیر منقضی عجائب کی حفاظت کی۔ کاتبوں نے رسم الخط کی، قاریوں نے طرزِ ادا کی، حافظوں نے اس کے الفاظ اور عبارت کی وہ حفاظت کی کہ نژدہ قرآن کے وقت سے آج تک ایک زبریا زیر تبدیل نہ ہو سکا۔ کسی نے قرآن کے رُکوع گن لیے، کسی نے آیتیں شمار کیں، کسی نے حرف کی تعداد بتلائی، حتیٰ کہ بعض نے ایک ایک اعراب اور ایک ایک نکتے کو شمار کر ڈالا۔

اے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک سے آج تک کوئی لمحہ اور کوئی عت ایسی نہیں بتلائی جاسکتی جس میں ہزاروں بلکہ لاکھوں کی تعدادِ حفاظِ قرآن کی موجود نہ ہو جنہوں نے کاغذ کے اوراق میں نہیں، جو مٹ جانے اور جل جانے کا امکان رکھتے ہیں، سیاہی کے نقوش میں نہیں، جن کے محو یا مشکوک ہو سکنے کا احتمال ہے، لکڑی اور لوہے کے صندوقوں میں نہیں، جن کے کھوئے جانے یا لوٹ جانے کا اندیشہ ہے، بلکہ اپنے دلوں کے اوراق میں اور سینوں کے صندوقوں میں بڑی احتیاط اور خبرداری سے محفوظ رکھا۔

بَلْ هِيَ آيَةٌ بَيِّنَةٌ فِي
صُورِ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ.
(عنکبوت ۴۹)

مگر جن لوگوں کو عقل دی گئی ہے، اُن کے عقیدے میں
تو یہ (قرآن ایسی کھلی کھلی آیتیں ہیں کہ کوئی مُصِیْف مزاج
اُن سے انکار نہیں کر سکتا)۔

خیال کرو کہ ۸-۱۰ سال کا ہندوستانی بچہ، جسے اپنی مادری زبان میں دو تین جزو کار سالہ یاد کرانا دشوار ہے، وہ ایک غیر ملکی زبان کی اتنی ضخیم کتاب، جو متشابہات سے پُر ہے، کس طرح فر فر سنا دیتا ہے۔ رمضان المبارک میں اسلامی مساجد کا وہ سینہ دیکھنے کے قابل ہے، جب چھوٹے چھوٹے بچے اپنی نقلی آواز اور محسوسانہ لہجے میں قرآن شریف سنا کر سامعین کے دلوں کو وجد میں لاتے ہیں، پھر کسی مجلس میں ایک حافظ سے کوئی

۱۔ غیر منتہی، الامحدود ۲۔ منظر، نظارہ

حرف چھوٹ جائے یا اعراب کی فروگزاشت ہو جائے، تو چاروں طرف سے تصحیح کرنے والے للکار تے ہیں۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ پڑھنے والوں کو غلطی پر قائم رہنے دیں۔

ان حالات کو سامنے رکھ کر تاریخ سے دریافت کر دو کہ کیا قرآن کے ہوا کبھی دنیا میں کسی اور کتاب کی بھی اس قدر حفاظت اور خدمت ہوئی ہے؟ میں یقین کرتا ہوں کہ کتنا ہی بڑا نکتہ جینی کرنے والا کیوں نہ ہو، اس قدر انصاف کشی نہ کرے گا کہ وہ قرآن کی اس بے مثال حفاظت میں بھی شبہ اور تردد کرنے لگے۔ باقی، سو فسطائیوں سے میرا خطاب نہیں، جو محسوسات اور مشاہدات میں ”لا آدری“ کہنے سے دریغ نہ کریں! قرآن کریم کی تعلیم | قرآن کریم نے تمام ابواب ہدایت کے متعلق جو کچھ تعلیم دی ہے، اُس کی پوری تفصیل کسی انسانی بیان میں کہاں سما سکتی ہے! قرآنی علوم کا دریے ناپید اکنار کس کی ٹھٹی میں آ سکتا ہے اور کس بشر کی طاقت ہے کہ وہ اس رب العزت کے سمندر کو ایک کوزے میں بند کر سکے! لیکن قرآن کے اعجازوں میں سے شاید یہ بھی ایک اعجاز ہے کہ وہ جس قدر مشکل ہے، اُسی قدر آسان بھی ہے، جتنا طویل و عریض ہے، اتنا ہی مختصر بھی ہے۔ یعنی جس طرح وہ ایک بڑے بڑے روشن دماغ حکیم کا پیٹ حکمتوں سے بھر دیتا ہے، اسی طرح ایک وحشی سے وحشی انسان کی پیاس بھی اپنے چشمہ ہدایت سے بجھا سکتا ہے۔

میں اس وقت قرآن کے علوم و معارف کا تھوڑا سا اندازہ کرنے کے لیے بڑے بڑے کتب خانوں اور درس گاہوں کا حوالہ نہیں دیتا، بلکہ ایک بہت ہی سہل طریقہ بتلاتا ہوں کہ مضامین روحانیت اور ابواب ہدایت میں سے جو مضمون اور باب چاہو لے لو اور جتنی کتابیں آسمانی ہونے کی مدّعی ہیں، اُن میں صرف اس ایک باب کے متعلق جو تعلیمات ہیں، ہر ایک مذہب والا انتخاب کر کے پیش کر دے۔ انسانی کتابوں اور آراء سے کوئی اضافہ نہ کیا جائے، جو کچھ ہو، آسمانی کتاب کے حوالے سے مع اصل عبارت کے ہو اور عبارت کا صحیح ترجمہ ملکی زبان میں کر دیا جائے۔ اس کے بعد وہ سب تحریریں کسی ایک مفتق علیہ حکم کے سامنے یا اگر یہ نہ ہو سکے تو عام ببلک کے رو برو

پیش کردی جائیں۔ بہ یک نگاہ سب کے سامنے آنے سے دیا خود فیصلہ کر لے گی کہ کس کتاب کی تعلیم اُس باب میں زیادہ جامع، زیادہ مؤثر، زیادہ مُبرہن، زیادہ قابل قبول ہے۔ میں خیال کرتا ہوں کہ اس سے بڑھ کر آسان اور بے تکلف صورت تعلیمی موازنے کی اور نہ کوئی نہ ہوگی:

بس ایک نگاہ پہ ٹھہرا ہے فیصلہ دل کا
 قرآن کریم میں اللہ جلّ شأنہ کے کمالات | مولانا مولوی فیروز الدین دسکوی اپنے
 وصفات کا بیان اور ذکر اللہ کی کثرت | رسالے میں لکھتے ہیں:

”پھر ایک بڑی بھاری دلیل قرآن شریف کے کلامِ الہی ہونے کی یہ ہے کہ اُس میں خالق کائنات کی تمام صفاتِ کاملہ کو نہایت اعلیٰ طور پر بیان کیا گیا ہے۔ کلامِ الہی کا خاتمہ ہے کہ اُس میں خالق کائنات کی تمام صفاتِ کاملہ بڑی شان و شوکت کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی عظمت و شان اور اس کی صفاتِ کاملہ ایسے طور پر مذکور ہوتی ہیں کہ دنیا کی کوئی کتاب اُس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ کی صفاتِ کاملہ ایسے ڈھنگ سے بیان ہوئی ہیں کہ اس خصوصیت میں دنیا کی کوئی کتاب اُس کا مقابلہ ہرگز نہیں کر سکتی۔ بات بات میں اللہ تعالیٰ کی عظمت و شان چمکتی ہے اور اس کی اُلوہیت، ربوبیت، خالقیت، رحمانیت اور قدوسیت اعلیٰ سے اعلیٰ طور پر جلوہ گر ہوتی ہے۔ سارا کلامِ الہی اُسماے حسنیٰ اور صفاتِ کاملہ ربِّ العالمین سے بھرا پڑا ہے۔“

چنانچہ قرآن شریف میں خدا تعالیٰ کا ذکر اور اُس کا نام اس کثرت سے آتا ہے کہ دنیا کی کوئی کتاب اُس کے ساتھ مقابلہ نہیں کر سکتی۔ گویا قرآن شریف جاہِ جا خدا کا نام یاد کرنے کے لیے ایک بہانہ اور موقع دھونڈتا ہے۔ قرآن شریف کا کوئی صفحہ اُٹاؤ، اُس کا کوئی حصہ پڑھو، اُس کا اللہ کا نام یا اُس کی کسی اور صفت کا ذکر ضرور پاؤ گے۔ قرآن شریف میں صرف

دُعائیں اور خدا کی صفات ہی نہیں، بلکہ اُس میں تمام معاملات دینی و دنیوی اور قوانین قومی اور ملکی بھی بیان کیے گئے ہیں۔ ہاں ہمہ، اُس میں اللہ تعالیٰ کا نام اور اُس کے اسمائے حسنیٰ جایہ جاپائے جاتے ہیں، ایسی جگہوں پر اور ایسے معاملات میں بھی جہاں سے سخت دشوار ہے کہ اللہ کا نام لاسکے۔ قرآن میں اللہ کا لفظ ۶۶۶۶ دفعہ آیا ہے اور اس کے باقی اسمائے حسنیٰ کا کچھ شمار نہیں اور جو ضمائر اللہ تعالیٰ کی طرف پھرتی ہیں، اُن کی گنتی بحمد خدا کے اور کسی کو معلوم نہیں تسبیحات اور تہلیلات اور دعاؤں وغیرہ کے موقع پر تو اللہ تعالیٰ کا نام آہی جاتا ہے، لیکن معاملات اور تعزیرات کے موقع پر بھی جس طرح قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ کا نام آیا ہے، وہ صرف قرآن شریف ہی سے خصوصیت رکھتا ہے، دنیا کی کوئی کتاب اس خصوصیت میں قرآن شریف کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ توریت و انجیل وغیرہ کے صفحوں کے صفحہ خدا کے ذکر اور اس کا نام سے خالی ہیں، لیکن قرآن شریف کا کوئی صفحہ، کوئی حصہ الہی یاد اور الہی نام سے خالی نہیں۔ خدا تعالیٰ نے اس واقعے اور اس معاملے کا طرز بیان اور اسلوب ہی ایسے ڈھنگ پر ڈالا ہے کہ خواہ مخواہ اللہ تعالیٰ کا نام اور اُس کا ذکر بیچ میں ضرور آجائے۔ کوئی معاملہ، کوئی واقعہ، کوئی قصہ ایسا نہیں، جس میں بار بار اللہ تعالیٰ ذکر نہ آئے۔ قرآن شریف پڑھنے سے نہ صرف دینی احکام اور الہی شریعت سے آگاہی ہوتی ہے، بلکہ کلام ربانی سارے کا سارا یاد الہی سے پُر ہے، صفحے اُلٹتے جاؤ اور خدا تعالیٰ کا نام بار بار پڑھتے جاؤ اور خدا تعالیٰ کا نام بار بار پاتے جاؤ۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن شریف کی تلاوت میں بھی کمالِ ثواب ہے، کیوں کہ وہ اسمائے حسنیٰ سے پُر اور دُرود اور وظیفے کی بھی ایک مُقدس کتاب ہے۔

مثال کے طور پر ایک سورہ طلاق کو لے لو۔ سورہ طلاق کے نام سے تو

۱۵ اس سے مراد ذکر الہی کی کثرت ہے یعنی معنوں کے معنی اور ظہم میں اس کی ضرورت نہ ہونے کے باوجود اللہ کا نام مذکور اور یہ بھی ایک معجزہ ہے کہ اس کے باوجود فصاحت و بلاغت سے نہیں ہٹتا بلکہ مزید جلالت پیدا کر دیتا ہے۔

مفہوم ہوتا ہے کہ اُس میں صرف عورتوں کے طلاق دینے کی ہایت احکام و ہدایات ہوں گی۔ لیکن نہیں، اُس میں عبرت، وعظ، تذکیر اور خدا تعالیٰ کے مُقَدِّم ناموں کا وظیفہ بھی ہے۔ چنانچہ اس چھوٹی سی سورت میں پچیس جگہ رَب کا لفظ آیا ہے اور بہت سی ضمائر خدا کی طرف پھرتی ہیں، باوجودِ دے کہ اس سورت میں مُعاملۂ طلاق کا ذکر ہے، جس کو اگر کوئی اور شخص بیان کرتا، تو شاید ایک دو جگہ بھی اللہ کا نام نہ لانا،

اچھا، ہر ایسی کتاب کا، جو آسمانی الٰہی جاتی ہو، کیف ما اتفق ایک ایک صفحہ ہاتھ میں اٹھا لو اور شمار کر لو کہ اُس صفحے میں خدا کا نام کتنی جگہ اور کیسی عظمت و شان سے آیا ہے۔ یہ مولیٰ سی بات ہے۔ پتہ دے دے گی کہ کون سی کتاب آسمانی ہے جو کسی محلے میں ذرا سی دیر کے لیے اپنے پڑھنے والے کو خدا کی یاد سے غافل نہیں ہونے دیتی اور جو اس کا امکان بھی نہیں چھوڑتی کہ ہزار ہا سال تک کروڑوں انسان اگنی وغیرہ الفاظ سے، جو بہ قولِ سوامی دیانند پر میثور کے نام تھے، آگ اور دوسرے عناصر وغیرہ سمجھ کر خدا کی جگہ انھی چیزوں کی عبادت (پوجا) کریں۔

قرآن کریم کی بے نظیر سلاست اور روانی | مولانا فیروز الدین فرماتے ہیں:

”پھر ایک دلیل قرآن شریف کے کلامِ ربّانی ہونے کی اُس کی لاثانی بندش اور بے نظیر روانی ہے، جس پر آج تک ایک دُنیا شیدا ہے۔ کوئی عربی عبارت پڑھو، اُس کی بندش اور روانی معمولی قسم کی ہوگی، لیکن قرآن شریف کی روانی اور سلاست اس قسم کی ہے کہ جو لوگ معنی نہیں جانتے، جو لوگ عربی سے کچھ سمجھ نہیں رکھتے، وہ بھی اُس کی روانی اور سلاست کو دیکھ کر شیفۂ اور حیران ہیں۔

خوش آواز قاری جب قرآن شریف کو ایک لہنِ مرغوب اور اسلوبِ خوش سے پڑھتا ہے، تو دلوں میں زلزلہ اور ولولہ ڈال دیتا ہے۔ عام قاری و حافظ جب قرآن شریف کو ایک جوش کے ساتھ پڑھتے ہیں، تو کس قدر اثر

قلب پر ہوتا ہے! دنیا کے سردار حضرت رسول کریم صلعم جب اس کلام پاک کو پڑھتے ہوں گے، تو سننے والوں کے دلوں پر کیا کچھ اثر پہنچتا ہوگا! کلام الہی کے الفاظ، واقعات کی تصویریں معلوم ہوتی ہیں، جو سننے والوں کے پیش نظر ہیں۔ کسی شخص کی طاقت ہے کہ قرآن شریف کی سلاست اور روانی کی بابت کچھ بیان کر سکے! وہ ایک وجدانی امر ہے اور وجدانیات کی لذت کو بجز چکھنے کے کس کو یاد ہے کہ محرم تحریر یا تقریر میں لاسکے!۔

قرآن شریف کی عبارت پر جیسے پڑھے ہوئے مفتون ہیں، ویسے ہی اُن پڑھ عاشق ہیں۔ یہی عبارت کی روانی اور دلوں پر عجیب اثر ڈالنے والی جادو بیانی گفتار عرب کو اس بات کے کہنے پر مجبور کرتی تھی کہ:

إِن هَذَا إِلَّا سِحْرٌ يُوشِر
أَفْتَأْتُونَ السَّحَرَاءَ وَأَنْتُمْ
تَبْصُرُونَ۔ (مدثر آیت ۱۳)

یہ (قرآن) تو بس (ایک قسم کا) جادو ہے جو (انگوں سے) چلا آتا ہے اور بس! تو کیا تم (دیدہ و دانستہ جادو کی باتیں سننے کو آتے ہو!

تمام آسمانی کتابوں کے مدعی اسی طرح موازنہ کر لیں کہ ہر کتاب کی تھوڑی سی عبارت جس طرح پڑھی جاتی ہے، کسی اچھے صحیح اور صاف پڑھنے والے سے مجلس میں پڑھوا کر دیکھیں، خود معلوم ہو جائے گا کہ قلوب کس سے زیادہ لذت اور اثر حاصل کرتے ہیں۔ قرآن کریم عام اشعار کی طرح کلام منظوم نہیں، لیکن اُس نے نظم کی روح نکال کر نثر میں ڈال دی ہے، ایک بالکل ہی اچھوتا اسلوب، عام نثر اور نظم کے درمیان اختیار کیا ہے کہ شاعر اور خطیب دونوں کی رُو میں سو جان سے اُس کی لطافت اور شوکت پر قربان ہوتی ہیں۔ قرآن کی ان جہتی اور معنوی خوبیوں کو دیکھ کر بے ساختہ زبان پر آجاتا ہے کہ:

بہار عالم حُسنش، دل و جان تازہ می دارد

بہ رنگ اصحاب صورت را، بہ بوار باب معنی را

قرآن میں ایک مضمون دوسرے سے مغلوب نہیں ہوتا | انسان چوں کہ مخلوق ہے اور کم زور

مخلوق ہے، اس لیے جب اُس پر کوئی حالت طاری ہوتی ہے، تو اُس کے خصلتِ دلی حالت مُضْجِل اور مغلوب ہو جاتی ہے۔ بڑے سے بڑے قادر الکلام لیکچرار جب غصے میں بھرا ہوا مضمون بیان کرتا ہے، تو عین اُسی وقت مَلَا طَفَتْ اور مہربانی کی تقریر دیے زور سے نہیں کر سکتا۔ اسی طرح شفقت و رحمت کے ساتھ اگر غَضَب و سُخْط کی بھی ضرورت ہو، تو دونوں کا مُساویانہ توازن قائم رکھنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ یہ صرف خداوندِ اکبر کی ذات کا خاصہ ہے، جس کی ایک صفت دوسری صفت کے لیے مُزاحم نہیں ہوتی اور جس کو ایک شان دوسری شان سے مشغول نہیں کر سکتی کہ وہ ہر وقت و ہر آن تمامی مُتقابِل صفات کے ساتھ مُتَعَصِف ہے۔ اسی لیے جب اُس کے کلام کو پڑھتے ہیں، تو رحمت کے ساتھ غَضَب، وعدہ کے ساتھ وعید، تبشیر کے ساتھ انذار اور خوف کے ساتھ رجا، ترازو کے دو پتوں کی طرح، ہمیں برابر نظر آتے ہیں جن میں سے کوئی بھی دوسرے سے جھکا نہ ہو۔ عین غصے کے وقت پیار اور پیار کے وقت غصہ اس طرح کا ایک کا بیان دوسرے سے وزن میں گھٹنے نہ پائے۔ یہ صرف اُسی رَبِّ العالمین کے کلام میں دیکھا گیا ہے۔

قرآن میں غیبی خبریں | قرآن کے مضامین کے مُتعلق ایک اور ضروری چیز بیان کرنے سے رہ گئی، اور وہ اُحْم ماضیہ اور سِنِّینِ گزشتہ کی ایسی مُفَصَّل اور دُرُست خبریں اور واقعاتِ مستقبلہ کے مُتعلق اُس کی مُتحدِّدِ مِش گویاں ہیں، جو حرف بہ حرف صحیح ثابت ہو چکیں۔ یہ نہیں کہ کاہنوں اور مُنجموں کے اُمُکَل پچو بیانات کی طرح سوئیں ایک دو دفعہ تیر نشانے پر جا لگا، بلکہ قرآن نے جن واقعات کی خبر دی، وہ صبح صادق کی روشنی کی طرح نور افزاے دیدہ بصیرت ہوئے۔ مثال کے طور پر آپ اس آیت کو لے لیجیے:

قریب کے ملک (یعنی فارس) میں رومی (جو نصارا ہیں)
اہل فارس سے جو آتش پرست ہیں، مغلوب ہو گئے ہیں۔
لیکن یہ لوگ اپنے مغلوب ہوئے پیچھے مغرب چند سال میں

الَّتِي غَلِبَتِ الرُّومُ فِي أَدْنَى
الْأَرْضِ وَهُمْ مِنْ بَعْدِ
غَلِبِهِمْ سَيَغْلِبُونَ فِي

لہذا غلبت: مادیں

بُضِعَ سِنِينَ د سورہ روم آیت ۴۴) (پھر اہل فارس پر) غالب آجائیں گے۔
عجم پر روم کے غلبے کے متعلق جو خبر جتنے زمانے کے ساتھ مُقید کر کے اس آیت میں
دی گئی تھی، وہ بلا کم و کاست پوری ہوئی۔ اگر آپ قرآن کی پیشین گوئیوں کے متعلق
مُفَصَّل دیکھنا چاہتے ہیں، تو علمائے اس باب میں مُتَقِل رسالے لکھے ہیں، اُن کا
مطالعہ کیجیے، میں نے تو صرف ایک نمونہ دکھلا دیا ہے۔

اخبارِ ماضیہ میں بعض کو حُشَم یہ کہہ دیتے ہیں کہ شاید آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم
نے کسی سے پوچھ کر درج کر دیے ہوں گے، حالاں کہ وہ خوب جانتے ہیں کہ آپ خود اُمّی
تھے، آپ کی قوم اُمّی تھی، مادری زبان عربی کے سوا کوئی دوسری زبان آپ نے
سیکھی نہیں تھی، کسی عالم کی ملازمت و صحبت کا آپ کو موقع نہیں ملا، جو اس قدر مُفَصَّل
اور مُستند واقعات اُخذ کر سکتے۔

اگر ایسا ہوتا تو وہ لوگ، جن کے پیش نظر آپ کی زندگی کے تمام اُطوار و اُدوار
تھے اور پھر ہر وقت ایسی چیزوں کا کھوج لگانے میں سرگرم تھے، جو آپ کی تکذیب
کا ذریعہ بنیں، تیس سال کی طویل مدت میں سب سے پہلے ایسی شہادتیں ہم پہنچا کر
شائع کر دیتے۔ شاید اسی لیے قرآن کریم نے ایسے غیر ناشی عَنِ الدَّلِيلِ احتمالات
کا رد کرنا بھی ضروری نہ سمجھا۔ صرف اس قدر تنبیہ کر دی کہ نبی اُمّی صلعم پچھلے واقعات
بِن دیکھے بیان کر رہے، وہ اس کے سوا نہیں کہ وحی الہی نے اُن کو معلوم کر دئے
ہیں چناں چہ فرماتے ہیں:

تلك من أنباء الغيب	(اے پیغمبر! یہ غیب کی چند خبریں ہیں، جن کو وحی کے
نوحیها إليك وما كنت	ذریعے سے ہم تم کو پہنچاتے ہیں۔ اس قرآن کے نازل
تعلمها أنت ولا قومك	ہونے سے پہلے نہ تو تم ہی ان کو جانتے تھے اور نہ تمہاری
من قبل هذا (سورہ ہود آیت ۴۹)	قوم کے لوگ۔

۱۰ مہل اور بے دلیل احتمالات

اور فرماتے ہیں:

ذٰلِكَ مِنْ اَنْبِاءِ الْغَيْبِ
نُوحِيهِ اِلَيْكَ وَمَا
كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوا
اَمْرَهُمْ وَهُمْ
يَمْكُرُونَ. (سورہ یوسف آیت ۱۰۲)

اور فرماتے ہیں:

وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ
اِذْ قَضَيْنَا اِلَى مُوسٰى الْاَمْرَ
وَمَا كُنْتَ مِنَ الشّٰهِدِيْنَ
وَلَكِنَّا اَنْشَاْنَا قُرُوْنًا
فَتَطَاوَلَ عَلَيْهِمُ الْعَمْرُ
وَمَا كُنْتَ ثَاوِيًّا فِىْ اَهْلِ
مَدِيْنَةٍ تَتْلُوْ عَلَيْهِمْ اٰیٰتِنَا
وَلَكِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ. وَمَا
كُنْتَ بِجَانِبِ الطُّوْرِ اِذْ نَادَيْنَا
وَلٰكِنْ رَّحْمَةً مِّنْ رَبِّكَ
لِيُنْذِرَ قَوْمًا مَّا اَتٰهُمْ
مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ
لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ.
(سورہ قصص)

اے پیغمبر! یہ چند غیب کی باتیں ہیں، جن کو ہم وحی کے ذریعے
تجہ تمہیں معلوم کراتے ہیں، (اور یہ تمہاری صداقت کی دلیل
ہے)؛ ورنہ جس وقت یوسف کے بھائیوں نے اپنا مقیم ارادہ
کر لیا تھا کہ یوسف کو کنویں میں ڈال دیں، اور وہ (ان کے
ہلاکت کی) تدبیریں کر رہے تھے، تم تو ان کے پاس موجود نہ تھے
(کہ یہ حالات تم کو بہ طور خود معلوم ہو جاتے)

اور (اے پیغمبر!) جس وقت ہم نے موسیٰ کو (رسالت کے)
اختیارات دیے، تو تم (طور کے) مغربی جانب (جہاں موسیٰ
کو رسالت ملی تھی، موجود) نہ تھے اور نہ تم (اس واقعے کے)
چشم دید دیکھنے والوں میں تھے۔ مگر (بات یہ ہے کہ) ہم نے
بہت سی امتیں نکال کھڑی کیں اور ان پر بہت سے قرن
گزر گئے اور نہ تم مدین کے لوگوں میں رہے کہ تم اُن کو پہلی
آئینیں پڑھ پڑھ کر سناتے تھے (ادریوں تم کو اس وقت
کے حالات معلوم کرنے کا موقع ملا ہو)، بلکہ ہم کو تمہیں
پیغمبر بنا کر بھیجا (منظور) تھا۔ اور نہ اُس وقت کہ ہم نے
(موسیٰ کو) بلایا تھا، تم طور کے (کسی) طرف موجود تھے کہ
تمہارے وہ واقعات بہ چشم خود دیکھے ہوں، بلکہ (یہ) تمہارے
پروردگار کی (ایک) مہربانی ہے، تاکہ تم اُن لوگوں کو ڈراؤ
جن کے پاس تم سے پہلے کوئی ڈرانے والا نہیں آیا، عجیب نہیں
(تمہارے ڈرانے سے) یہ لوگ نصیحت پکڑیں۔

اچھا، واقعاتِ گذشتہ میں آپ کے یہ احتمالات سہی، لیکن مستقبل کے متعلق جو

بہ کثرت خبریں دی گئیں اور ایک کی بھی کوئی تکذیب نہ کر سکا، اُن میں بجز اس کے کہ اس عالم الغیب والشہادۃ کی طرف نسبت لکھا جائے، اور کیا کہا جاسکتا ہے !
خاتمہ کلام | میں اپنی تقریر ختم کرتا ہوں اور قرآن کریم کی تین بہت ہی چھوٹی چھوٹی سورتیں (العصر، الکوش، الاخلاص) کو پیش کر کے جو اخیر پارے میں ہیں، تمام مذاہب کو چیلنج دیتا ہوں کہ ان سورتوں میں سے کسی ایک کے مقابلے میں کوئی پُرانا یا نیا کلام سب مل کر لے آئیں، جس میں ایسے مختصر اور جامع الفاظ میں اس طرح کے مضمون کو اُسی قدر خوبیوں اور لطائف و مزایا کی رعایت کے ساتھ ادا کیا گیا ہو، جتنا کہ ہم اہل اسلام بحول اللہ و قوتہ بہ وقتِ مقابلہ ہر دو کلام، قرآن کریم کی اس سورت میں بتلا سکتے ہیں۔ اور اس کام کے لیے جتنی مُدت اور مُہلت مُعارضہ کرنے والے چاہیں، وہ دی جاسکتی ہے اور ہر ایک شرط منظور کی جاسکتی ہے۔

لیجیے ساری بحثیں اور سارے مناظرے صرف ایک ذرا سی بات پر ناتمام ہوتے ہیں:
 فَإِنْ لَمْ تَفْعَلُوا وَلَنْ تَفْعَلُوا اس پر بھی اگر تم ایسا نہ کر سکو اور ہرگز نہ کر سکو،
 فَانقُضُوا النَّارَ الَّتِي وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ (بقرہ آیت ۲) ہیں اور پھر جو تیار کی گئی ہے مُنکروں کے لیے۔
 خاتمہ مضمون پر میں یہ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ میں نے اس تقریر میں صرف یہ کوشش کی ہے کہ ایک صاف اور سلیس اور معقول طریقے سے قرآن کریم کا کلام الہی ہونا واضح کر دیا جائے۔ مضمون کے دوسرے حصے جو شاید اس کے بعد شائع ہو سکیں، اُن میں تفصیلاً بتلایا جائے گا کہ قرآن کریم کے متعلق منیٰ لفین اسلام نے کیا کیا شکوک و شبہات پیش کیے ہیں اور اُن کا ازالہ کس طرح ہو سکتا ہے۔ اُمید ہے کہ مُتبعین اور مناظرین اسلام اور طالبینِ حق و صدق کے لیے نافع ہوگا۔ اِنْ أُرِيدُ إِلَّا الْإِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ، وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ، عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ۔

الراقم
 شبیر احمد عثمانی

دارالعلوم دیوبند، ۲۴ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۲ھ

ہدیہ سنیہ

رکبا چاروں ائمہ فقہ حق پر ہیں؟

افادات

حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ
ترتیب و تحقیق: خالد القاسمی

اس رسالہ میں اس سوال کا مدلل و شافی
جواب دیا گیا ہے کہ کیا مذاہب اربعہ حق پر ہیں
حق پر ہیں تو کیا حق میں تعدد ہوتا ہے؟ نیز جنت
و دوزخ کو ایک تمثیل قرار دیے ولے کا حکم
شرعی کیا ہے۔

منتظم اشاعت

ناشر

دارالعلوم حیدر آباد۔ اے۔ پی۔ © دارالمؤلفین دیوبند۔ یو پی
۲۳۴۵۵۴

باهتمام: وجید الزماں قاسمی کیرانوی
معتد دارالمؤلفین دیوبند

طبع اول ۱۴۱۳ھ ۱۹۹۲ء
قیمت رسالہ ہدیہ سنیہ ۱۰/۱۰

فہرست مضامین ہدیہ سنہ

نمبر شمار	مضامین	صفحہ شمار	مضامین	صفحہ
۱	تقریب شیخ الادب مولانا محمد اعزاز علی صاحب قدس سرہ	۳۳۸	۱۵	مسلك جمہور اور شاہ ولی اللہ
۲	سوال	۳۳۹	۱۶	ابن تیمیہ اور ابن ہمام کا بیان
۳	جواب	۳۵۰	۱۷	تخطیہ میں ائمہ کا محتاط رویہ
۴	پہلے سوال کا جواب	۳۵۲	۱۸	دوسرے سوال کا جواب
۵	مختلف حیثیتوں کی وجہ سے شئی کی حقیقت نہیں بدلتی۔	۳۵۲	۱۹	قرآن و حدیث سے ثابت شدہ امور کی نفی کے لئے محض تمثیل کا حیلہ کافی نہیں۔
۶	بیک وقت مختلف احکام جاری ہو سکتے ہیں۔	۳۵۳	۲۰	گرگ بارہاں دیدہ اور خام مرید
۷	فرقہ مصوبہ کے نزدیک تقلید و اجتہاد کا معنی۔	۳۵۵	۲۱	عدم علم سے شئ وجود لازم نہیں
۸	مسائل کلامیہ میں خطا و صواب کی صورت	۳۵۶	۲۲	ملحدین کی بے ہودگیوں کا جواب
۹	مختلف فیہ مسائل	۳۵۷	۲۳	ایک گستاخانہ تحریر اور اس کا بھیانک نتیجہ۔
۱۰	جمہور کے نزدیک حق عند اللہ	۳۵۸	۲۴	نا قابل قبول نظریہ
۱۱	واحد اور ہر مجتہد مستحق ثواب ہے ہر مسئلے میں خدا کے دو حکم۔	۳۶۱	۲۵	فیصلہ کن توجہ
۱۲	اختلافات باعث رحمت	۳۶۱	۲۶	کیا جنت دوزخ کی تخلیق خدا کی قدرت سے باہر ہے؟
۱۳	عملاً سب حق پر ہیں	۳۶۲	۲۷	شاہ ولی اللہ کی رائے۔
۱۴	مسلك جمہور مستند کتابوں کی روشنی میں	۳۶۳		

تقریب

شیخ الادب مولانا محمد اعجاز علی ضاقد سہ

دارالعلوم دیوبند کے ایک ذی استعداد فہیم فیض یافتہ نے، حضرت مولانا مولوی شبیر احمد صاحب مدظلہ مدرس دارالعلوم دیوبند کی خدمت میں، دو شعبہ تحقیق کی غرض سے پیش کیے تھے۔ حضرت مولانا ممدوح نے، باوجود کثرت مشاغل، محققانہ جواب تحریر فرمایا۔ چوں کہ اس قسم کے شبہات علمی دنیا میں اکثر پیش آتے رہتے ہیں اور حضرت مولانا ممدوح نے جس تحقیق اور جدت سے جواب تحریر فرمایا ہے، وہ مفید اور حقائق علمیہ سے معمور ہونے کے باوجود، حسن بیان میں بھی اپنی نظیر آپ ہے؛ اس لیے اہل علم کی خدمت میں ان سوالات و جوابات، دونوں کو بہ طور ایک نادر تحفے کے پیش کیا جاتا ہے۔ اُمید ہے کہ اہل علم اس کو بہت پسند فرما دیں گے۔ اور ہماری دعا ہے کہ قادر مطلق مولانا کے علمی فیوض کے اس سلسلے کو تا قیام قیامت قائم رکھ کر تشنگان علم کو سیراب فرماتا رہے، آمین۔

محمد اعجاز علی عنقرء

سوال

مجمع الحکمت والکلمات . مخدومنا المکرم حضرت اُستاد ذی صفا قبلہ است برکاتہم !
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

طالب النجربہ عافیت ہے۔ چوں کہ خاکسار خدمتِ عالی میں کبھی ارسالِ عریضہ نہ کر سکنے کی وجہ سے سخت نادِم ہے، اس لیے نہایت مُنتہِمانہ لہجے میں اپنی سابقہ غفلت و تساہل کی معافی کی درخواست ان الفاظ میں پیش کرتا ہے کہ : ”قَلِمُ عَفْوٍ بِرِکُنَاہِمُ کَشْ“، اور بعد ازیں حسبِ ذیل مسائل کی جانب آں جناب کی توجہ مُنعطف کرنا چاہتا ہے۔ اُمید کہ یہ لحاظِ شفقتِ اُستادانہ، میرے غلجان و انتشار کو زائل کرنے کی تکلیف گوارا فرمائیں گے۔

(۱) حَقِیْقَت اور بَطْلانِ واقعی، اغماہِ مُعْتَبَرِ مبنی نہیں ہے، اور اُمورِ واقعیہ کے وجودات اور اُعدام لحاظِ لاجظ کے تابع نہیں ہیں یہی وجہ ہے کہ حیثیاتِ اعتباریہ مُبْطَل یا مُعْتَبَرِ حَقَائِقِ نفسِ الامری نہیں ہو سکتے۔ اس اُصول کو مدِ نظر رکھتے ہوئے جب مذاہبِ ائمہ اربعہ کی حقیقت پر غور کرتا ہوں، جس کو ہر خاص و عام میں شہرت کا فخر حاصل ہے، تو عقلِ نارسا، اور اکِ حقیقت سے قاصر ہو جاتی ہے۔ کیوں کہ ان مذاہب میں باہم بعض ایسے مسائل نظر آتے ہیں، جن میں کم از کم نسبتِ تضاد کی پائی جاتی ہے۔ اور یہ مُسَلَّم الثبوت امر ہے کہ : الضّدّ ان لا یجتمعان ؛ پس ان مذاہب کو حق تسلیم کرنے پر، عالمِ واقع میں، اجتماعِ اُضدادِ حالتِ واحدہ میں لازم آتا ہے، جس کا بطلان اُبْدُہُ البدیہیات سے ہے۔ اور یہ بھی ظاہر ہے، جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، کہ حقائقِ واقعیہ پر حیثیاتِ زائدہ کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ پس ان کے حق ہونے کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟

لہ ندامت آمیز لے بڑی ترین ، بالکل واضح

(۲) ایک وہ شخص ہے، جو دوزخ و جنت پر تو ایمان رکھتا ہے، مگر جو امور قرآن شریف و کتب احادیث میں جنت کے متعلق مذکور ہیں، اُن کو صرف تمثیلات پر معمول کرتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ چوں کہ دُنیاوی نقطہ نظر سے وہ انتہائے انعامات تھے، اس لئے اُن کو بیان کر کے اس امر کی جانب اشارہ کر دیا گیا ہے کہ اہل جنت کے لیے جنت میں تمام آرام و آسائش کی چیزیں تھیں گئی ہیں؛ ورنہ جنت کی حقیقت نہ کسی کو معلوم ہوئی اور نہ ہو سکتی ہے۔ چنانچہ آل حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسی کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں کہ: لَا عَيْنٌ رَأَتْ وَلَا أُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا حَظَرَ عَلَى قَلْبٍ بَشَرٍ الْغُرُضُ، اس سے ثابت ہو گیا کہ ”رُؤِیت“ ”سَمَاعَت“ ”حُظُور بِالْبَال“، خلاصہ یہ کہ کسی ذریعے سے جنت کی حقیقت کسی پر منکشف نہ ہو سکی۔ بعینہ ہی خیال اس شخص کا جہنم کے متعلق بھی ہے۔ پس یہ خیالات کہاں تک صحیح ہیں اور شرعاً اس شخص کا کیا حکم ہے؟

جواب

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

برادرِ مکرم سَلَامُ اللّٰهِ تَعَالٰی !

بعد سلام مسنون آں کہ آپ کا عنایت نامہ پہنچا، ممنون کیا حق تعالیٰ شانہ مجھ کو اور آپ کو اور تمام مسلمانوں کو اپنی رضا کی توفیق عطا فرمائے ! جن مسائل کی بابت آپ نے دریافت فرمایا ہے، مجھ کو حیرت ہے کہ باوجود دے کہ وہاں ماشار اللہ بہت سے اہل علم اور اہل علم کے فیض یافتہ موجود ہیں، جو فضلہ تعالیٰ مشکل سے مشکل مسائل کو مجھ سے زیادہ زور اور ثبوت کے ساتھ حل کرنے کی قابلیت رکھتے ہیں، آپ اُن سے مشافہتاً بہت جلد اور بہ سہولت اُس قدر اطمینان حاصل کر سکتے تھے، جو شاید میرے متعبد و خطوط سے بھی حاصل نہ ہو سکے، پھر آپ نے مجھ کو خط لکھنے کی زحمت کیوں اٹھائی؟ حالانکہ آپ دیوبند میں رہ چکے ہیں، میری حالت سے بھی بہ ہر حال واقف ہیں کہ میری ایچ مدانی اور لا اُبالی پُن حد سے زیادہ گزرا ہوا ہے۔

اس لیے کبھی یہ خیال ہوا کہ آپ کا خط یہاں کسی عالمِ جید کے حوالے کر دوں، تاکہ وہ آپ کی تسکین کر دے؛ لیکن یہ خیال کر کے کہ یہاں سے جانے کے بعد یہ آپ کی پہلی عنایت ہے، دل گوارا نہیں کرتا کہ کچھ بھی جواب نہ لکھا جائے؛ لہذا جس طرح ان مسائل کو میں اب تک سمجھ ہوئے ہوں، مختصر قلم بند کر کے آپ کی خدمت میں روانہ کرتا ہوں۔ اگر شفا ہو جائے، تو حق تعالیٰ کا شکر ادا کیجیے اور بہ صورت دیگر مناسب ہوگا کہ دوسرے علمائے متبحرین سے رجوع کیا جائے۔

پہلا مسئلہ، یعنی مذاہبِ اربعہ کی حقیقت کے متعلق جو کچھ بندہ نے اہل السنۃ والجماعت کی کتابوں کا مطالعہ کر کے اب تک منقح کیا ہے، اس کو پیش کروں گا۔
 فَإِنْ يَكُ صَوَابًا، فَمِنْ اللَّهِ سُبْحَانَهُ وَتَعَالَى، وَإِنْ يَكُ خَطَاً، فَمِنِّي وَمِنَ الشَّيْطَانِ. وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيمِ. لَا إِلَهَ غَيْرُهُ وَلَا خَيْرَ إِلَّا خَيْرُهُ.

پہلے سوال کا جواب

سوال کے دو جزو سب سے پہلے یہ عرض کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے سوالِ اول میں غور و تنقیح کے بعد دو جزو نکلتے ہیں:

(۱) کسی چیز کا حق یا باطل ہونا اعتبارِ معتبر یا لحاظِ لائحہ پر مبنی نہیں ہو سکتا اور حیثیاتِ زائدہ اعتباریہ، حقائقِ واقعہ کے لیے مبطل یا مغیر نہیں ہو سکتے۔
(۲) مذاہبِ ائمہ اربعہ، واقع میں سب حق ہیں؛ حالانکہ ان مذاہب میں بہت سے ایسے مسائل ہیں جو باہم متضاد ہیں۔ مثلاً سب سے بڑا تضاد یہ ہے کہ ایک چیز کو ایک امام واجب یا فرض قرار دیتے ہیں اور دوسرے اُسی کو مکروہ تحریمی یا حرام، و علیٰ ہذا القیاس؛ تواضداد کا اجتماع ایک ہی چیز کے اندر اور ایک ہی وقت میں کیسے حق ہو سکتا ہے؟ اور اگر ان میں باہم حیثیات کا فرق نکالا جائے، تو وہ بہ حکم مقدمہ اولیٰ صحیح نہیں۔

آپ کے یہ دونوں دعوے بحثِ طلب ہیں۔ الفاظ ایسے محمل اور ذوالوجہ اختیار کیے گئے ہیں کہ جن سے کئی معنی کا احتمال ہوتا ہے۔ پس جب تک ہر ایک لفظ کی کماحقہ تشریح اور محتملاتِ عبارت میں سے بعض کی تعیین نہ ہو جائے، کچھ رائے زنی کرنا بے سود ہے۔
دعویٰ اول کا جواب | دعویٰ اول میں اگر یہ ارادہ کیا گیا ہے کہ کسی چیز کے ساتھ مختلف اعتبارات اور حیثیات لگ جانے سے اس چیز کی حقیقت یعنی ماہیت نفس الایۃ بدل نہیں سکتی۔ مثلاً زید زمین پر چل رہا ہو، یا ہو ا میں اڑ رہا ہو، یا کھانا کھا رہا ہو، یا بھوکا مَر رہا ہو، تحصیلِ علم میں مشغول ہو یا لہو و لعب میں اپنی عمر تباہ کرتا ہو، ہر حالت میں اور ہر ایک حیثیت کے لگ جانے کے وقت اُس کی حقیقت وہی حیوانِ ناطق رہتی ہے اور زید کو کسی طرح لحاظ کر دے، اُس کی حقیقت میں ذرا فرق نہیں آ سکتا، تو بلاشبہ مشائین کے مذاق کے موافق یہ دعوا صحیح ہے اور ہم کو اس سے انکار کر لے کی ضرورت نہیں۔

مختلف حیثیتوں کی وجہ سے | مگر مذاہب اربعہ کی حقیقت کے مسئلے سے یہ دعوا محض
شے کی حقیقت نہیں بدلتی | بے تعلق ہے۔ کیوں کہ ائمہ اربعہ مثلاً جس چیز کے وجوب و
حرمت میں مختلف ہیں، تو ہر مجتہد کی تصویب کرنے والے بھی یہ نہیں کہتے کہ اُس چیز پر
مختلف اور متضاد احکام جاری ہونے سے (جو اُن کے زعم میں بہ سبب اختلافِ نسبت
و اعتبارات کے جاری ہوئے ہیں) خود اس چیز کی حقیقت بدل جاتی ہے۔

مثلاً قے یا رُعاف کو امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ ناقض وضو کہتے ہیں اور امام شافعیؒ
فرماتے ہیں کہ ناقض وضو نہیں ہے۔ تو دونوں صورتوں میں قے اور رُعاف کی حقیقت
اُسی طرح محفوظ رہتی ہے، جس طرح کہ زید کی حقیقت حالتِ تحصیلِ علم اور لہو و لُعب میں
یا مثلاً یہ نہیں کہا جاتا کہ اُس فاتحہ کی حقیقت کچھ اور ہے، جس کو امام صاحب مُقتدی
کے حق میں مکروہ تحریمی قرار دیتے ہیں اور جس کو امام شافعیؒ ہر ایک مُصلیٰ کے حق میں
فرض فرماتے ہیں، اُس کی کوئی دوسری حقیقت ہے۔

پس اگر مختلف اعتبارات و حیثیات کے طاری ہونے سے آپ کا یہ خیال ہے کہ
اُس شے کی حقیقت واقعہ نہیں بدلتی، تو میں اور بہت عقلاً آپ کے ہم آہنگ ہیں اور
اس کا انکار آپ نے کسی سے نہ سنا ہوگا۔

بہ یک وقت مختلف احکام | لیکن اگر یہ مقصد آپ کا نہیں، بلکہ یہ ہے کہ کسی شے کے
جاری ہو سکتے ہیں | ساتھ حیثیات زائدہ اور اعتبارات کے لگ جانے سے اُس
پر نفس الامر میں مختلف احکام جاری نہیں ہو سکتے ہیں، تو میں کہتا ہوں کہ آپ نے یہی
نہیں کہ محض ایک بے سند دعو کیا ہے، بلکہ ایسا دعو اکر کے ان سبکڑوں دلائل و شواہد
کو جھٹلادیا، جو اس دعوے کی بہ بانگِ دُہل تکذیب کرتے ہیں۔

مثلاً زید کو دیکھیے کہ وہ ایک شخص ہے اور اُس کی ایک غیر متبدل حقیقت ہے۔
لیکن وہ اتفاق سے عمر و کا بیٹا اور خالد کا باپ اور ہندہ کی اولاد اور زینب کا شوہر ہے

تو کیا ان سب نسبتوں اور اعتبارات اور حیثیات کے لگنے کے بعد، جو کہ اس کے نفس حقیقت سے یقیناً خارج ہیں، ایک ہی وقت اور ایک ہی آن میں اُس پر ان مختلف اعتبارات و نسبتیں سے ہر ایک کے مناسب احکام و حقوق، جن میں بعض متضاد بھی ہیں، بہ اتفاق عقلاے دُنیا عائد نہیں ہوتے؟ کیا جس طرح اُس کو ہم اُس کے بیٹے خالد کے اعتبار سے مُطاع اور واجبُ التعظیم کہتے ہیں، اُسی طرح اُس کے باپ عمرو کے اعتبار سے بھی سمجھیں؟ یا جس طور پر کہ اُس کو اپنی زوجہ زینب پر تصرف کرنے کی اجازت دی جاتی ہے، اُسی طور سے ہندہ کے مقابلے میں بھی (جو اُس کی ماں ہے) مُطلق العنان چھوڑا جاسکتا ہے؟ حاشا! ثم حاشا!! حالاں کہ ہر ایک حالت میں اُس کی حقیقت اور ماہیت جوں کی توں باقی رہی۔ البتہ اُبوت، بُنوت اور زوجیت وغیرہ نسبتیں لگ جانے سے اُس کے حق میں مختلف احکام تجویز ہو گئے۔

اس کی مثالیں ایک دو نہیں، دس میں نہیں، پچاس سو نہیں، لَا تُعَدُّ وَلَا تُحْصَى ہیں؛ ضلع کا مجسٹریٹ باشندگانِ ضلع پر حاکم، مگر گورنمنٹ آف انڈیا یا واسراے یا لفٹننٹ گورنر کا محکوم ہے، تو کیا جو احکام و معاملات اُس کے لیے بہ اعتبار رعایا کے تسلیم کیے جائیں گے وہی بہ اعتبار محکام بالادست کے بھی ماننے پڑیں گے؟ ایک ہی مُرعن غذا ایک کن دُرست آدمی کھا کر زیادہ قوی اور توانا ہوتا ہے، لیکن ایک ضعیف المعده مریض کو اُس کا استعمال ہلاکت سے قریب تر کر دیتا ہے۔ ایک ہی شخہ ایک طبیب کا تجویز کیا ہوا ایک ہی وقت میں ایک مریض کے حق میں اُکسیرِ شفا ثابت ہوتا ہے، مگر دوسرے مریض کے لیے، جس کا مرض اُس طرح کا نہ ہو، سببِ قاتل سے کم نہیں رہتا۔

ان سب صورتوں میں یہ دریافت کرتا ہوں کہ ایک ہی چیز ایک ہی وقت میں ایک ہی شیشی میں عطاری دُکان یا سرکاری ہسپتال میں رکھی ہوئی ہے، اُس کو ہم کس طرح مُفید بھی، مُضر بھی، مُنہی بھی اور مہلک بھی، واجب الاستعمال بھی اور ممنوع الاستعمال بھی

کہہ سکتے ہیں؟ اس کا جواب بجز اس کے اور کیا ہوگا کہ یہ سب احکام و اوصافِ واقعہ اس دوا کے لیے مختلف استعمال کرنے والوں کی نسبت سے ثابت ہوئے ہیں جس کی واقعیت سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا !

تو میں پوچھتا ہوں کہ اب آپ کا وہ قاعدہ کہاں درست رہا کہ مختلف حیثیاتِ زائدہ کے لگنے سے کسی چیز کے واقعی احکام نہیں بدل سکتے؟ کیوں کہ یہاں ماہیت اور حقیقت تو اُس دوا کی غیر متغیر ہے، جو کچھ بھی اختلاف آیا ہے، بہ ہر حال باہر سے آیا ہے۔

میش بریں نیست، کہ آپ یہ کہیں گے کہ مذاہبِ اربعہ پر اس مثال کے انطباق کی، فرقہ مضروبہ (جو کل مجتہدِ مصیب کا قائل ہے) کے نزدیک، کیا صورت ہوگی؟ یہ فرقہ مضروبہ کے نزدیک اس کے متعلق بالاجمال یوں کہا جاسکتا ہے کہ شارع کی تقلید واجتہاد کے معنی طرف سے کسی مجتہد کو اجتہاد کی اور غیر مجتہد کو تقلید کی اجازت

ہونے اور اپنے اجتہاد یا امام کے مسلک کو واجب الاتباع ٹھہرانے کے یہ معنی ہیں کہ اُن کے مذاق کے موافق حق تعالیٰ شانہ کے علمِ ازلی میں جس فعل کا کرنا تمام بندوں کے حق میں مفید تھا، اُس نے تمام مجتہدینِ اُمتِ محمدیہ کو اُن کے جواز یا وجوب پر اتفاق کرنے کی توفیق مرحمت فرمائی اور جس کا چھوڑنا اُصلح تھا، اُس کے واسطے ایسے راستے نکالے اور سامانِ مہیا فرمائے کہ تمام مجتہدین کا اجماع اُس کی حرمت یا گراہت پر ہو گیا۔ اور جس فعل کو حق تعالیٰ شانہ نے، اپنے علمِ ازلی میں بعض بندوں کے حق میں نافع اور بعض کے حق میں مضر سمجھا، اُس میں ائمہ ہدیٰ کی رائیں مختلف کر دیں۔

اُدھر عام مومنین کے قلوب میں، خالص اپنی رحمت سے جو مومنین پر مبذول ہوتی ہے، ایسے مختلف و دائمی اسباب پیدا فرمادیے، جو اُن میں سے ہر ایک کو خواہی نخواہی ایک ایسے امام کی تقلید کی طرف لے جائیں کہ جس کا مسلک اُس خاص شخص کے حق میں اُصلح تھا۔ اب یہ شخص عملاً اُن دواؤں کا استعمال کرے یا نہ کرے جو اُس کے طبیعت

اس کو بتلائی ہیں، لیکن حق تعالیٰ نے اپنی حجت اس پر قائم کر دی، لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَ يُحْيِيَ مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ۔

یاد رکھیے، میرا اس وقت یہ دعو انہیں کہ فرقہ مصتبوہ کی یہ تقریر صحیح ہے یا غلط ہے؛ مگر اس قدر گزارش ہے کہ جس طرح ایک ہی دو مختلف مریضوں اور مختلف مواسم اور مختلف احوال مریض کے اعتبار سے نافع بھی اور مضر بھی، مُہلک بھی اور زندگی بخش بھی ہو سکتی ہے، اُسی طرح مصتبوہ کے خیال میں ایک چیز اور ایک ہی کام بعض کے واسطے جائز اور بعض کے حق میں حرام، بلکہ ایک ہی شخص کے لیے مختلف زمانوں کے اعتبار سے نفس الامر میں ایسا ہو سکتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ہر مقلد کو ہر وقت، جو مسلک اُس کے مناسب ہوتا ہے، اُسی کی طرف مائل ہونے کی اپنے فضل اور رحمت سے توفیق عطا فرماتا ہے۔ تحریر الاصول اور اس کی شرح میں اس فرقے کی رائے کا جو مختصر تذکرہ کیا ہے، اُس کی تفصیل یہ ہے جو بندہ نے گزارش کی۔ من شاء

فليطالعُه مع التدبُّر البالغ۔

الغرض، مصتبوہ کے زعم کو تسلیم کر کے اجتماع اُضداد فی نفس الامر کا خیال محض غلط ہے، اور ایسا ہے جیسا کہ کوئی شخص پس کر کہ کشتہ فولاد نہایت مقوی ہے اور یہ کہ نہایت مُہلک بھی ہے، اجتماع ضدین کا خیال باندھنے لگے۔

دعویٰ دوم کا جواب | اب میں آپ کے سواں اول کے دوسرے جزو کی طرف متوجہ ہوتا ہوں، جو کہ اصل مقصود ہے یعنی یہ کہ مسائل مختلف فیہا میں حق عند اللہ متعدد ہوتا ہے یا واحد؟ اور ہر ایک مجتہد مُصیب ہے یا کوئی ایک غیر مُعین مُصیب ہے اور باقی مُخطئ ہیں؟ مسائل کلامیہ میں | تفصیل اس کی، جیسا کہ علمائے محققین نے بیان کی ہے، یہ ہے کہ عقلیات خطا و صواب کی صورت | یعنی جن مسائل کا ماننا سماع پر موقوف نہیں، مثلاً عالم کا حادث اور صانع عالم کا وجود اور اس کی تمامی صفات الہیہ اور انبیاء علیہم السلام کی بعثت، اُن میں

لہ مُصیب: برحق، مُخطئ: خطا وار کھ کذا فی النسخة الاصلیة مطبوعة کتب خانہ اعزازیہ دیوبند

اختلاف کے وقت بالاجماع مُصِیب کوئی ایک ہے اور وہ وہی ہے جس کا اجتہاد واقع کے مطابق ہو اور اُس نے کوشش کر کے حق کو پایا ہو۔ کیوں کہ ممکن ہی نہیں کہ نفسِ الام میں مثلاً عالمِ حادث بھی رہے اور قدیم بھی، یا خداے تعالیٰ موجود بھی ہو اور معدوم بھی؛ تو لامحالہ فریقین میں سے ایک ہی فریقِ حق پر ہو سکتا ہے۔

اور جو خطا پر ہے، جب کہ اُس کی خطا سے اسلام کی یا اُس کے بعض اجزائے ضروریہ کی نفی ہوتی ہو، تو وہ بالاتفاق کافر ہے؛ اور اگر خطا مسائلِ مسئلہ اعتقاد میں ہے کہ جس کے انکار سے ملتِ اسلام کے اصولِ اولیہ کی نفی نہیں ہوتی، مثلاً کوئی شخص قرآن مجید کو مخلوق کہے یا اس کا معتقد ہو کہ شرور اور قباحِ حق تعالیٰ کے ارادے کے بغیر پیدا ہوتے ہیں، تو ایسا شخص اپنی خطا سے اگرچہ مذہبِ مختار کے موافق صریح کافر نہ کہا جاوے، لیکن مُبتدع اور آثم ضرور ہے۔

مسائلِ فقہیہ | یہ تو مسائلِ کلامیہ کا حال تھا۔ رہ گئے مسائلِ فقہیہ، تو ان میں سے جو شخص اپنے اجتہاد کے زور سے بدیہیاتِ فقہ کا انکار کرنے لگے، مثلاً: نماز، روزہ، حج یا زکوٰۃ کی فرضیت یا زنا، سرقہ اور شراب کی حرمت کا، تو نہ فقط یہ کہ وہ بالاتفاق مخطی ہے، بلکہ صریح کافر اور آثم ہے۔ ہاں، اگر وہ مسائل، باوجود قطعی ہونے کے بدیہیاتِ شرع میں سے نہیں ہیں، جیسا کہ مثلاً اجماع اور خبر واحد اور قیاس شرعی کا مُحْتَج ہونا؛ تو اس قسم کی باتوں کا نہ ماننے والا اگرچہ بلاشبہ مُخطی اور مُبتدع اور گنہگار ہوتا ہے، مگر کفر کی نسبت اُس کی طرف نہیں کی جاسکتی۔

مختلف فیہ مسائل | باقی ایسے مسائلِ شرعیہ جن میں اجتہاد کا مساعیغ ہو اور کوئی نفسِ قاطع یا اجماع اس میں موجود نہ ہو، تو فقط اس قسم میں نزاع ہے۔ مُعتزلہ اور بعض اشاعرہ کی طرف یہ منسوب ہے کہ وہ ایسے مسائل میں اختلافِ مجتہدین کے وقت تعدّدِ حق کے قائل ہیں۔ جن میں سے ایک جماعت کے خیالات کا خلاصہ جُزِ اول میں پیش کیا جا چکا ہے اور

تفصیل اُن کے اقوال و دلائل کی، کتبِ اصول و کلام میں مذکور ہیں حتیٰ کہ شیخ عبدالوہاب شرانی رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف سے تو معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے تعددِ حق کا بیان کرتے ہوئے، مسائلِ شرعیہ میں مجتہد فیہا کی قید بھی ہائی نہیں چھوڑی، جو خود قائلینِ تعددِ حق کے نزدیک بھی ضروری تھی۔

جمہور کے نزدیک حق عند اللہ واحد | بہ ہر حال، ائمہٴ معتزلہ اور چند اہلِ السنۃ والجماعۃ کی رائے یہ بتلائی جاتی ہے کہ وہ مسائلِ فقہیہ اور ہر مجتہد مستحقِ ثواب ہے

غیر منصوصہ میں تعددِ حق کے قائل ہیں، لیکن جمہور اہلِ سنت والجماعت کا، جن میں ائمہٴ اربعہ بھی شامل ہیں، مذہبِ مختار یہی ہے کہ تمام مسائلِ منصوصہٴ اصلیہ اور فرعیہ کی طرح ان مسائل میں بھی عند اللہ کوئی ایک حق ہے، کہ جس کی تلاش میں مجتہدین اپنی اپنی قوتِ اجتہاد صرف کرتے ہیں۔ پس جو مجتہد اپنی سعیِ بلیغ سے اس محکمِ مطلوب پر پہنچ گیا، وہ تو بالبداہت کام یاب ہو گیا اور جس کی نظر سے باوجود استفراغِ وسع اور امکانی جدوجہد کے محکمِ مطلوب مستور رہا، تو گو کہہ سکتے ہیں کہ اُس کو بہ اعتبارِ حاصلِ مقصود کے کام یابی نہ ہوئی، لیکن اس اعتبار سے اُس کی کوشش بھی رائگاں نہیں گئی کہ حق تعالیٰ کمالِ فضل و احسان سے، بہ سببِ مسائلِ اجتہادیہ کے غایتِ درجہ دقیقُ الماخذ ہونے کے، اس کو معذور قرار دے کر اُس کی محنت اور جدوجہد کی قدر کرتا ہے اور بجائے اس کے کہ ایک غیر معتد بہ رائے کے موافق اپنی اس خطا کی وجہ سے وہ آئیم ٹھہرتا، اُلٹا اجر اور ثواب کا مستحق ہوتا ہے۔ لِمَا فِي الصَّحِيحَيْنِ مَرْفُوعًا:

إِذَا حَكَّمَ الْحَاكِمُ فَاجْتَهَدَ فَأَصَابَ
فَلَهُ أَجْرَانِ، وَإِذَا حَكَّمَ
فَاجْتَهَدَ فَأَخْطَأَ، فَلَهُ أَجْرٌ
وَاحِدٌ.

حاکم جب اپنے اجتہاد سے کوئی فیصلہ دے اور وہ فیصلہ واقع میں بھی درست ہو، تو اُس کے واسطے دو ہر ثواب ہے، اور اگر اُس میں خطا ہوئی، تو اگر ثواب تب بھی ہے۔

یعنی لکنہ کوشش کرنے کے باوجود

ایک مثال سے وضاحت | اس کو یوں سمجھیے کہ مثلاً فلسفہ کے ایک استاذ نے اپنے تین ذہین طالب علموں کے شوق و محنت و توجہ و فطانت کا امتحان کرنا چاہا اور اعلان کر دیا کہ تم میں سے جو شخص طبیعیاتِ شفا کے فلاں مقام کو خوب اچھی طرح سمجھ کر ہمارے رُوبہ رُو ٹھیک ٹھیک بیان کر دے گا، اس کو ہم بیس روپیے کی ایک گھڑی انعام میں دیں گے۔ اور فرض کیجیے کہ اُن کو مطالعہ کرنے کے لیے ایک شب کی مہلت دی گئی۔ اب ایک طالب علم نے تو اُن میں سے محض اپنی ذکاوت پر اعتماد کر کے اور شفا کی عبارت کو ایک آدھ مرتبہ سرسری نظر سے گزران کر کتاب کو بالائے طاق رکھ دیا اور رات بھر خوب بے فکری اور آرام کی نیند سویا، مگر صبح کو جب اُس نے اُستاد کے سامنے کتاب کھولی، تو نہ عبارت کتاب کی صحیح پڑھی اور نہ مطلب صاف بیان کیا۔ بلکہ جو کچھ تقریر تھی، وہ محض غلط تھی، تو ظاہر ہے کہ ایسے طالب علم کے حق میں اس کے سوا کیا ہونا ہے، کہ بجائے انعام کے مناسب سزا تجویز کی جاوے اور نفریں اور ملامت کی ہر چہاں طرف سے اُس پر بوجھار ہو اور شفا کی جماعت سے اُسے خارج کر دیا جاوے!

باقی جو طالب علم اُس کے سوا تھے، اُن کو اُستاد نے دیکھا کہ وہ باوجود اول درجہ کی ذہانت و فطانت کے، محض اس خوف سے کہ کہیں کتاب کا مطلب سمجھنے میں کوئی نہ ہو اور غلطی نہ ہو جائے جس سے اُستاد ناراض ہو جائے اور ہم غصروں کو شتمات کا موقع ملے، رات بھر چراغ کے سامنے آنکھیں تاپتے رہے۔ بار بار نیند کا تقاضا ہوتا تھا، مگر وہ دونوں ہمت کے دھنی شفا اور اُس کے خواہش اور تعلیقات سامنے رکھے ہوئے، اُس مقام کی مختلف تقریروں کا موازنہ کرتے رہے اور شیخ رئیس کا صحیح صحیح منشا معلوم کرنے کی فکر میں رات بھر مستغرق رہے۔

یہ سب نظارہ اُستاد اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا اور دل ہی دل میں اُن کی

۱۵ شامت کسی کے نقصان پر خوش ہونا۔

محنت اور کاوش اور اُن تھک کوشش کی داد دے رہا تھا۔ لیکن افسوس، سوہر اتفاق سے ایک طالب علم اُن میں کا صبح کو جب استاد کے سامنے امتحان کے لیے حاضر ہوا، تو نتیجہ خلاف اُمید نکلا اور بہ افسوس معلوم ہوا کہ تمام شب کی دواؤں میں بھی جس کا مشاہدہ خود استاد کر رہا تھا، کتاب کے عمیق اور غامض مطلب تک رسائی نہ ہو سکی۔

ہاں، اُس کے دوسرے حریف نے، کہ وہ بھی ذہانت اور محنت میں اُس سے پیچھے نہ تھا، اس مقام کی جو تقریر کی، تو وہ ایسی کی کہ گویا خود ابن سینا قبر میں سے اٹھ کر اپنی مراد ظاہر کرنے کے لیے آگیا اور اس نے کتاب کے ایک ایک لفظ کی گہرہ کھول دی۔ اُس وقت استاد کو اُس پر پیار آیا اور اُس نے اُس کی پیشانی چوم لی اور خوش نما گھڑی میں روپیہ کی جیب سے نکال کر اُس کے حوالے کی۔ لیکن اُس دوسرے ذہین طالب علم کی محنت کو بھی، جسے وہ رات بھر دیکھ کر رحم کھاتا رہا تھا، اُس نے کالعدم نہیں سمجھا، غایت شفقت سے اُس کی تسکین کی اور شہ سواروں کے میدان جنگ میں گرنے کی مثالیں پیش کر کے اُس کو مطمئن کیا، تاکہ وہ آئندہ اپنی فہم اور کوشش کی طرف سے بے پرواہ اور بدگمان نہ ہو جائے، بلکہ دوسرے امتحانات میں اپنے معاصر سے سبقت لے جانے کی بیش از بیش سعی کرے۔ اُس کو بھی ایک گھڑی مگر دس روپیہ کی اُس کی محنت کے صلے کے طور پر دی۔

جیسا کہ آپ نے سنا ہو گا کہ غازی عثمان پاشا شیر پلو ناجب دشمنوں کے ہاتھ میں پڑ گئے، تو خود دشمن کے یہاں اُن کی جاں بازانہ بساتیوں کا کیسا کچھ احترام ہوا، اور سلطان اعظم نے اُن کا شاندار استقبال ایک فاتح جنرل کی حیثیت میں کیا، اور دنیا کے عقل مند چلا اٹھے کہ عثمان کی شکست ایک ایسی شکست ہے، جس پر ہزاروں فاتح قربان کیے جاسکتے ہیں۔

پس ٹھیک اسی طور پر تم مجتہدین کی حالت کو سمجھو۔ اگر بالفرض مجتہد کسی مسئلے کا حکم صحیح دریافت کرنے میں اُس پہلے طالب علم کی طرح بے پروائی برتے اور قوت اجتہاد کو

لے دواؤں: بھاگ دوڑ لے بسالت: بہادری

پوری پوری ہمت اور محنت کے ساتھ کام میں نہ لائے، تو حسب تصریحِ علمائے محققین، یہی نہیں کہ وہ محض مخفی ہوگا، بلکہ گنہ گار اور آثم ٹھہرے گا۔

ہاں، وہ دونوں مجتہدین، جنہوں نے منصبِ اجتہاد پر فائز ہو کر مُسادی کو شش اور محنت استخراجِ احکام میں کی، مگر تقدیر سے ایک تو حق تعالیٰ کے صحیح منشا کے معلوم کرنے میں کام یاب ہو گیا اور دوسرا نہ ہوا، تو حق تعالیٰ اپنی غایتِ رافت اور رحمت سے ان دونوں کو علیٰ قدرِ مراتب اجر و ثواب مرحمت فرمانے میں تنگی نہ کریں گے، اگرچہ بعض کو بعض پر فضیلت ہو۔ جیسا کہ انبیاءِ مُرسَلین اور خُلفائے راشدین میں بھی بعض بعض سے افضل ہیں۔ وَذَلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ، وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ ہر سلسلے میں خدا کے دُوحکم | شیخ تہمی الدین ابن دقیق العید فرماتے ہیں کہ مجتہدین کے واسطے ہر ایک واقعے میں اللہ تعالیٰ کے دُوحکم ہیں: ایک یہ کہ اُس واقعے سے مُتعلیٰ خدا کا جو کچھ حکم واقع میں ہے، جس کی طرف رہنمائی کرنے والے لطیف اشارات و امارات بھی اس نے اپنے کلام میں اور اپنے رسول کے کلام میں نصب فرما دیے ہیں، اُس کو معلوم کریں دوسرا یہ کہ ہر مجتہد، بعد اپنی پوری قوتِ اجتہاد اور انتہائی کوشش صرف کر لینے کے جس نتیجے پر پہنچے، وہی اس کے حق میں واجب الاتباع ہے۔

پس وہ مجتہد، جو ایک مسئلہ اجتہادی میں پوری ہمت صرف کر لینے کے بعد بھی حق تعالیٰ شانہ کے صحیح منشا اور مطلوب پر مُطلع نہ ہو سکا، اگرچہ اُس حکمِ اول کے فوت ہونے کے اعتبار سے، جس کا معلوم کرنا ہر مجتہد کے ذمے لازم تھا، مخفی کہا جاسکتا ہے، لیکن دوسرے حکم کے لحاظ سے ہر ایک مجتہد کو مُصیب بھی کہہ سکتے ہیں۔ کیوں کہ جو کچھ اُس نے اپنے علم اور اجتہاد سے معلوم کر لیا، اُس کے حق میں اب وہی واجب الاتباع قرار دیا گیا ہے۔ اختلافاتِ باعثِ رحمت | تو جن لوگوں نے ”کُلُّ مجتہدٍ مُصیب“ کی آواز بلند کی، اگر اُن کی غرض یہی ہے، جواب ہم نے بیان کی، تو بلاشبہ اس میں تمام اہل سنت والجماعت

ان کے ساتھ متفق ہیں۔ اور یہی وجہ تھی کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے عہد مبارک میں کوئی مجاہلی دوسرے پر مسائل اجتہاد میں اختلاف رکھنے کی وجہ سے ملامت یا طعن و تشنیع نہیں کرتا تھا اور تفصیل یا تبدیع تو کجا، ایک کی طرف سے دوسرے کی تائیم بھی نہ ہوتی تھی بلکہ ایسے اختلافات کو توسعہ اور رحمت جان کر، ایک دوسرے کے ساتھ رہنا نہایت رواداری کا برتاؤ کرتے تھے۔

خود احناف کی کتابوں میں، بجز ایسی صورتوں کے جس میں فسادِ صلوٰۃ کا مظنہ غالب ہو، ائمہ حنفی کی شافعی کے پیچھے اور شافعی کی حنفی کے پیچھے جائز رکھی گئی ہے۔ اور بعض بعض مسائل میں، جہاں فقہائے زمانہ کو شرعاً رخصت اور تیسیر کی ضرورت محسوس ہوئی ہے، دوسرے ائمہ کی آرا کو معمول بہا بنایا گیا ہے۔ کیوں کہ کسی خاص امام کی تقلید کے لازمی معنی اگرچہ اُس امام کے مذہب کو صواب اور راجح کرنا ہے، لیکن پھر بھی احتمالِ خطا کا اعتراف اور دوسرے امام کے اجتہاد کے متعلق احتمالِ صواب کی تصریح موجود ہے۔ اگر خالص شرعی مصالح، جن کا ادراک فقہا کر سکتے ہیں، اس طرف داعی ہوں کہ بعض مسائل میں دوسرے ائمہ کے مذاہب پر فتویٰ دیا جائے، تو آخر اس احتمالِ خطا و صواب سے فائدہ اٹھانے کا اور کون سا موقع ہے؟

عملاً سب حق پر ہیں | اس لیے یہ خوب محفوظ رکھنا چاہیے کہ باوجود دے کہ حق عند اللہ کے اعتبار سے، ہر ایک مسئلے میں کوئی ایک ہی مجتہد مُصِیْب ہوتا ہے، لیکن عملاً سب حق پر ہیں۔ یعنی حق تعالیٰ شانہ نے یہ وسعت دی ہے کہ مجتہد اپنے اجتہاد کے ادبِ عمل کرے، اگرچہ اُس کا اجتہاد باوجود پوری کوشش کے ٹھیک نشانے پر نہ بیٹھا ہو۔

تمثیلاً یوں سمجھو کہ کعبہ، نفس الامر میں ایک مُعین مکان کا نام ہے اور اُسی کا

نہ تفصیل: گمراہ قرار دینا، تبدیع: بدعتی قرار دینا، تائیم: گنہ گار قرار دینا۔

نہ مظنہ: جمع مظان، احتمال، جگہ۔ نہ آسانی: نہ صحیح

استقبال شریعت نے نماز میں ضروری قرار دیا ہے۔ **قَوْلٍ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ**۔ لیکن جس وقت سمتِ کعبہ ٹھیک معلوم نہ ہو، تو بعدِ تحرّی کے جو سمت مُعَيَّن ہو، اُسی کا استقبال قبولِ صلوٰۃ کے لیے کافی سمجھا گیا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ ہماری تحرّی جس طرف ہو، ضروری نہیں کہ نفسِ الامری میں خانہ کعبہ بھی اُسی طرف منتقل ہو جائے۔ پس یہ خدا کی رحمت اور انعام ہے۔ اگرچہ واقع میں مُسْتَقْبِلٌ قِبْلَہ وہی شخص ہے، جس کا رُخ ٹھیک کعبہ کی طرف ہو۔ مگر تاہم دوسری طرف منہ کرنے والوں کو بھی تَوْشَعًا اور حُکْمًا مُسْتَقْبِلِ کعبہ تسلیم کر لیا گیا ہے۔

تو یہ اعتبار کعبہ نفسِ الامری اور حکمِ ادلی کے تو فقط ایک ہی شخص مُصِیْب ہے اور سب مُخْطِی، لیکن یہ اعتبار قبولِ صلوٰۃ اور امثالِ امرثانی کے سب مُصِیْب ہیں۔ یہی مطلب ہے حدیث: **أَصْحَابِي كَالنَّجُومِ بِأَيْتِهِمُ اقْتَدَيْتُمْ أَهْدَيْتُمْ** کا، اگر وہ صحیح طور پر ثابت ہو جائے۔ اور نیز حضرت الشیخ **الْأَجَلُ مُحَدِّثٌ لِّكُلِّ وَحْيٍ رَحِمَهُ اللَّهُ عَلَيْهِ** کی اس عبارت کا، جو سبیلُ الرِّشَادِ ص ۳۲ میں ہے: ”پس ہر چند کہ عِنْدَ اللَّهِ محلِ اختلاف میں حق واحد ہوتا ہے، مگر عمل میں سب حق ہوتے ہیں“ اور یہی محل ہے حضرت امام ابو حنیفہ کے اس اشارے: **كُلُّ مُجْتَهِدٍ مُصِيبٌ وَالْحَقُّ عِنْدَ اللَّهِ وَاحِدٌ**، اور امام ابو یوسف کے اس کلام کا: **كُلُّ مُجْتَهِدٍ مُصِيبٌ وَإِنْ كَانَ الْحَقُّ فِي وَاحِدٍ، فَمَنْ أَصَابَهُ فَقَدْ أَصَابَ الْحَقَّ وَمَنْ أَخْطَاهُ فَقَدْ أَخْطَاهُ**۔“ التقریر والتحبیر، ص: ۳۸، ۳۹

ع: ۳، مصری

حضرت امام صاحب اور امام ابو یوسفؒ کی ان نصوص کو ہمیشہ یاد رکھیے جن سے یہ خوبی واضح ہوتا ہے کہ امام صاحب اور دیگر ائمہ اہل سنت سے جو بعض شاذ اقوال، ہر مجتہد کی تصدیق کی نسبت اُن کے مشہور و معروف مذہب: **الْمُجْتَهِدُ يُخْطِئُ وَيُصِيبُ** کے خلاف منقول ہیں، فی الحقیقت اُن کے اصل مذہب کے خلاف نہیں ہیں۔

لہ یعنی استقبال قبلہ کرنے والا

تعجب ہے کہ امام عبد الوہاب شہرانی نے بھی میزان کبریٰ میں پیش تر اسی قسم کے اقوال کی سطح سے مدد لی ہے۔

مسلک جمہور مستند | اس جگہ میں مناسب سمجھتا ہوں کہ چند نقول مستند کتابوں کتابوں کی روشنی میں | کی آپ کے سامنے پیش کر دوں جو اس بات کو ظاہر کرتی ہیں؛

کہ اصل مذہب جمہور اہل سنت والجماعت اور ائمہ اربعہ کا یہی ہے کہ اجتہادیات میں حق عند اللہ واحد ہے اور اسی بنا پر مجتہد مصیب بھی ہو سکتا ہے اور مخطی بھی؛ چنانچہ تحریر الاصول اور اس کی شرح میں لکھتے ہیں کہ:

والمُختار أن حُكْمَ الواقعة المُجْتَهَد
فِيهَا حُكْمٌ مُعَيَّنٌ أَوْجِبَ طَلِبُهُ،
فَمَنْ أَصَابَهُ فَهُوَ الْمَصِيبُ، وَمَنْ
لَا يَصِيبُ فَهُوَ الْمَخْطِئُ، وَنَقَلَ هَذَا
عَنِ الْأَئِمَّةِ الْأَرْبَعَةِ أَبِي حَنِيفَةَ وَ
مَالِكٍ وَالشَّافِعِيِّ وَأَحْمَدَ. وَ
ذَكَرَ السُّبْكِيُّ أَنَّ هَذَا هُوَ الصَّحِيحُ
عَنْهُمْ، بَلْ نَقَلَهُ الْكَرْخِيُّ عَنْ
أَصْحَابِنَا جَمِيعًا. وَلَمْ يَذْكُرِ
الْقُرَافِيُّ عَنْ مَالِكٍ غَيْرَهُ. وَذَكَرَ
السُّبْكِيُّ أَنَّ الَّذِي حَرَّرَهُ
أَصْحَابُ الشَّافِعِيِّ عَنْهُ وَقَالَ
ابْنُ السَّمْعَانِيِّ: وَمَنْ قَالَ
عَنْهُ غَيْرَهُ، فَقَدْ أَخْطَأَ
(عليه) (ص ۳۶، جلد: ۳)

مذہب مختاریہ ہے کہ ہر واقعہ مجتہد فیہا میں ایک حکم
مُعَيَّن ہوئے جس کی تلاش خدا کی طرف سے لازم
کی گئی ہے۔ پس جس مجتہد نے اُس کو پایا، وہ
مُصِيب ہے اور جو نہ پاسکا، وہ مُخْطِئ ہے۔ چنانچہ
یہی خیال چاروں اماموں: ابو حنیفہ، مالک، شافعی
احمد رضی اللہ عنہم کا ہے۔ اور سبکی نے لکھا
ہے کہ یہی رائے ائمہ اربعہ کے نزدیک صحیح ہے۔
بلکہ کرخی نے تو ہمارے تمام اصحاب (حنفیہ سے
یہی خیال نقل کیا ہے۔ اور قرافی نے اس کے ہوا
امام مالک سے کوئی قول نقل نہیں کیا۔ اور سبکی
نے ذکر کیا کہ یہی وہ قول ہے، جس کو امام شافعی
کے اصحاب نے امام شافعی سے مُنْقَض کر کے لکھا
ہے۔ اور ابن السمعانی نے فرمایا کہ جس کسی نے
امام شافعی سے اس کے سوا دوسرا قول نقل
کیا، اُس نے خطا کی۔

شیخ شمس الدین ابن القیم اَعْلَامُ الْمُوقَعِينَ میں لکھتے ہیں:

اور ائمہ اربعہ نے تصریح کی ہے کہ اقوال مختلفہ میں سے ایک ہی قول حق ہوتا ہے۔ یہ نہیں کہ سب کے سب اقوال درست ہوں۔

وقد صَرَّحَ الْأُئِمَّةُ الْأَرْبَعَةُ بِأَنَّ الْحَقَّ فِي وَاحِدٍ مِنَ الْأَقْوَالِ الْمَخْتَلِفَةِ وَ لَيْسَتْ كُلُّهَا صَوَابًا (مفتا ۲ جلد: ۳)
حافظ ابن تیمیہ قادیانی میں لکھتے ہیں:

(المقام الأول، هل يُلْهِ في كُلِّ حَادِثَةٍ تَنْزِلُ حُكْمٌ مُعَيَّنٌ فِي نَفْسِ الْأَمْرِ، بِمِثْلَةِ مَا يَلِيقُ قَبْلَهُ مُعَيَّنَةٌ هِيَ الْكَعْبَةُ وَهِيَ مَطْلُوبُ الْمُجْتَهِدِينَ عِنْدَ الْإِشْتِبَاهِ؟ فَالْجَوَابُ عَلَيْهِ السَّلَفُ وَ جَمَاهُورُ الْفُقَهَاءِ وَأَكْثَرُ الْمُتَكَلِّمِينَ أَوْ كَثِيرٌ مِنْهُمْ، أَنَّ يُلْهِ فِي كُلِّ حَادِثَةٍ حُكْمًا مُعَيَّنًا قَدْ سَمِعْنَاهُ عَفْوًا، لَكِنْ أَكْثَرُ أَصْحَابِ أَبِي حَنِيفَةَ وَبَعْضُ الْمُعْتَزِلَةِ يُسَمُّونَ هَذَا الْأَشْبَهَ وَلَا يُسَمُّونَهُ حُكْمًا، وَهُمْ يَقُولُونَ: مَا حَكَّمَ اللَّهُ بِهِ، لَكِنْ لَوْ حَكَّمَ لِمَا حَكَّمَ إِلَّا بِهِ، فَهُوَ عِنْدَهُمْ فِي نَفْسِ الْأَمْرِ حُكْمٌ بِالْقُوَّةِ.

پہلی بحث یہ ہے کہ کیا ہر ایک حادثے میں جو پیش آئے، خدا کی طرف سے کوئی ایک حکم معین ایسا ہوتا ہے، جیسا کہ حق تعالیٰ نے خاص کعبہ کو ایک معین قبلہ بنا دیا ہے، جس کو اشتباہ کے وقت مجتہدین معلوم کرنا چاہتے ہیں؟ تو سلف صالحین اور جمہور فقہاء اور اکثر متکلمین یا بول کہو کہ بہت سے متکلمین کا مذہب یہ ہے کہ دہرے حادثے میں خدا کا حکم معین ہے، جس کا نام ہم نے عفو رکھا ہے۔ اور اکثر حنفیہ اور بعض اُس کو اِشْبَہ کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور اُس کو وہ حکم نہیں کہتے بلکہ یوں کہتے ہیں کہ گو خداوند تعالیٰ نے اس حادثے میں صاف حکم نہیں فرمایا؛ لیکن اگر وہ حکم دیتے تو اس کے سوا حکم نہ دیتے۔ تو ان لوگوں کے نزدیک نفس الامر میں حکم معین ہے، مگر بالقوہ۔

وَحَدَّثَ بَعْدَ الْمَائَةِ الثَّلَاثَةِ فِرْقَةٌ مِنْ أَهْلِ الْكَلَامِ زَعَمُوا أَنَّ لَيْسَ عِنْدَ اللَّهِ حَقٌّ مُعَيَّنٌ هُوَ مَطْلُوبُ الْمُسْتَدْلِينَ، إِلَّا فِيمَا فِيهِ دَلِيلٌ قَطْعِيٌّ

پھر تیسری صدی کے بعد ایک جماعت متکلمین کی ایسی پیدا ہوئی، جس کا یہ خیال ہے کہ بجز ان سائل کے، جن کے واسطے کوئی ایسی دلیل قطعی پہلے سے موجود ہو جس کی معرفت پر

يَتِمَكَّنُ الْمُجْتَهِدُ مِنْ مَعْرِفَتِهِ، فَمَا مَا فِيهِ دَلِيلٌ قَطْعِيٌّ لَا يَتِمَكَّنُ مِنْ مَعْرِفَتِهِ أَوْ لَيْسَ فِيهِ إِلَّا أُدْلَةُ ظَنِّيَّةٌ، فَحُكْمُ اللَّهِ عَلَى كُلِّ مُجْتَهِدٍ مَا ظَنَّهُ، وَتَرْتُّبُ الْحُكْمِ عَلَى الظَّنِّ كَتَرْتُّبِ الذِّدَّةِ عَلَى الشَّهْوَةِ فَكَمَا أَنَّ كُلَّ عَبْدٍ يَلْتَدُّ بِدُرِّكَ مَا يَشْتَهِيهِ وَتَخْتَلِفُ اللَّذَاتُ بِاخْتِلَافِ الشَّهَوَاتِ كَذَلِكَ كُلُّ مُجْتَهِدٍ حُكْمَهُ مَا ظَنَّهُ، وَتَخْتَلِفُ الْأَحْكَامُ ظَاهِرًا وَبَاطِنًا بِاخْتِلَافِ الظَّنُونِ وَزَعَمُوا أَنَّ لَيْسَ عَلَى الظَّنُونِ أُدْلَةٌ كَأَدْلَةِ الْعُلُومِ، وَإِنَّمَا تَخْتَلِفُ بِاخْتِلَافِ أَحْوَالِ النَّاسِ وَعَادَاتِهِمْ وَطِبَاعِهِمْ وَهَذَا قَوْلٌ خَبِيثٌ يَكَادُ فُسَادُهُ يُعْلَمُ بِالْاضْطِرَارِّ عَقْلًا وَشَرْعًا. وَقَوْلُهُ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: فَلَا تَنْزِلْهُمْ عَلَى حُكْمِ اللَّهِ، فَإِنَّكَ لَا تَدْرِي مَا حَكَمَ اللَّهُ فِيهِمْ، وَقَوْلُهُ لِسَعْدٍ: لَقَدْ حَكَمْتَ فِيهِمْ بِحُكْمِ اللَّهِ

مُجْتَهِدٍ پوری طرح قادر ہے، باقی تمام مسائل میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے کوئی حکم معین نہیں۔ تو جن مسائل میں دلیل قطعی پہلے سے موجود تھی، مگر مجتہد اُس کی معرفت پر قادر نہ تھا، یا سرے سے بجز ادلہ ظنیہ کے کوئی دلیل قطعی موجود ہی نہیں تھی؛ تو ایسی صورت میں جس مجتہد نے جو رائے اپنے اجتہاد سے قائم کی بس خدا کے نزدیک بھی مسئلے کا حکم وہی ہے۔ اور اس تقدیر پر مجتہد کی رائے پر حکم کا ترتیب ایسا ہی ہوگا، جیسا کہ لذت کا ترتیب شہوت پر ہوتا ہے۔ تو جیسا کہ ہر آدمی کی جو خواہش ہو، اُسی کے حاصل ہونے سے اُس کو لذت حاصل ہوتی ہے، اور لوگوں کی خواہشات کے اختلاف سے لذات بھی مختلف ہوتی ہیں؛ اسی طرح ان لوگوں کے نزدیک کسی مجتہد نے جو خیال کسی مسئلے میں قائم کر لیا، خدا کا حکم بھی اُس کے لیے وہی ہے۔ اور مجتہدین کے خیالات کے اختلاف سے احکام خداوندی بھی ظاہر و باطناً مختلف ہوں گے۔ اور ان لوگوں کا گمان یہ ہے کہ مسائل ظنیہ میں دلائل کا حال وہ نہیں جو مسائل یقینیہ میں ہوتا ہے۔ اور ظنیات لوگوں کے حالات و عادات اور طبائع کے اختلاف سے مختلف ہوتے رہتے ہیں۔

من فوق سبعة أَرْقعة،
وقولُ سليمان: اللَّهُمَّ
إِنِّي أَسْأَلُكَ حُكْمًا
يُؤَافِقُ حُكْمَكَ؛ كَلَّةُ
يَدُلُّ عَلَى فسادِ هذا
القول مع كَثْرَةِ
الأدلة السَّمْعِيَّةِ
والعقلية على فساده.

(ص ۱ جلد: ۳)

(حافظ ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ) اس جماعت کا یہ خیال
ایک گندہ خیال ہے جس کا فساد اور بطلان از روئے عقل
بھی اور از راہ شریعت بھی قریب قریب بے ساختہ طور پر
معلوم ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد: ہر کہ
اُن کو اللہ کے حکم پر مت اتار دے، کیوں کہ تم کو کیا معلوم ہے کہ
اللہ کا حکم اُن کے بارے میں کیا ہے؟ اور نیز آپ کا وہ ارشاد
جو حضرت سعدؓ کو فرمایا کہ: ”بلاشبہ تو نے اُن کے بارے میں
وہ فیصلہ کیا جو حق تعالیٰ نے سات آسمانوں کے اوپر سے کیا
تھا“ اور حضرت سلیمان علیہ السلام کا یہ سوال کہ اے اللہ!
میں تیرے سے ایسے حکم کا خواست گارہوں، جو تیرے حکم کے
موافق ہو؟ یہ سب باتیں بہت سی اَدلّہ عقلیہ اور سمعیہ کی
مَعِیت میں اس خیال کے بطلان کی طرف رہنمائی کرتی ہیں۔

شیخ محمد الدین نووی لکھتے ہیں:

وقد اختلف العلماء في أن
كُلَّ مُجْتَهِدٍ مُصِيبٌ أَمْ لِلْمُصِيبِ
وَلِاحِدٍ، وَهُوَ مِنْ وَاقِفٍ الْحُكْمِ
الَّذِي عِنْدَ اللَّهِ تَعَالَى؛ وَالْآخِرُ
مُخْطِئٌ لَا إِثْمَ عَلَيْهِ لِعُذْرِهِ ؟
وَالْأَوَّلُ عِنْدَ الشَّافِعِيِّ وَأَصْحَابِهِ
أَنَّ الْمُصِيبَ وَاحِدٌ (ص ۱۶۹ ج: ۲)

اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ آیا مسائل مختلف فیہا ہیں:
ہر ایک مجتہد مصیب ہے یا فقط ایک! اور وہ وہی
جس کی رائے اُس محکم کے موافق پڑ جائے، جو اللہ تعالیٰ
کے نزدیک پہلے سے مُتَعَيَّن ہے۔ اس صورت میں
دوسرا مُخْطِئ ہوگا، لیکن گنہ گار نہ ہوگا، کیوں کہ وہ معذور
تھا؛ تو امام شافعی اور اُن کے پیروں کا صحیح ترین
مسلك یہی ہے کہ مصیب کوئی ایک ہوتا ہے۔

شیخ الاسلام حافظ ابن حجرؒ اِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ، وَإِنَّهُ يَأْتِيَنِ الْخَصْمَ
فَلَعَلَّ بَعْضَكُمْ أَنْ يَكُونَ أَبْلَغَ مِنْ بَعْضٍ، (المحدث) کے تحت
لکھتے ہیں:

وفیه ان المجتہد قد یخطئ
فی ردِّ بہ علی من زعم
ان کلَّ مجتہدٍ مُصیبٌ و
وفیه ان المجتہد اذا اخطأ
لا یلحقہ إثمٌ، بل یؤجر
کما سیأتی

(فتح الباری صفحہ ۱۵۲ ج ۱۳)

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ مجتہد سے کبھی کبھی
خطا بھی ہوتی ہے۔ تو یہ حدیث صحیح اُن لوگوں کے رد
میں پیش کی جائے گی، جو کہتے ہیں کہ ہر ایک مجتہد
مصیب ہی ہوتا ہے۔ اور اس حدیث سے یہ بھی
معلوم ہوا کہ مجتہد اگر خطا بھی کرتا ہے، تب بھی
گنہگار نہیں ہوتا، بلکہ ماجور ہوتا ہے، جیسا کہ
اس کا بیان آگے آئے گا۔

اور باب ما یدکر من ذمّ الرأی میں تحریر فرماتے ہیں:

والی هذا یؤمئ قولُ الشافعی
فیما أخرجه البیہقی بسندٍ
صحیحٍ إلی احمد بن حنبل: سمعتُ
الشافعی یقول: القیاسُ عندَ
الضرورة، مع ذلك فلیس العامل
برأیه علی ثقہ من أنّه وقعَ
علی المراد من الحکم فی نفسِ
الامر، وإتّما علیہ بذلّ الوُسع فی
فی الاجتہاد لیؤجر ولو اخطأ، وبالله
التوفیق. (فتح الباری صفحہ ۲۲۵ ج ۱۳)

اور اسی کی طرف اس قول میں اشارہ موجود ہے،
جو بیہقی نے بسند صحیح بہ حوالہ امام احمد بن حنبل نقل
کیا ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے امام شافعی کو
یہ کہتے سنا کہ قیاس ضرورت کے وقت جائز ہے
مگر ساتھ ہی قیاس اور رائے پر عمل کرنے والے کو
یہ وثوق نہیں ہو سکتا کہ اس کی رائے ٹھیک اُس
حکم پر جا پہنچی ہو، جس کا فی الواقع حق تعالیٰ نے
ارادہ فرمایا ہے۔ بس اس کا کام تو اتنا ہی ہے کہ
اجتہاد میں اپنی پوری طاقت صرف کر کے ثواب
حاصل کرے، خواہ اس اجتہاد میں وہ غلطی کیوں نہ ہو

پھر باب أجر الحاکم إذا اجتہد فأصاب أو اخطأ میں إذا حکم الحاکم
فاجتہد ثمّ أصاب فله أجران وإذا حکم فاجتہد ثمّ اخطأ فله
أجرٌ کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

یعنی مجتہد نے خیال کیا کہ حق اس طرف ہے،
اور اتفاق ایسا ہوا کہ نفس الامر میں حق اُس کے

ای ظنّ أنّ الحقّ فی جهة فصادف
أن الذی فی نفس الامر

بِخلافِ ذَلِكَ، فَأَوَّلُ لَهُ أَجْرُ
الاجْتِهَادِ وَأَجْرُ الْإِصَابَةِ، وَالْآخِرُ لَهُ
أَجْرُ الْاجْتِهَادِ فَقَطْ؛ وَقَدْ تَقَدَّمَ
الْإِشَارَةُ إِلَى وَقُوعِ الْخَطَا فِي الْاجْتِهَادِ
فِي حَدِيثِ أُمِّ سَلَمَةَ: إِنْكُمْ تَخْتَصِمُونَ
إِلَيَّ وَلَعَلَّ بَعْضَكُمْ أَنْ
يَكُونَ أَلْحَنَ بِحُجَّةٍ مِنْ بَعْضٍ
فَتْحُ الْبَارِي صَفْحَ ۲۶ ج ۱۳

پھر ابوبکر ابن العربی کا یہ قول نقل فرمایا ہے:

تَعَلَّقَ بِهَذَا الْحَدِيثِ مَنْ قَالَ
إِنَّ الْحَقَّ فِي جِهَةٍ وَاحِدَةٍ
لِلتَّصَرُّعِ بِتَخَطُّطِهِ وَاحِدًا لِبَعِيدِهِ.
(فَتْحُ الْبَارِي صَفْحَ ۲۶ ج ۱۳)

جانبِ مخالف میں تھا؛ تو پہلے مجتہد کے (جس پر
حق واضح ہو گیا) دواجر ہیں: ایک اجتہاد
(کوشش) کا، اور ایک اصابت (یعنی حق کو
پالینے) کا؛ اور دوسرے مجتہد کو فقط اجتہاد کا
ثواب ملے گا۔ باقی یہ کہ اجتہاد میں خطا بھی
واقع ہوتی ہے، اس کی طرف اُم سلمہ
کی حدیث: إِنْكُمْ تَخْتَصِمُونَ إِلَيَّ
کے تحت میں اشارہ کیا چکا ہے۔

اس حدیث سے اُن لوگوں نے استدلال کیا ہے
جو کہتے ہیں کہ حق کسی ایک ہی طرف ہوتا ہے؛
کیوں کہ حدیث میں لاغلی الثَّغَيْنِ کسی ایک
کے تخطیہ کی تصریح موجود ہے۔

علامہ مازری کے قول کا مطلب | اس کے بعد حافظ رحمۃ اللہ علیہ نے ایک قول علامہ
مازری کا نقل کیا ہے، جس کو ذیل میں درج کروں گا۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ جو
لوگ حق عند الواحد مانتے ہیں اور المجتہدِ مخطی و یُصِيب کے قائل ہیں، وہ جیسا کہ
اس مسئلہ مُعینہ کے اعتبار سے یوں کہہ سکتے ہیں کہ اس خاص مسئلے میں حق عند اللہ
ایک جانب ہے؛ اسی طرح مجموعہ مسائل اجتہادِ یہ کے لحاظ سے یوں بھی کہہ سکتے ہیں
کہ حق عند اللہ فریقین میں مُخَصَّر ہے، یعنی دونوں سے باہر نہیں۔ اگر بعض مسائل میں
ایک مجتہد مُصِيب اور دوسرا مخطی ہے، تو دوسرے بعض مسائل میں اس کا عکس ہوگا۔
اس اعتبار سے حق جابین میں رہے گا۔

بلکہ خاص ایک مُعین مسئلہ کے اعتبار سے بھی اگر الحق فی الظرفین کا اطلاق کر دیں
تو اس معنی سے صادق ہو سکتا ہے کہ حق ان دونوں سے خارج نہیں، بلکہ انہی دونوں

میں منحصر اور دائر ہے؛ اگرچہ تعینِ مخطی اور مصیب کا بشخصہ نہ کیا جاسکے۔ پس علامہ مازری کے سیاقِ عبارت میں تاثر کرنے سے ان شاء اللہ تعالیٰ یہی مفہوم ہوتا ہے کہ جس مذہب کو انھوں نے الحق فی الطرفین کے عنوان سے نقل کیا ہے، وہ یہی مذہب ہے جو مجتہد کو مخطی اور مصیب دونوں تسلیم کرتا ہے۔ کیوں کہ جیسا کہ آپ عبارت میں ملاحظہ فرمائیں گے، اس کے مقابل میں وہ دوسری جماعت قائم کر رہے ہیں جس کا مسلک کل مجتہد مصیب ہے اور اسی ترتیب سے پھر دلائل بیان کیے ہیں؛ چنانچہ حانظ لکھتے ہیں کہ:

علامہ مازری نے فرمایا: کہ اس حدیث (اذا حکم الحاکم فاجتہد الخ) سے دونوں فریق استدلال کرتے ہیں۔ وہ بھی جو یہ کہتا ہے کہ حق دونوں طرف دائر ہے کسی مسئلے میں اس طرف ہوتا ہے، کسی میں اس طرف، اور وہ بھی جس کے نزدیک ہر مجتہد مصیب ہے۔ (یعنی حق ہر ایک مسئلے میں اس طرف بھی ہے اور اس طرف بھی) پہلا فریق کہتا ہے کہ اگر ہر مجتہد مصیب ہوتا ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک پر خطا کا اطلاق کیوں فرمائے؟ حالانکہ دو نقیض (خطا اور صواب) ایک حالت میں جمع نہیں ہو سکتیں۔ اور دوسرا فریق جو ہر ایک مجتہد کی تصویب کرتا ہے، اس کا ماخذ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرے کے واسطے بھی ایک ثواب مقرر فرمایا ہے۔ اور اگر وہ مصیب نہ ہوتا، ثواب بھی نہ ملتا۔ باقی، حدیث میں جو لفظ خطا کا اطلاق ہوا ہے، اس کا جواب وہ یہ دیتے ہیں کہ یہ ان صورتوں کے ساتھ مخصوص ہے،

قال المازری: تمسك به راي بالحديث: اِذَا حَكَمَ الْحَاكِمُ فَاجْتِهَدِ كُلُّهُ مِنَ الطَّائِفَتَيْنِ. مَنْ قَالَ إِنَّ الْحَقَّ فِي الطَّرَفَيْنِ وَمَنْ قَالَ إِنَّ كُلَّ مُجْتَهِدٍ مُصِيبٌ. أَمَّا الْأَوَّلَى، فَلِأَنَّهُ لَوْ كَانَ كُلُّ مُصِيبٍ، لَمْ يُطْلَقْ عَلَى أَحَدِهِمَا الْخَطَا، لِاسْتِحَالَةِ النَّقِیْضَيْنِ فِي حَالَةٍ وَاحِدَةٍ؛ وَأَمَّا الْمَصْرُوبَةُ، فَاجْتَبَوْا بِأَنَّهُ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جَعَلَ لَهُ أَجْرًا، فَلَوْ كَانَ لَمْ يُصِيبْ لَمْ يُكْجَرُوا أَجَابُوا عَنْ إِطْلَاقِ الْخَطَا فِي الْخَبَرِ عَلَى مَنْ ذَهَلَ عَنِ النَّصِّ أَوْ اجْتَهَدَ فِيمَا لَا يَسُوغُ الاجْتِهَادُ فِيهِ مِنَ الْقَطْعِيَّاتِ فِيمَا خَالَفَ الْأَجْمَاعَ، فَإِنَّ مِثْلَ هَذَا

مُصَنِّفِین کی نقل کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

مسلمک جمہور اور شاہ ولی اللہ، | الغرض، ہمارے ادپرے کے بیان سے جمہور اہل سنت
ابن تیمیہ اور ابن ہمام کے بیانات | کا مسلک آپ کو معلوم ہو گیا کہ یہ اعتبار حکم
نفس الامری اور حق عند اللہ کے، مجتہد مخطی بھی ہوتا ہے اور مُصِیب بھی بالخصوص جب کہ
یہ اجماعی مسئلہ ہے کہ مسائل منصوصہ میں حق عند اللہ واحد ہوتا ہے، اور یہ بھی مُسَلَّم
ہے کہ **إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ** کے اقتضا کے موافق، قیاس مظہر حکم ہے مثبت حکم نہیں؛ تو
کوئی وجہ نہیں کہ مجتہد فیہ مسائل میں، چونکہ عند اللہ شارع ہی کی طرف منسوب
ہیں، وحدت حق کا انکار کیا جاوے۔ حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ عقد الجید
میں جس کے ابتدائی صفحات ہماری معروضات کے خلاف شبہات پیدا کر سکتے
ہیں، صفحہ ۳۳ پر لکھتے ہیں:

اور جب کہ وہ باتیں جو ہم نے پہلے بیان کی ہیں، تمہارے
تردیک مُحَقِّق ہو گئیں، تو تم نے یہ بھی سمجھ لیا ہو گا کہ
ہر ایک ایسا حکم، جس پر مجتہد اپنے اجتہاد کی قوت
سے کلام کرتا ہے، وہ منسوب شارع علیہ الصلوٰۃ
والسلام ہی کی طرف ہو گا، یا تو شارع کے صریح
الفاظ کی طرف اُس کی نسبت ہو گی اور یا کسی ایسی
عِلَّت کی طرف، جو شارع کے الفاظ سے نکالی گئی
ہو۔ اور جب قصہ یوں ہے کہ مجتہد کے بتائے
ہوئے کُل احکام شارع علیہ السلام کی طرف
منسوب ہیں، یعنی یہ دعوا کیا گیا ہے کہ خود شارع
نے تنصیصاً یا تعلیلاً یہ احکام دیے ہیں، تو اب
یہاں دو درجے ہیں: پہلا درجہ یہ ہے کہ آیاتی لقیقت
شارع نے اپنے کلام سے اس معنی کا ارادہ کیا

وَإِذَا تَحَقَّقَ عِنْدَكَ مَا بَيَّنَّاهُ
وَعِلِمَتْ أَنَّ كُلَّ حُكْمٍ يَتَكَلَّمُ
فِيهِ الْمُجْتَهِدُ بِاجْتِهَادِهِ، مَنْسُوبٌ
إِلَى صَاحِبِ الشَّرْعِ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ
وَالسَّلَامُ، إِمَّا إِلَى لَفْظِهِ
أَوْ إِلَى عِلَّةٍ مَاخُودَةٍ مِنْ
لَفْظِهِ وَإِذَا كَانَ الْأَمْرُ
عَلَى ذَلِكَ، فَفِي كُلِّ اجْتِهَادٍ
مَقَامَانِ: أَحَدُهُمَا أَنَّ صَاحِبَ
الشَّرْعِ هَلْ أَرَادَ بِكَلَامِهِ هَذَا
الْمَعْنَى أَوْ غَيْرَهُ، وَهَلْ نَصَّبَ
هَذِهِ الْعِلَّةَ مَدَارًا فِي نَفْسِهِ
حِينَما تَكَلَّمَ بِالْحُكْمِ الْمَنْصُوبِ عَلَيْهِ

اولاً؛ فان كان التصويب
بالنظر إلى هذا المقام،
فأحد المجتهدين لا يعينه
مصيب دون الآخر واثنيهما
أن من جملة أحكام الشرع
أنه صلى الله عليه وسلم
عهد إلى أمته صريحاً
أودلالة أنه متى اختلف
عليهم نصوصه أو اختلف
عليهم معاني نص من
نصوصه، فهم مأمورون
بالاجتهاد واستفراغ الطاقة
في معرفة ما هو الحق من ذلك
فإذا تعين عند مجتهد شيء
من ذلك، وجب عليه اتباعه
كما عهد إليهم أنه متى
اشتبه عليهم القبلة في
الليلة الظلماء، يجب
أن ينحروا ويصلوا على جهة
وقع تحريمهم عليها، فهذا
حكم علق الشرع بوجود
التحرى كما علق وجوب الصلوة
بالوقت وكما علق تكليف الصن

تھا، جو مجتہد نے سمجھ میں، یا اس کے سوا کوئی اور معنی
مُراد تھے؟ اور آیا حکم منصوص کا جب شارع نے
تکلم فرمایا، تو اپنے دل میں اُسی علت کو اُس نے حکم کا
مدار ٹھہرایا تھا، جس کو مجتہد نے قرار دیا ہے، یا اور کچھ؟
تو اس درجے میں کوئی ایک ہی مجتہد مصیب ہو سکتا
ہے (یعنی جس کا اجتہاد شارع کی مُراد و مقصود کے
مُوافق ہو)۔ دوسرا درجہ یہ ہے کہ من جملة احکام
شریعت کے ایک یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم
نے صراحتاً یا دلالتاً اپنی امت کو یہ وصیت فرمائی
ہے کہ جب اُن کو اپنے نبی کے اقوال مختلف معلوم
ہوں، یا ایک ہی نص کے معانی میں اختلاف پیش
آئے، تو وہ مامور ہیں کہ حق کے دریافت کرنے میں
اجتہاد سے کام لیں اور اپنی پوری پوری طاقت
اُس میں صرف کریں۔ اُس کے بعد جب ایک مجتہد
کے نزدیک کوئی ایک بات متعین ہو جائے، تو اُس پر
اُسی کا اتباع واجب ہے، جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ
وسلم نے امت کو یہ وصیت فرمائی کہ جب اندھیری
رات میں (مثلاً) قبلہ مُشتبہ ہو جائے، تو اُدل خوب تخری
کریں۔ پھر جس طرف تخری سے قبلہ متعین ہو، اُسی
طرف کو ناز پڑھ لیں۔ تو یہ ایک حکم ایسا ہے، جس
کو شریعت نے تخری پر مُعلق رکھا ہے، جس طرح
ناز کی فرضیت وقت کے آنے پر مُعلق ہے اور کسی
لڑکے کا مُکلف ہونا اُس کے بالغ ہونے پر مُعلق ہے۔

بَلُوغِهِ، فَإِنْ كَانَ الْبَحْثُ بِالْمَنْظَرِ
 فِي هَذَا الْمَقَامِ، نَظَرًا، فَإِنْ كَانَتْ
 الْمَسْئَلَةُ مَعًا يَنْقُضُ فِيهِ اجْتِهَادُ
 الْمُجْتَهِدِ فَاجْتِهَادُهُ بَاطِلٌ قِطْعًا
 وَإِنْ كَانَ فِيهَا حَدِيثٌ صَحِيحٌ
 وَقَدْ حُكِمَ بِخِلَافِهِ فَاجْتِهَادُهُ
 بَاطِلٌ عَظْمًا، وَإِنْ كَانَ الْمُجْتَهِدُ هَذَا
 جَمِيعًا قَدْ سَلَكَ مَا يَنْبَغِي لَهُمَا
 أَنْ يَسْلُكَهُ وَلَمْ يُخَالَفْ أَحَدًا مِنْهُمَا
 صَحِيحًا وَلَا أَمْرًا يَنْقُضُ اجْتِهَادَ
 الْقَاضِي وَالْمُفْتِي فِي خِلَافِهِ
 فَهُمَا جَمِيعًا عَلَى الْحَقِّ (إِذَا)
 بِالْمَنْظَرِ إِلَى الْمَقَامِ الثَّانِي،
 لِمَا صُرِّحَ فِيهِمَا تَقْدِمُ
 أَنَّ الْمُصِيبَ وَاحِدًا لَا بَعِيْنَهُ
 بِالْمَنْظَرِ إِلَى الْأَوَّلِ)۔

پس اگر مجتہد کے مخطی اور مصیب ہونے کی بحث
 اس درجے میں آکر ہو، تو دیکھا جائے گا کہ یہ
 مسئلہ ان مسائل میں سے تو نہیں، جن میں مجتہد کا
 اجتہاد ٹوٹ جائے گا! اگر ایسا ہو، تو اس کا
 اجتہاد قطعاً باطل ہو جائے گا۔ اور اگر اس
 مسئلے میں کوئی حدیث صحیح اور مجتہد کا حکم اس
 کے خلاف ہو، تو ظن غالب یہ ہے اس کا
 اجتہاد باطل ہے۔ اور اگر دونوں مجتہد اس
 مسلک پر چلے، جس پر ان کو چلنا چاہیے تھا
 اور کسی حدیث صحیح کی انھوں نے مخالفت بھی
 نہیں کی اور نہ کسی ایسے امر کا خلاف کیا، جس
 کے خلاف میں قاضی اور مفتی کا اجتہاد قائم نہیں
 رہ سکتا، تو اس صورت میں دونوں مجتہد حق
 پر ہوں گے۔ (یعنی بہ اعتبار درجہ ثانیہ کے،
 کیوں کہ درجہ اولی کے اعتبار سے تو کسی ایک
 مجتہد کے مصیب ہونے کی تصریح پہلے ہو چکی ہے)۔

شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ اپنے فتاویٰ میں لکھتے ہیں:

إِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
 أَخْبَرَ أَنَّ الْحَاكِمَ الْمُجْتَهِدَ الْمُخْطِئُ
 لَهُ أَجْرٌ وَالْمُصِيبُ لَهُ أَجْرَانِ، وَ
 لَوْ كَانَ كُلُّهُمَا أَصَابَ حُكْمَ اللَّهِ
 بَاطِلًا وَنَاضِرًا، لَكَانَا سَوَاءً - وَلَمْ
 يَنْقُضْ حُكْمَ الْحَاكِمِ وَالْمُفْتِي

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو آگاہ فرمایا
 کہ حاکم مجتہد جب مخطی ہو، تو اس کے لیے ایک
 اجر ہے اور مصیب ہو، تو دو اجر ہیں۔ اور
 اگر دونوں مجتہدوں میں سے ہر ایک کی
 رسائی ظاہر و باطناً ٹھیک ٹھیک اللہ تعالیٰ
 کے حکم تک ہو جاتی، تو پھر دونوں کا اجر بھی

إِذَا تَبَيَّنَ أَنَّ النَّصَّ بِخِلَافِهِ،
وَأَن كَانَ لَمْ يَبْلُغْهُ مِنْ غَيْرِ
قَصُورٍ وَلَا تَقْصِيرٍ وَلَمَّا
قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ:
فَأَنكَ لَا تَدْرِي مَا حَكَمَ اللَّهُ فِيهِمْ
وَلَمَّا قَالَ لِسَعْدٍ: لَقَدْ حَكَمْتَ
فِيهِمْ بِحُكْمِ الْمَلِكِ، إِنْ كَانَ
كُلُّ مُجْتَهِدٍ يَحْكُمُ
بِحُكْمِ اللَّهِ - وَارْتِفَاعُ اللَّوْمِ
بِحَدِيثِ الْمُخْتَلَفِينَ فِي
صَلَاةِ الْعَصْرِ فِي بَنِي قُرَيْظَةَ
وَحَدِيثِ الْحَاكِمِ.

(ص ۱۷۹ ج ۳)

مسادی ہوتا۔ اور حاکم اور مفتی کا قول اُس
صورت میں نہ ٹوٹ سکتا، جب کہ یہ ظاہر
ہو جائے کہ نص صریح اس کی مخالف ہے،
مگر مجتہد کو وہ نہیں پہنچی، باوجودے کہ اُس
کی طرف سے کسی قصور اور کوتاہی کا اظہار
نہیں ہوا۔ اور اگر ہر مجتہد کا ہر حکم اللہ ہی کا
حکم ہوتا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی یہ
ارشاد نہ فرماتے کہ: ”تو نہیں جانتا کہ اللہ کا
حکم اُن کے ساتھ کیسا ہے؟“ اور حضرت سعدؓ
سے یوں خطاب نہ فرماتے کہ: تو نے ان کے
معلق وہ فیصلہ کیا، جو بادشاہ کا فیصلہ تھا۔
(باقی، جب کہ دو مجتہدوں میں سے کوئی
ایک خطا پر ہوا، تو مخطی پر ملامت کیوں
نہیں ہو سکتی؟) اس کا جواب اس حدیث
میں ہے، جس کے اندر عصر کی نازی قریظہ میں
پڑھنے نہ پڑھنے کی بابت صحابہ کرام کا اختلاف
بیان ہوا ہے۔

بلکہ بڑی دلیل مجتہد کے مخطی ہونے کی یہ ہے
کہ صحابہ مراعاتِ خطائی الاجتہاد کا اطلاق کرتے
تھے اور باوجودے کہ یہ بات اُن میں عام فہمی،
لیکن کسی صحابی کا اُس پر انکار کرنا مسموع نہیں
ہوا۔ دیکھو، ترکِ غول کے مسئلے میں حضرت علی

اور شیخ ابن ہمام تحریرُ الاصول میں لکھتے ہیں:
بَلِّ الدَّلِيلَ إِطْلَاقُ الصَّحَابَةِ الْخَطَا
فِي الاجْتِهَادِ شَائِعًا مُتَكَرِّرًا بِلَا
نَكِيرٍ كَعَلِيٍّ وَزَيْدِ بْنِ
ثَابِتٍ وَغَيْرِهِمَا مِنْ مُخْطِئِهِ
ابْنِ عَبَّاسٍ فِي تَرْكِ الْعَوْلِ

وَهُوَ ابْنُ عَبَّاسٍ خَطَاؤُهُمْ فِي الْقَوْلِ.... وَقَوْلُ ابْنِ بَكْرٍ فِي الْكَلَالَةِ: أَقُولُ فِيهَا بَرَأئِي، فَإِنْ يَكُنْ صَوَابًا فَمِنْ اللَّهِ، وَإِنْ يَكُنْ خَطَاؤًا فَمِنِّي وَمِنْ الشَّيْطَانِ.... وَعَنْ ابْنِ مَسْعُودٍ مِثْلُ قَوْلِ ابْنِ بَكْرٍ فَقَالَ سُبْحَنَ اللَّهِ دَاوُدُ عَنْهُ: فَإِنْ يَكُنْ صَوَابًا فَمِنْ اللَّهِ، وَإِنْ يَكُنْ خَطَاؤًا فَمِنِّي وَمِنْ الشَّيْطَانِ، وَاللَّهُ وَرَسُولُهُ بَرِئَانِ.... وَقَوْلُ عُمَرَ فِي الْجَهَنَّمَ: إِنْ كَانَ قَدْ اجْتَهِدَ أَفْقَدَ أَخْطَاؤِي عُثْمَانُ وَعَبْدُ الرَّحْمَنِ بْنُ عَوْفٍ.. (مع حذف وزيادة) (ص ۳۹ ج ۳)

اور زید بن ثابت وغیرہ نے حضرت عبداللہ بن عباس کو خطا پر بتلایا، اور ابن عباس عموں کے قائل ہونے پر ان حضرات کا تخطیہ کرتے تھے۔ اور کلام کے مسئلے میں حضرت صدیق اکبرؓ نے فرمایا کہ یہ مسئلہ میں اپنی رائے سے بیان کرتا ہوں، اگر وہ درست ہو، تو اللہ کی طرف سے اور درست نہ ہو، تو میری طرف سے اور شیطان کے دخل سے ہے۔ اور اس طرح کا قول ابن مسعود کا سنیں ابی داؤد میں موجود ہے کہ اگر یہ مسئلہ صحیح ہے، تو حق تعالیٰ کی ہدایت سے ہے، ورنہ اس کو میری طرف سے اور شیطان کی طرف سے سمجھو کیوں کہ اللہ اور اس کا رسول ایک غلط بات سے بُری ہیں۔ اور فاروق اعظمؓ نے مجاہد کے مسئلے میں فرمایا کہ اگر عثمان اور عبدالرحمن بن عوف نے اجتہاد کیا ہے، تو ان سے اس اجتہاد میں غلطی ہوئی۔

تخطیہ میں ائمہ کا محتاط رویہ | آخر میں یہ بتلا دینا بھی فائدے سے خالی نہ ہو گا کہ باوجود اس کے چاروں امام وحدت حق کے قائل ہیں اور المجتہدین محضی ویضیب کے مدلول کو صحیح جانتے ہیں؛ لیکن تاہم کسی مجتہد کا جھٹ پٹ محضی کا لفظ استعمال کرنے کو نازیبا اور خلاف احتیاط سمجھتے ہیں۔ چنانچہ اس بارے میں جو تفصیل و تفتیش امام احمد بن حنبلؒ کی ہے، اُس کا اقتباس یہاں درج کیا جاتا ہے:

محمد بن الحکم نے امام احمد سے استفسار کیا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایات مختلف ہوں اور کوئی آدمی ایک حدیث کو پکڑے، تو اس کو ہونہر میں آپ کی کیا رائے ہے؟ امام احمد رحمۃ اللہ

قال الإمام أحمد من رواية محمد بن الحكم، وقد سألته عن الرواية عن رسول الله صلى الله عليه وسلم إذا اختلف فأخذ الرجل بأحد الحديثين

فَقَالَ: إِذَا أَخَذَ الرَّجُلُ بِحَدِيثٍ صَحِيحٍ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَأَخَذَ آخَرَ بِحَدِيثٍ ضِدَّهُ صَحِيحٍ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَقَالَ: الْحَقُّ عِنْدَ اللَّهِ وَاحِدٌ وَعَلَى الرَّجُلِ أَنْ يَجْتَهِدَ وَيَأْخُذَ أَحَدَ الْحَدِيثَيْنِ وَلَا يَقُولَ لِمَنْ خَالَفَهُ إِنَّهُ مُخْطِئٌ إِذَا أَخَذَ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَأَنَّ الْحَقَّ فِيمَا أَخَذْتُ بِهِ أَنَا، وَهَذَا بَاطِلٌ. لَكِنْ إِذَا كَانَتِ الرَّوَايَةُ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَحِيحَةً فَأَخَذَ بِهَا رَجُلٌ وَأَخَذَ آخَرَ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاحْتَجَّ بِالشَّيْءِ الضَّعِيفِ كَانَ الْحَقُّ فِيمَا أَخَذَ بِهِ الَّذِي احْتَجَّ بِالْحَدِيثِ الصَّحِيحِ وَقَدْ أَخْطَأَ الْآخَرَ فِي التَّأْوِيلِ مِثْلَ: لَا يَقْتُلُ مُؤْمِنٌ بَكَافِرٍ. وَاحْتَجَّ بِحَدِيثِ السُّلَمَانِيِّ، قَالَ: فَهَذَا عِنْدِي مُخْطِئٌ وَالْحَقُّ مَعَ مَنْ ذَهَبَ إِلَى حَدِيثِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: لَا يَقْتُلُ مُؤْمِنٌ بَكَافِرٍ، وَإِنْ حَكَمَ بِهِ حَاكِمٌ ثُمَّ رَفَعَ إِلَى حَاكِمٍ آخَرٍ، لِأَنَّهُ لَمْ يَذْهَبْ

علیہ نے فرمایا کہ جب ایک مجتہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح حدیث سے استدلال کرے اور دوسرا بھی اُس کے مقابلے پر دوسری حدیث صحیح سے استدلال کرتا ہے، تو اگرچہ حق عند اللہ کسی ایک جانب میں ہے، لیکن آدمی کا کام یہ ہے کہ پورے اجتہاد کے بعد ایک حدیث کو لے لے اور اپنے مخالف کی نسبت یہ نہ کہے کہ اُس کے خطا کی اور خود ہی ہے جو میں کہتا ہوں اور باقی سب باطل ہے، کیوں کہ اُس کا مخالف بھی آخر کار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سے اخذ کر رہا ہے۔ ہاں، اگر ایک حدیث صحیح ہو اور دوسری ضعیف، تو بے کھٹکے کہا جائے گا کہ حق اُس کی طرف ہے جو حدیث صحیح سے استدلال کرتا ہے اور حدیث ضعیف سے استدلال کرنے والا مخطی ہے، مثلاً لَا يَقْتُلُ مُؤْمِنٌ بَكَافِرٍ حدیث صحیح ہے، تو جو اس کے مقابلے میں سلمان کی حدیث سے استدلال کرے گا، وہ مخطی ہوگا۔ اور اگر ایک مجتہد یا حاکم تو حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے استدلال کر رہا ہے اور دوسرا کسی صحابی کا قول پیش کرتا ہے، تو اس دوسرے نے خطا کی۔ اور کسی حاکم نے اس دوسرے کے نوافی فیصلہ کر دیا، پھر اُس کا مُرافعہ کسی دوسرے حاکم کی عدالت میں کیا گیا ہے، تو یہ دوسرا حاکم پہلے

إلى حديث رسول الله صلى الله عليه وسلم الصحيح وإدا روى عن رسول الله صلى الله عليه وسلم حديث واحتج به رجل أو حاكم عن أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم كان قد أخطأ التأويل، وإن حكم به حاكم ثم رفع إلى حاكم آخر رد إلى حاكم رسول الله صلى الله عليه وسلم وإذا اختلف أصحاب محمد صلى الله عليه وسلم وأخذ آخر عن رجل آخر من أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم فالحق عند الله واحد وعلى الرجل أن يجتهد وهو لا يدري أصاب الحق أم أخطأ. وهكذا أقل عمر: والله ما يدري عمر أخطأ أم أصاب، ولكن إنما كان رأياً منه. قال: وإذا اختلف أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم وأخذ رجل بقول أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم وأخذ آخر يقول التابعين، كان الحق في قول أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم، ومن قال يقول التابعين، كان تأويله خطأ والحق عند الله واحد.

(فتاویٰ ابن تیمیہ صفحہ ۱۷۷ ج: ۳)

کے فیصلے کو توڑ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے کی طرف لوٹا دے گا۔ اور اگر ایک شخص ایک صحابی کے قول کی سند کپڑتا ہے اور دوسرا دوسرے صحابی کے قول سے، تو خدا کے نزدیک حق پر کوئی ایک ہے، لیکن انسان کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے اجتہاد کو کام میں لائے اور اُس وقت اُس کو یہ معلوم نہیں ہوگا کہ وہ خطا پر ہے یا صواب پر ہے چنانچہ حضرت عمرؓ نے ایسا ہی فرمایا کہ: عمر نہیں جانتا کہ وہ خطا پر ہے یا صواب پر، البتہ ایک رائے اُس کی تھی (جوبیان کر دی گئی)۔ امام احمد فرماتے ہیں کہ اگر ایک شخص تو صحابہ کے اقوال سے استدلال کرتا ہے اور دوسرا اُس کے جواب میں تابعین کے اقوال سے، تو حق صحابہ کے اقوال کی طرف ہوگا اور اُس وقت تابعین کے اقوال سے احتجاج کرنا غلطی ہوگا۔ اور یہ ہر حال حق اللہ کے نزدیک کسی ایک طرف ہے۔

امام احمدؒ کے اس کلام سے اندازہ کر دو کہ ایسے بڑے بڑے جلیل القدر اور رفیع الرتب

یعنی استدلال کرتا۔

ائمہ یہ یقین رکھتے ہیں باوجود کہ ہر مسئلہ میں حق صرف ایک طرف ہو سکتا ہے، پھر بھی اپنے مخالف کے تخطیہ میں کس قدر محتاط تھے۔ چنانچہ جو کچھ بھی حسن ظن ائمہ کرام کی نسبت آج باقی ہے، وہ انہی پاک نفس بزرگواروں کی احتیاط اور بے تعصبی اور فراخ دلی اور حسن تادب کا نتیجہ ہے۔ بَرَزَ اللَّهُ مَصَاجِعَهُمْ وَنَوَّرَ اللَّهُ قُبُورَهُمْ وَأَفَادَ عَلَيْنَا شَأْبِيبَ بَرَكَاتِهِمْ، آمین۔ وقد بقى خبايا في الزوايا، تركنا ابرازها مخافة النطويل، واللّٰهُ يقولُ الحقُّ وهو يهدى السبيل، وحسبنا اللّٰهُ ونعم الوكيل

دوسرے سوال کا جواب

سوال کے اہم اجزاء دوسرا سوال آپ کا دوزخ و جنت کے متعلق ہے، جس کے سمجھنے سے بندہ بالکل قاصر رہا۔ جو عقیدہ جنت و دوزخ کی نسبت سوال میں مذکور ہے، اس میں چند امور کا التزام صراحت کیا گیا ہے:

- (۱) جنت و دوزخ کے وجود کو سائل تسلیم کرتا ہے۔
- (۲) جن چیزوں کا ہونا جنت و دوزخ میں قرآن مجید اور احادیث صحیحہ نے بتلایا ہے، اُس کے نزدیک وہ سب تمثیل پر محمول ہے۔
- (۳) یہ بھی اقرار ہے کہ جنت میں تمام آرام و آسائش کی چیزیں مہیا کی گئی ہیں۔
- (۴) جنت کی حقیقت کسی کو معلوم نہیں اور نہ ہو سکتی ہے۔ چنانچہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: لَا عَيْنٌ رَأَتْ وَلَا أُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلَى قَلْبِ بَشَرٍ۔

قرآن و حدیث سے ثابت شدہ امور کی | میں دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ جب سائل نفی کے لیے محض تمثیل کا حیلہ کافی نہیں | کو یہ اعتراف ہے کہ بہشت میں اہل بہشت کے لیے تمام آرام و آسائش کی چیزیں مہیا فرمادی گئی ہیں، تو کیا کوئی انسان سطحِ ارض پر ایسا بھی پایا جاتا ہے کہ جس کو سرسبز باغیچہ اور شاداب مہین یا شوخی اور قرینے سے بہتی ہوئی نہریں، جن کی آب رسانی کا انتظام یورپ کے دائرہ و کس سے بھی زیادہ موزوں ہو، یا درخشاں موتیوں کی جگمگاتی ہوئی عمارتیں یا خالص سونے چاندی کے ظروف کے استعمال سے تکلیف پہنچتی ہو؟ یا حسن و جمال کے پاک و صاف نورانی پیکر، جن پر نظر پڑتے ہی اللہ جمیل و یحییٰ الجمال کا نقشہ آنکھوں میں پھر جائے، اُس کو بُرے معلوم ہوتے ہوں؟ یا کابل و کشمیر کے اعلیٰ قسم کے سیب اور انگور اور طرح طرح

کے میوے اور پھل نہایت بیش قیمت کشتیوں میں قرینے سے رکھے ہوئے دیکھ کر اُس کو استغراغ ہو جاتا ہو؟!

پس ان سارے غیش و نشاط کے سامانوں کی موجودگی اگر بنی نوع انسان کے حق میں فطرتاً کوئی تکلیف دہ چیز نہیں ہے، تو میں نہیں سمجھتا کہ پھر سائل، جو کہ جنت میں تمام آرام و آسائش کی چیزوں کا مہیا ہونا تسلیم کرتا ہے، کیوں تمثیل کا بہانہ رکھ کر ان نعمتوں کے اقرار سے گریز کرتا ہے؟ ممکن ہے کہ دنیا میں کسی جگہ کوئی ایسا وحشی بن ماش بھی پایا جاتا ہو، جس کی زندگی ان تمام نعمائے الہیہ کے دیکھنے سے مُنغفص ہو جاتی ہو۔ لیکن مُشکل یہ ہے کہ وہ اتنی وسیع جنت، جس کو عرضھا السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ فرمایا گیا ہے، فقط انھی چند وحشی بن مانسوں کا مسکن بنا دیا جاوے، تو اس کی تسلیم کے واسطے شاید سائل بھی تیار نہیں ہوگا۔ پھر میں حیران ہوں کہ جن چیزوں کے وجود کی تمام انبیاء سابقین خبر دیتے چلے آئے، قرآن اور حدیث نے اُس کی تصدیق پر ٹھہر کی، قرآن صحابہ سے لے کر تیرہویں صدی کے مجددوں کے زمانے تک تمام اہل اسلام اُس کی تصدیق کو جزو ایمان سمجھتے رہے، تمثیل کے ایک عیارانہ حیلے سے کس طرح اُن کی نفی کی جاسکتی ہے؟

گُرگ باراں دیدہ | سوال میں جس شخص کا عقیدہ بیان کیا گیا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی اور خام مُرید | اُس ابلیس کی دہی کو پوری طرح ضبط نہ کر سکا، جس نے یہ لکھا تھا کہ ان نعمائے جنت کے بیان سے تمثیلاً ایک اعلیٰ قسم کی راحت کی طرف اشارہ کرنا ہے، جس کو کوئی عبارت نہیں سمجھا سکتی۔ اُس نے یہ لفظ نہیں لکھے کہ جنت میں تمام آرام و آسائش کی چیزیں مہیا کی گئی ہیں۔ وہ گُرگ باراں دیدہ تھا، جانتا تھا کہ ایسا لکھنے سے تمام ظواہر نصوص پر ایمان رکھنا ضروری ہو جاتا ہے۔

سوال میں جس شخص کی نسبت استفسار کیا گیا ہے، وہ مسکین "ایک قسم کی راحت" اور تمام آرام و آسائش کی چیزیں، "ان دونوں عبارتوں میں فرق کو ملحوظ نہیں رکھ سکا؛

حالاں کہ اب اُس کی عبارت خود اُس کو مُلزم کرتی ہے اور اُس کے کلام کے تہافت پر صاف شہادت دیتی ہے۔

پس میں ایسے نوآموز اور خام مُردے سے کیا خطاب کروں، جو اپنے اعتقاد کو خود بھی واضح طور پر سمجھا ہوا نہیں ہے، یا بیان نہیں کر سکتا! اُس کے عقیدے کا ماخذ اس وقت میرے سامنے ہے، کبھی دل چاہتا ہے کہ حرفاً حرفاً جواب لکھ کر آپ کے پاس بھیج دوں، لیکن بندہ کے پاس وقت نہیں، محض آپ کی خاطر عزیز جان کر یہ چند سطور لکھی ہیں اور چند اور لکھتا ہوں۔

صحیح حدیث "غلط استدلال" وہ شخص جس کی کتاب اس وقت میرے سامنے رکھی ہے، اگر جاہل تھا تو کیا آپ کے علم کو بھی اُس کے جہل کی ظلمت نے اپنے اندر چھپا لیا؟ آپ نے لکھا ہے کہ جنت کی حقیقت نہ کسی کو معلوم ہوئی اور نہ ہو سکتی ہے، کیوں کہ مُغیر صادق نے فرمایا ہے: لَا عِیْنَ رَأَتْ وَلَا أُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلَى قَلْبِ بَشَرٍ۔

آپ مجھ کو بتلائیے کہ اس حدیث صحیح کے سُن لینے کے بعد آپ نے خود جنت کے وجود سے ہی کیوں نہ انکار کر دیا؟ جب "خَطَرَ عَلَى قَلْبِ بَشَرٍ" کو اس قدر عام تسلیم کرتے ہیں، تو بہ ہر حال یہ عقیدہ، کہ جنت ہے اور اُس میں اعلیٰ قسم کی رحمت موجود ہے، اس قدر ایمان رکھنے کے واسطے بھی تو یہ ضروری ہے کہ جنت اور اُس کی اعلیٰ قسم کی رحمت کا کسی نہ کسی طرح تصور آئے اور جب کسی طرح سے بھی اُن کا تصور آیا، تو "خَطَرَ عَلَى قَلْبِ بَشَرٍ" صادق ہو جائے گا، کیوں کہ "خطور بالبال" عام ہے، اجمالی ہو یا تفصیلی، بالکنہ اور بکنہ ہو یا بالوجہ اور بوجہ۔ اب اگر آپ "خطور" کے معنی میں کوئی تخصیص کریں گے، تو آپ کے حریف کو بھی اجازت ہوگی کہ وہ اپنے مذاق کے موافق تخصیص کر لے۔

اس کے علاوہ آپ عَنَب وُرْتَان اور حور و نصور کی آیتوں کو جب تمثیل پر محمول فرماتے

لے تہافت: تناقص لے عَنَب: انگور، وُرْتَان: انار

ہیں، تو ظاہر ہے کہ لفظی تمثیل سے مراد آپ کی، تشبیہ ہے اور تشبیہ کا حاصل اس کے سوا کیا ہے کہ مُشَبَّہ اور مُشَبَّہ پہ میں کوئی وصف جامع ہو، حتیٰ کہ اگر اس وصف جامع کا ادراک مخاطب کو نہ ہو، تو وہ تشبیہ اُس کے حق میں اُس سے زیادہ کار آمد نہیں ہو سکتی ہے، جتنا کہ ایک اندھے کے حق میں کھیر کی تشبیہ بنگلے کے ساتھ کار آمد ہوئی تھی۔

پس اس وصف جامع کے ادراک سے، جو کہ مُشَبَّہ اور مُشَبَّہ پہ یا مثال اور مُثَلَّ نہ میں ضرور ہوتا ہے، یہ لازم ہوگا کہ جنت کی نعمتوں کا تصور اس وصف جامع سے ہو جائے، حالاں کہ ”خطور بالبال“ کی مشکل پھر اُس وقت ناقابل حل رہ جائے گی۔ عدم علم سے عدم وجود لازم نہیں! اگر آپ یہ کہیں کہ ”ولا خَطَرَ عَلٰی قَلْبِ بَشَرٍ“ سے یہ مراد ہے کہ نعمائے جنت کی کنہ اور ماہیت کسی کے دل پر نہیں گزری، تو اس لیے یہ کیوں لازم آیا کہ آپ اُن کے وجود جسمانی کا انکار کر دیں؟ کیا جس چیز کی حقیقت معلوم نہ ہو، مثلاً خود حق تعالیٰ شانہ، تو اُس کے وجود کی بھی نفی کر دینی چاہیے؟ پھر تو سب سے اول خدا ہی کی نفی کی جاوے، تاکہ نہ قرآن کو ماننا پڑے اور رسول کو اور نہ جنت و دوزخ کا مصنوعی اقرار کر کے خدا پر احسان رکھا جاوے! میں جانتا ہوں کہ شاید ہزاروں چیزیں محسوسات میں ایسی ہوں گی، کہ اُن کی حقیقت آپ کو اور مجھ کو بلکہ تمام حکمائے مُتَفَلِّسِین کو معلوم نہ ہوگی اور میں تو یہاں تک بدگمان ہوں کہ جن چیزوں کی حقیقت معلوم ہو جانے کا دعوا کیا جاتا ہے، وہ بھی محکمت امتحان پر شاید ہی کھرا ثابت ہو سکے۔

بہ ہر کیف، جن چیزوں کی حقیقت جاننے سے حکما کی زبانیں بھی اعتراف کرنے لگی ہیں، کیا اُن کے وجود سے آپ انکار کر سکتے ہیں؟ تو پھر میں نہیں سمجھتا کہ جنت کی جسمانی نعمتیں کیوں آپ کو ایسی بُری معلوم ہوتی ہیں کہ اُن کی حقیقت معلوم

نہ ہونے کی وجہ سے آپ اُن کی ہستی ہی اُڑائے دیتے ہیں۔ یہاں اگر کسی چیز کے وجود کی خبر خواہ اس نے دی ہے، تو اُن کی خبر خواہ اس سے زیادہ سچے تجربے کے پاس سے قطعی طور پر پہنچ چکی ہے۔

میرا خیال ہے کہ جنت کی جسمانی نعمتوں کا انکار کرتے وقت، اُس کے دل میں بھی گد گدیاں ضرور اٹھی ہوں گی، اور خواہ آپ کتنا ہی اس ہنس کو بے ہودہ سمجھیں، لیکن اس تمنا سے دل آپ کا بھی خالی نہ ہوگا کہ کاش ایسا ہی ہو جاتا جیسا کہ یہ مولوی کہتے ہیں! پر آپ کا دل یورپ کے مُجددوں سے ڈرا ہوا ہے اور اس شخص کے تسخّر نے آپ کو اور زیادہ کھسیانہ کر رکھا ہے؛ اس لیے آپ اُس بات کا انکار کرتے ہیں، جس کی تمنا دل میں لیے ہوئے ہیں۔

مُجددین کی بے ہودگیوں کا جواب | حالاں کہ ان مُلا جدہ سے آپ کہاں تک ڈریں گے! خدا کی ہستی کا وہ مذاق اُڑاتے ہیں، نبوت اور روحی کا وہ مذاق اُڑاتے ہیں، فرشتوں اور شیاطین کا وہ مذاق اُڑاتے ہیں، مُرکز زندہ کیے جانے کا وہ مذاق اُڑاتے ہیں، عذابِ قبر کا وہ مذاق اُڑاتے ہیں، آپ کی نماز کا، آپ کے حج و عمرے کا، آپ کے نکاح و طلاق کا، آپ کی ہر ہر بات کا اُن کے یہاں تسخّر کیا جاتا ہے؛ تو پھر آپ کے پاس اُن ساری بے ہودگیوں کا جواب اس کے سوا کیا ہے: **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا** (الایۃ)

وہ کہتے ہیں کہ ان تخیلات و اُوہام کا مانتا بے وقوفوں کا کام ہے۔ ہمارا ایمان سَفہا کا سا ایمان نہیں ہے۔ آپ اُن سے کہہ دیجیے کہ آپ کا جواب ہمارا خدا پہلے ہی دے چکا ہے، جہاں اُس نے یہ فرمایا ہے:

اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں کی طرح	إِذَا قِيلَ لَهُمْ آمِنُوا كَمَا
تم بھی ایمان لے آؤ، تو کہتے ہیں کہ کیا ہم بھی ویسا	آمَنَ النَّاسُ، قَالُوا أَنْتُمْ
ہی ایمان لے آؤ، جیسا کہ بے وقوف ایمان	كَمَا آمَنَ السُّفَهَاءُ،
لائے ہیں؟ یاد رکھو کہ خود ہی لوگ بے وقوف	أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَاءُ

ولکن لا یعلمون
ایک گستاخانہ تحریر | آپ ان زنادقہ کی کتابیں پڑھیے، جنت و دوزخ کے اکھر
اور اس کا بھیانک نتیجہ کے موقع پر لکھا ہے کہ:

دو علمائے اسلام رحمۃ اللہ علیہم اجمعین، بہ سبب اپنی رقت قلبی اور توجہ
الی اللہ اور خوف درجا کے غلبہ کے، جو آدمی پر زیادہ اثر کرنے سے ایسے درجہ
پر پہنچا دیتا ہے کہ اصل حقیقت کے بیان کرنے کی جرأت نہیں رہتی، یہ طریقہ
اختیار کیا تھا کہ جو امر الفاظ سے مستفاد ہوتا ہے، اُسی کو تسلیم کر لیں اور
اُس کی حقیقت اور اُس کے مقصد کو خدا کے علم پر چھوڑ دیں۔ اس
واسطے وہ بزرگ، تمام اُن باتوں کو تسلیم کرتے ہیں، جن کو کوئی بھی نہیں
مان سکتا اور وہ باتیں جیسا کہ عقل اور اصلی مقصدِ بانی مذہب کے
برخلاف ہیں، ایسے ہی مذہب کی سچائی اور بزرگی اور تقدس کے
مخالف ہیں۔“

اس گستاخانہ اور احمقانہ تحریر کو بار بار پڑھو۔ یہ بتلاتی ہے کہ جن لوگوں کے
دلوں پر رقت اور توجہ الی اللہ اور خوف درجا غالب ہو جاتا ہے (جیسا کہ تمام
علمائے اسلام کے دلوں پر تھا) تو اُن کو اصل حقیقت کے بیان کرنے کی جرأت
نہیں رہتی، بلکہ وہ ایسی باتوں کو ماننے لگتے ہیں، جو عقل کے بھی خلاف اور بانی مذہب
کے مقصد کے بھی اور مذہب کے تقدس اور سچائی کے بھی!

اس کے بعد آپ احادیث میں خدا کے اُس رسول کی سیرت کو پڑھیں (فلا
ابی و اُمی)، جو اپنی نسبت فرماتے ہیں: فَوَاللّٰهِ اِنِّیْ اَخِشَاکُمْ اللّٰہَ
وَاَتَّقَاکُمْ، تو آپ یقین کریں گے کہ آلِ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر
نہ کسی کے دل میں خدا کا خوف ہو سکتا ہے اور نہ اُس قدر انابت الی اللہ کسی کو میسر
آسکتی ہے، جو آپ کو حاصل تھی۔ تو اس اصول کا نتیجہ، جس کو اس زندقہ نے اختیار
کیا ہے، مجز اس کے اور کیا ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو (العیاذ باللہ) یہ

کہا جاتا ہے کہ آپ حقیقت کے بیان کرنے میں سب سے کم جرأت کر سکتے ہوں گے اور جو کچھ فرماتے ہوں گے، وہ علمائے اسلام سے بھی زیادہ لوگوں کی عقل کے خلاف اور مقصودِ خداوندی کے خلاف ہوگا۔ **كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ** **إِنْ يَقُولُونَ إِلَّا كَذِبًا** (کہن آیت) **تَكَادُ السَّمَوَاتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ** **وَتَنْشَقُّ الْأَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًا** (مریم ۹۰)

نا قابل قبول نظریہ | بلاشبہ ان لوگوں کی تحریرات کا منشا یہ ہے کہ جس شخص کا دل خدا کے خوف سے خالی ہو، فسوت اور غفلت عن اللہ اُس پر چھا گئی ہو، شیطان کے تسلط نے اُس کو پورا بے باک اور شوخ بنادیا ہو؛ تو شاید وہ اصل حقیقت اور صداقت کا اظہار نہایت جرأت کے ساتھ کر سکتا ہے، اور صرف اُسی سے یہ اُمید کی جاسکتی ہے کہ وہ خداے رب العزت کی صحیح صحیح مُراد کو سمجھ کر تمام مخلوق کو خدا کے دین کی طرف متوجہ کر سکے، اور اُن کے دلوں میں اُس کا سچا منشا اتار سکے۔

بے شک ایسا ہی ہوتا، اگر تاریکی روشنی کو پیدا کر سکتی اور بول دہراز سے عطر کشید کیا جاسکتا؛ جب ایسا نہیں تو کم رد کہ: **وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمَى وَالْبَصِيرُ** **وَلَا الظُّلُمَةُ وَلَا النُّورُ** **وَلَا الظِّلُّ وَلَا الْحَرُورُ** **وَمَا يَسْتَوِي الْأَحْيَاءُ وَلَا الْأَمْوَاتُ** (فاطر ۳۵ آیت ۱۹ تا ۲۲)

استدلال غلط ہونے کی وجہ | اس موقع پر میرے واسطے سب سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ اُن لوگوں کی ایسی گستاخانہ اور جالبانہ تحریروں سے بعض فہمیدہ اہل علم کو کیوں شبہات پیدا ہو جاتے ہیں؟ ایک کو چشم بے بصیرت نے اتنا لکھ دیا کہ: **وَلَا خَطَرَ عَلَى قَلْبِ بَشَرٍ** سے مُراد نعمائے جسمانی کی نفی ہوتی ہے اور قرآن مجید کی سیکڑوں آیات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیسیوں احادیث تمثیل پر محمول ہیں؛ تو اہل علم کو اُس سے پوچھنا تھا کہ **لَا خَطَرَ عَلَى قَلْبِ بَشَرٍ** سے کیا مُراد ہے؟ اگر بالکل عام ہے، تب تو یہ غلط ہے جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، اور اگر کسی خاص قسم کے ”خطورہ“ کی نفی کی گئی ہے، تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ جنت میں سے خواہی خواہی جسمانی لُذائِد

کو خارج کیا جاوے !

محاورات اور مثالوں | تماشا ہے کہ نعمائے جہانی کے منکر اس کو تو جائز رکھتے ہیں کہ سیڑیوں سے وضاحت

کر لیں، مگر ایک ”وَلَا خَطَرَ عَلَى قَلْبِ بَشَرَةٍ“ ایسا جملہ ہے کہ اُس میں کسی ادنیٰ تعریف بھی جائز نہ رکھا جاوے، حالانکہ محاورات کے موافق اس میں کچھ بھی اشکال نہیں! اگر سلطان المعظم کسی معمولی عالم کی دعوت کر دیں، تو اُس کو پورا یقین ہوگا کہ وہاں ضرور پُر تکلف کھانے تیار ملیں گے، اور اپنی معلومات کے موافق اُس نے کچھ فہرست بھی کھانوں کی ضرور اپنے ذہن میں سوچ رکھی ہوگی۔ بلکہ یہی فرض کر لو کہ کھانوں کی فہرست لکھی ہوئی پہلے ہی سے اُس کے پاس مطبوع سلطانی سے پہنچ گئی تھی، مگر جب دسترخوان پر پہنچا تو بعض کھانے اب اُس نے ایسے پائے، جو اُس نے پہلے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھے تھے اور بعض ایسے پائے کہ جن کا تجربہ ہوا تھا، مگر وہاں اُن کی ترکیب ہی کچھ اور تھی اور لذت اور مزد ہی دوسرا تھا، پھر ایوان سلطانی میں عجب عجیب طرح کے تکلفات اُس کو نظر پڑے، جنہوں نے اُس کی آنکھیں خیرہ کر دیں، اور سلطان المعظم نے اُس کا اس قدر تپاک سے خیر مقدم اور احترام کیا کہ وہ بالکل مہبوت ہو گیا۔

اب وہ شخص وہاں سے آکر، اگر اپنے ہم نشینوں سے یہ کہے کہ ایوان سلطانی میں اس طرح کے تکلفات تھے اور ایوان طعام اور لذیذ غذائیں مہیا تھیں، اور سلطان نے میری اس طرح تکریم اور عزت افزائی کی، جس کا میرے دل میں خطرہ اور وہم و خیال بھی نہ گزرا تھا، تو اس کے معنی اس کے سوا کیا ہیں کہ اعزاز و اکرام اور مدارات کا وہ انتہائی درجہ، جو اُس نے ایک ایسے بڑے باجاہ و جلال بادشاہ کے دربار میں دیکھا، وہ اُس کے حوصلہ امید سے باہر تھا اور اُس کی توقعات کی پرواز وہاں تک کبھی نہ پہنچی تھی! اگرچہ نفس اعزاز اور مدارات کا اُس کو پہلے سے یقین تھا، تاہم یہ کیفیت اور

۱۰ یعنی وہم و گمان

ایسا شان دار سماں اپنے اعزاز و اکرام کا اُس کے خیال میں نہ تھا۔ اسی طرح یاد رکھیے کہ جن میوؤں اور پھلوں وغیرہ کے نام نعمائے جنت کی فہرست میں لیے گئے ہیں، اگرچہ آدمی کتنی ہی پرواز اُن کی اعلیٰ کیفیات کے سمجھنے کے لیے کرے؛ لیکن چوں کہ اُس کی پرواز اُس کی محسوسات کے ذائقے تک محدود ہے، اس وجہ سے اُس کے خیال و خطرے میں بھی جنت کے پھلوں کی اعلیٰ سے اعلیٰ کیفیت نہیں آسکتی۔ فرض کرو کہ ایک شخص نے مسقطی حلوہ کبھی نہ کھایا ہو اور نہ کبھی دیکھا ہو۔ اب اگر اُس کے سامنے حلوائے مسقطی کی تعریف کر دے، تو اگرچہ وہ اتنا یقین کرے گا کہ وہ کوئی قسم حلوے کی ہے اور کھانے کی چیز ہے؛ لیکن اُس کی صورت اور رنگ اور مزہ کے جو کچھ اجمالی و سادس و خطرات آئیں گے، تو اپنی ماکولات کے انداز کے موافق آئیں گے، خواہ وہ کتنا ہی اپنے خیال کو آگے بڑھانا چاہے۔ اب اگر اُس کو کبھی اتفاق سے حلوائے مسقطی کھانے کی نوبت آجاوے اور اُس وقت وہ مزہ لے کر بول اُٹھے کہ یہ مزہ اور لذت تو خیال اور گمان میں بھی نہ تھا، تو ظاہر ہے کہ اُس کا مطلب یہ ہے کہ اس اعلیٰ لذت تک خیال کی رسائی نہیں ہو سکتی تھی، نہ یہ کہ نفس مزہ اور لذت کا تصور بوجہ نا بھی نہ تھا۔

فرض کرو کہ اخبارِ نامگز کا ایک نامہ نگار، جس کی نظر دنیا کی تمام عظیم الشان لڑائیوں کی تاریخ پر تھی، یہ لکھ کر بھیجے کہ آج جو حملہ جرمنی دروون پر کیا، جس کی اطلاع ہمارے جاسوسوں نے پہلے سے دے دی تھی کہ حملہ ہونے والا ہے، اور اسی طرح جو مقاومتِ فرانس نے اس حملے میں کی اور جس شدت کی جنگ ہوئی اور جس زور کارن پڑا، نہ آنکھوں نے کبھی دیکھا اور نہ کانوں نے سنا تھا اور نہ دل میں اس طرح کا کبھی خیال اور خطرہ گزرا تھا، تو غالباً ”لاخطر علی قلب بشر“ سے نعمائے جنت کا انکار کرنے والے یہاں بھی شاید یہ کہنے لگیں کہ اس جملے سے تو یہ ثابت ہوتا ہے دروون پر

جنگ ہی نہیں ہوئی، کوئی مجھول الکھنہ اور نامعلوم الحقیقت واقعہ یورپ میں پیش آیا ہوگا، جس کے ہول ناک ہونے کو لندن ٹائمز کے نامہ نگار نے اس تمثیل میں بیان کیا ہے۔ کیوں کہ جب گورڈن پر دشمن کے حملہ آور ہونے کے ارادے پر پہلے سے یقینی اطلاع ہو چکی تھی، تو یہ کہنا کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ اس حملے کا خیال اور دہم بھی نہ تھا، دل میں تو حملہ خطور کر چکا تھا، اگرچہ کتنی ہی کم حیثیت میں کیوں نہ ہو۔

اب آپ انصاف فرمادیں کہ ان سب مثالوں میں سے پہلے سے دل میں خطرہ نہ ہونے کے کیا معنی ہیں؟ اگر وہی معنی ”ولا خطر علی قلب بشر“ میں بے جاویں، تو کیا مضائقہ ہے؟

فیصلہ کن توجیہ | اس کے بعد میں وہ بات کہتا ہوں کہ جس سے بحث کا خاتمہ ہو جائے اور منصف فہیم کے لیے ان شاء اللہ العزیز قیل و قال کی گنجائش ہی نہ رہے۔ جس حدیث سے منکرین احتجاج کر رہے ہیں، اُس کے الفاظ یہ ہیں: أَعَدَدْتُ لِعِبَادِي الصَّالِحِينَ مَا لَا عَيْنٌ رَأَتْ وَلَا أُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلَى قَلْبِ بَشَرٍ۔ جس کا ترجمہ صرف اس قدر ہے کہ میں نے اپنے نیک بندوں کے واسطے ایسی چیز تیار کی ہے، جس کو نہ آنکھ نے دیکھا اور نہ کان نے سنا اور نہ کسی آدمی کے دل میں اس کا ”خطرہ“ ہوا۔ بیش ازین نیست کہ اس سے جنت میں ایسی چیز کا موجود ہونا ثابت ہوا کہ جن شے کی یہ حالت ہے۔ لیکن یہ کس لفظ سے نکلتا ہے کہ ایسی چیز کے سوا، جس کے یہ یہ اوصاف ہیں، اور کوئی چیز جنت میں نہیں جس کو فرض کیجیے آنکھ نے دیکھا ہو یا کان نے سنا ہو یا دل میں اس کا خیال گزرا ہو!

یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ آپ کو کوئی مدعو کرے اور یہ کہے کہ آج ہم نے تمہارے لیے ایسی چیز تیار کی ہے، جو تم نے کبھی نہ کھائی ہوگی۔ اس کا کسی کے نزدیک یہ مطلب نہیں کہ بس اس چیز کے سوا دسترخوان پر کوئی ایسی چیز نہ آئے گی، جو آپ نے کبھی کھائی ہو۔

ایک سوداگر یہ کہے کہ میری دکان پر آج کل اس قسم کے کپڑے آئے ہوئے ہیں، جو آپنے تاج تک کبھی نہ دیکھے ہوں گے، تو ہرگز یہ مُراد نہیں کہ دکان میں اُن کے سوا ایسے نقصان ہوں گے، جن کو ہم نے کبھی دیکھا ہو۔

اسی طرح اگر یہاں سمجھا جاوے تو کیا حرج ہے کہ جنت میں ایسی نعمتیں بھی ہیں جن کا من و وجہ ”خطور“ پہلے ہوا ہو اور ایسی بھی، جو کبھی مُدتُ العمر خیال میں نہ آئی ہوں۔ باقی جن نعمائے جسمانیہ کا تسفر کر کے ایک غیر مہذب بھانڈا کا فرض انجام دیا گیا ہے، تو اُس کا جواب ہمارے پاس کچھ نہیں بجز اس کے کہ: **إِنْ تَسْخَرُوا مِنَّا، فَإِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُونَ**۔ فَسَوْفَ نَعْلَمُونَ مَنْ يَأْتِيهِ عَذَابٌ يُخْزِيهِ وَيَجِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيمٌ۔ کیا جنت و دوزخ کی تخلیق، یہ عجیب بات ہے کہ یہ لوگ زبان سے خدا کے وجود خدا کی قدرت سے باہر ہے؟ اور اُس کے غیر محدود قدرت رکھنے اور کتاب اللہ کو ماننے کے باوجود، کس طرح جسارت کر کے اُس کی لامحدود قدرت و حکمت کو اپنی عقل کی گُلّیاں میں بند کر دیتے ہیں! نہ معلوم جنت میں کون سی چیز ایسی ہے، جس کا پیدا کرنا اُس قادرِ قیوم کے لیے آسمانوں اور زمین اور چاند، سورج اور سمندر اور پہاڑوں سے بھی زیادہ دشوار ہے؟ یا آگ پانی کا ایک کُرہ یا آگ کا ایک کُرہ اور ایک طبقہ اور مٹی کا ایک طبقہ پیدا کرنا سراسر اُس کی حکمت اور دانائی کو ظاہر کرتا ہے اور پھر اُن کے تھوڑے تھوڑے اجزاء کو محفوظ کر کے آدم کا خمیر بنانا، اس حکمت کے اظہار میں اور چار چاند لگاتا ہے، تو اسی طرح اگر اس دنیا میں اُس نے راحت و تکلیف کو مخلوط پیدا فرمایا اور ان دونوں کے واسطے ایک ایک کُرہ اور مخزن علاحدہ علاحدہ بنادیا، کہ جو جسمانی اور روحانی خوشی اور راحت اور عیش کا خزانہ ہے، اُس میں کسی تکلیف کا نام اور نشان نہ آنے پائے اور جو رنج اور تکلیف اور مصیبت کا خزانہ ہے، اُس میں راحت کا اور خوشی کا شائبہ نہ پایا جاسکے، تو کیوں حکمت کے خلاف ٹھہرے گا؟

منکرین کی مثال | مولانا جلال الدین رومی نے سچ فرمایا ہے کہ یہی جنت اور اُس کی نعمتوں کا انکار کرنے والے جب رحم مادر میں تھے، تو اُس وقت اُن سے اگر کوئی جا کر کہتا کہ اس تنگ و تاریک کوٹھری سے تم باہر نکلو اور یہ حیض کا ناپاک خون کھانا چھوڑ دو، تو تم کو باہر ایک ایسا وسیع زمین آسمان نظر پڑے گا کہ جس کی وسعت سے تمہارے اس مجرے کی نسبت، ایک اور کروڑ کی بھی نہ ہوگی۔ اور جب تم یہ ناپاک غذا (دمِ طمث) چھوڑ دو گے، تو تم کو نہایت خوش رنگ اور خوش ذائقہ لطیف غذا دی جائے گی، جس کے بعد تم اس غذا کو کبھی نہ یاد کرو گے۔ تو یہ منکرین ہی انصاف سے بتلا دیں کہ کیا وہ رحم مادر میں ان باتوں کو باور کر سکتے تھے؟ وہ نیچے اوپر ادھر ادھر نظر دوڑاتے اور رحم کی جھلتی کے سوا کچھ نہ دیکھے۔ جن غذاؤں کا اُن سے وعدہ کیا جاتا تھا، وہ یہی کہتے جو جنت کے کھانوں کی نسبت کہتے ہیں کہ یہ سب تمہارے خیالات و اوہام ہیں، نہ اس مکان سے وسیع کوئی مکان ہے اور نہ اس غذا کے سوا کوئی غذا ہے۔ لیکن حق تعالیٰ شاہ نے اپنی قدرتِ بالغہ سے اُن کو بطنِ مادر سے باہر نکالا اور انھوں نے وہ سب چیزیں دیکھ لیں جن کی اُن کو خبر دی جاتی تھی اور اب کوئی تردد اُس میں باقی نہ رہا۔ پس ٹھیک ٹھیک یہی مثال ہمارے نزدیک ان تنگ نظروں اور کور باطنوں اور دُنیا کے بدستوں کی ہے۔ یہ ہرگز ان چیزوں کو تسلیم نہ کریں گے، جب تک کہ اُن کو دیکھ نہ لیں گے۔ اسی خیال کے شخص کی تاریخ کا مصرعہ ہمارے اُستاد دَام فیضہ نے کیا ہی خوب کہا ہے:

ماتے جس کو نہیں تھے، لیجیے پہنچے وہاں

شاہ ولی اللہ کی رائے | اب میں اس جواب کو ختم کرتا ہوں، کیوں کہ بندہ کو فرصت زیادہ نہیں ہے۔ اخیر میں اتنا اور گزارش کرتا ہوں کہ آپ نے جو ایسے شخص کا شرعاً حکم دریافت کیا ہے، جو یہ عقیدہ رکھتا ہو، اس کا استفتاء حضرت مفتی صاحب سے کریں۔ بندہ تو فقط ایک عبارت حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی لکھے دیتا ہے، جو حجتہ اللہ البالغہ میں ہے۔ عالمِ مثال کے ذکر میں جو احادیث لائے ہیں، اُن کے

انہوں نے تین درجے کیے ہیں، جس میں تیسرا یہ ہے:

أَوْ يَجْعَلُهَا تَعْمِيلًا يَتَفَهَّمُ مَعَانِ أُخْرَى
وَلَسْتُ أَرَى الْمُقْتَصِرَ عَلَى الثَّالِثَةِ
مِنْ أَهْلِ الْحَقِّ - وَقَدْ صَوَّرَ الْإِمَامُ
الْغَزَالِيُّ فِي عَذَابِ الْقَبْرِ تِلْكَ الْمَقَامَاتِ
الثَّلَاثَ، حَيْثُ قَالَ: وَأُمَثَالُ هَذِهِ
الْأَخْبَارِ لَهَا ظَوَاهِرٌ صَحِيحَةٌ
وَأَسْرَارٌ خَفِيَّةٌ، وَلَكِنَّهَا
عِنْدَ أَرْبَابِ الْبَصَائِرِ وَاضِحَةٌ،
فَمَنْ لَمْ يَنْكَشِفْ لَهُ حَقَائِقُهَا
فَلَا يَنْبَغِي أَنْ يُنْكِرَ ظَوَاهِرَها
بَلْ أَقَلُّ دَرَجَاتِ الْإِيمَانِ
التَّسْلِيمُ وَالتَّصَدِيقُ
(رحمة الله البالغه ص ۱۳)

یا اُن اہادیث کو تمثیل پر محمول کیا جائے جس سے دوسرے معانی کی تفہیم مقصود ہے۔ اور میں ایسے شخص کو، جو اس تیسرے درجے پر محدود ہے، اہل حق میں شمار نہیں کرتا۔ اور ایام غزالی نے بھی عذاب قبر کے بیان میں یہ تینوں درجے بیان کیے ہیں، جہاں یہ فرمایا ہے کہ اس قسم کے اخبار کے ایک تو ظاہر معنی ہیں جو صاف ہیں اور ایک اُن کے دقیق اسرار ہیں، جو اہل بصیرت کے نزدیک واضح ہیں۔ تو جس شخص پر وہ خفایں منکشف نہ ہوں، اُس کو یہ مناسب نہیں کہ وہ ظواہر کا بھی انکار کر بیٹھے، بلکہ کم از کم ایمان یہ ہے کہ اُن کو تسلیم کرے اور ان کی تصدیق کرے۔

میرے اس سارے خط کو آپ مہربانی فرما کر ہمارے خاں صاحب محترم ادریجی مولوی محمد عرفان صاحب کو ضرور سُنادیں۔ اگر کچھ اصلاح فرمادیں، تو مُطلق کر دیں۔ والسلام۔ اور ان دونوں صاحبوں سے بہت بہت سلام بندے کا عرض کر دیں۔ اور بعض الفاظ، جو آپ کو خطاب کر کے تیز لکھے گئے ہیں، اُن سے فی الحقیقت آپ مُراد نہیں۔ بلکہ وہ شخص مراد ہے جس کا یہ عقیدہ ہو۔ فقط

الترّاقم
شبیر احمد عثمانی عفا اللہ عنہ

از دارالعلوم دیوبند

۲۰ ربیع الثانی ۱۳۳۳ھ

الشہاب لوجم الخاطف المرتاب

اسلام میں مرتد کی سزا

افادات

حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ
ترتیب و تحقیق: خالد القاسمی

منتظم اشاعت

ناشر

دارالعلوم حیدرآباد دہلی © دارالمؤلفین دیوبند۔ دیوبند
۲۳۵۵۴

طبع اول سال ۱۴۱۵ھ قیمت ۱۰/۰

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الشہاب لرحم الخاطف المرتد

الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلَى خَيْرِ
خَلْقِهِ مُحَمَّدٍ وَآلِهِ وَصَحْبِهِ أَجْمَعِينَ.

کابل میں نعمت اللہ قادیانی کی سنگ ساری کے واقعے سے ہندوستان کے
اخباروں میں قادیانیوں کے ارتداد کی بحث پھر تازہ ہو گئی اور سابقہ یہ مسئلہ بھی زیر بحث
آگیا کہ اسلام میں مرتد کی سزا کیا ہے؟ مسٹر محمد علی امیر جماعت احمدیہ لاہور نے ”پیغام صلح“
کے ضمیمے کے طور پر ایک ہمفلٹ بھی اسی مضمون کے متعلق بڑی تعداد میں شائع کرایا
ہے، جس میں پورے زور و خطابت سے حکومت افغانستان اور علمائے دیوبند کے خلاف
(جو افغانستان کے اس فعل کی سب سے بڑھ کر تحسین کرنے والے ہیں) نفرت اور اشتعال
پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے اگرچہ مجھے یقین ہے کہ مسلمان اب بہت کچھ قادیانیوں کی فتنہ
پر دازیوں اور اسلام کے خلاف ان کی دیسہ کاریوں سے واقف ہو گئے ہیں اور اسی لئے
ان کا کوئی پروپیگنڈا افغانی گورنمنٹ یا علمائے دیوبند کے خلاف ان شاء اللہ مؤثر نہیں
ہو سکتا، تاہم سلسلہ تحریکات جس حد تک پہنچ گیا ہے، اسے دیکھتے ہوئے مناسب معلوم ہوا
کہ اس باب میں ٹوٹوٹے کے ساتھ کچھ عرض کیا جائے، اس ضمن میں پہلی بحث جو ہمارے سامنے
آتی ہے، وہ قادیانی جماعت کے ارتداد کا مسئلہ ہے اور بھریہ دیکھنا ہے کہ مرتد کی نسبت
اسلام کیا فیصلہ کرتا ہے؟ تو ضروری ہوا کہ اولاً ارتداد کے معنی سمجھ لیتے جاتیں۔

لے یعنی اعتدال

ارتداد کی تعریف

مُرْتَد کے معنی مُغْت میں (راجع یعنی کسی چیز سے لوٹنے اور بھرنے والے کے ہیں، اور شریعت کی اصطلاح میں مُرتد اس شخص کو کہا جاتا ہے جو دین اسلام کو اختیار کر کے اس سے پھر جانے امام راغب ارتداد کے معنی لکھتے ہیں: هُوَ التَّوْبُوْعُ مِنَ الْإِسْلَامِ إِلَى الْكُفْرِ. اسلام سے کفر کی طرف پھر جانا، مفردات: ص ۱۹۲۔ اور محمد علی صاحب اپنے پمفلٹ میں لکھتے ہیں: ”ارتداد یہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو قبول کر کے پھر اس سے انکار کر دے اور کہہ دے کہ آپ رسول ہیں۔“

لیکن یہ بات صاف موقی چاہئے کہ امام راغب کی تعریف میں کفر اور محمد علی صاحب کی تعریف میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت سے انکار کرنے کا کیا مطلب ہے؟ کیا رسالت کا انکار اسی وقت سمجھا جائے گا کہ وہ زبان سے کہہ دے کہ میں آپ کو رسول نہیں جانتا؟ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی یقینی خبر اور قطعی فرمان کا انکار کرنے سے بھی رسالت کا منکر ٹھہرے گا؟۔

فرض کیجئے ایک شخص زبان سے اقرار کرتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے رسول ہیں، نماز بھی قبلے کی طرف پڑھتا ہے، زکوٰۃ بھی ادا کرتا ہے، مسلمانوں کا ذیہ بھی کھاتا ہے مگر ساتھ ہی یہ بھی کہتا ہے کہ میرے خیال میں سورۃ احزاب یا سورۃ نساء قرآن کی سورت نہیں، یا حضرت عیسیٰ (علیہ السلام)، مثلاً خدا کے پیغمبر نہیں (معاذ اللہ) باقی سارے قرآن اور سارے انبیاء کی تصدیق کرتا ہوں، تو کیا ایسی تصریحات کے باوجود بھی محمد علی صاحب اے مسلمان سمجھے رہیں گے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان رکھنے والا تصور کریں گے؟ اور ان بعض انبیاء یا بعض اجزائے قرآن کی تکذیب کو خود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بلکہ رب محمد کی تکذیب قرار نہ دیں گے؟۔

اگر ایسے شخص کو باوجود زبانی اقرار رسالت کے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت بلکہ خود خداوند رب العزت کا منکوی قرار دیتے ہیں، جیسا کہ اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهِ وَیُرِیدُوْنَ اَنْ یَّفْرِقُوْا بَیْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهِ

یہ ہے اور فرد و قسم پر ہے: (۱)

(۲) دوسرے یہ کفر کہ مثلاً وہ مسیح موعود کو نہیں مانتا اور اس کو ثبوتاً وجود اتمام حجت کے جھوٹا جانتا ہے اور اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ دونوں قسم کے کفر ایک ہی قسم میں داخل ہیں ۱۰، اور اسی کتاب کے ص ۱۶۳ پر لکھتے ہیں: ”جو مجھے نہیں مانتا وہ خدا اور رسول کو بھی نہیں مانتا ۱۰، تو ان کے اقرار اور تسلیم سے ثابت ہوا کہ ان کے نزدیک بھی اللہ اور اس کے رسول کے انکار کی صرف یہی صورت نہیں کہ ایک شخص زبان سے صریح طور پر یوں کہے کہ میں خدا کو یا اس کے پیغمبر عربی صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں مانتا بلکہ ہاں وقتاً بعض نہایت ہی قطعی اور ضروری چیزوں کا انکار کرنے والا بھی جن کی اطلاع خدا اور اس کے رسول نے دی ہو، خدا اور اس کے رسول ہی کا انکار کرنے والا سمجھا جائے گا، جو قرآن کی تصریح اور مرزا صاحب کے اقرار کے موافق کفر ہے۔

پس جب کہ امام راغب کی تصریح کے موافق، اسلام سے کفر کی طرف پھر جانے کا نام ارتداد ہے اور محمد علی صاحب اور ان کے مسیح موعود کی تصریحات سے یہ ثابت ہو چکا کہ کفر صرف یہی نہیں کہ اللہ اور اس کے رسول کا صریح طور پر زبان سے انکار کیا جائے، بلکہ بعض قطعیات اسلام کا انکار کرنا بھی حقیقت میں اللہ اور اس کے رسول کا انکار کرنا

ہے، جو کفر ہے: تو معلوم ہوا کہ ارتداد یعنی اسلام سے کفر کی طرف پھر جانے کی دو صورتیں ہیں: (۱) ایک یہ کہ کوئی مسلمان مرتد اسلام سے انکار کر بیٹھے۔ (۲) دوسرے یہ کہ ایسا نہ ہو مگر بعض ضروریات دینیہ اور قطعیات شرعیہ سے انکار کرے، دونوں صورتوں میں ایسا شخص مرتد یعنی اسلام سے کھل کر کفر میں جانے والا ہے۔

کیا مرزا قادیانی اور اس کی امت مرتد ہیں۔

جو لوگ مرزا غلام احمد قادیانی کو مرتد کہتے ہیں، ان کے نزدیک معیار ارتداد وہی ہے، جو ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ مرزا صاحب پہلے مسلمان تھے اور جمہور اہل اسلام کے سے عقائد رکھتے تھے، اس کے بعد انھوں نے تدریجاً بعض اسی باتیں لکھیں اور شائع کیں، جن کا مانتا، کھلے طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا نہ ماننا ہے اگرچہ بار بار زبان سے یہ بھی اظہار کرتے رہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے رسول ہیں اور خاتم الانبیاء ہیں اور تمام انبیاء و مرسلین خدا کے پاک اور برگزیدہ بندے ہیں، لیکن ساتھ ہی وہ قلم اور زبان سے ہدایت اصرار کے ساتھ اسی چیزیں بھی نکالے گئے جو ان کے پہلے اذکار کی تکذیب ہیں۔

وہ جب کہتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کی تصریح کے موافق خاتم النبیین ہیں، تو ساتھ ہی یہ بھی کہتے جاتے ہیں کہ میں آپ کے بعد نبی ہو کر آیا ہوں۔ پھر یہ نبوت، جس کا انھیں دعویٰ ہے، صرف وہ ولایت و محدثیت ہیں، جسے بعض صوفیہ نے (مثلاً شیخ اکبرؒ) اپنی اصطلاح میں نبوت کے لفظ سے تعبیر کر دیا ہے اور کہہ رہے ہیں کہ وہ گروہ اولیاء میں موجود ہوتی ہے، گو اس کی وجہ سے وہ اولیاء، انبیاء نہیں کہلاتے۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ
بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ
بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو بتلایا کہ
خواب (سچا) اجملائے نبوت میں سے ایک جز ہے

فَالْإِتِّصَافُ بِكَمَالَاتِ النَّبُوَّةِ لَا يَسْتَلْزِمُ
الْإِتِّصَافُ بِالنَّبُوَّةِ (عِبَقَات ج: ۱ ص ۱۵۹)
فَلْخَبِّرْ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
أَنَّ الرُّبُوبَ يَجْزُءُ مِنْ أَجْزَاءِ النَّبُوَّةِ. فَقَدْ
بَقِيَ لَكُمْ صُغْرٌ.

اور نہ کبھی آج تک کسی دلی نے حسی کہ اس محدث نے بھی جس کے محدث ہونے کی تصدیق زبان رسالت سے ہو چکی تھی (حضرت عمر بن الخطاب) اپنی نبوت پر ایمان لانے کی طرح لوگوں کو دعوت دی ہے اور نہ مرزا صاحب ایسی گھٹیا نبوت کے مسئلہ میں جو ایک سچا خواب دیکھنے سے بھی کسی مومن صالح کو فی الجملہ حاصل ہو سکتی ہے۔

مرزا صاحب کا دعوائے نبوت

بلکہ وہ محدثیت سے آگے بڑھ کر مدعی ہوتے ہیں ایسی نبوت کے، جس پر نہ صرف قادیان کو، نہ صرف پنجاب کو، نہ صرف انڈیا کو، بلکہ خاتم النبیین کی نبوت کی طرح تمام عالم

تو لوگوں کے واسطے نبوت میں سے یہ جز (درویا) وغیرہ باقی رہ گیا ہے، لیکن اس کے باوجود بھی نبوت کا لفظ اور نبی کا نام، بجز مشرط کے اور کسی پر بولا نہیں جاسکتا، تو نبوت میں ایک خاص وصف معین کی موجودگی کی وجہ سے اس نام (نبی) کی بندش کر دی گئی ہے۔

بقی للناس فی النبوة فی ہذا وغیرہ ومع
هذا لا یطلق اسم النبوة ولا النبی الا
على المشرع خاصة فحجر هذا الاسم
لخصوص وصف معین فی النبوة
(فتوحات ج ۲ ص ۳۹۵)

جیسے کسی کی طرف مبشرات کی وحی آتی اور وہ مبشرات اجزائے نبوت میں سے ہیں، اگرچہ صاحب مبشرۃ نبی نہیں ہو جاتا پس رحمت الہیہ کے علوم کو سمجھو تو نبوت کا اطلاق اسی پر ہو سکتا ہے، جو تمام اجزائے نبوت سے متصف ہو، وہی نبی ہے اور وہی نبوت ہے، جو ہم سے منقطع ہو چکی اور ہم سے روک دی گئی کیوں کہ نبوت کے اجزاء میں سے تشریع بھی ہے، جو وحی ملی میں سے ہوئی ہے اور یہ بات صرف نبی کے ساتھ مخصوص ہے

کمن یوحی الیہ فی المبشرات، وہی
جزء من أجزاء النبوة وان لم یکن
صلب المبشرۃ نبیاً ففتطن لعموم
رحمة الله فما تطلق النبوة الا لمن
اتصف بالمجموع فذلك النبی وتلك
النبوة التي حجزت علينا وانقطعت،
فان من جعلتها التشریع بالوحی
الملکی فی التشریع وذلك لا یكون الا
لنبی خاصة (فتوحات ص ۵۶۸ ج ۲)

کو ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے پھر جو کوئی اس دعوت کے پہنچنے پر بھی ایمان نہ لاتے وہ دائرہ ایمان و اسلام سے خارج اور جہنمی ہے، جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر ایمان نہ لانے والا بے ایمان اور جہنمی ہوتا ہے، بلکہ ان کا نہ ماننے والا بعینہ خدا اور رسول کو بھی نہ ماننے والا ہے، نہ صرف یہی کہ ان کو معمولی نبی تسلیم کر لیا جائے بلکہ بعض اولوالعزم پیغمبر اور خاتم الانبیاء بنی اسرائیل سیدنا حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام پر بھی ان کی فضیلت کا اقرار کیا جاتے، پھر فضیلت بھی کوئی جزئی فضیلت نہیں بلکہ کلی فضیلت اور ہر شان میں ان سے بڑھ کر مانا جاتے، اور اگر ہوئے تو ان سب کے بعد ذرا دہلی زبان سے تشریحی (صاحب تشریح برنی بھی تسلیم کر لیا جاتے، ملاحظہ ہوں مرزا صاحب کی عبارت ذیل۔

”اب ظاہر ہے کہ ان الہامات میں میری نسبت بار بار بیان کیا گیا ہے کہ یہ خدا کا فرستادہ، خدا کا مامور، خدا کا امین اور خدا کی طرف سے آیا ہے جو کچھ کہتا ہے، اس پر ایمان لاؤ، اور اس کا دشمن جہنمی ہے۔“ (انجامِ اہتمام، بار دوم، ص ۶۲۔

”پھر حال جب کہ خدا تعالیٰ نے مجھ پر ظاہر کیا ہے کہ ایک ایک شخص، جس کو میری دعوت پہنچی ہے اور اس نے مجھے قبول نہیں کیا ہے، وہ مسلمان نہیں ہے اور خدا کے نزدیک قابلِ مواخذہ ہے۔“ (نیج المصلی، جلد اول، ص ۲۰۸ منقول)

(از تسمیۃ الاذہان جلد ۲، ص ۱۳۵)

”علاوہ اس کے جو مجھے نہیں مانتا وہ خدا اور رسول کو بھی نہیں مانتا، کیونکہ میری نسبت خدا اور رسول کی دشمنی گواہی موجود ہے (حقیقۃ الوحی، بار دوم، ص ۱۶۳۔

اب جو شخص خدا اور رسول کے بیان کو نہیں مانتا اور قرآن کی تکذیب کرتا ہے اور عمداً خدا تعالیٰ کے نشانوں کو رد کرتا ہے اور مجھ کو باوجود صد ہا نشانوں کے مفری ٹھہراتا ہے تو وہ مومن کیوں کر ہو سکتا ہے؟“، ایضاً، ص ۱۶۳۔

”اوائیل میں میرا ہی عقدہ تھا کہ مجھ کو مسیح بن مریم سے کیا نسبت ہے؟ وہ نبی ہے اور خدا کے بزرگ مقررین سے ہے، اور اگر کوئی امر میری فضیلت کی

نسبت ظاہر ہوتا، تو میں اس کو جزئی فضیلت قرار دیتا تھا، مگر بعد میں جو خدا تعالیٰ کی وحی بارش کی طرح مجھ پر نازل ہوئی، اس نے مجھے اس عقیدے پر قائم نہ رہنے دیا اور صریح طور پر نبی کا خطاب مجھے دیا گیا، مگر اس طرح سے کہ ایک پہلو سے نبی اور ایک پہلو سے امتی، (حقیقۃ الوحی، بار دوم، ص ۱۴۹)۔
 ”خدا نے اس امت میں سے مسیح موعود بھیجا، جو اس پہلے مسیح سے اپنی کام شان میں بڑھ کر ہے۔“ (حقیقۃ الوحی، ص ۱۳۸ منقول از ریویو، جلد اول ص ۶ ص ۲۵۷)۔

کافر کس طرح کے رسول کا نہ ماننے والا ہوتا ہے؟

اس کے متعلق تریاق القلوب صفحہ ۱۳۰ میں لکھتے ہیں۔
 ”یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے لائق ہے کہ اپنے دعوے سے انکار کرنے والے کو کافر کہنا، یہ صرف ان نبیوں کی شان ہے، جو خدا تعالیٰ کی طرف سے شریعت اور احکام جدیدہ لاتے ہیں، لیکن صاحب شریعت کے ماسولے جس قدر اور محدث ہیں کہ گو وہ کیسے ہی جنب الہی میں اعلیٰ شان رکھتے ہو اور غلبت مکالمہ الہیہ سے سرفراز ہوں، ان کے انکار سے کوئی کافر نہیں بن جاتا۔
 ماسوا اس کے یہ بھی تو سمجھو کہ شریعت کیا چیز ہے؟ جس نے اپنی وحی کے ذریعے سے چند امر دینی بیان کئے اور اپنی امت کے لئے ایک قانون مقرر کیا، وہی صاحب شریعت ہوگا، پس اس تعریف کی رو سے بھی ہمارے مخالف ملزم ہیں، کیونکہ میری وحی میں امر بھی ہے اور نہی بھی، اور اگر کہو کہ شریعت سے وہ شریعت مراد ہے، جس میں نئے احکام ہوں، تو یہ باطل ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿إِنْ هَذَا لَفِي الصُّحُفِ الْأُولَىٰ صُحُفِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ﴾ یعنی قرآنی تعلیم توریت میں بھی موجود ہے اور اگر یہ کہو کہ شریعت وہ ہے جس میں یہ استیفاء امر دینی کا ذکر ہو، تو یہ بھی باطل ہے، کیوں کہ اگر توریت یا قرآن شریف میں یہ استیفاء احکام شریعت کا ذکر ہوتا، تو پھر اجتہاد کی گنجائش نہ رہتی، (اربعین ص ۷۰)۔

کیا محمد علی اور بے خبری سے ان کی تائید کرنے والے یہ عبارتیں سن رہے ہیں؟ کیا یہی وہ صوفیوں کی اصطلاحی یا مجازی یا لغوی نبوت ہے جس کا ثبوت، روایا کی حدیث یا شیخ اکبر کے کلام میں پایا جاتا ہے؟ کیا قادیانیوں کا یہی ظلی اور بروزی نبی ہے جو اصلی اور حقیقی نبیوں سے بھی بڑھ گیا ہے؟ کیا امتی رکھ دینے سے اصل حقیقت پر پردہ پڑ سکتا ہے اور کیا یہ سخت حیرت انگیز اور معجزہ خیز منطق نہیں ہے کہ کسی پرانے نبی (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کا دوبارہ آنا تو آیت خاتم النبیین کے خلاف ہو لیکن پچھلے نبیوں پر فضیلت کلی رکھنے والا ایک نیا نبی قادیانی میں آجاتے۔ یہ خاتم النبیین کے خلاف نہ ہو گا تو یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود باوجود نے مفسول انبیاء کے آئے کا سلسلہ تو بند کر دیا۔ لیکن ان سے اعلیٰ اور افضل انبیاء کی تشریف آوری کا دروازہ کھول دیا ہے؛ کاش کہ قرآن میں بھی خاتم النبیین کی آیت کے ساتھ فاتح النبیین کی کوئی آیت ہوتی اور جس صراحت اور تکرار کے ساتھ حضور سے پہلے آنے والے انبیاء کا تذکرہ ہوتا ہے اس کا عشر عشر بھی پیچھے آنے والے نبی کے متعلق ہوتا کہ امت کو زیادہ کام انھیں پچھلوں سے پڑنا تھا اور یہ ان پہلوؤں سے افضل بھی تھے۔

کیا امرناتوں میں کوئی بھی خوف خدا رکھنے والا نہیں؟ کیا ان کے دلوں پر مہر و طغی ہے؟ کیا ان کے قلوب بے تھر سے بھی زیادہ سخت ہو گئے ہیں جو ایسی ایسی مرتد عبارتوں کے بعد بھی ایک مفتری علی اللہ کو سچا پیغمبر بناتے چلے جاتے ہیں؟ عجیب تماشا ہے کہ اس مفتری کو اپنے تئیں سچا ثابت کرنے کے لئے انھم کے قصے میں اور محمدی بیگم کے ساتھی لکھتے ہیں۔ معاذ اللہ خدا کو اور اس کی تفصیلات میر مہک کو جھوٹا ٹھہرایا، مگر وہ محروم الخیر جماعت!

۱۔ شیخ اکبر رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

فَمَا بَقِيَ لِلأُولِيَاءِ الْيَوْمَ بَعْدَ ارْتِفَاعِ
النَّبَوَةِ إِلَّا التَّعْرِيفَاتُ، وَانْسَدَّتْ
أَبْوَابُ الْأَمْرِ إِلَّا لِلْهِمَةِ وَالنَّوْاسِي
فَمَنْ احْتَمَا بَعْدَ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ
وَسَلَّمَ، فَهُوَ مُتَعِ شَرِيعَةِ نُوحٍ بِهِ.

تو آج ادلیا کے پاس نبوت ختم
ہو جانے کے بعد تعریفات کے سوا
کچھ بھی باقی نہ رہا، ادا امر و نواہی الہی کے
دروازے بند ہو گئے رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم کے بعد جو کچھ ادا امر و نواہی الہی کا دعویٰ

جو کج علماتے دیوبند پر خدا کو جھوٹا کہنے کا فرضی الزام رکھ کر اپنے لئے نئی لغنت خرید رہی ہے۔ اس مفتری کا برابر کلمہ پڑھتی جاتی ہے، جو اپنی سچائی کا ثبوت ہی جب پیش کر سکتا ہے جب پہلے خدا کو جھوٹا ثابت کر دے۔ کِبْرُوت کَلِمَةٌ تَخْرُجُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ۔

شاید محمد علی صاحب کو علماتے دیوبند کے آئینہ اعتقاد میں اپنا چہرہ نظر آ گیا ہے جو معاذ اللہ خدا کے جھوٹ بولنے کی تصویر سامنے آگئی: اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهُ قَلْبٌ اَوْ اَلْقٰى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيدٌ۔ خوب سمجھ لو کہ جھوٹے جیسے اور بے ہودہ غدر تراش کر ختم نبوت جیسے قطعی اور اسلام کے بنیادی عقیدے کی تکذیب کرنا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور صدق و راست بازی اور قرآن کریم کے وحی الہی ہونے سے انکار کرنا ہے، فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيَاتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ۔ یہ لوگ تجھے نہیں جھٹلتے بلکہ ظالم خدا کی آیات کا انکار کرتے ہیں، اور جیسا کہ ابتداء میں عرض کر چکا ہوں یہی ارتداد ہے کہ آدمی اسلام کا اقرار کرنے کے بعد پھر اس سے صریحاً انکار کرنے لگے یا ایسی قطعی اور صاف چیزوں کا انکار کر بیٹھے، جو انکار رسالت کو مستلزم ہو، ارتداد کی اس قسم خفی کا نام یعنی یہ کہ آدمی زبان سے اسلام کا نام بھی لیتا رہے اور کلمہ بھی پڑھتا رہے مگر نام مقول تحریفات اور ناقابل تاویلات باطلہ سے قطعیات کے انکار پر بھی تلا ہو، سلف کی زبان میں ”وَذَنَدُوْهُ“ ہو گیا ہے اور جیسا کہ ہم آگے چل کر بیان کریں گے زنا باقہ کا حکم بھی وہی عام مرتدین کا سلسلہ ہے۔

اس تمام تقریر سے یہ نتیجہ نکلا کہ مرزا غلام احمد قادیانی، جس کی ختم نبوت کو رد کرنے والی تصریحات ہم نقل کر چکے ہیں، اسلام کے ایک قطعی عقیدے کو تسلیم نہ کرنے کی وجہ سے مرتد اور زندیق ہے اور جو جماعت ان تصریحات پر مطلع ہو کر ان کو صادق سمجھتی ہو اور اس کی حملت میں لڑتی رہے، وہ بھی یقیناً مرتد اور زندیق ہے، خواہ وہ قادیان میں سکونت رکھتی ہو یا لاہور میں، جب تک وہ ان تصریحات کے غلط اور باطل ہونے کا اعلان نہ کرے گی، خدا کے عذاب سے خلاص پانے کی اس کے لئے کوئی سبیل نہیں۔

یہاں تک ہم نے مرزا صاحب اور ان کے اذتاب کے ارتداد کا صرف ایک سبب نہ نکالتے یعنی مرتدین، اناہاع۔

بیان کیلئے کیوں کہ محمد علی صاحب نے اپنے مفصل میں اسی کا ذکر کیا تھا۔ دوسرے
موجبات ارتداد مثلاً توہین انبیاء علیہم السلام وغیرہ سے عمداً غمناک کیا گیا ہے مثلاً
اس خدمت کو میرا کوئی دوسرا بھائی انجام دے گا اور بیت سے بزدگ مجھ سے پہلے
بھی فی الجملہ انجام دے چکے ہیں، آپ یقین کیجئے کہ ہم کو مرزا صاحب یا کسی ایک کلمہ غم
کے کا فراور مرتد ثابت کرنے میں کوئی خوشی نہیں ہے ہماری حالت تو یہ ہے کہ نہ
ہم غیر مقلدین کو کا فر کہتے ہیں، نہ تمام شیعوں کو، نہ سارے پجریوں کو، حتیٰ ان بریلویوں
کو بھی کا فر نہیں کہتے جو ہم کو کا فر بتلاتے ہیں، اور ہماری تمنا تھی کہ کوئی صورت ایسی نکل
آتی کہ مرزائیوں کی کفر سے بھی ہم کو زبان آلودہ نہ کرتی پڑتی، لیکن ان کے ملحدانہ دعاوی
نے جن سے بارگاہ رسالت میں سخت گستاخی ہوتی ہے اور کسی طرح ختم نبوت کا ستون
کھڑا نہیں رہ سکتا، ہم کو مضطر کر دیا ہے کہ بادل ناخواستہ ان کی کم زاری سے لوگوں کو
پچائیں کہ جو زہر، دودھ یا مٹھائی میں مخلوط ہو گیا ہو وہ سخت خطرناک ہے۔

جو عبارتیں مرزا صاحب کی میں اوپر نقل کر چکا ہوں، کیا ان کے مطلع کے بعد
اس مسئلے کا اعلان نہیں ہو جاتا کہ جو کوئی ان کو نبی اور مسیح موعود نہ مانے وہ دائرہ ایمان
و اسلام سے خارج ہے؟ اب تم خود دنیا کی مردم شماری کر لو کہ تمہارے کا فر بناتے ہوتے
غیر مسلموں کے سوا کتنے آدمی مسلمان نہ جاتے ہیں، حالاں کہ یہ کروڑوں غیر مسلم فی ملک کم
لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ کا اقرار بھی کرتے ہیں اور سارے احکام بجالاتے ہیں
کیا مسٹر محمد علی اپنے اس فقرے میں، لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ کا اعتراف کرنے
والے کو کا فر کہتا بڑی خطرناک غلطی ہے خواہ مرزا محمود صاحب کہیں یا مولوی کفایت اللہ
صاحب۔ دونوں ناموں سے پہلے مرزا غلام احمد قادیانی کا اور اضافہ کریں گے اور ان کی
قبر پر جا کر دلائل تقولوا لمن القی، الیکم السلام، اَلَسْتُ مُؤْمِنًا، کی تلاوت فرمائیں؟
ایک طرف تو آپ کے مسیح موعود، سارے جہاں کے کلمہ پڑھنے والوں کو، بجز چند لاکھ نفوس
کے مسلماتی سے نکال رہے ہیں اور دوسری طرف آپ شاید ہر اس شخص کو جو مسلمانوں
کو اسلام کرے (خواہ ہندو ہو یا یہودی یا نصرانی یا دہریہ) مومنین تسلیم کرتے ہیں اس سے
سبب ارتداد نہ چشم پوشی۔

نبی قادیانی اور امتی، دونوں کی شریعت فہمی اور قرآن دانی کی حقیقت بے نقاب ہو جاتی ہے کہنا گیا ہے کہ قادیانی بڑے نمازی ہیں، قرآن بہت پڑھتے ہیں، روزے رکھتے ہیں زکوٰۃ دیتے ہیں، اگر اس پر بھی وہ مسلمان نہیں، تو بڑی حسرت اور حیرت کا مقام ہے، میں کہتا ہوں کہ ایک ایسی ہی بد بخت قوم کا تذکرہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحیحین کی احادیث میں فرمایا ہے کہ جو قرآن کی تلاوت بھی کرے گی اور یہ ظاہر سچے مسلمانوں سے بھی زیادہ گارہا پڑھے گی اور روزے رکھے گی، مگر ان کا قرآن ان کے حلقوم سے آگے نہ بڑھے گا اور وہ اسلام میں سے ایسی ہی لکھ چکی ہوگی، جیسے تیر شکار کا جسم چھید کر صاف لکھ جاتا ہے آپ نے فرمایا کہ اگر میں نے ان کو پایا تو عادی و نمود کی طرح ان کو قتل کروں گا، حق تعالیٰ شانہ اپنی پناہ میں رکھے اور اس دنیا سے ایمان پر اٹھالے کہ یہ مقام بڑے خوف اور عبرت کا ہے۔

مرزائیوں کو بڑا فخر ہے اور بعض سادہ لوح آزاد منش مسلمان بھی ان کی مدح سرائی میں رطب اللسان ہو جاتے ہیں کہ وہ آج اسلام کی ایسی خدمت کر رہے ہیں، جو کسی دوسری جماعت مسلمین سے بن نہیں پڑی، یعنی یورپ میں اسلام پھیلاتے ہیں، ملکاتوں کو رشوہ ہونے سے روکتے ہیں، آریوں وغیرہ کے مقابلے پر سینہ سپر ہوتے ہیں، وغیرہ وغیرہ ان کا یہ فخر اور منقبت اگر یہ سمجھ دار مسلمان اس لئے تسلیم نہیں کرتے کہ جس چیز کی وہ اشاعت اور حمایت کرتے ہیں، وہ صحیح اسلام نہیں ہے بلکہ یا تو وہ مرزا صاحب کی نبوت کی تبلیغ ہوتی ہے اور یا مرزا صاحب کا ترمیم کیا ہوا اسلام، جسے انھوں نے بہت سے اصول و فرسٹ کاٹ کر جو انان یورپ یا یورپ پر ایمان لانے والوں کے، اہوا و ظنون کے سلنچے میں ڈاھا لایا ہے۔

لیکن میں اس سے قطع نظر کر کے علی سبیل المثال کہتا ہوں کہ ان کا یہ سب امتیاز اور فخر اور خدمات اسلام کو تسلیم کرنے کے بعد بھی ان کا مومن اور ناجی ہونا ضروری نہیں ہے۔ صحیح مسلم کے ابواب الایمان میں اس شخص کا واقعہ پڑھتے، جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ہمراہ جہاد میں تھا اور اس نے وہ خدمت

لے یعنی ہندو اور مرتد ہونے سے

اور اعانت اسلام اور مسلمانوں کی کی تھی، جس کا اعتراف صحابہ نے حضور کی جناب میں ان الفاظ سے کیا:

مَا لِحِزَانِنَا الْيَوْمَ أَحَدٌ مَا لِحِزَانِ أَفْلَانِ تَنَاجَى دُنْ هِمَّ مِمَّ سَ كَوْنِي سَمِي إِسَاكَافِي نِيَسْ هُوَا
جیسا کہ افلان آدمی ہوا ہے۔

مگر لسان نبوت سے، باوجود ان خدمات جلیلہ کے، ارشاد ہوا، لَمَّا إِنَّهُ مِنْ أَهْلِ النَّارِ، وہ دوزخی ہے، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ:

إِنَّ اللَّهَ يُؤَيِّدُ هَذَا الدِّينَ بِالزَّجَلِ بے شک حق تعالیٰ اس دین کو مدد پہنچا دیتا ہے
الْفَجْرِ۔ بد معاش آدمی سے۔

اور جامع صغیر میں حدیث ہے کہ۔

سَيُشَدُّ هَذَا الدِّينَ بِرِجَالٍ لَيْسَ قَرِيبٌ بِهِ كَ اس دین کی تائید اور تقویت لے
لَهُمْ عِنْدَ اللَّهِ خَلْقٌ۔ لوگوں کے ذریعے سے جو جابجی جن کیسے خدا کے یہاں
(والسراج المنیر، شرح الجمع الصغیر) کوئی دقت نہیں۔

اور عبد اللہ بن عمرؓ نے ایک ایسی جماعت کے متعلق، جو قرآن کو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رب کو مانتی تھی صرف قدر کا انکار کرتی تھی، فرمایا۔

إِذَا الْقِيَتَ أُولَئِكَ فَلْيَبْرَهُمْ أَنِي جَب تَمَّ اَن سَ طَو تَوَكْبَهُ دَو كَمِي (عبد اللہ بن عمر
بُرِّي مِنْهُمْ وَلْتُمْ بَرَاءُ مِي رَضِيَ اللہ عَنْہُ، ان سے علامہ ہوں اور وہ ہم سے بے
وَالَّذِي يَحْلِفُ بِهِ عَبْدُ اللَّهِ بْنُ عَمْرِو بے تعلق ہیں، قسم ہے اس ذات کی جس کی قسم عبد اللہ
لَوْ أَنَّ لِأَحَدِهِمْ مِثْلَ أَحَدِ ذَهَبًا بن عمر کھا سکتا ہے، اگر ان میں سے کسی کے پاس
فَانْقَعَتْ، مَا قَبِلَ اللَّهُ مِنْهُ حَتَّى (پہاڑ) کے برابر سونا ہو، پھر وہ اسے خرچ کر ڈالے
يُؤْمِنُ بِالْقَدَرِ۔ تب بھی اللہ تعالیٰ ہرگز اسے قبول نہیں کرے گا۔

کہ وہ تقدیر پر ایمان لے آئے۔

ابو طالب سے بڑھ کر اسلام اور پیغمبر اسلام کی حمیت اور اعانت ایسی نازک ترین ساعت میں کس نے کی ہوگی۔ لیکن وہ ساری خدمات اور جان بازیاں بھی

اس کو ضوطح نار سے نہ بچا سکیں، روایات بالا کو پڑھ کر کس کی ہمت ہے کہ قادیانیوں کی محض نام نہاد خدمات اسلامیہ کو دیکھ کر ان کے مومن یا ناجی ہونے کا فتویٰ دے دے اور ان کے عقائد کفریہ کی طرف کچھ التفات نہ کرے۔

عہد رسالت میں منافقین کا گروہ برابر اپنے کو مسلمان کہتا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر قسمیں کھا کر گواہی دیتا تھا، اللہ پر اور یوم آخر پر ایمان رکھنے کا اظہار کرتا تھا، مسجدوں میں مسلمانوں کے ساتھ ان کے قبلہ کی طرف منہ کر کے نمازیں پڑھتا تھا اور ان کا ذبیحہ بھی کھاتا تھا، لیکن اس پر بھی ان کو جھوٹا اور بے ایمان کہا گیا اور مسلمانوں کو ان کے مکائد سے بچتے رہنے کی ہدایت کی گئی کیوں کہ ان کے دوسرے قرآن و احوال اور مخاطبات سر یہ ان کے دعوائے ایمان کی تکذیب کرتے تھے، "ولتعرفنہم فی الحسن القول" اور ان کا دل ایمان سے خالی تھا اور وہ لوگ بھی ہمارے یہاں کہ پنجابی نبی کی امت کی طرح اندر ہی اندر اسلام اور مسلمانوں کی جبر کاٹتے رہتے تھے، فرق صرف اتنا ہے کہ پنجابی نبی اور اس کی امت نے تنگ ظرفی سے اسلام کے خلاف بعض عقائد کا اعلان بھی کر دیا اور اس لئے وہ منافق کے بجائے مرتد کے حکم کے تحت میں آگئے اور امیر افغانستان ان کو منافقین کی سی مہلت نہ دے سکے، اگر قادیانی پکلی منافقین میں شامل ہو کر افغانی حد و تعزیر سے بچنا چاہتی ہے، تو اس کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ وہ جہاراً اپنے عقائد کا اقرار کرنا چھوڑ دیں، پھر ان کے دلوں کا حال خدا کے اور یوم آخرت کے حوالے کر دیا جائے گا، غالباً مرزا محمود نے جو مشورہ تہمت اللہ کے واقع کے بعد اپنی پارٹی کو دیا ہے اس میں اسی نفاق کی تعلیم کی طرف ایک قدم اٹھایا ہے۔

محمد علی صاحب کو بڑی فکر اس کی ہے کہ اگر غلامے دیوبند قادیانیوں کو کافر بتلاتے ہیں، تو سنیوں کو شیعہ اور شیعوں کو سنی، مقلدوں کو غیر مقلد اور غیر مقلدوں کو مقلد، علی ہذا القیاس دیوبندیوں کو بریلوی، اور بریلویوں کو دیوبندی کافر قرار دیتے ہیں، اس صورت میں تو کوئی مسلمان نہ رہے گا اور ایک دوسرے کو مرتد سمجھ کر قتل لے مصلح، تار، لٹ ملائیہ طور پر۔

کر دیں گے، لیکن اول تو یہ دعویٰ ہی غلط ہے کہ ان میں سے ہر ایک فرقہ دوسرے کو کافر اور مرتد اور واجب القتل سمجھتا ہے، دوسرے واقعات آپ کے اس خطرے کی تردید کرتے ہیں، کیا اس وقت تک افغانستان میں تین مرتد قتل نہیں کئے گئے؟ پھر بھی خدا کے فضل سے کوئی موقع ایسا ہمیشہ نہیں آیا کہ کوئی مسلمان، محض فرضی جرم ارتداد پر کسی جگہ قتل کر دیا ہو اور اگر کسی جگہ زندہ ایسا کیلیا گیا، تو آپ دیکھ لیں گے کہ اس کا خون بحمد اللہ وقوتِ رنگ لے کر بدو نہ نہیں رہے گا۔

محمد علی صاحب کو ایسا لکھتے وقت اسلام کے نام اور اپنی نام نہاد، ملت کی شرم کرنی چاہئے، کیا وہ نہیں جانتے کہ مسلمان یہود و نصاریٰ کو اور وہ سب لوگ مسلمانوں کو کافر کہتے ہیں؟ تو کیا اس اختلاف کے وقت یہود و نصاریٰ کے کافر کہنے سے آپ کو اپنے مزعوم اسلام میں کچھ تردد ہو جاتا ہے، یا آپ کے ہاتھ میں کوئی معیار ایسا دیا گیا ہے، جس پر آپ اپنے اسلام اور ان کے کفر کو پرکھ سکتے ہیں؟ اسی طرح کیا قرآن و سنت نے کوئی معیار قبیح و محکم ہمارے ہاتھ میں ایسا نہیں دیا کہ ہم مدعیانِ اسلام کے اختلاف کے وقت ہر ایک کے کفر و ایمان کو اس پر پرکھ سکیں؟ تو صرف اتنا کہہ دینے سے کہ ہر ایک فرقہ دوسرے کو کافر و مرتد کہتا ہے، یہ فیصلہ نہیں کیا جاسکتا کہ ان میں کوئی کافر و مرتد نہیں، یا سارے کافر یا مرتد ہی ہیں؟ معاذ اللہ۔

خدا نے اگر تم سے نور ایمان چھین لیا ہے، تو کیا عام انسانوں کو جو نور فہم عطا ہوتا ہے، وہ بھی سلب کر لیا گیا ہے؟ تم کو بڑا غیظ ہے کہ جب مرزائی افغانستان میں قتل کئے جاتے ہیں، تو بالائی اور بہائی شاہ ایران کے حکم سے کیوں قتل نہیں کئے جاتے؟ یہ سوال، یا تو آپ کو کب ہندو لے سید محفوظ الحق سے کئے اور یا شاہ ایران اور شری کی پٹری منٹ سے اور یا ان ملعونین مرجومین سے، جو کابل کے قلم رو میں، اس علم کے بعد کہ وہاں خالص اسلامی مدد و تعزیر کی تلوار چمکتی رہتی ہے، ارتداد کا جھنڈا اٹھا کر گئے اور انجام کار آخرت سے پہلے دنیا میں بھی ان کو حق تعالیٰ کے غضب و انتقام کا مورہ دینا پڑا۔

کیا اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے؟

اب میں دوسرے مسئلے کی طرف آتا ہوں، وہ یہ کہ اسلام میں مرتد کی سزا کیلئے اور افغانستان کا فعل کس حد تک اصل قانون اسلام پر منطبق ہو سکتا ہے؟ اسلامی اصول کے موافق کسی مسئلہ شرعی کے اثبات کے لئے چار دلیلیں ہو سکتی ہیں۔ کتاب اللہ سنت رسول، اجماع مجتہدین، قیاس و استنباط، اگرچہ یہ ضروری نہیں کہ ہر مسئلے کا ثبوت چاروں طریقوں سے ہو اور نہ ہر ایک دلیل ہر مسئلے میں کارآمد ہو سکتی ہے، تلام مسئلہ زیر بحث (قتل مرتد) میں اتفاق سے چاروں دلیلیں جمع ہو گئی ہیں۔

چوں کہ بار بار کہا گیا ہے کہ قتل مرتد کا ثبوت، قرآن کریم سے پیش کر دیا جاتا ہے کہ مرزا صاحب کی نبوت، جس کے نہ ملنے سے مسلمان خارج از اسلام ہو جاتے ہیں، قرآن مدیث، اجماع وغیرہ سب کو چھوڑ کر صرف ایک دو صوفیوں کی ناتمام عبارتوں سے بھارت ثابت ہو جاتی ہے، اس لئے ہم نے یہ ہمہ وجوہ اتمام حجت کے ہے مناسب سمجھا ہے کہ اولاً مرتد کے بارے میں قرآن ہی کا فیصلہ سنایا جائے۔

مرتدین کے حق میں قرآن کا فیصلہ۔

یوں تو قرآن کریم کی بہت سی آیات ہیں، جو مرتد کے قتل پر دلالت کرتی ہیں لیکن ایک واقعہ جماعت مرتدین کے بہ حکم خدا قتل کئے جانے کا ایسی تصریح اور ایضاح کے ساتھ قرآن میں مذکور ہے کہ ڈرنے والوں کے لئے اس میں تاویل کی ذرا گنجائش نہیں، نہ وہاں محاورہ ہے، نہ قطع طریق، نہ کوئی دوسرا جرم، صرف ارتداد اور تنہا ارتداد ہی وہ جرم ہے، جس پر حق تعالیٰ نے ان کے بے دریغ قتل کا حکم دیا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی برکت سے بنی اسرائیل کو جب خدا نے فرعون کی غلامی سے نجات دی اور فرعون بنوں کی دولت کا مالک بنادیا، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک ٹھہرے ہوتے وعدے کے موافق حضرت ہارون کو اپنا ولیفہ بنا کر کوہ طور

پر تشریف لے گئے، جہاں آپ نے چالیس راتیں عداۃ عبادت اور لذت مساجد میں گزاریں اور تورات شریف آپ کو عطا کی گئی، اور تو یہ ہو رہا تھا اور ادھر سامری کی فتنہ پردازی نے بنی اسرائیل کی ایلہ بڑی جماعت کو آپ کے پیچھے راہ حق سے ہٹلایا وَأَضَلَّهُمُ السَّامِرِيُّ۔ یعنی سونے چاندی کا ایلہ بچھڑانا کر کھڑا کر دیا، جس میں سے کچھ بے معنی آواز بھی آتی تھی، بنی اسرائیل جو کئی صدیوں تک معصری بت پرستوں کی صحبت بلکہ غلامی میں رہے تھے اور جنہوں نے عبور بحر کے بعد بھی ایک بت پرست قوم کو دیکھ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہ بے ہودہ درخواست کی تھی کہ: اجْعَلْ لَّنَا إِلَهًا كَمَا لَهُمْ آلِهَةٌ، ہمارے لئے بھی ایسا ہی معبود بنادے جیسے ان کے معبود ہیں۔ سامری کے اس پھڑے پر مفتون ہو گئے اور یہاں تک کہہ گزرے کہ یہی تمہارا اور موسیٰ کا خدا ہے، جس کی تلاش میں موسیٰ بھول کر ادھر ادھر پھر رہے ہیں حضرت ہارون علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام کی جانشینی کا حق ادا کیا اور اس کفر و ارتداد سے باز آ جانے کی ہدایت کی۔

يَا قَوْمِ إِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهِ وَإِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمَنُ فَاتَّبِعُونِي وَاطِيعُوا أَمْرِي۔ اے لوگو! تم اس پھڑے کے سبب فتنے میں ڈال دیئے گئے ہو مالا لگ تمہارا پروردگار تمہارا رحمان ہے۔ تو تم میری پیروی کرو اور میری بات مانو۔

لیکن وہ اپنی اسی سخت مرتد حرکت پر جے رہے بجائے توبہ کے یہ کہا کہ: لَنْ نَبْرَحَ عَلَيْهِ عَاكِفِينَ حَتَّىٰ يَرْجِعَ إِلَىٰ بَنِي إِسْرَءِيلَ۔ ہم برابر اپنے اس فعل پر جے رہیں گے یہاں تک کہ خود موسیٰ علیہ السلام ہماری طرف واپس آئیں۔

ادھر حضرت موسیٰ کو پروردگار نے اطلاع کی کہ تیری قوم تیرے پیچھے فتنہ (ارتداد) میں پڑ گئی وہ غصے اور غم میں بھرے ہوئے آئے اور اپنی قوم کو سخت سست کہا حضرت ہارون سے بھی باز پرس کی سامری کو بڑے زور سے ڈانٹا اور ان کے بتاتے ہوئے معبود کو جلا کر رکھ کر دریا میں پھینک دیا، یہ سب ہوا، لیکن ان مرتدین کی نسبت خدا کا فیصلہ رہا، جنہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پیچھے گوسالہ برستی

اختیار کر لی تھی، تو دنیا میں تو ان کے لئے خدا کا فیصلہ یہ تھا۔

إِنَّ الَّذِينَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ
سَيُنَالِهِمْ غَضَبٌ مِّن رَّبِّهِمْ
وَذَلَّةٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَكَذَلِكَ
نَجْزِي الْمُفْتَرِينَ (اعراف ۱۵۲)

جنہوں نے بچڑے کو معبود بنایا، ضرور ان کو دنیا
میں ذلت اور خدا کا غضب پہنچ کر رہے گا اور
مفترین کو ہم ایسی ہی سزا دیتے ہیں۔

اور اس غضب و ذلت کے اظہار کی صورت عبادِ عجل کے حق میں یہ تجویز ہوئی
جو سورۃ بقرہ میں ہے۔

أَنكُم ظَلَمْتُمْ أَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ
الْعِجْلَ فَتُوبُوا إِلَىٰ بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوا
أَنْفُسَكُمْ (بقرہ ۵۴)

اے قوم بنی اسرائیل! تم نے بچڑے کو معبود بنا کر
اپنی جانوں پر ظلم کیا، تو اب خدا کی طرف رجوع
کر دو پھر اپنے آدمیوں کو قتل کرو۔

اور فاقتلوا أَنْفُسَكُمْ میں أَنْفُسَكُمْ کے معنی وہی ہیں، جو أَنْفُسَكُمْ قَتَلْتُمْ
أَنْفُسَكُمْ میں ہیں، اور قتل کو اپنے اصلی اور حقیقی معنی سے (جو ہر طرح کے قتل کو خواہ
لوہے سے ہو، یا پتھر سے، شامل ہے، پھرنے کی کوئی وجہ موجود نہیں، بلکہ غضب اور
ذلت فی الحیوۃ الدنیا کا لفظ اس کے نہایت ہی مناسب ہے، اور یہی غضب کا لفظ
دوسری جگہ عام مرتدین کے حق میں بھی آیا ہے، جیسا کہ فرماتے ہیں: مَنْ كَفَرُوا بِاللَّهِ
مِنْ بَعْدِ إِيمَانِهِ إِلَّا مَنْ أَكْرَهَ وَقَلْبُهُ مُطْمَئِنٌّ بِالْإِيمَانِ، وَلَكِنْ مَنْ شَرَحَ
بِالْكُفْرِ صِدْرًا فَعَلَيْنَاهُمْ غَضَبًا مِّنَ اللَّهِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ (نحل ۱۰۶)۔
اس حکم کا نتیجہ، جیسا کہ روایات میں ہے، یہ ہوا کہ کئی ہزار آدمی جرم ارتداد میں
خدا کے حکم سے موسیٰ علیہ السلام کے سامنے قتل کئے گئے اور صورت یہ ہوئی کہ قوم
میں سے جن لوگوں نے بچڑے کو نہیں پوجا تھا، ان میں سے ہر ایک نے اپنے اس عزیز
و قریب کو، جس نے گویا سہارے کی تھی، اپنے ہاتھ سے قتل کیا اور جیسا کہ بعض روایات
میں آیا ہے، قاتلین کا اپنے عزیزوں کو اپنے ہاتھوں سے قتل کرنا، اس کی سزا تھی کہ
انہوں نے اپنے آدمیوں کو ارتداد سے روکنے میں کیوں تساہل کیا۔

یہ واضح رہے کہ یہ مقتولین، سزائے قتل دیئے جانے سے قبل ایک طرح کی توبہ بھی کر رہے تھے جیسا کہ فرمایا ہے۔

ولما سقط في ايديهم وراوا
لنهم قد ضلوا، قالوا: لئن
لم يرهمنا ربنا ويغفر لنا لكونن
من الخاسرين۔ (اعراف ۱۳)

اور جب وہ نادام ہوئے اور معلوم کر لیا کہ وہ
رستے سے بھٹک گئے ہیں، تو کہنے لگے کہ اگر ہمارا
پروردگار ہم پر رحم نہ فرمائے گا اور ہم کو نہ بخشتے گا،
تو ہم ضرور خسارہ اٹھانے والوں میں سے ہونگے

لیکن اس توبہ نے بھی ان کو دنیا کی عقوبت سے نہیں بچایا۔ جیسا کہ اب بھی بعض اقسام مرتد کے متعلق علما کا یہی فتویٰ ہے کہ وہ توبہ کے بعد بھی فدا قتل کسے جلتے گا۔ خواہ توبہ، آخرت کے عذاب کو اس سے اٹھامے، اسی طرح گویا لبریتوں سے بھی اگرچہ دنیا میں فدا کی تحریر ساقط نہیں ہوتی، لیکن قتل کئے جانے کے بعد خدا نے احکام آخری کے اعتبار سے ان کی توبہ کو قبول فرمایا اور ان قاتلین کی بھی جنھوں نے اپنے اقربا کے ارتداد کے معاملے میں مہارت کی تھی۔

ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ مِّنْ دَارِكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ
الرَّحِيمُ. (بقرہ ۵۴)

یہ تمہارے خالق کے یہاں تمہارے حق میں بہتر ہے
پھر خدا نے ان کی توبہ قبول کر لی، کیونکہ وہ توبہ
قبول کرنے والا مہربان ہے۔

محمد علی صاحب جن کی تفسیر پر مرثیوں کو بٹانا زہے، لکھتے ہیں کہ: سینلہم
غَضَبٌ مِنْ رَبِّهِمْ وَذَلَّةٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَكَذَلِكَ نَجْزِي الْمُفْتَرِينَ
کے بعد وَالَّذِينَ عَمِلُوا السَّيِّئَاتِ ثُمَّ تَابُوا مِنْ بَعْدِهَا وَآمَنُوا أَنْ رَبَّهُمْ
بَعْدَ مَا لَعَنُوا رَحِيمًا ۖ وَاقْعُ هَبْ، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ توبہ کے بعد جبرم معاف
ہو جاتا ہے۔ لیکن ان کو یاد رکھنا چاہئے کہ جو مبدتوبہ کے بعد بھی خدا یا تعزیراً قتل
کیا جاتے، جیسا کہ عبادِ غل کے گئے تھے، اُس کے حق میں یہ معافی کی آیت اسی ہے،
جس طرح سارق کے بارے میں وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوا أَيْدِيَهُمَا
جزاءً بِمَا كَسَبَا ۖ تِلْكَ آيَاتُ اللَّهِ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ کے بعد فَمَنْ

تَابَ مَنْ بَعْدَ ظُلْمِهِ وَأَصْلَحَ، فَإِنَّ اللَّهَ يَتُوبُ عَلَيْهِ، إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ اس معافی کی طرف اشارہ ہے، اگرچہ سرقہ کی سزا دنیا میں اس سے ساقط نہیں ہوتی۔

الحاصل، واقعہ عجل سے یہ بات بہ خوبی واضح ہو گئی کہ مرتدین کی ایک جماعت کو جس کی تعداد ہزاروں سے کم نہیں تھی، حق تعالیٰ نے محض ارتداد کے جرم میں ثابت اہانت اور ذلت کے ساتھ قتل کر دیا اور ارتداد بھی اس درجے کا قرار دیا گیا کہ توبہ بھی ان کو خدائی سزائے محفوظ نہ کر سکیں، بلکہ توبہ کی مقبولیت بھی اس صابرانہ مقبولیت پر مرتب ہوئی۔

کہا جاسکتا ہے کہ یہ واقعہ موسوی شریعت کا ہے، امت محمدیہ کے حق میں اس سے تمسک نہیں کیا جاسکتا؛ لیکن آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ پہلی امتوں کو جن خرائج اور احکام کی ہدایت کی گئی ہے اور قرآن نے ان کو نقل کیا ہے، وہ ہمارے حق میں بھی معتبر ہیں اور ان کی اقتدا کرنے کا امر ہم کو بھی ہے، جب تک کہ خاص طور پر ہمارے پیغمبر یا ہماری کتاب اس حکم سے ہم کو علاحدہ نہ کر دیں، چند ابنیہ و مرسلین کے تذکرے کے بعد جن میں حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی ہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطا ہوا کہ:

أُولَئِكَ الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ فَبِهِدَاهُمْ أَتْبَعُهُ (انعام ۹۰) آپ بھی ان کی ہدایت پر چلے۔

یہ خطاب فی الحقیقت ہم کو سنانا ہے، خود محمد علی صاحب اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ، "قرآن شریف میں کسی انسان کا ذکر ہو یا کسی قوم کا، سب مسلمانوں کی تعلیم کے لئے ہے، (دیوان القرآن ص ۵۴) پس اسی قاعدے سے، بنی اسرائیل کے مرتدین کو قتل کئے جانے کے حکم میں بھی تعلیم ہم مسلمانوں کو ہوگی۔

مرتد کا فیصلہ، سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

خصوصاً جب کہ دوسری آیات کی معیت میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کا عام و تمام فیصلہ بھی (جو لتبیین للناس ما نزل الیہم) میں داخل ہے، یہی کہ من بدل دینہ فاقتلوه (صحیح بخاری) جو اپنا دین بدلے۔ اسے قتل کر دو۔ محمد علی صاحب نے بخاری کی اس حدیث کے ساتھ خوب ٹھٹھا کیا ہے اور اس طرح اپنے دل کی گندگی کو بڑھایا ہے کہتے ہیں کہ یہاں دین سے کیا مراد ہے؟ کیا ہر ایک دین کو بدلنے والا واجب القتل ہے؟ تو یہودی سے نصرانی یا ہندو سے عیسائی۔ وہ بھی واجب القتل ہوگا؟ کیا محمد علی صاحب ایمان سے کہہ سکتے ہیں کہ جب وہ یہ لکھ رہے تھے، خود ان کا ضمیر اندر سے ان پر لعنت نہیں کر رہا تھا؟ کیا واقعی طور پر وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی ایک لفظ کا بھی کوئی ایسا مطلب لینا جائز سمجھتے ہیں کہ جس سے یہ لازم آتا ہو کہ ہر شخص جو اپنا پرانا مذہب چھوڑ کر اسلام میں آتا جائے، اسے تم قتل کرتے جاؤ؟ یہاں تو آپ معنی ڈالنے میں سوارش دیا تہ سے بھی گفے سبقت لے گئے؛ جس وقت آپ کے دل میں یہ سوال آیا تھا کہ حدیث میں جو مسلمانوں کو خطاب ہے مَنْ بَدَّلَ دِينَهُ فَاقْتُلُوهُ، اس میں کون سا دین، خدا کے رسول کی مراد ہے؟ تو اس کے جواب میں قرآن کی آواز پر کان دھرا ہوتا، جو کہتا ہے کہ "إِنَّ السَّيِّئِينَ عِنْدَ اللَّهِ إِلَّا سَلَامٌ" (بلاشبہ دین تو اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے) ومن یتبع غیر الاسلام دینا، فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ (اور جو کوئی اسلام کے سوا اور دین کی تلاش کرے، تو وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا) مگر آپ کے دل میں تو وہ خدا کا دین ہے ہی نہیں، اس لئے آپ مجبور ہیں کہ کافروں کے دین کی طرف جائیں، الْإِنَّمَا يُتَرَشَّعُ بِمَا فِيهِ۔

ہر حال، حدیث صحیح نے مرتد کے معاملے میں، خواہ وہ ہر سچا کار ہو یا نہ ہو، فیصلہ کر دیا کہ وہ واجب القتل ہے، اور لطیف یہ ہے کہ حضور نے کمال بلاغت سے مَنْ إِذْ قَدْ عَنِ دِينِهِ، نہیں فرمایا کہ شاید کسی کو شبہ ہو تا کہ یہ صرف اس کے حق میں ہے جو مثلاً یہودیت وغیرہ کسی مذہب باطل کو چھوڑ کر اسلام میں آیا تھا، پھر ادھر ہی لوٹ گیا، بلکہ مَنْ بَدَّلَ دِينَهُ فرمایا کہ واجب القتل ہونے کے لئے خدائی دین کو تبدیل

کرنا کافی ہے، ضرورت نہیں کہ جس مذہب سے آیا تھا، اس میں لوٹ کر جلتے۔
خُدائے عزوجل اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم
دونوں کا فیصلہ مرتد کے متعلق۔

یہاں تک تو آپ نے مرتد کے بارے میں خدا اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا الگ الگ فیصلہ سنا، اب ایک جاتی بھی سن لیجئے۔
 حضرت ابو موسیٰ اشعری اور معاذ بن جبل رضی اللہ عنہما پیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن کا علاقہ تقسیم کر دیا تھا، دونوں اپنے اپنے حلقے میں کام کرتے تھے ایک دفعہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ، ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کے پاس بغرض ملاقات آئے، دیکھا کہ ایک شخص ان کے پاس بندھا کھڑا ہے، دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ مرتد ہے یعنی پہلے یہودیت سے اسلام لایا پھر یہودی بن گیا، حضرت ابو موسیٰ نے معاذ سے کہا کہ تشریف رکھیے، انہوں نے کہا کہ میں، میں اس وقت تک نہ بیٹھوں گا جب تک یہ قتل نہ کر دیا جائے، تین مرتبہ یہی گفتگو ہوتی۔ معاذ بن جبل نے فرمایا: قضاء اللہ ورسولہ یعنی یہ اللہ کا اور اس کے رسول کا فیصلہ ہے، چنانچہ وہ قتل کر دیا گیا۔
 (صحیح بخاری)۔

زنادقہ کے متعلق حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا فیصلہ۔

یہ تو آپ نے ان دو صحابیوں کا ذکر سنا، جو غالباً آپ کے خیال میں علانے دیوبند سے بھی زیادہ تنگ نظر ہوں گے، اب نبی کے جو تھے خلیفہ، حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی (بہ قول آپ کے) تنگ نظری بھی ملاحظہ کیجئے۔
عن عکرمۃ قال: أتت عیالی بزنادقۃ فأخبرتهم حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے پاس چند زنادقہ لائے گئے۔

فَبَلَغَ فَلَكَ ابْنُ عَبَّاسٍ فَقَالَ: لَوْ كُنْتُ أَنَا، لَمْ أَخْرِقْهُمْ لَنَهَى رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
 انہوں نے ان کو جلا دیا، یہ خیر ابن عباس کو پہنچی انہوں نے فرمایا کہ اگر میں ہوتا تو ان کو جلا نہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ

لَا تَعَذِّبُوا بِعَذَابِ اللَّهِ وَلَقَدْ قَتَلْتَهُمْ
 يَقُولُ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ
 وَسَلَّمَ مَنْ بَدَّلَ دِيْنَهُ
 فَأَقْتُلُوهُ (صحیح بخاری)

اللہ لعناب (آگ) سے کسی سزا امت دو ماہیت
 میں ان کو قتل کرنا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ
 وسلم نے فرمایا کہ جو اپنا دین تبدیل کرے اسے
 قتل کر دو۔

حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں روایات نقل کی ہے جن میں تصریح ہے کہ یہ نہایت
 مرتدین تھے پھر بعض علماء کا قول نقل کیا ہے کہ:

وَمِنْ الزَّانِدَةِ الْبَاطِنِيَّةُ
 وَهُمْ قَوْمٌ زَعَمُوا أَنَّ اللَّهَ خَلَقَ
 شَيْئًا ثُمَّ خَلَقَ مِنْهُ شَيْئًا آخَرَ
 فَذَبَرُوا الْعَالَمَ بِأَسْرِهِ وَيَسْتَمُوا
 الْعَقْلَ وَالنَّفْسَ إِلَى قَوْلِهِ وَلَهُمْ
 مقالات سخيفة في النبوات و
 تحريف الآيات وفساد
 العبادات (فتح الباری ص ۱۲۵۴)

اور زنادقہ میں ہی سے باطنیہ فرقہ ہے (جن کے
 خیالات تخیلی عالم کی نسبت نقل کرتے کے بعد
 فرماتے ہیں کہ) نبوات اور تحریف آیات و عبادات
 میں ان کے اقوال نہایت نامعقول ہیں۔

اس سے ظاہر ہوا کہ جس کو فقہاء زندقہ کہتے ہیں، وہ مرتد ہی ہے اور زنادقہ و مرتدین کا
 حکم آپ کو معلوم ہو چکا۔

قتل مرتد کا فیصلہ اجماعِ ائمہ الاسلام سے

قرآن و سنت کے بعد تمام ائمہ اسلام کا متفقہ فیصلہ بھی قتل مرتد کے متعلق سن
 لیجئے، امام عبد الوہاب شمرانی، میزانِ کبریٰ میں تحریر فرماتے ہیں۔
 وَقَدْ اتَّفَقَ الْأَئِمَّةُ عَلَى أَنَّ
 مَنْ ارْتَدَّ عَنِ الْإِسْلَامِ، وَجِبَ
 قَتْلُهُ وَعَلَى أَنَّ قَتْلَ الزَّانِدِ يَنْبَغِي

اور تمام ائمہ کا اس پر اتفاق ہو چکا ہے کہ جو شخص
 اسلام سے پھر ملے بازِ ندیقہ ہو، اس کا قتل واجب
 ہے اور زندقہ وہ ہے جو اندوختی کفر کے باوجود

ولجب، وهو الذی یسر الکفر اسلام سے مظاہرہ کرتا ہے۔

وینتظاہر باسلام (میزان ص ۱۶۵ ج ۲)

اس عبارت کو پڑھ کر یہ آیت بھی تلاوت فرمائیے۔

وَمَنْ يُشَاقِقِ الرَّسُولَ
مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَى
وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمَوْمِنِينَ
نُؤَلِّهِ مَا تَوَلَّى وَنُصْلِهِ جَهَنَّمَ
وَسَاءَتْ مَصِيرًا - (نار ۱۱۵)

اور جس کسی نے رسول کی مخالفت کی ہدایت ظاہر ہو جانے کے بعد اور مومنین کے راستے کے سوا کسی اور راستے پر چلا، تو اس کو حوالے کریں گے اس شخص جس کو وہ اختیار کرتا ہے اور داخل کریں گے دوزخ میں اور وہ برا ٹھکانہ ہے۔

قتل مرتد کے متعلق قیاس شرعی اور عقل سلیم کا کیا حکم ہے؟

چوں کہ مضمون اندازے سے زیادہ طویل ہوتا جا رہا ہے، اس لئے قرآن، سنت اجماع پیش کرنے کے بعد چند الفاظ حافظ ابن القیم کے نقل کرتا ہوں، جن سے معلوم ہوگا کہ کافر، حربی، اور مرتد کا قتل کیا جانا عقل سلیم اور قیاس صحیح کا اقتضا ہے فرماتے ہیں۔

فَأَمَّا الْقَتْلُ، فَجَعَلَهُ عَقُوبَةً
أَعْظَمَ الْجَنَایَاتِ، كَالْجَنَایَةِ عَلَى
الْأَنْفُسِ، فَكَانَتْ عَقُوبَةً مِنْ
جَنْسِهِ، وَكَالْجَنَایَةِ عَلَى السَّيْفِ
بِالطَّعْنِ فِيهِ وَالْإِرْتِدَادَ عَنْهُ
وَهَذِهِ الْجَنَایَةُ أَوْلَى بِالْقَتْلِ، وَكَفَّ
عِدْوَانِ الْجَانِ عَلَيْهِ مِنْ كُلِّ
عَقُوبَةٍ، إِذْ بَقَاؤُهُ بَيْنَ أَظْهَرِ عِبَادِهِ
مُفْسِدَةٌ لَهُمْ، وَلَا خَيْرَ يُرْجَى فِي
بَقَائِهِ وَلَا مَصْلَحَةَ فَإِذَا احْبَسَ

خلاصہ مطلب: خدا تعالیٰ نے کئی طرح سزائیں مقرر کی ہیں ان میں سے قتل سب سے بڑے جرم کی سزا ہو سکتی ہے، مثلاً کسی بے گناہ کو ہلاک کر دینا، یا کسی عورت کی آبروریزی کر کے منہ کالا کر دینا، یا دین حق پر طعن کرنا اور اس سے پھر جانا اور جب قتل عمد کی سزا قتل ہے، تو دین برباد کرنے کی سزا بطریق اولیٰ قتل ہونی چاہئے، کیونکہ ایک نفس کا ہلاک، دین کی تباہی سے زیادہ قبیح نہیں ہے، پس اس شخص کا وجود جو دین حق پر طعن کرے یا اس سے پھر جائے، مسلمانوں کی جماعت کے

شرہ وأمسك لسانه وكف
أفاه والتزم الذل والصفار
وجبرهان أحكام الله ورسوله
عليه وأداء الجزية. لَمْ يَكُنْ
فِي بَقَائِهِ بَيْنَ أَظْهَرِ الْمُسْلِمِينَ
مَنْرَرٍ عَلَيْهِمُ وَالْثَنِّيَّابِلَاغِ وَ
مَتَاعٍ إِلَى حِينٍ، وَجَعَلَهُ أَيْضًا عَقُوبَةَ
الْجَنَابَةِ عَلَى الْفَرْجِ لِلْحَرَمَةِ
لِخَافِهَا مِنْ الْمَفَاسِدِ الْعَظِيمَةِ

وَلِحَتْلَاطِ الْإِنْسَابِ وَالْفَسَادِ الْعَامِ۔ (اعلام الموقعین، ص ۲۶۱۸ ج ۲)
یہاں تک ہم نے اولہ اربعہ سے قتل مرتد کا یہ قدر کفایت ثبوت پیش کر دیا ہے
اور اگر ضرورت محسوس ہوئی تو آئندہ اس کی مزید تشریح کی جلتے گی یہ بات رہ گئی کہ
بعض لوگوں نے قرآن کی وہ آیات پیش کی ہیں جن میں مرتد کے اعمال ضبط ہونے
یا ان پر لعنت برسنے یا آخرت میں غضب اور عذاب ہونے کا ذکر ہے ان آیات میں
ساتھ کے ساتھ اس کے قتل کئے جانے کا حکم مذکور نہیں، لیکن اس کو تو غالباً مراثیوں کو
بھی تردد نہ ہوگا کہ قتل عمد کی سزا اسلام میں قتل ہے، پر حق تعالیٰ نے جس جگہ قرآن میں
یہ فرمایا ہے۔

وَمَنْ يُقْتَلْ مُؤْمِنًا مَنَعِمًا دَا
فَجَزَاءُ جَهَنَّمَ خَالِدًا فِيهَا. وَ
غَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَلَعْنَةُ وَأَعْدَاةُ
عَذَابًا عَظِيمًا. (نار ۹۳)
اور جو شخص کسی مسلمان کو قتل کرے گا،
تو (آخرت میں) اس کی سزا جہنم ہوگا جس
میں ہمیشہ رہنا ہوگا اور اس پر اللہ
غضب اور لعنت کریگا۔ ایسے شخص کے بعد
نے مذاب عظیم تیار کر رکھا ہے۔

تو اس کا بدلہ صرف یہ قرار دیا ہے کہ اس کو دوزخ میں غلود ہوگا اور اللہ کا غصہ اور اس

کی لعنت اس پر ہے اور خدا نے اس کے لئے نرا عذاب تیار رکھا ہے، تو کیا اس جگہ صرف اخروی سزا مذکور ہونے سے مرزاتوں کے مایہ ناز مفسر کے تردید کا قائل کو بھی دنیا میں آزاد چھوڑ دیا جائے گا، اگر کوئی آپ کی قرآن، فہمی اور نکتہ بندی ہے تو اپنے نام نہاد اسلام اور اس کے فلسفے کو آپ دنیا میں خوب نیک نام کر سگے، اور اگر آپ قائل کی نسبت فیصلہ کرنے میں آیت مذکورہ کے ساتھ قرآن کی دوسری آیات کو بھی ملائیں تو مرتد کے متعلق فیصلہ کرتے وقت ایسا کرنے سے کیا چیز مانع ہے؟ آپ کتنی ہی کوشش کیجئے اور احادیث و آثار سے بھاگ کر قرآن کی پناہ لیجئے، مگر قرآن آپ کو ضرور دھکے دے گا اور آپ کی جیلِ فاسدہ کے منہ پر ٹہلنے مارے گا کیونکہ رسول سے بھاگنے والے کے واسطے خدا کے یہاں کوئی پناہ نہیں ہے۔

مرتد کی نسبت اسلامی حکومت کا فیصلہ۔

قرآن، حدیث، اجماع، قیاس کے فیصلوں کے بعد ایک خالص اسلامی حکومت (افغانستان) کا فیصلہ بھی وہی ہونا تھا، جو ہوا، لیکن جب سے دولت علیہ افغانیہ کی سب سے بڑی شرعی عدالت نے نعمت اللہ قادیانی کو اس کے ارتداد کے جرم میں جہاں ذلت اور رسوائی کے ساتھ قتل کر دیا ہے، مرزائی امت نے اس خالص اسلامی قانون کی تنقید اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک سنت کے احیاء کے خلاف سخت شور و ہنگامہ مپا کر رکھا ہے کبھی وہ افغانستان کے مقابلے پر امریکہ اور یورپ کو ابھارتے ہیں، کبھی ہندوؤں سے فریاد کرتے ہیں، کبھی آزاد منشی لیڈروں کو اکسائے جاتے ہیں اور سب سے آخر میں رائے عامہ سے لبرل کی جاتی ہے، لیکن ان کو یاد رکھنا چاہیے کہ قتل مرتد کا قانون نہ تو یورپ و امریکہ کی حکومتوں کا بنایا ہوا ہے اور نہ کانگریس یا کسی اور دہنوی انجمن کی متعظم کمیٹی سے اس کی منظوری میں رائے لی گئی ہے اور نہ ہی سلک کے غوغا سے مامیاد و ثروں کی کثرت کو اس کے پاس کتے ملنے میں کچھ دخل ہے، وہ تو ایک آسمانی فیصلہ ہے جو خدا کے ان وفادار بندوں کے

ہاتھوں سے نفاذ پذیر ہوتا ہے جن کی نسبت قرآن حکیم میں یہ ارشاد ہوا ہے۔

فَسَوْفَ يَأْتِي اللَّهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ أَذِلَّةٌ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَمِيزَةٌ عَلَى الْكَافِرِينَ يَجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ ذَلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَن يَشَاءُ اللَّهُ وَهُوَ غَنِيٌّ بِمَا يُعْطِي

تو قریب ہے کہ خدا لائے گا ایسی قوم کو جن کو وہ محبوب رکھتا ہے اور وہ خدا کو محبوب رکھتی ہے کافروں کے مقابلے میں غالب اور مومنین کے مقابلے میں خاکسار جو جہاد کرے گی خدا کے راستے میں اور کسی طاعت کرنے والے کی طاعت سے نہ ذریعگی یہ خدا کا فضل ہے جس کو چاہے۔

اور وہ ایک فرمان رسالت ہے جن کا امثال انہی سعید رجوں کا حصہ ہے جن کو حق تعالیٰ نے اپنے باغیوں کی سرکوبی کے لئے جہاں میں سے چن لیا ہے اور جن کو اس نے محض اپنے افضال سے اُمیدوار علی اللہ رحمۃ اللہ علیہم کا تمغہ مرحمت فرمایا ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ اس دورِ حق میں جب کہ الحاد اور لامریت کی رف کے خلاف کوئی کام کرنے کی بہت سی کم جرات ہو سکتی ہے اعلیٰ حضرت امیر غازی زیدہ اللہ بعونہ و نصیرہ نے اس سُنّتِ سنّیہ زندہ کر کے بارگاہِ الہی اور قطبِ مومنین میں وہ عزت پیدا کر لی ہے جو انسانوں کی دی ہوئی اور بادشاہوں کی تسلیم کی ہوئی عزتوں سے بالاتر ہے۔ قاعدہ ہے کہ جو شخص جس گورنمنٹ کے قانون کو قبول کرتا اور اس کی حمایت کرتا ہے، اس کی پشت پر اس گورنمنٹ کی ساری طاقت ہوتی ہے پس ضرور ہے کہ جو بادشاہِ خدائی قانون کی حمایت اور تنقید کرے، خدائی طاقت اس کی حامی اور سرپرست ہو۔ اور اسی لئے ہم کو یقین رکھنا چاہئے کہ اعلیٰ حضرت امیر غازی جس وقت تک قانونِ الہی کو بلا خوفِ لومۃ لائم اپنا دستور العمل بناتے ہوں گے خدائی طاقت ان کو ہر شیطانی طاقت کے مقابلے میں مظفر و منصور کرے گی۔ فلن اللہ ھو مولاه و جبریل و صالح المومنین و الملائکۃ بعد ذلک ظہیر و تحکم

آج صلیح دار افغانستان نے اقامتِ مددِ دیا بسینہ سے قرنِ صحابہ کی یاد تازہ کر دی اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی روحِ مبارک کو خوش کرنے میں اس بات کی کچھ

پردہ انہیں کی کہ دنیا ان کو وحشی سمجھے گی یا جاہل، انہوں نے بڑی دلیری کے ساتھ اسلام کے حقیقی حسن و جمال اور قدرتی سادگی و خوب صورتی سے پردہ اٹھا دیا اور اس بناوٹی خوبصورتی اور مصنوعی رنگ و روپ سے اس کو بے نیاز کر دیا جس میں اسلام کے نادان دوست یا دانا دشمن اسے پیش کر رہے تھے۔

امیر کابل جیسے نمائندہ، خود اسلامی فرمان روا سے اسلام کی یہ خدمت کچھ زیادہ عجیب نہیں، لیکن تعجب اور تعجب سے زیادہ مسرت ہم کو اس بات پر ہے کہ غلام ہندوستان کے اسلامی اخباروں کو (جن میں معزز زمیندار اور سیاست خصوصیت سے قابل ذکر ہیں) حق تعالیٰ نے ایسی سیدھی سمجھ اور مومنانہ جرأت اور مصراط مستقیم پر چلنے کے لئے بصیرت کی روشنی عطا فرمائی ہے جس نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لاتے ہوئے اسلام کی اصلی ہیئت اور فتنہ عظیمہ مرزائیت کے کفریات اور بدنتائج کا مشاہدہ کرنے کے لئے غافلوں اور بے خبروں کی آنکھوں کے سامنے اجالا کر دیا ہے۔

مسلمان قوم کے حق میں یہ بڑی مبارک فال ہے کہ اس کے موقر اخبار، تجارتی مقاصد اور لومۃ لائمن کی پردہ نہ کر کے ٹھیک ٹھیک اسلامی تعلیمات لوگوں کے سامنے پیش کرے اور ان کی حمایت پر علی وجہ البصیرت کمر بستہ ہوں۔ ان اخباروں کی روش، افغانستان کے اس فعل کی تائید و تحسین میں، حق پرست مسلمانوں پر یہ ثابت کر رہی ہے کہ یہ اخبار محض کسب زر کا آلہ نہیں، بلکہ اسلام کے بہترین خادم ہیں جو چاہتے ہیں کہ حد سے بڑھے ہوئے آزاد مسلمانوں کے جذبات و محسوسات کی ٹرین کو کچھ پیچھے ہٹا کر اسی سیدھی لائن پر گھڑا کر دیں، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ نے عرب کی سرزمین پر بچھائی تھی۔

لاہوری پارٹی کے امیر (محمد علی صاحب) تو لکھتے ہیں کہ افغانستان کے اس فعل نے اسلام کی ترقی کو دس برس پیچھے ڈال دیا، مگر میں انہیں خوش خبری سناتا ہوں کہ دس برس نہیں، اس نے اولوالامر مسلمانوں کو نہایت ہی مہلک آئندہ کی طرف ترقی کرنے سے تیرہ سو سال پیچھے ہٹا دیا ہے، مرزائیوں کو بڑی فکر ہے کہ افغانستان کا یہ فعل جب زمیندار اور سیاست اس وقت کے دو مشہور اخبار ہیں۔

اسلام کی طرف منسوب ہوگا، تو غیر مسلم قومیں اسلام سے نفرت کرے لگیں گے در یہ سمجھ جاتیں گی کہ اسلام صرف تلوار کے زور سے قائم رکھا جاسکتا ہے اور یہ ایک بڑی روک اشاعتِ اسلام کے راستے میں ہوگی، لیکن قرونِ اولیٰ تجربہ ہم کو یہ بتلاتا ہے کہ جب صدیق اکبر اور دوسرے خلفاء کے عہد میں ارتداد کا فیصلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے موافق تلوار کے نوک سے کیا جاتا تھا، حتیٰ کہ بعض اوقات سر زمینِ غیب کا وسیع رقبہ مرتدین کے خون سے رنگین ہو گیا، اس وقت اشاعتِ اسلام کی رفتار ترقی اس قدر سریع اور حیرت میں ڈالنے والی تھی کہ جسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک عظیم الشان معجزے کے سوا اور کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

جیسا کہ تھوڑی دیر پہلے میں ثابت کر چکا ہوں، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے مَنْ بَدَّلَ دِينَهُ فَاقْتُلُوْهُ کی تعمیل میں ایک لمحے کا ٹوک بھی رہنا نہ رکھتے تھے، لیکن مرزائیوں کے لئے یہ کس قدر تعجب اور غصے کا مقام ہوگا کہ انہی صحابہ کے عہد میں بے شمار کفار اسلام کے حلقہ بہ گوش بنتے گئے، نہ تو وہ قتلِ حدین کو دیکھ کر اسلام سے بدگمان ہوئے اور نہ انہوں نے عاصیین اسلام سے نفرت کی، بلکہ وہ یہ دیکھ کر کہ مسلمان حکمرانوں کے زیر سایہ جہاں تمام یہود و نصارا اور دوسری غیر مسلم اقوام اس طرح آبادانہ زندگی بسر کرتے اور اپنے مذہبی وظائف کو بلا روک ٹوک بجالاتے ہیں، کسی مرتد کا بے دریغ قتل کیا جانا اس بات کی دلیل ہے کہ مسلمان صرف ایک ہی چیز کے خواہاں ہیں، اور وہ یہ کہ ان کے دین میں زہریلے جراثیم کی تولید نہ ہونے پلے اور کبھی ہو جائے تو اس کو ترقی اور تعدیہ کا موقع نہ ملے جراثیم ارتداد کا فنا کرنا فی الحقیقت بقیدِ سچے ایمان داروں کی حفاظت کرنا ہے، مرتد کا وجود، ایک جسمِ فتنہ ہے جس سے کم زور اور سادہ لوح مسلمانوں کے خیالات میں تشویش اور ان کے جذبات میں تلاطم پیدا ہو سکتا ہے۔

جو لوگ عہدِ رسالت میں اپنے آدمیوں کو آمنوا ہا لدی اَنْزِلَ عَلٰی الدِّیْنِ آمَنُوا وَخِصَّهُ النَّهَارُ وَاکْفَرُوا آخِرَہ کا مشورہ دیتے تھے، ان کی غرض بھی نفعِ تم

یہ سچ ہے، یہی تھی یعنی یہ کہ کچھ مصنوعی مسلمانوں کو اسلام سے پھرتے ہوئے دیکھ کر سچے مومنین کو بھی جھوٹ اور باطل کی طرف آنے کی ترغیب ہوگی، یا کم از کم یہ خیال کر کے کہ آخر کچھ تو وہ ہے کہ یہ لوگ اسلام قبول کرنے کے بعد اس سے منحرف ہو گئے ہیں ان کے دلوں میں بھی ایک طرح کا تردد اور تذبذب پیدا ہو جائے گا، اسی لئے اسلام نے ارتداد کے مہلک جراثیم کو تباہ کر ڈالنے کے لئے پوری قوت استعمال کرنے کا حکم دیا ہے بہتر ہے کہ مرتد کو اؤ لا سجداء، اس کے شبہات کا ازالہ کرو، اگر وہ خدا کی کھلی کھلی آیات دیکھنے اور واضح دلائل سننے کے بعد بھی اپنی معاندانہ ضد اور بٹ دھرمی پر قائم رہے اور اپنی ہوا، ہوس یا اوہام باطلہ کی پیروی سے باز نہ آئے، تو مسلمانوں کی جماعت کو اس کے زہریلے وجود سے پاک کر دو کہ تَبَيَّنَ دُشْدُ مِنَ الْغَيِّ کے بعد دین میں کوئی اکراہ نہیں، لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَيَحْيَىٰ مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ۔ ایک شخص اتفاقاً گھوڑے سے گر پڑا، ٹانگ ٹوٹ گئی، ہڈی کے ریزے ریزے ادھر ادھر گھس گئے، سول سرجن کا کام یہ ہے کہ ہڈی کو جوڑے، زخم صاف کرے، ہٹی باندھے اور مرہم لگاتے، لیکن اگر کسی تدبیر سے زخم مندمل نہ ہو سکے، بلکہ اس کے پلوں دوڑنے اور باقی ٹانگ کو بھی خراب اور مسموم کر ڈالے گا اندیشہ ہو، تو کیا اس وقت سول سرجن کا یہ ایک مشفقانہ فرض نہیں ہو جاتا کہ وہ ٹانگ کے مسموم حصے کو کاٹ کر پھینک دے اور اس فاسد عضو بدن پر یہ سمجھ کر زخم نہ کھلتے کہ گھوڑے سے گرنا اور ٹانگ ٹوٹ جانا اور زخم کا مندمل نہ ہونا اس کے اختیار میں نہیں تھا اس وقت سول سرجن کا فرض یہ دیکھنا نہیں کہ آیا مریض نے اپنے اختیار سے مرنے کو پیدا کیا ہے، یا بے اختیاری طور پر پیدا ہو گیا ہے، بلکہ اپنے اختیار کو دیکھنا ہے کہ جسے وہ مریض کے بقیہ اعضاء بدن کو بچانے کے لئے استعمال کر سکتا ہے۔

یاد رکھو کہ ارتداد ایک سخت زہر بلا مادہ ہے، جو جسم مسلم میں پیدا ہو جاتا ہے، خدا فی سول سرجن جب اس کی تحلیل یا اخراج کی تدبیر سے تھک جاتے ہیں، تو آخر الحیل التمیف کے قاعدے سے اس عضو فاسد کو کاٹ کر پھینک دیتے ہیں اور

وہ ایسا کرنے کے وقت خدا کی طرف سے ولا تاتخذکم بہملاؤفۃ فی دین اللہ اور واغفلظعیہم کے مخاطب ہوتے ہیں۔ کسی سخت آپریشن کا مشاہدہ کرنے سے بعض اوقات نازک دل عورتیں یا بعض ضعیف القلب مرد بھی غش کھا کر گر پڑتے ہیں لیکن اگر کوئی کمزور دل ڈاکٹر اس سے متاثر ہو کر آپریشن چھوڑ بیٹھے تو نہیں کہہ جاسکتا کہ وہ بڑا رحم دل ہے۔ بلکہ کہا جلتے گا کہ وہ اپنے منصب سے معزول کر دینے کے قابل ہے۔ ہم کو خدا کا بڑا شکر ادا کرنا چاہئے کہ اس نے موجودہ مجدد انخطاط امیر غازی خان اللہ خان اور ان سے پہلے ان کے والد مرحوم کو وہ اختیارات بخشے اور ان اختیارات کے استعمال کی توفیق مرحمت فرمائی، جو جسم مسلم کو نہایت ہی کمی آلائشوں سے پاک کرنے اور اصلاح پر لانے کے لئے ضروری تھے۔ اگر یہ فرض محال یہ صحیح بھی ہو کہ امیر مرزا کے اس فعل سے اشاعت اسلام میں کچھ رکاوٹ پیدا ہوئی ہے تو اس میں پھر بھی کوئی شبہ نہیں کہ حفاظت اسلام میں اس سے بڑی بھاری مدد ملے گی اور شدید قادیان کی کسی چوتھی بکری کو اب مدت تک یہ ہو س نہ ہوگی کہ علانیہ افغانیوں کے اسلام یا ان کی متحدہ قومیت میں سینگ مار کر کابل کے ذبیح خانے سے شہادت کا قرعہ حاصل کرے۔

مرزا محمود یوں یا محمد علی، ان کو چاہئے کہ وہ دُؤلِ یورپ یا سُرورِ جی ہندو مسلمانوں کو اتنا بے خوف نہ سمجھیں کہ وہ سب کے سب امیر کابل کو آپ کہنے سے اتنا سفاک اور جاہل سمجھ لیں گے کہ وہ دُؤلِ غیر کے تمام سفر اکو اس قدر مامون و مصون رکھنے اور ہندوؤں کو ہندوستانی ہندوؤں سے زیادہ آزادی اور طمانیت عطا کرنے کے باوجود، مشتق تیغ آزمائی یا جبر و اکراہ اسلام پھیلانے کے لئے قادیان کی ایک بکری دُفعت اللہ بمشیر جلا کر خوش ہوتے ہیں۔

کوئی شبہ نہیں کہ کسی آدمی کو عمدًا قتل کر ڈالنا بڑی سخت چیز ہے۔ مگر قرآن نے جس کو فتنہ کہا ہے۔ وہ قتل سے بھی بڑھ کر سخت ہے۔ وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ .. وَالْفِتْنَةُ الْكَبْرُ مِنَ الْقَتْلِ .. یہ فتنہ، دینِ حق سے ہٹنے یا ہٹائے جانے کا فتنہ ہے۔

جس پر واحد رھم ان یفتنواک عن بعض ما انزل اللہ الیک میں متنبہ کیا گیا ہے، اور جس کو حضرت ہارون علیہ السلام نے اپنی قوم کے مرتد کو سالہ پرستوں کو مخاطب کرتے ہوئے یا قوم انما فتنتم بہ سے تعبیر فرمایا تھا اور جو ان کفار کا ہمیشہ منطرح نظر رہتا ہے جن کی نسبت قرآن میں کہا گیا ہے۔ ووالو تکفرون کما کفروا، فتکونون سواء (وہ چاہتے ہیں کہ جن سے وہ خود کافر ہیں، تم بھی کافر ہو کر ان کی برابر ہو جاؤ) اور وَذَکْیَئِذْ مِّنْ أَهْلِ الْکِتَابِ لَیُؤْذُوْکُمْ مِّنْ بَعْدِ اٰیْمَانِکُمْ کُفَّارًا لَّحْسَدًا مِّنْ مِّمَّنْ دُفِنِیْہُمْ، (بہت سے اہل کتاب ازراہ حسد یہ آرزو رکھتے ہیں کہ تم کو ایمان لانے کے بعد پھر کافر بنالیں) اور وَلَا یُزَالُ سُوْنُ یُقَاتِلُوْکُمْ حَتّٰی یُرَدَّوْکُمْ عَنْ دِیْنِکُمْ اِنْ اَسْتَطَاعُوْا (اور وہ ہمیشہ تم سے اس لئے جنگ کرتے رہیں گے کہ اگر ان کا بس چلے تو تم کو تمہارے دین سے ہٹا دیں)

اسی فتنے کو روکنے اور مٹانے کے لئے وہ جارحانہ اور ملافاعانہ جہاد بالسیف شروع کیا گیا جس کا خیال مسلمانوں کے دلوں سے محو کرنے کے لئے لاہوری پارٹی کا لغوی اور محمودی پارٹی کا بروزی بنی مبعوث ہوا ہے پڑھو و قاتلوہم حتی لا یكون فتنۃ و یتکون الذین للہ، دشمنان اسلام سے اس وقت تک لڑو کہ فتنے کا وجود نہ رہے اور خدا کا دین ہی غالب ہو کر رہے (جیسا کہ لیٹظہرہ علی الذین کذبہ سے مفہوم ہوتا ہے) صحیح بخاری میں ابن عمر سے اور سنن ابن ماجہ میں عمران بن حصین سے منقول ہے کہ اس فتنے سے مراد ارتداد کا فتنہ ہے (دیکھو فتح الباری ص ۴۰ ج ۱۳)

اور اسی کی طرف اشارہ صحیح مسلم میں سعد بن ابی وقاص کی روایت میں موجود ہے۔ پس اسلام کا سارا جہاد و قتال، خواہ مجرم کی صورت میں ہو یا دفاع کی طرف مرتد بننے یا بنانے والوں کے مقابلے میں ہے، جس کی غرض یہ ہے کہ فتنہ ارتداد یا اس کے خطرے سے مومنین کی حفاظت کی جائے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مرتدین کا جو مجسم فتنہیں استیصال ہو اور مرتد بنانے والوں کے حملوں اور تدبیروں اور ان کی شوکت و قوت کو، جس سے وہ مسلمانوں کے ایمان کو موت کی دھمکی دے سکتے ہیں ہر ممکن

طریقے سے روکا جائے یا تو ناجائز، چنانچہ کفار اگر جزیہ دے کر اسلامی —
 رعایا بننے یا مسلمانوں کو امن میں آہلے یا با، محمی مصالحت اور معاہدے کی وجہ سے
 مسلمانوں کو عملاً مطمئن کر دیں کہ وہ ان کے دین میں کوئی ختمہ امتلازی نہ کر دیں گے
 اور ان کے غلبہ اور شوکت کی وجہ سے مسلمانوں کو مرتد نہ بننے جانے کا کوئی اندیشہ باقی
 نہ رہے گا، تو ایسی اقوام کے مقابلے میں مسلمانوں کو اختیار اٹھانا ناجائز نہیں۔

حتی یعطوا الجزیۃ عنی ۱۰ (توبہ ۲۹) یہاں تک کہ وہ جزیہ ادا کر دیں ہاتھ سے ذیل
 یدوہم صلحرون ۱۰ (توبہ ۲۹) ہو کر۔

وَإِذَا أَخَذُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۱۰ استجارتك فليجروا حتی یسمع
 کلام اللہ ثم ابلغه مامنہ (توبہ) کلام سننے، پھر اس کو اس کی امن کی جگہ پہنچا دو
 وَلَنْ يَجْنَحُوا إِلَيْكَ فليجرح ۱۰ اور اگر وہ صلح کے لئے جھکیں، تو تم بھی اس کے
 لہاؤ تو کُلُّ علی اللہ، فلن اعتزلکم ۱۰ لئے جھک جاؤ اور خدا پر بھروسہ کرو، پھر اگر
 فَلَمْ يقاتلواکم والقوا إِلَيْکُم ۱۰ وہ تم سے ملاصق رہیں اور نہ لڑیں اور صلح کی
 السَّلَامَ، فليجعلَ اللہ لکم ۱۰ سلسلہ جنبا ئی کریں، تو پھر اللہ تعالیٰ نے ان
 علیہم سبیلاً ۱۰ (نار ۹۰) کے مقابلے میں تم کو کوئی راستہ نہیں دیا، اور
 وَإِنْ نَكَثُوا أَيْمَانَهُمْ مِنْ بَعْدِ عَهْدِهِمْ ۱۰ اگر عہد و پیمان کے بعد اپنی قسمیں توڑ ڈالیں
 وَطَعْنُوا فِي دِينِكُمْ فَقَاتِلُوا أُمَّةَ الْكَفْرِ ۱۰ اور تمہارے دین پر زبان درازی کر کہہ لو کہ تو
 (توبہ ۱۲) تم کفر کے سرور و دل سے۔

پس جہاد بالسیف، خواہ مجبوری ہو (یعنی بطریق حفظ ما تقدم) یا دفاعی (یعنی بطریق
 چاہ ساز) صرف مومنین کے ایمانوں کے حفاظت کے لئے ہے اور یا ایک ایسا
 فطری حق ہے جس سے کوئی عقل مند اور مہذب انسان مسلمانوں کو محروم نہیں کر
 سکتا، اس لئے احکام جہاد کی نسبت جو قرآن میں بہ کثرت موجود ہیں، یہ نہیں جاسکتا
 کہ وہ لا اکرہ فی الدین اور افاقت تکبرہ الناس حتی یکنونوا مومنین

کے معارض ہیں، بلکہ کہا جائے گا کہ رین میں کوئی اکراہ نہیں، البتہ جو فتنے دین میں خنہ ڈالتے ہوں، ان کے روکنے میں ضرور اکراہ ہے، یعنی جہاں تک مسلمانوں کی طاقت میں ہوگا فتنے کو اجازت نہیں دی جائے گی کہ وہ مسلمانوں کی جماعت میں سر نکالے یا نشوونما پائے۔

اگر اسلام کی اسی حفاظت خود اختیاری کے معنی اس کا بہ زور شمشیر پھیلا یا جانا ہے تو میں اقرار کرتا ہوں کہ بے شک ایسی حفاظت کے لئے شمشیر استعمال ہوئی ہے اور برابر ان لوگوں کے ہاتھوں سے جنہیں خدا ایسی قوت اور توفیق بخشے گا، استعمال ہوتی ہے گی الجہاد ماضی الی یوم القیامۃ، خواہ قادیان کا متنبی اپنے قلم کی چوایوں سے کتنا ہی اس تلوار کی جھنکار کو پست کرنا چاہے۔

ہم بحمد اللہ خوب سمجھتے ہیں کہ اسلام کے بہت سے دانادشمنوں نے اس امر کی حمایت میں کہ اسلام بہ زور شمشیر نہیں پھیلا، موٹی موٹی کتابیں لکھی ہیں اور کیسی خوبصورتی اور دانائی سے ایک سچی بات کہہ کر دوسری سچی بات (جہاد بالسیف) کی ابمیت اور دلولے کو مسلمانوں کے دلوں سے محو کرنا چاہا ہے اور اسلام کے بہت سے نادان دوست بھی ان کی اس منافقانہ، ہم دردی کا شکار ہو گئے ہیں اور انھوں نے اپنی اصلاح کی قینچی سے مسئلہ جہاد کے بازو کترڈا لے دیں، لیکن یاد رکھئے کہ قبا ئین بالحق کا گروہ نہ تو کسی کی تجہیل اور تحقیق سے ڈرتا ہے اور نہ کسی کی مکاری اور چہر اساق سے ہستجتاب ہے، وہ بلا خوف تردید کہتا ہے کہ تم حقیقت جہاد سے جا ملے ہو اور خدا سے قدوس کی انتہائی وفاداری اور اس کی راہ میں شجاعانہ سرفروشی کو اگر تم وحشیانہ حرکت اور مذہبی دیوانگی سے موسوم کرتے ہو، تو ہم اپنی دیوانگی اور تمہاری فرزانگی کی نسبت مولانا رومی کی زبان میں صرف اتنا ہی کہہ سکتے ہیں۔

آزمودم عقل دور اندیش را بعد ازیں دیوانہ سازم خویش را

اوست دیوانہ کہ دیوانہ نہ شد اوست فرزانہ کہ فرزانہ نہ شد

بہر حال، قتل مرتد یا جہاد بالسیف کا حکم، مسلمانوں کو فتنے سے محفوظ رکھنے

کے لئے ہے، جس کا اول مخاطب امام صاحب اقتدار، حاکمِ جن ممالک میں مسلمانوں کا کوئی امام صاحب اقتدار نہ ہو، وہاں عام مسلمان اس قسم کے احکامات کو مکلف نہیں ہوں (جیسے ہندوستان، بنگالہ علیہ، ہندوستان کے مرتد یا غیر مسلم اقوام کو امت مسلمہ کے خلاف قتل سے خوف کھانے کی کوئی وجہ نہیں، بلکہ خود افغانستان کی غیر مسلم بنایا مستانیں کو بھی جیسا کہ مشاہدہ کیا جا رہا ہے، کوئی خطرہ نہیں۔

الذی پارتی کے امیر کی سمجھ میں ابھی تک یہ فلسفہ نہیں آیا کہ ایک ہندو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو نعوذ باللہ جھوٹا سمجھ کر حکومت افغانستان کے ماتحت آزاد ہے۔ ایک عیسائی یا یہودی آپ کو نعوذ باللہ مفتری قرار دے کر حکومت افغانستان کے کسی عہدے پر فائز ہو سکتا ہے۔ لیکن ایک مسلمان یہ کہہ کر فاطمہ البتین کے یہ معنی میں یہ نہیں دے یعنی فاطمہ البتین کا تاویل باطل کے پردے میں انکار کر کے واجبِ قتل ہو جاتا ہے۔

مجھے افسوس ہے کہ ایسی سیدھی اور روٹی سی بات امیر جماعت احمدیہ کی سمجھ میں کیوں نہیں آتی، کروڑوں انسان جو برٹش قلم روئے باہر رہتے ہیں اور انھوں نے آج تک انگریزوں کی حکومت اپنے اوپر قبول نہیں کی، آزادیوں کے چوچا یہ قانون اپنے لئے بنائیں اور جس طرز سے چاہیں، زندگی بسر کریں، انگریزی حکومت کو ان سے کوئی سروکار نہیں، لیکن وہ شخص جو برٹش حکومت اور برٹش قانون کو قبول کر کے انگریزی رعایا بن چکا ہے، وہ چاہے بغاوت کا جھنڈا کھڑا کر دے اور سڈیشن یا انار کی پھیلانے اور حکومت کے قانون کو توڑنے کے ساتھ ہی زبان سے یہ بھی کہتا رہے کہ میں انگریزوں کی وفادار رعایا میں سے ہوں، حکومت اس سے انکشاف نہیں کر سکتی، حکومت اگر اس کے نئے پچانسی یا حبس دوام کی سزا تجویز کرے، تو یہ سوال نہیں کیا جاسکتا کہ جب کروڑوں آدمی دنیا میں انگریزی حکومت سے باہر ایسے موجود ہیں، جو انگریزی قانون اور اس کی حکومت کو قطعاً نہیں مانتے اور حکومت ان سے تعرض نہیں کرتی، تو کیا وجہ ہے کہ رغبت نہ کرنے والے شخص کو

سڈیشن کے جرم میں اس قدر سخت اور سنگین سزا دی جا رہی ہے۔
 خوب سمجھ لو کہ جو شخص اسلام میں داخل ہو اور اس کے حلقہ حکومت میں آگیا
 اور اس نے اسلام کے پورے قانون کو اپنے حق میں قبول کر لیا، اب اگر وہ اسلام کا نبائی
 دعواری کھتے ہوئے اسلام سے نکلنا چاہتا ہے اور اس کے قانون کو توڑنا چاہتا ہے اور
 خاتم النبیین کی رعیت بننے کے بعد کسی کتاب کو جدید غی مان کر فی الحقیقت آپ کے
 دعوئے خاتم النبیین کو جھٹلاتا ہے، وہ اسلام کا باغی ہے۔ پس اسلام کی طرف سے
 وہ یقیناً ایسی سزا کا مورد ہوگا جس کے مورد وہ غیر مسلم لوگ نہیں ہیں، جو ابھی تک
 اسلام کے حلقہ میں داخل ہی نہیں ہوتے اور جو فُتُنُ شَاءَ فَلْيُؤْمِنُ وَمَنْ شَاءَ
 فَلْيُكْفُرْ کی تہدید آمیز آزادی سے ابھی تک متمتع ہو رہے ہیں۔

امیر جماعت احمدیہ سوال کرتے ہیں کہ: ”اگر مسلمان حکومتیں اپنے ملکوں میں
 یہ قانون بنائیں گی کہ غیر مسلم کو ان کے ملک میں اپنے مذہب کی تبلیغ کی اجازت نہیں
 تو اس کے بالمقابل کیا عیسائی طاقتیں اسی قسم کا قانون اسلام کے خلاف بنانے
 میں حق بہ جانب نہ ہوں گی کہ ان کی حکومت میں تبلیغ اسلام کی اجازت نہیں! اس
 کا نتیجہ کیا ہوگا یہی کہ تبلیغ اسلام کا کام دنیا میں قطعی طور سے رک جاتے گا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اسلام اپنے اختیار سے کسی شخص کو مرتد بناتے جانے کی
 اجازت نہیں دے سکتا، اسلام کا یہی قانون، افغانستان میں بہت پہلے سے رائج ہو
 اب اگر اس کے جواب میں محمد علی یا مرزا محمود کے مشورے سے غیر مسلم حکومتیں اپنے
 قلمرو میں تبلیغ اسلام کو روک دیں، تو اگرچہ ہم مسلمان اپنے اس عقیدے کے موافق
 کہ آج دنیا میں صرف ایک مذہب، اسلام ہی سچا اور مکمل عالم گیر مذہب ہو سکتا ہے
 ان کی اس بندش کو حق بہ جانب نہیں کہہ سکتے، تاہم یہ ضرور ہے کہ وہ ایسا کر گزریں
 تو ہم ان کو روک بھی نہیں سکتے، نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک طرف اگر نو مسلموں کا سلسلہ رک
 جائے گا تو دوسری جانب پرانے مسلمانوں کا اسلام سے نکلنا بھی بند ہو جائے گا اور
 میں خیال کرتا ہوں کہ وجودہ دولت کی حفاظت، عہد غیر موجود دولت کی تحصیل

سے اہم اور مقدم ہے، کسی چھوٹی سے چھوٹی اور ضعیف سے ضعیف سلطنت کی نفرت بھی اس کی اہمیت نہ نہیں دے گی کہ وہ اپنے حاصل شدہ حقوق و فوائد کی حفاظت کے لئے فوج بھرتی کرنے اور بڑی سے بڑی طاقت کی ٹکراٹھانے سے پہلو تھو کرے۔ حالاں کہ وہ جانتی ہے کہ اس تمغلا کے سلسلے میں اس کے سپاہیوں کا نقصانہ غنیم کے سپاہیوں سے بہت زیادہ ہوگا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اسلام لشہروں کے ایمان کی حفاظت میں لسی غیرت اور مضبوطی نہ دکھلاتے اور اس خوف سے کہ اس کو دوسری جگہ بعض غیر حاصل شدہ فوائد سے محروم ہونا پڑے گا، اپنے حاصل شدہ حقوق کی حفاظت سے دست بردار ہو جائے؟

مرزا محمود اور محمد علی مع اپنی ذریات کے ایڑی چوٹی کا زور لگا کر عیسائی طاقتوں سے ایسا قانون بنالیں اور تبلیغ اسلام کے قانونار وک دے جانے کا گناہ اور قتل مرتد کے جوابد میں قتل کئے جانے والے نو مسلموں کا خون اپنی گردن پر اٹھالیں، لیکن وہ یہ امید ہرگز نہ رکھیں کہ افغانی حکومت ان کی ان دھمکیوں سے مرعوب ہو کر اپنا اسلامی قانون بدل ڈالے گی اور ان کو یہ موقع دیا جائے گا کہ افغانستان کے نہایت ہی یکے اور سچے مسلمانوں میں ایک جھوٹے نبی کا نام لے کر اور غیر مسلموں کے لہجنت بن کر تفرقہ اندازی کرتے پھرینا۔

محمد علی صاحب کہتے ہیں کہ ۱۰۰ اسلام کی فتح اس میں نہیں کہ مسلمان ملکوں میں دوجہ مذہب کی تبلیغ رکی رہے، بلکہ اسلام کی فتح یہ ہے کہ مخالفت اپنی ساری مادی طاقتوں کو صرف کر لیں اور جس قدر اسلام سے لوگوں کو کلکالنے کے لئے زور لگا سکتے ہیں اہانتہ رکھ لیں کہ کس طرح پردہ ناکام بہتے ہیں۔

بے شک اس نتیجے کا ہم کو بھی یقین ہے اور خدا کی مہربانی اور امداد سے ہم کو پہلا وثوق ہے کہ اسلام کے خلاف سب دجالانہ کوششیں، اندرونی یا بیرونی، آخر کار ناکام ہو کر رہے گی، لیکن اس یقین اور وثوق سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہم برائی کی جس کوشش کو ظہور میں آنے سے پہلے روکنے پر قادر ہوں، نہ روکیں اور جس بدی کو نمودار ہونے

سے قبل ہی ہم بند کر سکتے ہوں، بند نہ کریں، اسلام صرف بہادری نہیں، حکیم بھی ہے وہ اپنی بہادری کے خوش میں اور آخری فتح کے یقین پر احتیاطی تدابیر اور حفاظتی دسائے کو نظر انداز نہیں کرتا، بلکہ یہ طور انجام دینی جہاں تک ممکن ہو، فتنے کے آنے سے پہلے ہی بند لگا دیتا ہے، اگر اس پر بھی فتنہ کسی جگہ نہ رک سکے، تو پھر بہادرانہ مقابلہ کرتا ہی اور ہر صورت میں انجام دہی ہوتا ہے کہ حق کی فتح اور باطل کا سر نیچا ہو۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مرتدین پر چڑھائی کی، لیکن جب انھوں نے مانعین زکوٰۃ سے (حکم زکوٰۃ نہ ماننے کی وجہ سے) قتال کا ارادہ کیا، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہ مانع آئے کہ کلمہ پڑھنے والوں کے ساتھ قتال کیسے کرو گے؟ آپ نے فرمایا کہ: وَاللّٰهِ لَا قَاتِلِينَ مَنْ ذَرَقَ بَيْنَ الْقِسْلُوۃِ وَالزَّكُوۃِ.. خدا کی قسم میں ضرور اس شخص سے قتال کروں گا، جو نماز اور زکوٰۃ میں غرق کرے، چنانچہ حضرت عمر اور دوسرے معترضین کی کچھ میں یہ بات اگلی اور حق تعالیٰ نے ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ہاتھ سے فتنہ ارتداد کا استیصال کر دیا اور حق کو وہ فتح اور نصرت نصیب ہوئی کہ بعد میں صحابہ، ابو بکر کے اس کارنامے پر رشک کرتے تھے،

غور کرنے کا مقام ہے کہ مانعین زکوٰۃ اگر خلیفہ کے مقابلے میں چڑھ کر آئے تھے تو کیا حضرت عمر جیسے جلیل القدر صحابہ اس کی مدافعت سے ابو بکر صدیق کو روک سکتے تھے کیا انھوں نے فقاتلوا للی تبغی حتی تفی الی امر اللہ، قرآن میں نہیں پڑھا تھا پھر ابو بکر رضی اللہ عنہ نے جواب میں یہ نہ فرمایا کہ یہ لوگ باغی ہیں اور مدافعت کے مقابلے پر انھوں نے چڑھائی کی ہے، اس لئے ان سے لڑنا ضرور ہے، جو جواب دیا، وہ صاف بتلاتا ہے کہ اگر کوئی جماعت، مسلمان ہونے کے بعد نماز یا زکوٰۃ یا اسلام کے کسی قطعی حکم کے ماننے سے انکار کرے گی تو اس سے ضرور قتال کیا جائے گا، تا وقتے کہ راہ راست پر نہ آجائے۔

ہاں، حنفیہ نے قبل مرتد کے حکم سے عورت کو مستثنیٰ کہا ہے، اگرچہ جس دہم کا حکم

وہ بھی دیتے ہیں، یہ اس لئے نہیں کہ جرم ارتداد کی سزا قتل نہیں ہے، بلکہ ایک ہی جرم کی اور سزائیں مجرمین کے احوال کے تفاوت کی بنا پر ہیں، میں پہلے ثابت کر چکا ہوں کہ ارتداد اسلام سے بغاوت کا نام ہے تو کیا حکمت و انصاف کی بڑی بڑی مدعی گورنمنٹوں کے یہاں بھی بغاوت کے جرم کی سزا ہر ایک مجرم کے حق میں یکساں ہوگی؟ اگر امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ نے بعض نصوص کے اشارے سے دو مجرموں کے لئے ایک ہی جرم کی دو سزائیں تجویز کی ہیں، تو اس پر کیا اعتراض ہے؟ کیا شریعت میں امتہ اور حرہ کی حد میں فرق نہیں ہے؟ حالانکہ جرم ایک ہی ہو تو ہے؟ کیا ایک ہی فعل زنا، زانی کے محسن اور غیر محسن ہونے کے فرق سے الگ الگ سزائوں کا موجب نہیں ہے؟ اس پر مرتد اور مرتدہ کے جرم ارتداد اور اس کے مدارج کو قیاس کر دو، یعنی مرتد اور مرتدہ کی سزائوں کے تفاوت سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ جرم ارتداد کی نہیں ہے، زیادہ توضیح چاہو تو برابر اور محترم مولانا سراج احمد صاحب اور مولانا میرک شہ صاحب کے مضامین کا مطالعہ کرو۔

اب میں مضمون کو ختم کرتا ہوں اور جانتا ہوں کہ اس کے جواب میں مجھے بہت سی گالیاں دی جائیں گی، لیکن میری پھر بھی یہی دعا ہوگی کہ خدائے قادر و توانا فرمائے کہ ارتداد کی دلدل سے نکال کر دینا و آخرت کی سزا سے بچاتے اور ہم سب کا خاتمہ ایمان پر لے کرے اور بادشاہ اسلام امیر افغانستان کو اجراتے حدود اسلامیہ اور محافظت حقوق مسلمانوں کی پیش از پیش توفیق مرحمت فرماتے۔ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَبَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ رَحْمَةً إِنَّكَ أَنْتَ الْوَهَّابُ۔ رَبَّنَا لَا تَأْخُذْنَا إِنْ نَسِينَا أَوْ أَخْطَأْنَا إِنَّكَ أَنْتَ الْغَفُورُ الْكَرِيمُ۔ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا مِلًّا مِلَّةِ الَّذِينَ قَدْ خَلَوْا مِنْ قَبْلِنَا، وَلَا تَجْعَلْنَا مِلًّا مِلَّةِ الَّذِينَ قَدْ خَلَوْا مِنْ قَبْلِنَا، إِنَّكَ أَنْتَ الْغَفُورُ الْكَرِيمُ۔

شبیر احمد عثمانی عفا اللہ عنہ

۱۸ ربیع الاول ۱۴۳۲ھ دیوبند۔

تذنیب یعنی ضمیمہ الشہاب

حامد و مُصلّیاً!

خدا کا شلہ پیسے اس زبان سے ادا کروں جس نے میرے ناچیز رسالہ ”الشہاب“ کو نام و فام میں نہ وہ حسن قبول عطا فرمایا، جس کا مجھے لکھتے وقت کچھ بھی اندازہ نہ تھا۔ الشہاب کی اشاعت شروع ہوئی اور چاروں طرف سے اس کی مانگہ مونی لگی، شکریہ اور تحسین کے بہت سے خطوط آتے، مسلمانوں کو توقع سے بڑھ کر فائدہ پہنچا اور حق تعالیٰ نے باطل پرستوں کے دلوں میں اسی بہت ڈال دی کہ ان کو میرے ماہ سے زائد اس کی اشاعت کو دوا، لیکن مرزائیوں کی کوئی پارٹی بھی جواب سے غمیدہ برآ نہ ہو سکی۔

رسالہ کے بڑھتے ہوئے اثر کو دیکھ کر مرزائی دانت پیسے رہے میں اور ان کے سینوں پر آ رہے چل رہے ہیں، لیکن جس طرح انہیں قبول حق کی توفیق نہیں ہوتی، جواب دینے کی ہمت بھی نہیں ہو سکی، البتہ آج ۶ جنوری ۱۹۲۵ء کو ایک مسٹر محمد علی امیر جماعت احمدیہ لاہور کا اتفاقاً ہمارے ہاتھ آیا، جو سزلے ارتداد کے متعلق ان کے پہلے رسالے کی صدائے بازگشت سے زیادہ نہ تھا، اس رسالے پر ۲۲ رد سمبر کی تبلیغ پڑی ہے اور دیوبند سے ۱۹ نومبر کو ”الشہاب“ خود ان کے نام روانہ ہو چکا تھا، لیکن آپ رسالے کے بالکل آخر میں لکھتے ہیں کہ ”مضمون یہاں تک پہنچ چکا تھا کہ رسالہ الشہاب ملا، گویا دیوبند سے لاہور ایک ماہ سے نائد عرصے میں رسالہ پہنچا بہر حال آپ کے جدید رسالے کا خلاصہ چند الفاظ میں یوں ہو سکتا ہے کہ۔ کسی شرعی مسئلے کے اثبات کے لئے تین چیزیں ہیں، قرآن، حدیث، اجتہاد ائمہ،

اجتہاد ائمہ میں خطا اور غلطی ہو سکتی ہے، حدیث بھی غلط روایتوں اور غلط فہمیوں سے محفوظ نہیں، لہذا ان دونوں سے علاحدہ ہو کر صرف قرآن رہ گیا جو محفوظ ہے پس اس کے خلاف جو چیز آئے گی، رد کر دی جائے گی، اور خلاف کا مطلب بھی یہ سمجھنا چاہئے کہ ان کے مزعوم معنی اور تفسیر کی رو سے جس مسئلے میں قرآن خاموش بھی ہو، اس کے متعلق صحیح سے صحیح اور ناطق حدیثیں بھی یہ کہہ کر نظر انداز کر دی جائیں گی کہ ان کا ذکر قرآن میں ان کی بتلائی ہوئی تفسیر کے موافق نہیں ہے اس طرح تمام مسائل اور مباحث کا فیصلہ اس ایک اصول سے ہو جاتا ہے اور کسی قسم کی کد و کاوش کی ضرورت نہیں رہتی۔

اس ”تمہید“ کے بعد آپ نے وہ آیات قرآنی پیش کی ہیں جن میں مرتد کے قتل کئے جانے کا حکم نہیں ہے، نہ یہ کہ اس کے قتل نہ کرنے کا ذکر ہے، بلاشبہ ان کا یہ استدلال ایسا ہی ہے، جیسے کوئی شخص وَمَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا فَجَزَاءُ ۖ جَهَنَّمَ خَالِدًا فِيهَا، وَغَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهُ وَأَعَدَّ لَهُ عَذَابًا عَظِيمًا کو پیش کر کے یہ کہنے لگے کہ قتل عمد کی سزا بھی قتل نہیں ہے، کیوں کہ اس آیت میں باوجود نے کہ قتل عمد کا ذکر کیا گیا، مگر ساتھ کے ساتھ قاتل کی سزا قتل نہیں بتلائی گئی، اس کے جواب میں وہ کہتے ہیں کہ یہاں سزا دینا اور نہ دینا دونوں سے سکوت ہے اور دوسری جگہ قرآن میں کُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلِ، فرما کر قاتل کی سزا بتلا دی گئی، ٹھیک اسی طرح ان کو سمجھنا چاہئے کہ فَاقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ بھی جو مرتدین ہی کے متعلق قرآن میں دوسری جگہ آیا ہے، اس میں ہم کو تعلیم دے دی گئی کہ ارتداد کی سزا اللہ کے نزدیک قتل ہے۔

آپ نے میرے استدلال قرآنی پر بیچ و تاب تو بہت کھاتے اور علماء کو گالیاں بھی دیں، جو اس نبی کے امتی کے لئے نہایت زیبا ہیں، جو ذاتم اخلاق، سب و شتم اور لعن و طعن کی تکمیل ہی کے لئے شاید مبعوث ہوا تھا، لیکن آیت قرآنی ”فَاقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ“ کا کوئی مطلب پھر بھی نہ بتلا سکے، آپ نے میرے استدلال پر جو سوال

کہتے ہیں، ان کا نمبر و اجواب سنئے۔

سوالات

(۱)

کیا گو سالہ پرستی سے بنی اسرائیل مرتد ہو گئے تھے؟ اگر یہ صحیح ہے، تو کسی قوم کا عقیدہ خواہ کچھ ہو، کیا عملی طور پر کسی تعلیم سے انحراف پر تعداد کا فتویٰ صادر ہو سکتا ہے اور کیا آج لاکھوں مسلمان جو قبر پرستی اور کئی قسم کی من دون اللہ پرستش میں مبتلا ہیں، ان پر ارتداد اور سنگ ساری کا حکم صادر ہو سکتا ہے؟

جواب

(۱)

کیا ایمان لانے کے بعد گو سالہ پرستی، جس کے ساتھ یہ بھی اعلان ہو کہ هَذَا إِلَهِي هَكَم وَاللهُ مُوسَى فَتَسْبِي، اس کے ارتداد ہونے میں بھی آپ کو کچھ تردد ہے؟ پھر تو کھلی سے کھلی بت پرستی بھی آپ کے نزدیک کفر نہیں ہوگی! کیا قبر پرستی یہ کہتے ہیں کہ یہ قبر یا صاحب قبری مسلمانوں کا اور حضرت محمد صلعم کا معبود ہے۔ (معاذ اللہ)

(۲) قرآن شریف میں صاف مذکور ہے کہ سامری کو جو اس شرارت کا بانی تھا، قتل نہیں کیا گیا، سوال یہ ہے کہ حکم شریعت کو سب سے بڑے مرتد پر کیوں نہ صادر کیا گیا؟ کیا وہ اس قوم کا مولوی تھا اور اسی نے شریعت سے مستثنیٰ تھا؟

(۲) سامری اس شرارت کا لالہ، ای بانی تھا، جیسا آنحضرت صلعم کے زمانے میں عبد اللہ بن ابی ریمس المنافقین قہقہ افک کا بانی اور «الَّذِي تَوَلَّى كِبْرَهُ» کا معصداق اعظم تھا مگر آپ کو شاید یہ خبر نہ ہو کہ حسب روایات صحیحہ اس پر حد قذف جاری نہ کی گئی حالانکہ حضرت حسان بن ثابت وغیرہ مومنین پر حد قذف جاری ہوئی، حقیقت یہ ہے کہ منافقین سب سے بڑے کفر شرازیں کرتے ہیں لیکن اپنے نفاق کی وجہ سے دنیا میں قانونی گرفت سے اپنے کو بچاتے رہتے ہیں، جھوٹ بولنے اور بات بنادینے میں ان کو کوئی باک نہیں ہوتا، ساری

کاروائی کر کے بھی قانونی زد سے بنے کہ
 بچا لیتے ہیں، جیسا کہ لاہوری پارٹی باوجود
 کہ مرزا صاحب کی ان کتابوں کے حرف بحرف
 صحیح و صادق ہونے پر ایمان رکھتی ہے، جو
 دعاوی نبوت پر مشتمل ہیں، مگر ازراہ خدا
 و فریب زبان سے یہی کہتی ہے کہ ہم ان کو نبی
 نہیں مانتے، سامری کا نفاق ان سے بھی زیادہ
 عریق تھا، وہ شروع سے ہی مومن نہ تھا،
 بلکہ یہاں منافق تھا جو ملت موسوی کی گھات
 میں رہتا تھا، گویا وہ اس عہد کا عبداللہ بن
 ابی تھا، علامہ سید محمود آلوسی بغدادی رحمۃ
 اللہ "روح المعانی میں بہت سے اقوال
 نقل کر کے فرماتے ہیں: **وَبِالْجُمْلَةِ كَانَ
 عِنْدَ الْجُمْهُورِ مُنَافِقًا يُظَاهِرُ الْإِيمَانَ
 وَيُبْطِنُ الْكُفْرَ** روح المعانی، ص ۸۹
 پس جیسا کہ رسالۃ الشہاب میں بتلچکا، وہ
 منافق کے احکام کھلے ہوئے مرتد سے علامہ
 ہیں، اس لئے سامری ان مرتدین کے ذیل
 میں نہیں آیا، ہاں، اس کے فتنے سے محفوظ
 کرنے کے لئے حق تعالیٰ نے اس کو یہ سزا
 دی، **فَإِنَّ لَكَ فِي الْحَيَاةِ أَنْ تَقُولَ
 لَا مَسَاسَ، وَإِنَّ لَكَ مَوْعِدًا لَنْ
 تَخْلَفَهُ**۔

(۳) اِکْرَفَا قَتَلُوا اَنْفُسَهُمْ کے یہ معنی درست ہیں کہ شرک کرنے والوں کو قتل کر دو، تو اس شرک میں ساری قوم مبتلا ہے اس کے بعد جس قوم بنی اسرائیل کا ذکر ہے وہ کہاں سے آئی تھی؟۔

(۴)۔ قرآن شریف میں ان کی توبہ قبول کرنے کا بھی ذکر ہے اور اسی واقعے کا ذکر کر کے بعد یہ بھی فرمایا ہے، ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ۔ ہم نے تمہیں معاف کر دیا تاکہ تم شکر گزار بنو اگر قتل کر دیئے گئے تو وہ معافی، جس پر شکر گزاری کا حکم ہوتا ہے، کیا تھی۔

(۳) یہ آپ ثابت کیجئے کہ گو سالہرستی میں ساری کی ساری قوم مبتلا تھی، لفظ قوم تو بلا قرآن میں ایسے واقعات کے ذیل میں استعمال ہوا ہے، جن کا تعلق مخصوص جماعت یا افراد سے تھا،

(۴)۔ اگر اس آیت میں انہی مقتولین کی معافی کا ذکر ہے، تو بے شک نجات اخروی کے لحاظ سے ان کی توبہ مقبول ہو چکی اور جب اس کی مقبولیت کی اطلاع باقی قوم کو دی گئی، تو باہمی تعلقات کی بنا پر ان کو بھی شکر گزار ہونا چاہئے، اگر کسی ماں باپ بجاتی بہن کا جرم حق تعالیٰ معاف کر دے اور اس سے اپنا عذاب اٹھالے، تو کیا یہ ایک طرح کا احسان اس شخص پر نہیں ہے؟ دیکھو، يٰبَنِي إِسْرَائِيلَ اذْكُرُوا نِعْمَتِيَ الَّتِي أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ میں ان بنی اسرائیل کو خطاب ہو رہا ہے جو آنحضرت صلعم کے عہد میں موجود تھے، اور جس انعام کا ان پر ذکر کیا گیا ہے، مثلاً فرعون کے ہاتھ سے نجات دلانا، دریا سے پار کرنا وغیرہ وغیرہ وہ ان بنی اسرائیل سے متعلق نہیں، بلکہ ان کے اسلاف سے متعلق تھا، اسی طرح یہاں بھی سمجھ لو، اور اگر آپ کے نزدیک دنیا میں ہی

ان کا جرم معاف ہو چکا تھا، تَوَاتَّ الَّذِينَ
اِتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَيْنًا لَهُمْ غَضَبٌ
مِنْ رَبِّهِمْ وَذَلَّةٌ فِي الْحَيَاةِ
الدُّنْيَا، کس طرح صحیح ہو گا؟ کیا خدا
تعالیٰ ایک جرم معاف کر کے پھر اسی پر سزا
بھی دیتا ہے۔

(۵)۔ کیا یہ صحیح ہے کہ رانوب جیسے امام
لغت نے فاقتلوا انفسکم کے معنی یہ
بھی لکھے ہیں قیل: عُنِيَ بِقَتْلِ النَّفْسِ
اماطة الشهوات یعنی قتل نفس سے مراد
شہوات کا دور کرنا ہے، تو وہ تصریح اور
ایضاح کہاں رہی، جس کا مولوی صاوب
کو دعوا تھا؟۔

(۵)۔ رانوب نے یہ معنی خود اختیار نہیں
کئے، کسی اور کا قول نقل کیا ہے، وہ بھی بہ
صیغہ تحریف، اور یہ پتا نہیں کہ اس کا قاتل
کون ہے اور کس رتبے اور درجے کا ہے، ایک
ایسے مجہول قاتل کے غیر معروف قول کے
مقابلے میں کیا ان الَّذِينَ اِتَّخَذُوا
العجل سينا لهم غضب من
ربهم وذلّة في الحياة الدنيا
سے آپ دست بردار ہو جائیں گے؟ کیا
اماطة الشهوات اور نفس کشی بھی خدا کا غضب
اور ذلت ہے؟ ایسے غیر ناشی عن دلیل
احتمالات، کسی مضمون کی صراحت اور وضوح
کو باطل نہیں کر سکتے۔

یہ تو امیر جماعت احمدیہ لاہور کی قرآن دانی کا حال تھا، اب حدیث فہمی کا نمونہ
دیکھتے۔ میں نے سنت رسول اللہ صلعم کے ذیل میں چند احادیثِ قولیہ صحیحہ پیش کی تھی
آپ فرماتے ہیں کہ ”یہ تو نبی کریم صلعم کے اقوال و ارشادات ہیں، سنت رسول اللہ صلعم
تو آپ کا عمل ہوتا ہے، عمل دکھلاؤ۔“

بلاشبہ جو لوگ امامِ اديتہ محمد رسول اللہ ﷺ سے گھبراتے اور بھگتے ہیں، خدا کی لعنت سے کچھ ایسے غلطی ہو جاتے ہیں کہ موٹی موٹی چیزوں کے سمجھنے کا مادہ بھی ان میں نہیں رہتا اور دنیاؤں اور آخرت کی رسوائی سب کو بھول جاتے ہیں کہ کسی اذنی طالب علم سے پوچھ لیا، ہوتا کہ علمائے حدیث و اصول، صرف فعل و قول، اللہ تعالیٰ کو کسی سنت کہتے ہیں یا حضور کے قول کو بھی؟ بالہ، قول و فعل میں معارضہ ہو، تو قول کو فعل پر ترجیح دیتے ہیں۔

امیر جماعت احمدیہ کا ایمان اور قول و فعل میں امتیاز اس حد تک پہنچ گیا کہ حضرت معاذ بن جبل کی صحیح حدیث قضاء اللہ و رسولہ کو قرآن کے مقابل صحابہ کا ایک فعل قرار دیتے ہیں اور پھر کھسیانے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ واقعہ اپنی ساری تفصیلات کے ساتھ مذکور نہیں، ہمیں کیا علم ہے کہ اس مرتد نے کیا کچھ کیا تھا گویا آپ کا جہل (نہ جانتا) بھی بخاری کی صحیح حدیث کو رد کر سکتا ہے! یہ امتی تو لیتے ہی سے بھی بڑھ گیا، کیوں کہ مرزا صاحب تو کسی کو رد کرنے کے لئے اپنی وحی کی آیت نکھڑتے تھے، لیکن آپ کے یہاں ایک حیرکانہ معلوم ہونا بھی اس کے رد کر دینے کے لئے کفایت کرتا ہے۔

اجماع ائمہ جو میں نے امام شعرانی کی کتاب سے نقل کیا تھا، اس کا جب کچھ جواب نہ بن پڑا تو فرماتے ہیں کہ یَسْتَنْابُ اَبَدًا اور لا قَتْلَ اِلَّا بِالْحَرَابِ اس کے معارض ہے، مگر یہ بتلایا کہ یہ جملے اجماع کے مخالف کس طرح ہیں، جن بعض لوگوں کی رائے یَسْتَنْابُ اَبَدًا کی ہے، ان کا مطلب یہ ہے کہ اگر مرتد قتل سے پہلے اَرْتَدَّ سے توبہ کر لے، پھر ارتداد کیا، پھر توبہ کر لی اور اسی طرح کرتا رہا، تو توبہ قبول ہوتی رہے گی، اجماع اس پر ہے کہ مرتد واجب القتل ہے اور ان حضرات کے نزدیک جب توبہ قبول ہو جاتی ہے، تو وہ بعد توبہ مرتد ہی نہیں رہتا، پھر کیوں قتل کیا جاوے فی الحقیقہ یہ جملہ ان علماء کے مقابلے میں ہے جو فرماتے ہیں کہ تیسری دفعہ مرتد ہونے والے کی توبہ بھی قبول نہیں، اور لا قَتْلَ اِلَّا بِالْحَرَابِ جس جگہ لکھا ہے، وہیں اس

کی تفصیل بھی موجود ہے کہ حراب سے بالفعل جنگ کرنا مراد نہیں، آپ خود بھی اِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِينَ يَحَارِبُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ، کی تفسیر میں تسلیم کر رہے ہیں کہ ہر جگہ حراب کے معنی جنگ کرنے کے نہیں ہوتے اور اس کے شواہد قرآن شریف سے پیش کرتے ہیں، دیکھو بیان القرآن، ص ۶۱۵۔

قیاس شرعی جو میں نے حافظ ابن قیم سے نقل کیا تھا، اس کا آپ نے کچھ ذکر نہ کیا، بلکہ اس کی جگہ دوسری عبارت جو میں نے اس سیاق میں نہیں لکھی تھی، نقل کر دی اور افسوس کہ اس کا بھی کچھ جواب نہ دے سکے،

میرے مضمون میں ایک جگہ اَخْرَجَ الْحَيْلَ الشَّيْفَ، عربی کا یہ جملہ آگیا تھا، جیسے کاتب نے نسخ میں لکھ دیا، آپ اسے آیت قرآنی سمجھ کر قرآن میں تلاش کر رہے ہیں، حالاں کہ بہتر ہوتا کہ آپ اسے کابل کے اسلحہ خانے میں تلاش کرتے:-

آپ کہتے ہیں کہ جس طرح خلیفۃ المسلمین کو یورپین طاقتوں کے دباؤ سے قتل یا مرتد کا قانون بدلنا پڑا، ان علما کو بھی ذلیل ہو کر ایک دن ایسا کرنا پڑے گا، مگر آپ کو یہیں سے سمجھ لینا چاہیے تھا کہ علمائے ربانیتین کو حق تعالیٰ نے کیا جرات اور قوت قلبی بخشی ہے کہ جو چیز آپ کے ادعا کے موافق یورپین طاقتوں کے دباؤ سے خلیفۃ المسلمین تک کو مانتی پڑی ہے، اسے آج تک ہندوستان کے محکوم مولویوں نے نہ مانا، تم تمام علما کو مرزا صاحب کی طرح بزدل اور ڈرپوک نہ سمجھو، بحول اللہ و قوتہ ایسے علما قلیل کثیر برابر موجود رہیں گے، جو تلواروں کی چمک اور بندوتوں کی کنزک کے نیچے بھی حق کا اظہار کریں گے، اور خدا نہ کردہ اگر افغانستان بھی ایک قانون اسلامی کو تبدیل کرے گا، وہ جب بھی تبدیل نہ کریں گے۔

آپ نے آخر میں چند سوالات کا جو پمفلٹ میں کتے تھے، پھر اعادہ کیا ہے، لیکن ان سب کا جواب یہ ہے کہ ناظرین کرام ایک مرتبہ ازراہ مہربانی پھر رسالہ اشہاب کو پڑھ جائیں، ان شاء اللہ تعالیٰ تمام وساوس شیطانیہ کے لئے لائحہ عمل کا کام دے گا اور کوئی ضروری سوال ایسا نہ ملے گا جس کا جواب اس میں موجود نہ ہو

میں تطویل کی ضرورت نہیں سمجھتا، کیوں کہ آپ نے عملاً میرے رسالے کے سارے مضامین کو تسلیم کر لیا ہے اور جن ایک دو امور کی نسبت یہ دو ایک ورق سیلہ کہتے ہیں، اس کے شافی اور مبسوط بحث ہمارے رسالے میں پہلے سے موجود ہے۔ وَ مَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللَّهُ لَهُ نُورًا فَعَالَهُ مِنْ نُورٍ...

تم ہزار برا بھلا کہو، لیکن جو کاری ضرب الشہاب نے تمہاری اہل بنیاد پر لگائی ہے، وہ خدا کے فضل سے بے اثر نہیں گئی جن کروڑوں مسلمانوں کو آپ کے مرزا صاحب نے دائرۃ اسلام سے نکالا تھا وہ اس رسالے سے اطمینان پیا ہے میں اور دنیا میں جو چند نفوس مرزا صاحب نے مسلمان چھوڑے تھے، ان کے دلوں میں حق تعالیٰ نے ایسا رعب ڈال دیا ہے کہ وہ اب الشہاب کے کسی مطالعہ کرنے والے سے اپنے ارتداد کو نہیں چھپا سکتے، ایک طرف اگر مرزائی اور آریہ اور عیسائی چند جاہلوں کو مرتد بنا رہے ہیں، تو دوسری طرف خدا تعالیٰ حق کا نور پھیلا رہا ہے، بہت سے غافلوں کی آنکھیں کھلتی جاتی ہیں اور بہت سے لوگ اسلام کی فطری کشش سے اسلام کی طرف جذب ہوتے جاتے ہیں۔ كَذَلِكَ هُوَ لَاءِ هُوَ لَا يَمُنُ مِنْ غَطَاءِ رَبِّكَ وَمَا كَانَ عَطَاءُ رَبِّكَ مَحْظُورًا۔ تم جلتے رہو اور غیظ کھاتے رہو، ہماری طرف سے یہ جواب ہے۔ "مُوتُوا بِغَيْظِكُمْ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ۔"

الواقف

شبیر احمد عثمانی

۱۰ جمادی الآخر ۱۳۴۳ ہجری

مطبوعات دار المؤلفین دیوبند

- ماہِ شریح الاسلام (حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہ کی مکمل موعظ) ۴۰/-
- القاموس الاصطلاحی عربی اللہ (اصطلاحی دکنشری) ۵۰/-
- القاموس الاصطلاحی اردو عربی (اصطلاحی دکنشری) ۴۵/-
- فن انشاء الرجال ۲۰/-
- تاریخ طبری کا تحقیقی جائزہ ۱۵/-
- مفتاح الحدیث (علم حدیث کے بنیادی اصول و ضوابط) ۱۵/-
- خلافت راشدہ کا عہد زریں (مجلد) ۵۰/-
- خلافت راشدہ کا عہد زریں (کارڈ بورڈ) ۴۰/-
- تحریک آزادی اور مسلمان ۵۰/-
- ماسونیت کیا ہے؟ ۱۵/-
- اسلام کا نظام طہلاق ۳۰/-
- صداقت اسلام ۲۰/-
- دارالعلوم احیاء اسلام کی عظیم تحریک ۰/-
- عظمت اسلام ۰/-

دار المؤلفین، دیوبند (یو پی انڈیا)